

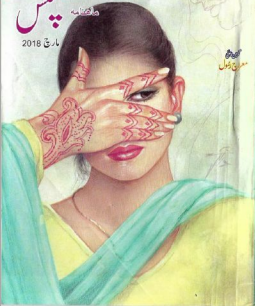
نوجوت کتب خانہ کابل

سینس ڈائجسٹ

ماہنامہ

مارچ 2018

پیشکش
سینس ڈائجسٹ





مدیر اعلیٰ
عذر ان رسول

مدیرہ
نائب مدیر اطہر حسین

مینجر اشتہارات
محمد شہزاد خان
0333-2256789

سرکولیشن مینجر
سید منیر حسین
0333-3285269

جسٹس
ناہید سلطان اختر

معصوم بچوں کا چپن چھین لینے والے
سگدل اور قلم انوں کا ماحیرا

07
انشائیہ
جون ایلیا

جب الفاظ معنی ٹھہریں تو ایسی
ہی لازوال تحریر رستم ہوتی ہے

16
موراں
علی اختر

ماضی کا آئینہ بہ اختیار اور بے اختیار
فرانز کا بلی آموز اور عبرت آمیز واقعات

57
التجا
محمد شوکی

بعد از مرگ
روحوں کی درد انگیز التجاؤں کا قصہ

08
آپ کے خط
مدیر اعلیٰ

سپنس کی مجلس مشاورت و مشاورتیں لی تا
شیریں بائیں گلے گلے اور پر خلوص مشورے

19
نفع نقصان
تنویر ریاض

مستی کی چاشنی میں
لہجہ و حوکاہی کی تخیلوں کا قصہ

62
رنگ آسمان
سر آرزو اجپوت

شرق مغرب کے عجیب استراحت اور تاریخی تخیلوں
عبرت اثرات میں لہجہ و حوکاہی کا قصہ

108
آواز حق
مرزا امجد بیگ

بیرون ملک جا کر روزگار کے خواہش مند
لوگوں کے لیے ایک عبرت اثر واقعہ

99
مہلت
نور عباس

مخوف ہاتھوں میں اپنا اہم رشتہ
کراکے محیر ہاں کے طعیناں کا قصہ

139
خلش
نعمان اسحاق

زندگی کے بجائے درد کو جینے
والی ایک حسینہ کی دلہزدہ گفتگو

163
جس زدہ
مظہر سلیم ہاشمی

ایک پتھر دل باپ کی شقی القلمی
ایک لرزہ خیز وادوات

221
انتقام
انجم فاروق ساحلی

جوش میں ہوش کھو دینے والے
مصر کی سرزمین پر فرعون
سازشیں اور بغیر کے معجزات کا احوال

245
تنہائی
نادیہ نور

خون جھاڑنے والے برقیلم موسم
کی لہجہ گردانے والی وادوات کا احوال

151
امانت
شاہ زین رضوان

محبت کے رشتوں میں
گندمی متا کی تڑپ اور گرن کی روداد

174
وقت
حسامیت

ایک عزم بازی کی بازی گری
خیز واقعات پر شکل ایک لہجہ باطنی داستان

225
حضرت موسیٰ
رضوانہ ساجد

جوش میں ہوش کھو دینے والے
مصر کی سرزمین پر فرعون
سازشیں اور بغیر کے معجزات کا احوال

252
حریف
نشون ہادی

خفاقت کی چادر میں جھپٹے خیزوں کی اذیت
اور بے اعتبار رشتوں کی دلخراش داستان

160
مخفیانہ شعریں
قاریین

آپ کے ہاتھوں ہی ایک گمنام کے
آپ کے ہاتھوں ہی ایک گمنام کے

209
دیدہ دلیری
شاہد لطیف

دوسروں کو نصیحت کرنے والے
منصفوں کی بے ایمانی اور بے اصولی کا مجرا

239
ناکام
منظور امام

ناکامی سے منہ چھپانے اور ڈر جانے
والوں کے لیے ایک حساس تحریر

**
کترین
انار

دنیا بھر سے ادھر ادھر سے لطیف چٹکے
اقتباسات، مکرر لہجہ اور تھکے ہوئے آپ کے لیے

مشرق

ایک انگریزی فلم کے دوران میں پاکستان کی ایک آراستہ و پیراستہ بیٹی یہ جاننے کے لیے بے تاب تھی کہ پاکستان اور انگلستان کے درمیان کھیل کا جو مقابلہ ہو رہا ہے، اس کا انجام کیا ہوا؟ اسی نزدیکی میں ایک شخص نے جو ٹرانسفر سے کان لگائے کھیل کی روداد سن رہا تھا، بتایا کہ پاکستان ہار گیا اور پھر ان بردمند اور جند مستیوں کے دلوں میں 1857ء کا دکھ تازہ ہو گیا۔ مغرب کے مقابلے میں مشرق کی بے حرستی کا داغ پھر جل اٹھا۔

ہم جس بود و ماند میں قائم ہیں، اس میں انگلستان سے ہارنا تو ہارنا، جیتنا بھی ہارنا ہے۔ کہتے ہیں کہ ایک یوز نے ایک انسان سے یہ شرط بندی کہ جو فلاں انسان کی ہو پھول اتار دے، وہ اس بیڑ کے سارے پھلوں کا حقدار ہوگا۔ یوز نہ اس نقل میں جیت گیا اور خوش خوش اپنے باپ کے پاس گیا۔ باپ نے کہا: ”ارے میرے بیٹے! یوز نے انسان کی نقل اتارنے میں، انسان سے جیت جانا کیا تیرے خیال میں جیتنا ہے؟“

تمہارا ہر کام اور ہر کھیل مغربی ہے، پس تم ہارے تو کیا اور جیتے تو کیا؟ بلکہ دکھ تو یہ ہے کہ تم ان کی نقل اتارنے میں کبھی کبھی جیت بھی جاتے ہو۔ اے قوم! تیری سحرگئی دیکھنے کے قابل ہے۔ تیرا قومی احساس اب صرف کھیلوں کے میدان میں بیدار ہوتا ہے۔

ہم دانشوروں کے اس فطانت نصاب اور حکمت مآب گردہ سے تعلق رکھتے ہیں جنہوں نے جراثیم کے ”قومی شعور“ پر خطبات دینے کی اہم ذمہ داری قبول کر رکھی ہے۔ جو حشرات کے ”تہذیبی تنھنات“ کے باب میں داہر تحقیق دیا کرتے ہیں۔ جراثیم کا قومی شعور، حشرات الارض کے تہذیبی تنھنات..... ایک کیڑا امیز پر جوکا ہوا مشرق کے عظیم ادبی روٹے پر انگریزی میں مضمون لکھ رہا ہے۔ ایک کوڑا، دیوان غالب ہاتھ میں لیے ہوئے، چاچا کی دھن میں بحر ہرج کی سر پر کی کر رہا ہے۔

تم کیا اور تمہارے احساس کیا۔ تمہاری حیثیت کیا ہے؟ جب نہیں ہو تو کیوں کان کھائے جاتے ہو۔ ذرا اپنے آپ کو چھو کر تو دیکھو۔ دیکھا تم نے۔ یہ کچھ اور ہے۔ اپنے سراپا پر نظر ڈالو۔ یہ کسی اور کی شکل ہے۔ تم جو کچھتے ہو، اس کی شیرینی اور ترشی پر تمہارا کوئی حق نہیں۔ تمہارے کان دوسروں کے لیے سنتے ہیں۔ تمہارا شمار دوسروں کے لیے سونگتا ہے۔ تمہارا لمس غلام، تمہاری بھارت غلام، تمہارا مذاق غلام، تمہاری ساعت غلام، تمہارا مٹام غلام۔ تمہیں وقت نے دہار ماری ہے کہ تمہارا حلیہ بگڑ گیا ہے۔ تمہارا داغ مآذف ہو گیا ہے۔ تمہارے ہونے کی اب محض ایک ہی دلیل رہ گئی ہے اور وہ یہ کہ تم گھبرتے ہو۔ مشرق قائم دائم ہے کہ چشم بد دور..... مشرق میں طول، عرض اور عمق پایا جاتا ہے۔ خدا اس چشم کو قائم و دائم رکھے۔

ماہ فروری 2018ء کے دل کش شمارے کی جھلکیاں



پاکیزہ
کراچی
ماہنامہ
پاکیزہ

رفعت سراج اور شیریں حیدر کے مسلسل ناول کی نئی چونکا دینے والی اقساط

صبا بخاری کے سلسلے وار ناول..... محبت لفظ ہے لیکن..... میں دیکھیے کردار نگاری کے حسین جوہر

ناہید سلطانہ اختر کے مشاق قلم کا شاہکار افسانہ..... چاک چاک قبائے دل

فرحین اطفر..... عورت کہانی میں ایک نہایت حساس موضوع لیے حاضر ہیں

روشانے عبد القیوم کا مکمل ناول..... میرا عشق صوفیانہ

کردار سازی اور روح کی بالیدگی کا اہتمام لیے

ذکیہ بلگرامی اور اختر شجاعت

کے ایمان افروز کالم

شائستہ زریں نے مہمان بلایا شہزاد شیخ اور ان کی وکیل ہم سفر کو

لکھیے جلد

ماہ نام قلم کاروں کی دل کو چھو جانے والی بہترین تحریریں جن میں عقیلہ حق، طیبہ عنصر مغل، بشری سیال، ہما بیگ، ماہ وش طالب، نزہت جبین ضیا، حرا قریشی، صدف آصف دیگر مصنفات شامل ہیں۔

اس کے ساتھ ساتھ دلچسپ مشتعل سلسلے، رنگ رنگ تراشے، دل موہ لینے والی شاعری، آزمودہ ترکیبیں اور بہت کچھ.....



عزیزان من!
السلام علیکم!

مارچ 2018ء کا شمارہ اپنے باذوق قارئین کی خدمت میں حاضر ہے۔ مہینہ مارچ کا ہوا اور قارئین پاکستان کا ذکر نہ ہوتا بات کچھ بھی نہیں ہے مگر..... مشکل تو یہ ہے کہ 23 مارچ کے اغراض و مقاصد کا ذکر کر کے بھی بات بنتی نظر نہیں آتی کیونکہ..... جب انسان کو اپنے ہی گھر کی چار دیواری میں بھی تحفظ کا احساس نہ ملے تو یہ کیفیت اسے ذہنی اذیت و اذیت کی شکل دے دیتی ہے۔ جی ہاں آج کل پاکستان کے مختلف شہروں میں بھی کچھ ایسی ہی بے اعتباری کی فضا چھائی ہوئی ہے۔ ایک بار پھر سے معصوم بچوں کے اغوا، ظلم اور زیادتی کی دہائیں پھیل رہی ہے۔ نامعلوم افراد معلوم ہو جانے کے باوجود قانون کے شکنجے سے آزاد نظر آتے ہیں۔ والدین غموں سے پھرد اور پولیس مجرمان سے دور جب کہ پاکستانی معاشرہ بے کس و مجبور..... یہ کسی منظر کشی اور تاریخ رقم ہو رہی ہے اور دوسری جانب قانون کی وردیوں میں ملیں اہل کاروں کے ہاتھوں بے قصور شہریوں کو کوئی بھی جھوٹا الزام دھر کر بے رحمانہ قتل کیا جا رہا ہے..... اب کوئی یہ بتلائے کہ ایسے میں بات کیسے بن سکتی ہے۔ اگرچہ انکسٹن و ممال کے جال میں الجھا کر تمام سیاستدان اپنے اپنے مفاد کی بات بنانے کی کوشش تو کرتے نظر آ رہے ہیں اور حسب دستور پاکستان کے دستور کی آڑ لے کر عوامی مسائل سے نظر ہٹانے کی روایت پر بھی دل وجان سے عمل پیرا ہیں۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو ایک ماہ میں دو بار بیٹروں کی تہوں میں اضافہ کر کے گیس، بجلی، پانی اور روزگار کو ترسے ہوئے لوگوں پر ہنگامی کام نہ مگرایا جاتا۔ بے یار و مددگار یہ قوم جس کے بظاہر اسنے سارے ”قائمین“ چلتے پھرتے اور تقاریر کرتے نظر آتے ہیں، اپنی بے بسی پر جھجھکا ہٹ اور ڈپریشن کا شکار نہ ہوا تو کیا کرے، اولاد چھوٹی ہو یا بڑی..... اس وقت والدین کے لیے یہ دور بہت بڑی آزمائش بن چکا ہے۔ جنگل کے قانون کے بھی کچھ اصول ہوں گے..... کچھ نہیں تو جنگلی جانوروں میں بھی کچھ دیر لٹا کی رقت ہوتی ہوگی، لیکن..... یہاں انسانی فعل..... انسانی معاشرہ اور قانون..... کس پر اعتبار کیا جائے..... کیا ہم پھر سے پتھر کے زمانے کی طرف دھکیلے جا رہے ہیں..... تعلیم، ترقی، جدت، ایجادات نے ہمیں اس شعور سے کیوں دور کر دیا ہے کہ یہ سب تو انسان کے لیے ہیں تو پھر یہ انسان کے ہی دشمن کیوں ہو گئے ہیں۔ بہر حال سوال تو بے شمار ہیں مگر جواب کسی ایک کا بھی ملنا دشوار ہے لہذا آخر میں ہم صرف یہ دعا ہی کر سکتے ہیں کہ یا الہی ہمارے رہنماؤں اور با اختیار طبقے کو وہ شعور دے جو انسان کے لیے صرف انصاف کی بنیاد پر بہترین معاشرہ تخلیق کر سکے، (آمین) اور اب اس سوالیہ نشان کو سوچ کی غمی میں دبائے کچھ اپنی غفلت کی بھی خبر لیتے ہیں جہاں قارئین اپنے سندیوں کے ساتھ ہمارے منتظر ہیں۔

محمد رفیق، واہ کینٹ سے تشریف لائے ہیں ”فردی 2018ء کا شمارہ اب وہاں سے ہمارے ہاتھوں میں آ گیا ہے۔ خوبصورت اور شاندار سالہ شائع کرنے پر میں ہی نہیں سب ہی آپ کو مبارکباد دیتے ہیں۔ دقت پر ملنے سے اسے پڑھ بھی لیتے ہیں اور پھر خط بھی لکھ دیتے ہیں۔ اس دفعہ بھی کہانیوں کا معیار پہلے سے بھی بہتر تھا۔ بجلی ہی کہانی بہت دھرم تاریخی غمی اور ملی اختر صاحب نے اس کہانی کو بہت ہی اچھے انداز میں تحریر کیا جس میں پیچیدگی اور تاریخی قوم کے بارے میں معلومات حاصل ہوئیں۔ ملی اختر صاحب نے حق ادا کر دیا اور خوبصورتی سے سب کرداروں کو ایک کہانی میں سودیا۔ بے شک وہ مبارک باد کے مستحق ہیں۔ (جی بالکل درست کہا۔ تاریخی کہانی بڑی عرق ریزی کا تقاضا کرتی ہے) دوسری کہانیوں میں تو ریا کی جوشی انتقام، زو یا اعجاز کی میراث، محمد یاسر اعوان کی شراکت دار، ناہید سلطانہ کی بے خبر، ملک صفدر حیات کی جرم زادہ، محمد الیاس کی جمہوریت، اختر زبیر و سلمیٰ کی جرم کون، شاکر لطیف کی نفسیاتی جنگ، شاہ زین رضوان کی نادیہ دھم، ایم زیڈ شیخ کی حقیقت، انجم فاروق ساحلی کی خطرناک، شرمیاس کی راز داں، اسامہ قادری کی وارث، سب ہی اچھی کہانیاں تھیں۔ (بہت خوب) محفل شعر و سخن نے بھی دل لوٹ لیا، بہت اچھے شعر پڑھنے کو ملے۔ خط بھی

خوب اچھے لکھے گئے ہیں۔ خاص کر فشی محمد عزیز صاحب عرصے سے پڑھ رہے ہیں مگر کچھ سال کے سال ہیں۔ میں بھی آپ کی اس بزم میں ایک کہانی ارسال کرنا چاہتا ہوں، کیا آپ اسے اپنے پرچے میں جکدیں گے۔ ”ذی ضرور جو پتا فہرست کے صفحے پر درج ہے اسی پر آپ ہمیں ارسال کر سکتے ہیں۔ اگر آپ کی کہانی قابل اشاعت ہوئی تو ضرور پرچے میں جکد پالے گی۔ سبس پسنڈ کرنے کا بے حد شکر ہے)

ریاض بٹ، حسن ابدال سے محفل میں شریک ہیں ”حیدر کی بھی سکرانٹ اور اس چوڑیاں یہ کہانی سناری غمی کہ انتظار کی گھڑیاں طویل ہو گئیں۔ خیر، آگے بڑھے تو جون ایلیا صاحب نے اسے قلم کی چھتھی ہوئی تحریر سے روشناس کرایا۔ غریب عوام کو ہر دفعہ بے وقوف بنانے والے سب اچھا ہے دکھائیں گے اور دھوٹے لے کر چلتے نہیں گے۔ پھر یا مقدر یا نصیب۔ اس کے بعد اپنی پیاری محفل میں قدم رکھا۔ فشی محمد عزیز سنے وہاڑی سے رقم طراز ہیں کہ یہ خط وہ تیس سال بعد لکھ رہے ہیں۔ بھی بہت دیر کردی مہرباں آتے آتے۔ چند مہرباں جب بھی آئیں مہرباں ہی ہوتے ہیں۔ آپ کا خط بہترین ہے۔ میرا شعر پسند کرنے کا شکر ہے۔ محمد صفدر معاویہ آپ نے یہ بات بالکل ٹھیک لکھی ہے کہ مال اچھا ہو تو قیمت نہیں دیکھی جاتی۔ آپ کو میرا تبصرہ پسند آیا مہربانی۔ آپ کا تبصرہ بھی قابل قدر ہے۔ ہر بات کا تفصیل سے ذکر ہے۔ ایمانے زارا شمارہ آپ تبصرہ خوب لکھتی ہیں۔ باربر عباس اور ماہین بابر آپ لوگوں کا کافی عرصے سے سبس کے ساتھ تعلق ہے۔ باربر عباس بھائی کافی اچھے اور گپ والے خط لکھتے رہے ہیں۔ ان کی ڈیڑھ دو بے قیمت والی بات سن کر مجھے بھی یاد آ گیا کہ میرا تعلق بھی سبس سے اتنا ہی پرانا ہے۔ (بہت خوب) عبدالجبار رومی کیسے ہو بھی..... محفل میں آپ کا خط دیکھ کر خوشی ہوئی ہے۔ ویسے شاہناہ سلطان، ناہید یوسف اور کرن عمران کے تبصرے شاندار ہیں۔ تاریخ کے اوراق سے کشید کردہ کہانی بہت دھرم نے بھی خوب معلومات میں اضافہ کیا۔ عورتوں کی ضد نے تاریکیوں کو آسمان سے زمین پر پٹخ دیا۔ ضد تو کسی کی بھی ہو نقصان پہنچاتی ہے۔ اس کے بعد پڑھی ملک صفدر حیات صاحب کی جرم زادہ، مطلب ہے، جرم کی کوکھ سے جنم لینے والا بندہ۔ لکھ پڑھ رنگ بدلتی کہانی نے ہمارے ذہن کو بھی کی قلابا زیاں لگوا دیں۔ آخر جب مجرم سامنے آیا تو حیران ہوئی۔ یہاں بھی آشنائے اسے قتل کروا دیا اور بعد میں کرکئی۔ بہر حال کہانی اچھی رہی۔ آج کل کی بلکہ میری ناقص رائے کے مطابق ہمیشہ کی سیاست سے پردہ اٹھاتی کہانی محمد الیاس کی جمہوریت عوام کی آنکھیں کھولنے کے لیے کافی ہے۔ اختر زبیر و سلمیٰ کی تحریر مجرم کون ایک چوکا دینے والی تحریر ہے۔ نعمان نے جو کچھ لکھا بظاہر اچھا نہیں کیا۔ لیکن اس نے معاشرے کو دھکی لوٹا جو معاشرے نے اسے دیا۔ انجم فاروق ساحلی کی کہانی خطرناک میں ایک بیوی نے اپنے خاوند کے قتل کا بدلہ بڑی ہوشیاری سے لیا۔ انجم فاروق ساحلی ویل ڈن، نفسیاتی جنگ، شراکت دار اور حقیقت بھی پسند آئیں۔ یہ بات میں بر ملا کہوں گا کہ آپ لوگوں کا انتخاب لا جواب ہوتا ہے۔ جس نے ہمیں سبس کا گرویدہ بنایا ہوا ہے۔ (آپ کی پسندیدگی کے چند جملے ہمارے حوصلے مہمیز کر دیتے ہیں) اس بار میرا شعر شاید راستے میں رہ گیا تھا۔“ (لگتا تو یہی ہے)

رمضان پاشا، بخش اقبال، کراچی سے تبصرہ کر رہے ہیں ”انشائیہ حسب معمول فکر انگیز تھا۔ خطوط کی محفل میں پہلے نمبر پر آنے والے فشی محمد عزیز صاحب کو مبارکباد، موصوف واقعی بہت پرانے تبصرہ نگار ہیں، یہ عاجز بھی اس زمانے سے وابستہ رہا ہے اور آج بھی وابستہ ہوں۔ (بہت شکر یہ جناب) 1984ء سے لے کر اب تک کے میرے تبصرے میں نے محفوظ رکھے ہوئے ہیں۔ اشعار کا ذخیرہ بھی محفوظ ہے۔ (بہت خوب جناب) مدیر اعلیٰ صاحب میں آپ سے شکایت نہیں کروں گا کہ فردری کے پرچے میں میرا خط شائع نہیں ہوا، ڈاک خانے والوں کی غفلت کا شکار بن گیا ہے مجھے۔ (بالکل درست کہا آپ نے۔ آپ کا پہلا خط بھی آپ کے دوسرے خط کے ساتھ ہمیں ملا ہے) جوش انتقام کہانی معقول تھی، تعجب ہے سراغ رساؤں میں بھی ایسی پھلے بازیاں ہوتی ہیں۔ میراث نے بہت متاثر کیا، ایک فکر انگیز کہانی تھی۔ کافی عرصہ یاد رہے گی۔ رنگ آسمان نے اس بار بہت گہرے رنگ بکھرے ہیں۔ اس کے علاوہ اس کہانی میں جس اور سبس کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا ہے، بہت مزہ آ گیا۔ شراکت دار نہ صرف پراثر تھی بلکہ سبق آموز بھی تھی۔ بے خبر، سدا اللہ کے بچے والدین سے کیوں نفرت کرتے تھے۔ اس کا سبب جان کر جرت ہوئی۔ جرم زادہ اس دفعہ ملک صاحب کی کہانی بہت ہی پڑکائی ہوئی تھی، کہانی میں خوب لطف آیا۔ جمہوریت، یاس، یہ تو کوئی کہانی ہی نہیں ہے۔ یہ تو اپنے وطن عزیز کے حالات بیان کیے ہیں سو بہت خوب کیے ہیں۔ ”مجرم کون؟“ کافی دلچسپ کہانی تھی، لطف آ گیا۔ وقت پر تبصرہ کرنے کا وقت نہیں آیا۔ نفسیاتی جنگ بھی خوب کہانی تھی۔ نادیہ دھم، پسند نہیں آئی۔ حقیقت نے بھی خوب مزہ ہم پہنچایا۔



(گلتا ہے آپ پتھر سے لے کر بڑھتے ہیں..... یہ تو ہماری حوصلہ افزائی ہے کہ آپ کو مزہ آجاتا ہے) خطرناک بھی اچھی کہانی تھی، اس میں سسٹمز بھی تھا۔ رازداں کہانی چٹ پٹی تھی۔ کہانی وارث نے تو ہلا جلا رکھ دیا، کہانی کا بھی کون اسامہ قادری، موصوف کا شیش گل اگلی تک ذہن میں گوج رہا ہے۔ اشعار کی محفل میں کراچی کے عاصم خان اور جنگ سٹی کے عظیم احمد عرفان احمد اور کونسل کے عادل خان کے اشعار قابلِ داد تھے۔ جن دوستوں نے اپنے اپنے تیمروں میں مجھ تاجیک کا ذکر خیر کیا، ان سب کا میں بدل سے شکر گزار ہوں۔“

اوشا رانچی، مٹھی، سندھ سے خراماں خراماں چلی آ رہی ہیں ”جنوری 2018ء کا شمار ہاتھ میں آتے ہی دل خوشیوں سے بھر گیا، دعا ہے اوپر والا پورا سال خوشیاں، سکون اور امن سے نوازے۔ آئیں۔ ڈاکراگل کے ذوق میں بھی اضافہ ہو رہا ہے اور ناٹل کی خوبصورتی میں چار چاند لگ رہے ہیں۔ ڈائجسٹ کی قیمت میں جتنا بھی اضافہ کریں ہم چھوڑنے والے نہیں۔ بے فکر رہیں۔ (فکرتو ہوتی ہے لیکن آپ کی محبت مطمئن کر دیتی ہے) ایلپا جی نے قانون کے بارے میں لفظ لفظ بولا، ویلڈن۔ ایمانے زاراشاد صدارت پر نظر آگئی۔ تیمر بھی پرہٹ تھا، مبارک ہو۔ زرین خان ہمیشہ سے باریک بین ہیں اور دور کی کوڑی لاتی ہیں۔ بہترین پوائنٹ آؤٹ کرتی ہیں۔ شاعری بھی کمال غضب ہوتی ہے۔ اس بار تو محفل نے بھی ممبران کو اچھے برے، چھوٹے بڑے تیمروں کے ساتھ خوش کر دیا، محفل میں جگہ دے کر۔ بابر عباس بھائی ابھی تک پرانے زمانے والے ڈائلاگ یعنی ناٹک کھینچنے والی بات کر رہے ہیں۔ ہم پاکستانی بڑے دل والے ہیں۔ درماندہ، تائید سلطانہ اختر جی میری فیورٹ رائٹر ہیں۔ سوسب سے پہلے ان کی کہانی پڑی۔ بہت ہی زبردست اور لا جواب داستان رہی۔ جس جس نے مہرن کی زندگی خراب کی برے انجام سے نہ بچ سکا۔ ایسی کہانیاں پڑھ کر دل اداس ہو جاتا ہے۔ مظہر امام صاحب بھی کچھ عرصے سے نظر نہیں آ رہے۔ درندان کی اسٹوری میں ہنسانے کا مواد ہوتا ہے۔ (کبھی کبھی تقدیر بھی آجاتا ہے کبھی) اک دور تھا، ڈاکٹر ساجد احمد جی نے کافی دلچسپ ماضی کا آئینہ دکھایا۔ مرزا احمد بیگ جی کی گریبان بھی بہت اچھا نام دے گئی۔ فرید احمد کو پیش مسائل اور ذاتی زندگی پر جتنی دھسے سامنے آئے۔ ڈاکٹر شیر شاہ سیدی جی کا آدی پڑھ کر دل دھکی ہو گیا۔ پاکستانیوں نے کیا کیا دکھائیں سے مگر رفیق جیسے لوگ پھر بھی نہیں سوجھتے۔ امید نو مظہر سلیم ہاشمی جی کی بہت پسند آئی۔ دعا چوہدری کافی مضبوط اعصاب رکھنے والی لڑکی تھی، اتنی مشکلات کا سامنا کیا، لیکن کامیاب رہی۔ آخری فیصلہ اپنے کزن کلیم کے حق میں دیا۔ شاکر لطیف جی کی سبکی بھی خوب رہی۔ ڈیوڈ کوایڈی جی جیسا سبکی ملا، پھر وہ بھی اس کی مجبو بہ کا باپ، ایڈی کی پھر بھی اپنے مقصد میں کامیاب نہ ہو سکا۔ آج کل میری پسندیدہ داستان حسام بٹ جی کی وقت ہے۔ اس میں حقیقت پر مبنی اسٹوری ہے اور آج کے دور پر ہے، گلتا ہے جیسے ہماری آنکھوں کے سامنے فلم چل رہی ہو۔ رنگب آساں، اسے آرا اجپوت جی بھی کسی سے کم نہیں، اس داستان کا پلاٹ پھیلاؤ کی طرف جا رہا ہے اور دلچسپی بڑھا رہا ہے۔ زبردست جناب اسے آرا اجپوت جی۔ کترینیں سدا کی طرح اسے دن نہیں۔ محفل شعر و سخن بھی جگہ گرا رہی تھی۔“

چلیلی ہیر، جنگ صدر، پنجاب سے تشریف لائی ہیں ”میرے بابا جان عرصہ دراز سے یہ رسالہ پڑھ رہے ہیں مگر کبھی لکھا نہیں۔ اب یہ تاج پختی پیر پڑھنے اور ساتھ لکھنے کے قابل ہوئی تو سب سیریس اور انکل نامبرہ نگاروں میں رونق ملیا کرنے حاضر ہے۔ (ماشا اللہ..... انکل ناما۔ تیمرہ نگارو!..... اب دیں جواب) ناٹل پر خاندان بدش نسل کی حسینہ سالو لا رنگ اور چھوٹی آنکھوں کے ساتھ ہونٹوں میں دوپٹا ڈالنے کی خوش گمانی میں مسکرا رہی ہے۔ انٹانہ میں جون ایلپا انکل مبارک ترین پیش کر رہے ہیں۔ آئیں۔ ادارہ میں رسالے کی قیمت 70 روپے کرنے کے بعد میں مکھن اور کریم لگا نہیں جھولے۔ (بھلا مکھن کے دور میں کریم نہ لگا میں تو کب لگا میں..... یہ بھی بتا دیں) سسٹمز ڈائجسٹ کا چمکا مکھن سے زیادہ مزہ دار ہے۔ (یہ ہوئی نا بات) تیمرے سب کے اچھے رہے۔ نئے ممبر ذہنی اچھا تیمرہ کرنے میں کامیاب رہے۔ ساتھ ہماری پیاری مدیرہ بیٹی احمد کے تراش خراش کا بھی کمال ہوتا ہے جو یہ محفل جتنی ہے (بہت شکر ہے) سلسلہ وار داستانیں میری فیورٹ ہیں۔ رنگب آساں مونسٹ فیورٹ ی۔ اے اے آر راجپوت کئی پہلوؤں سے اس داستان کا احاطہ کیے ہوئے ہیں۔ پروفیسر ہنری کی اچانک موت سے کہانی کا رخ تبدیل ہو گیا۔ اب سفر بنا اور شو کی پورا کریں گے۔ دوسری طرف شاہ زمان، اریہ اور علی کا نولہ بھی اپنے مشن کے قریب پہنچ چکا ہے۔ حسام بٹ صاحب نے بھی علی کی والدہ سلٹی بیگم کو بھی داستان میں ختم کر دیا۔ اب علی کا امریکا کا دہائیں جانا مکھن نہیں، ڈاکٹر شاہ بھی مشکوک لوگوں میں شامل ہے۔ علی اختر صاحب کی ہٹ دھرم بھی پیرہٹ رہی۔ تاتاریوں کی تہذیب و تمدن، رہن مہن رسم و رواج اور ان کی تین مشہور

اور ضدی عورتیں..... کی بالکل صحیح عکاسی کی۔ واللہ مزہ آگیا، کیسے کیسے شہزاد اور ہٹ دھرم لوگوں کو موت چٹ کر جاتی ہے تو راکینہ کو بھی زوال آ ہی گیا۔ (کبھی عبرت کا مقام ہے) رضوانہ ساجد اور داستان حضرت موسیٰ، بہت زبردست ویلڈن۔ اسامہ قادری جی ہمیشہ بے مثال لکھتی ہیں۔ وارث بھی ان کی بہت زبردست اور شاندار تحریر ہے، بہت ہی جنس اور سسٹمز سے بھرپور داستان، دل موہ لیا۔ ڈاکٹر رفعت، عروسہ اور سوبرا مظلوم اور اچھے کردار ہے۔ شاہ جہاں بڑا کردار اور بڑا انجام۔ محفل شعر و سخن اور مراسلے بھی زبردست تھے۔“

زرین خان آفریدی، حیدر آباد، سندھ سے شریک محفل ہیں ”ماہنامہ سسٹمز ڈائجسٹ فروری 2018ء، 15 جنوری کو مل گیا۔ سرورق حسینہ سرگمی آنکھوں والی ویلڈن ان کے لیے کی مناسبت سے زرد اور سرخ ڈریس میں اوم لگ رہی تھی۔ باقی سب چھوڑ چھا ڈکرائی محفل پر نظر ڈالی تو مدد لگ گیا۔ جھپٹے دو ماہ سے میرا تیمرہ غائب ہے حتیٰ کہ بلیک لسٹ میں بھی نظر نہیں آیا۔ ساتھ پوسٹ آفس والوں کی بھی کلاس لی ڈائجسٹ کے آفس بھی فون کیا کہ کیا چارہ ہے۔ (ماہر ہے کہ ”لی لی“ یہ پاکستان ہے) آپ کے دونوں خطوط ایک ساتھ ملے) انٹانہ میں ایلپا صاحب اس کو مبارک ترین قرار دے رہے ہیں۔ انشا اللہ ہم مشتاق ہیں۔ ادارہ یہ اس بار بھی خوب سیر حاصل تھا جس میں پاکستان کے مسائل نمایاں کیے گئے۔ محفل میں ششی محمد عزیز نے، اپنے اولڈ از گولڈ کی خوشی منار ہے تھے۔ مبارک باد، محمد صہرہ معادیہ صاحب بھی مستقل مزاج تیمرہ نگار ہیں۔ بابر عباس صاحب بھی کافی سے زیادہ اولڈ از گولڈ ہیں۔ ڈیوڈ روپے کا سسٹمز خریدنے والے خوش قسمت انسان، ایمانے زاراشاد بھی اپنی صدارت پر خوش ہوتی نظر آئیں۔ ریاض بٹ صاحب، ادریس احمد خان صاحب، عبدالجبار روی صاحب محمد تیمروں کے ساتھ رونق محفل تھے۔ نئے ناموں میں شاہانہ سلطان اور طلعت مسعود صاحب اچھے تیمروں کے ساتھ موجود تھے۔ تائید یوسف صاحب کا تیمرہ بھی میٹ رہا۔ جنوری 2018ء اور فروری 2018ء کے سسٹمز ڈائجسٹ بہت ہی زبردست اور شاندار رہے۔ محمد ایلاس صاحب کی کلاس، شریک صاحب کی کلاس اور ادریس صاحب کی اسے ون رہی، جنوری کے شمارے میں، اب فروری کی طرف آتے ہیں۔ ہسٹری اور تاری میرا پسندیدہ ٹاپک رہا ہے۔ ہٹ دھرم میں علی اختر صاحب نے تاری حورقوں اور ان کے رہن مہن پر بہترین روشنی ڈالی۔ داستان میں تو راکینہ نے بڑی خوشیاری اور چالاکی دکھائی مگر پھر بھی ہار گئی۔ ویلڈن علی اختر صاحب، رنگب آساں میں اسے آرا اجپوت نے پروفیسر ہنری کو مبارک داستان کا رخ بدل دیا۔ حسام بٹ صاحب نے وقت میں علی کی والدہ سلٹی کو راجا بھل دکھائی، اس طرح علی کا پاکستان میں رہ کر اپنی والدہ کا بدلہ لینا ضروری ہو گیا۔ یہ دونوں سلسلہ وار داستانیں سسٹمز ڈائجسٹ کی جان ہیں۔ ویلڈن۔ بے خبر میں تائید سلطانہ نے کافی سارے جاہل والدین کو خبردار کر دیا۔ لفظیاتی جنگ میں شاکر لطیف صاحب نے بہت عمدہ اور سسٹمز سے بھرپور اسٹوری پیش کی۔ مارٹن نے تو کمال کر دیا۔ شرارت دار محمد یاسر اعوان نے دھوکا اور جرم پر اسٹوری پیش کی۔ گریمک محسن نے دھوکا فراڈ کو ہلاک کر لیا تھا، ویس ڈس کے قتل کو بھی چھپانا چاہتا تھا مگر تو بولتا ہے۔ جھڑت موسیٰ، ایمان تیری قدرت..... کہ جس سے خطرہ تھا وہی ان کی آنکھوں کے سامنے پلا، بڑھا۔ رضوانہ ساجد صاحب، جزاک اللہ، تیمرے جیسے کا انتظار ہے۔ اسامہ قادری صاحبہ کی وارث نے آخری صفحات کا حق ادا کر دیا۔ بہت ہی اثر انگیز اور عبرت ناک داستان رہی۔ شاکر طرک دولت کے قتل پر لوگوں کی زندگیوں سے کیلتے ہیں لیکن قدرت اپنا کام کرتی ہے۔ شاہ جہاں جیسی عورت بھی لاپتہ ہو گئی۔ محفل شعر و سخن بھی کلاسک رہی۔ مراسلے بھی اے دن تھے۔ ہمارا خیال تھا کہ سسٹمز کلاسک نئے سال سے شروع کریں گے۔“ (اوہو..... محفل اداس نہ ہوں..... بس جلد ہی شروع کرتے ہیں)

محمد زبیر ساگر، گوجرہ سے چلے آ رہے ہیں ”سسٹمز ڈائجسٹ کا پرانا قادری ہوں۔ بہت دیر سے سسٹمز کے ساتھ میرا گہرا رشتہ ہے۔ باقاعدہ سسٹمز براہ خریطہ ہوں اور شوق سے پڑھتا ہوں لیکن خط کبھی کبھی لکھتا ہوں (بس یہی غلطی ہے آپ کی..... کبھی کبھی نہیں خط براہ باقاعدہ لکھتی ہیں) جنوری کا سسٹمز میرے ہاتھوں میں ہے بہت خوش قسمت ہوں کہ سسٹمز کے ناٹل کی خوبصورت حسینہ دیکھنے کو ملی، دلکش اور خوبصورت ناٹل دیکھ کر دل میں کچھ کچھ ہوتا ہے (اوہ خدا یا..... یہ کچھ کچھ کہتا ہوتا ہے) کبھی ہمیں بھی تو بتا میں (سسٹمز سے دلی محبت ہے جو کبھی ختم نہیں ہو سکتی اس لیے کہ اس کی ہر کہانی دل کو چھو لینے والی ہوتی ہے) کبھی کہانیاں اور تیمرے ابھی زیر مطالعہ ہیں لیکن میں یقین ہے کہ ہر ماہ کی طرح ہمارے سسٹمز کی ہر کہانی ہماری جان نے جلد ہی ایک کہانی سمجھوں گا۔ (جی ضرور.....)

محمد خواجہ، کورنگی، کراچی سے جنوری کے شمارے پر تیمرہ لے کر حاضر ہیں ”نیا سال ہم تمام اہل وطن کو مبارک۔ جنوری نے



سال کا شمار بہت معصوم شکل لڑکی کے سرورق کے ساتھ نمودار ہوا۔ اس دفعہ نظر پڑی تو شمارہ کی قیمت میں اضافہ نظر آیا۔ ویسے بھی اسنے پیارے شمارے کی قیمت کا اضافہ کوئی بات نہیں۔ ہم نے پڑھنا ہے اور پڑھتے ہی رہتا ہے۔ ماہنامہ کا تعلق دل سے ہے اور ویسے بھی شوق کی کوئی قیمت نہیں۔ انشاء بہت ہی با مقصد ہوتا ہے۔ قانون بے بس ہے یا بیک چکا ہے۔ انسان نے خطرناک صورت اختیار کر لی ہے۔ دوندے بھی دوندے کو بھگت میں نہیں مارتے۔ ایک زمانہ ہم نے بھی دیکھا ہے جب رات کو بہت دیر سے نکلنے دفتر میں کام بھی بہت تھکے۔ آدمی رات کو بھی بغیر کسی خوف کے گھر آجاتے لیکن اب دن بھی خوفناک ہیں۔ ہر سنے سال پر ایک نئی ترسنا بھری کی جانب سے قدم پر مہار کیا دویسے اور قبول کرتے۔ 2017ء بہت ہی کرناک گزرا۔ سال کا آخر انتہائی سیاسی ابتری کا شکار ہو گیا ہے۔ کسی کو سکون نہیں۔ دہشت گردی کا خوف۔ ہر طرف دشمن وطن عزیز پر میلی نظر رکھے ہوئے۔ مہنگائی انتہائی اونچے درجے پر۔ لو جو ان بیدار گار شوقیہ جراثیم میں مبتلا۔ اللہ رحم کرے۔ (آئین) دوستوں کی محفل اس پر آشوب دور میں بھی بڑی دل نشین ہے۔ میرے گزشتہ خط پر عزیز دوستوں عبد الجبار روی انصاری، رانا بشیر احمد ایاز نے میری کچھ عرصہ غیر حاضری کو محسوس کیا اور بہت ہی دل نشینی کا اظہار کیا۔ خاص کر کا الیکٹرک کے مجھ پر ظلم سے وابستہ۔ بہت شکر گزار ہوں۔ ایک دور تھا، ڈاکٹر ساجد نے برصغیر کے حکمران، جنکس، سازشوں، حقائق کو بڑی تفصیل سے تحریر کیا۔ تاریخ سے دلچسپی رکھنے والوں کے لیے نایاب تحفہ۔ رنگ آسمان، بڑی لا جواب قطیں، اس قسط میں محبت اور چاقوں کا زیادہ اظہار تھا لیکن ساتھ ہی ساتھ کچھ سستی خیر واقعات، مندرجہ میں کھیلے جانے والے ناپاک دھندے، راستے اور جنگوں کی بہترین عکاسی۔ دوا لگ کھائیوں کو انتہائی دلچسپ حیرانے میں لے کر چل رہے ہیں۔ ہمنور، ایک پیچیدہ کیس، کوئی جرم نہیں بس غلطی۔ کچھ بے گناہ ذہن آئے مگر ذہن اور قانون کے پاسداروں نے کیس کو حل کر لیا۔ گریبان، وکیل امجد بیک کا ذہن کارنامہ۔ لیکن ایک احمق اور حاکمیت نا انضامی جو اپنی ہی غلطی پر خندا کی مار کا شکار ہو گیا۔ وکیل صاحب نے تو بہت عمدگی سے اس کو جال سے باہر نکال دیا۔ لیکن وہ خود وہ بارہ ایک دلدل میں گر پڑا۔ یہ کہانی ایک امجد بیک صاحب کی کہانیوں سے خود اختلافی مگر بہت عمدہ اور فصاحت آمیز۔ دودھ ایک ریٹائرڈ شخص سکون کی تلاش میں ایسی جگہ پہنچ گیا جہاں ایک عورت ظالم کے ہاتھوں گرفتار تھی، اس شخص کی عقل و فہم کا جواب نہیں کرائی ہے لوٹ خدمت سے ایسا انتظام کیا کہ ظالم بھی ختم اور وہ بھی بے گناہ بھرا۔ وقت، حسام بیٹ کی شاندار سلسلہ وار کہانی، ہر قدم پر تجسس، ہر کھمبہ ہونے کا خطرہ، ایک عظیم نوجوان کی داستان حیات، منجھوے اور تھیرے سے بھر پور کہانی جس کا دائرہ امریکا سے پاکستان تک پھیلا ہوا۔ عکس، ایک عجیب نفسیاتی شخص کی داستان جس کی شخصیت دوا لگ الگ زاویوں پر مشتمل تھی۔ زندگی کے عجیب دوا ہے پر وہ کھڑا تھا۔ آخر اس کی دورنگی شخصیت نے پٹنا کھایا اور وہ اصل زندگی کی جانب چل پڑا مگر لیکن دلچسپ کہانی۔ بیچ کا آدمی، ڈاکٹر شیر شاہ نے اس کہانی میں موجود دور کے ماسوروں پر نشتر لگایا۔ خوفناک زلزلے میں ہزاروں جانیں گئیں۔ معذرو ہونے والے بے حاشا، دنیا بلی گئی۔ ایک ڈاکٹر نے کوئی خوف خدا نہ کیا اور اس مرحلے پر بھی کشیش سے نہ صرف مال بنایا بلکہ غیر ضروری سامان کا بوجھ خزانے پر ڈالا۔ امید، نو، ایک دردناک کہانی، ایک عظیم اور پروا شدہ والی لڑکی کی داستان۔ مفاد پرست اس کے پاؤں پر چبک گئے۔ بہت سبق آموز کہانی۔ چاندی کا چھکن، ایک چھوٹی لیکن بہت پیاری کہانی۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام، فرعون کی موت، دریائے نیل کا دلچسپ و ہر کو راست دینا، بہت سنا، فلمیں دیکھ ڈائیں لیکن رضوانہ ساجد کی مفصل تاریخ اور تحریر پڑھ کر لگا بہت معلومات حاصل ہوئیں۔ اب غلطی کا احساس نہیں۔ سخی، ایک حیرت انگیز اور دلچسپ کہانی، ایک خطرناک خطی شخص جو اتنا خوفناک انتقام کا عادی لیکن اس کا واسطہ ایک ماہر فنکار سے پڑا جس نے اس کے انتقام کی حسرت بھی پوری کر ڈالی اور اس کو کوٹھی سے مرنے دیا۔ در ماندہ، معاشرتی نا ہمواری، بھیڑیے نما انسان، مکر و دھوکہ، جس کی تحلیل کا کوئی موقع نہ جانے دیتے۔ اس دفعہ کے شمارے میں کسٹروں کی مقدار کچھ زیادہ اور تفصیل دار تھی۔ بہت چٹکارے دار اور شمارے کے حسن میں اضافہ۔ اشعار کی لکھناں بھی خوب سے خوب تر۔ (دیر سے آمد کا بھی بے حد شکر ہے، یہ محفل آپ ہی کے خطوط سے سبکی اچھی لگتی ہے)

ایمانے زار ارشاد: اسلام آباد سے تبصرہ کر رہی ہیں "نائل والی خاتون ٹھنڈی وجہ سے بنامند دھوئے لپ اسک لگا کر ہمارے پیارے سسٹمز پر برا بھلا ہو گئیں۔" ادانت میں دوپٹا اپنے آپ کو باگل 1980ء کی ہیروئین سمجھ کر دیا ہوا ہے ان محترمہ نے.....! "انشائیہ و ادارہ" پڑھ کر صرف ایک بات پلے پڑی ہم جہاں سے چلے تھے آج بھی وہیں کھڑے ہیں....! (اے بھائی ہم نہیں بڑھ رہے تو کیا ہوا۔ زمین تو اپنے مدار میں چکر پورا کرتی ہے نا بھئی) محمد عزیز سے صدر ات کی کرسی مبارک ہو۔ یہ بتائیں آپ مئے ہی کیوں ہیں؟ جون جولائی کیوں نہیں امیں نے بھی نوٹ کیا ہے خواہنا بہت کم شامل ہوتی ہیں..... بابر عباس



جناب عمر سیدہ محبوبہ تو مغربی ممالک کی ہی ہو سکتی ہے..... 70 یا 80 سالہ..... مالی کا ذاتی اوسط عمر بھی پاکستان میں نایاب ہے اور آپ شہرے پاکستانی اس لیے آپ تو ہاتھ جھاڑ لیجیے! طلعت مسعود نے اتنا طویل تبصرہ غالباً جہاز میں بیٹھ کر لکھا ہے..... آپ کا تبصرہ پڑھ کر جنوری کا شمارہ ذہن میں تازہ ہو گیا! زبردست..... سب کا فردا فردا بہت شکر ہے..... ذویا اعجاز نے "میراث" میں نفسیاتی طور پر زبردست ہٹ کیا ہے..... ایک شخصي حکمرانوں کے علاوہ عام لوگوں کو بھی شہر کی آزادی سے کچھ لپٹا دینا چاہیے ہے..... ہم بھول جاتے ہیں ہم جسے "اون" کرتے ہیں اس کے لیے خالی خولی دعوے سنی نہیں رکھتے۔ عملی اقدامات کی اشد ضرورت ہوتی ہے..... ایوم سیاہ..... مہاراجا کے جانشین پر تاب سے تو ہمیں انصاف کی امید تھی لیکن رابرٹ خروماغ بھی نا..... اپنی دشمنی ضرور پنڈال میں ہی نکالنی تھی..... بے چاری ریٹا! اب "رنگ آسمان" دلچسپ موڈ کا تھی ہوئی آگے بڑھ رہی ہے..... اریہ شاہ زمان در یحان کا لکھ جوڑ پتا نہیں کیا کچھ دکھانے والا ہے..... فی الحال تو ایک قتل تک بات مٹی ہے..... بچہ یہ انگریز آفیسر نے جینز بجا دی ہے آپ لوگوں کی..... حیرت انگیز بات لگی پروفیسر ہنری کی موت کو سرسری سا لپٹا حالانکہ وہ تو بڑا خاص مہمان تھا..... اور یہ مہارانی تو وہی روایتی قند پرور مہارانی نگلی شاپاش ہے.....! "وقت" میں ایکٹین کی کی کی اب پورے لگے ہے سلی پیٹم اوپر پڑاؤ کر گئیں بہت ہی شاگدگین تھیں..... ابھی تو ماں بیٹے کے طنز کو چند ہی لمحے گزرے تھے..... ایک تو اس چٹا سے ہم تنگ ہو رہے ہیں پتا نہیں کوئی کچھڑی پکا رہی ہے..... ایسا لگتا ہے نادر شاہ کے کہنے پر اسد علی کے قریب سے قریب تر ہو رہی ہے مگر بھی صاحب کی پیشین گوئیوں نے داغ چکار کر رکھا دیا ہے..... ڈلفی اب آگے جاؤ نا..... "شرکات دار" کے معصوم فراڈ ہے..... گریک نے بھی گولیاں کھلیں اور سونے کی مرغی کو ایک ہی مرتبہ مار کر جان چھڑا نا مہنگا پڑا۔ ورنہ آرٹ و آرٹس دانوں کا بکنا بھی عام ہو چکا ہے اور کوئی تنگ جاسی نہیں سکتا..... ناہید سلطانہ اختر کی "بے خبر" بہترین پیٹام پر مبنی رہی..... قلم واقعی امانت ہے اور اس کا پورا پورا حق ادا کر دیا ہے آپ نے..... ویلڈن..... پرائیویسی کے فقدان کے باعث کچے ذہن پھر ساری زندگی اس سے باہر نہیں نکل سکتے..... یہ ملک مفد حیات کی کہانی آتی پرانی کیوں ہوتی ہیں؟ (کیونکہ وہ خود اسنے ہی پرانے ہیں۔ اور وہ ان کہانیوں میں اپنے تجربات ہی تو لکھتے ہیں) لیکن کہانی پڑھ کر ماننا پڑے گا جراثیم تو اس زمانے میں بھی عام تھے بس پورے تنگ کی شرح کم تھی اور اس باری کہانی سے مجرم کا پھیلے ای سین میں معلوم ہو گیا تھا عموماً قند پر بن کا رد ہی ہوتا ہے جیسے کا کار کا ہوسو کچھ خاص نہیں لگی..... "جمہوریت" ہماری سیاست، سیاست دانوں و عوام کے کارناموں کی مضحکہ خیز داستان رہی۔ کوئی جہاں جہاز روپے اور ایک بریائی کی پلیٹ میں دوٹ بک جاتا ہو ہم خاک بہتری دشواری امید کسکتے ہیں، افسوس.....! اعتراض و صلی کی "مجرم کون" میں سسٹمز تو خوب رہا مگر کہانی میں اسنے کردار ایڈ کر دیے اور پلاٹ کو اس قدر پھیلا دیا کہ لکھاری کے لیے تانے بانے جوڑنا ہی مشکل ہو گیا..... خطرناک اور راز داران مختصر و پراثر شخص..... اس کا قاری نے "دارت" میں کیا خوب لکھا ہے۔ حرف حرف سستی خیز تحریر..... بالآخر اختتامی لمحات میں ملی تھیلے سے باہر آئی اور کیا خوب آئی۔ اپنے ہی پیچھے گھرے لے اڑا دیا..... مہرب!"

خلیق ربانی انجم، رجز، چارسدہ سے محفل کی زینت بنے ہیں "فردوری 2018ء سسٹمز کا شمارہ 22/1 کوٹلا۔ سرورق کو سرسری دیکھنے کے بعد اندرونی صفحات کی طرف قدم بڑھاتے تو بڑھتے قدم سسٹمز کے مضامین کی فہرست میں سرسری نگاہ ڈالنے کے لیے روکنے پڑے۔ سرسری نگاہ ڈالنے کے بعد جون ایلیا کے انشائیہ سے ہوتے ہوئے آپ کے خط میں پہنچے۔ مختصر ادارے سے ہوتے ہوئے..... جس میں چند اہم مسائل پر نشتر زنی کی گئی تھی..... سے قارئین کے خطوط میں پہنچے۔ جس میں ہر کسی نے بھر پور تبصرے کیے تھے اور سب کے تبصرے بہت اچھے بھی لگے۔ جن میں قسٹی محمد عزیز، محمد صفدر معادیہ، ایمانے زار ارشاد، محمد رفاقت، مرزا طاہر الدین بیگ، بابر عباس، ماہین بابر، فضل عباس، اور اس احمد خان، ریاض بیٹ، عبد الجبار انصاری، شاہانہ سلطان، ناہید یوسف، گلشن اقبال، طلعت مسعود کے تبصرے پسند آئے۔ اس کے علاوہ مندرجہ ذیل کہانیان بہت پسند آئیں۔ جن میں ذویا اعجاز زبیر ارٹ، بے خبر، ناہید سلطانہ اختر، جرم زادہ، ملک مفد حیات، جمہوریت، محمد الیاس، مجرم کون؟ اعتراض و صلی، وقت، حسام بیٹ، نفسیاتی جنگ، شاکر لطیف، حقیقت، ایم زید شیخ، حضرت موسیٰ، رضوانہ ساجد، خطرناک، انجم فاروقی ساحلی، راز داران، شمر عباس اور اسامہ قادری کی دارت پسند آئیں۔ محترم بابر عباس، ماہین بابر، فضل عباس آف کھاریاں نے قارئین کے خطوط میں سجا لکھا ہے کہ پتا نہیں کہ سسٹمز کلاسیک کی کہانیاں آپ کب سے شروع کر رہے ہیں؟ اس سلسلے میں گزارش ہے کہ اگر کہانی "مزن" سے ہم اندیشی جائے تو کیا بات ہوگی۔" (ہمیں اندازہ نہیں تھا کہ آپ لوگ سسٹمز کلاسیک کے لیے اسنے بے چین ہو گئے۔ انشا اللہ جلد ہی شروع

محمد صفدر معاویہ، مصلح غائبوں سے محفل میں حاضر ہوئے ہیں۔ سرورق پر دلربا سی ماڈل آویزاں ہے۔ محترم جون ایلیا کا انشاء یہ ہے: چا آج اس دفعہ کے انشاء نیوے لفظوں میں دو کاٹ ہے جو باخیر آدمی کو تہجد کے رکھ دے۔ آپ کا ادارہ یہ چڑھا۔ آپ نے جو کچھ لکھا وہ حکومت و ملت کے منہ پر طراغ ہے۔ اگر وہ سمجھے تو گمراہیوں کی ضرورت ہے سوچنے سمجھنے کی۔ وہ تو مزے سی مزے میں ہیں۔ ملک میں بے شک قتل و غارت ہو، زیادتی ہو، چوری ڈاکا عام ہو، زنا شراب کے اڈے چلیں، ہم کس کس کو روکیں؟ زینب کو، اسماء کو، انظار کو، تب اللہ جس کے مرکزی مزمع ابھی تک نہیں پکڑے گئے۔ پچھلی دفعہ آخری صفحات پر ناہید سلطانہ اختر کی درماتہ ایسے ہی درماتہ صفت لوگوں کو بے نقاب کرتی ہوئی تحریر تھی۔ ساتھیوں کی محفل میں میرے پڑوسی شہر مشرقی محمد عزیز نے کرسی صدارت پر قبضہ کیا ہوا ہے، مبارک۔ باقی تمام دوستوں کے تہمیرے ابھی پڑھنے ہیں جو کہ بہت بہترین ہوں گے۔ کہا نیوں میں رنگ آسمان پڑی جو کہ ہنگامہ خیز یوں سے بھر پور رہی۔ رینا باپ کا مقدمہ ہار گئی۔ رابرٹ کی غداری کی وجہ سے۔ اصرحہ پادین کا نولہ بھی مشکل میں ہے خدا خیر کرے۔ پھر وقت پڑی جہاں علی کی تو دنیا ہی ملت تھی اس کی ماں اس سے روٹھ کر خالق حقیقی کے پاس جا پہنچی۔ بہت بڑا مقدمہ ہے مجھے تو شاہ جی پر شک ہو رہا ہے کہ یہ سب دولت کی خاطر اس کا کیا دھرا ہے۔ محمد یاسر اعوان کی شراکت دار پڑی۔ اچھی تحریر تھی، واقعی خون کر کے بندہ بیخ نہیں پاتا۔ ناہید سلطانہ اختر کی بے خبری بھی اچھی تھی۔ جہاں انسانی تقاضے کے ہم مسئلہ کو اجاگر کیا گیا۔ اختر ازہم و علی کی جرم کو بھی عمدہ رہی۔ نوی نے بدلہ لینے کے لیے قلم قدم اٹھایا جو خود اس کی زندگی کو بھی برباد کر گیا۔

راجہ ثاقب محمود جتوہ، پنڈدادن خان سے گزشتہ شمارے پر تبصرہ کر رہے ہیں۔ ”نئے سال کے پہلے سسٹن کے شمارے کے پائل پر مسکراہٹ سمجھتی تھی۔ حیدر مسرتوں اور کامرا نیوں کی نوید ساری تھی۔ جون ایلیا اپنے انشاء میں قانون کی حرمت برقرار رکھنے کی تلقین کر رہے تھے۔ خطوط کی محفل جاندار تھروں سے بھر پور تھی۔ سب سے پہلے ڈاکٹر ساجد احمد صاحب کی تاریخی کہانی اک دور تھا، پڑھی جو جس سے بھر پور اور بہت ہی سبق آموز تھی۔ دیگر کہانیوں میں گر بیان، امید نور اور دراندہ دل کو چھو لینے والی تھیں۔ رنگ آسمان اور وقت بہت ہی دلچسپ داستانیں ہیں۔ رضوانہ ساجد نے اس مرتبہ حضرت موسیٰ کی عظمت کو اجاگر کیا۔ محفل شعر و سخن کے تمام اشعار اپنی نظیر آپ سے۔“ (انتانتھرا اظہار خیال..... ہنم کی کٹی ہے)

بابا رحمان، ماہین باہر، فضل عباس، نگہبانہ روڈ کھاریاں سے تشریف لائے ہیں۔ ”سری بڑی خواری کے بعد اپنا پیارا اور جان دلارا آنکھوں کا تار سسٹن جو کہ فردوسی کی شکل میں تھا کسی پچھڑے دوست کی طرح ملا۔ سرورق پر بھلا کیا تبصرہ کروں۔ ڈاکر صاحب جب بھی کرتے ہیں کمال کرتے ہیں۔ شاید بیوی کے زبیر اثر ہیں۔ اس ماہ بہت سے ایسے واقعات ہوئے ہیں جو دل خراش ہیں جن پر بہت کچھ لکھا جا رہا ہے اور لکھا جاتا رہے گا مگر ہوگا کچھ بھی نہیں۔ ان واقعات میں سے ایک واقعہ تصور شہر کا زینب کا واقعہ جو سات جنوری کو ہوا آج 19 جنوری ہے قائل گرفتار نہیں ہوا اور نہ ہی ہوگا۔ اس واقعے نے مجھے ہلا کر رکھ دیا۔ میرا عزیز دوست میرا عزیز ساتھی میرا عزیز بھائی جو میرے لیے بہت کچھ تھا۔ انصاف نادر 17 جنوری کو اپنے خالق حقیقی سے جامل۔ (اللہ تعالیٰ آپ کو کھیر دے اور آپ کے بھائی کو جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام عطا فرمائے) آپ سیاست پر بات کر کے اپنی جان کیوں ہلکان کرتے ہیں۔ اس سے شاید قسم کی قسم بھی ہوجاتی ہے (شاید اسی طرح اس مرض کی کوئی دوا مل جائے) اس بار بینک کے آغاز کے لیے آپ نے فشی محمد عزیز سے صاحب کو بھیجا ہے جو اپنی بینک کے جوہر دکھلاتے ہوئے پٹری کی طرف گامزن تھے مگر 99 کے پچھیرے میں آکر ڈاٹ ہو گئے۔ اوپر کے طور پر محمد صفدر صاحب آئے اور کیا خوب آئے زبردست کیا زور دار شاٹ لگے ہیں۔ ریاض صاحب آپ کے کہیں کا کیا بنا دیں کس جو کرکٹ میں اکثر چلتا رہتا ہے۔ خبر بڑی زبردست بینک کی آپ نے۔ سری ایک بات تو بتائیں ٹیم ٹیم میں گیارہ کھلاڑی کھیلے ہیں۔ بارہواں کھلاڑی غائب پانی پلانے کے لیے ہوتا ہے آپ نے تیرہ کھلاڑی کیسے کھلا دیے ہیں۔ اچھا اچھا یہ پاکستان ہے یہاں سب چلتا ہے۔ سری پہلے بتا دیتے اپنے طلعت مسودہ پانی پلانے والے کھلاڑی ہیں۔ کہا نیوں کی شروعات دی گریٹ اور ایک خوبصورت رائٹر جناب عزت آپ جو اپنی کہانی کو تھنٹے تھنٹے پاؤں چلاتے ہوئے دل کو گرماتے ہوئے ہمیں رنگ آسمان کی سیر کروا رہے ہیں، اے آرا راجپوت صاحب رنگ آسمان واہ واہ کیا کہنے۔ دوسرے نمبر پر حسام بٹ صاحب کو وقت کے ذریعے پکڑا۔ حسام بٹ صاحب تعین کریں پور کر رہے ہیں۔ آخری صفحات پر سسٹن نے ہمیشہ کلاسک اور

شانداز کہانیاں دی ہیں جو پرانے قاری حضرات کو ابھی تک یاد ہیں۔ محی الدین نواب مرحوم کی پتھر اور کزن، اس کے علاوہ دوسرے مصنفین کی جگہ اکبر، شوق کائین اور بہت سی دوسری، طاہر جاوید مغل کی کرب آشنائی اور حال ہی میں نکست کی فتح، کاشف زبیر مرحوم کی بہت سی یادگار تحریریں اور بہت سے خوبصورت رائٹروں نے بہت سی خوبصورت تحریریں پڑھنے کو دی ہیں، مگر اس قاری صاحب کی وارث۔ مزہ نکل آیا، سوری اس قاری صاحب۔ ناہید سلطانہ اختر صاحبہ ایک عجیبی ہوئی رائٹر ہیں ان کو پتا ہے میں نے قاری کو کیا دینا ہے، اس بار وہ بے خبر لے کر آئیں۔ بے خبر ایک اچھی تحریر تھی اور فکر انگیز بھی۔ اعتراض سلیم و صلی کی تحریر کردہ جرم کون نے اس طرح متاثر کیا جس طرح ایڈ زردہ مریش کا خون متاثر کرتا ہے بہت خوب۔ دلی ڈون محمد الیاس صاحب جمہوریت پسند آئی گوکہ ہمارے ملک میں نہیں۔ علی اختر صاحب نے اس بار ہٹ دھرم کے ذریعے توجہ جمع چنگیز خان کے خاندان کی سیر کرائی۔ بہت اچھے علی صاحب، ہم کو آپ کی سیر پسند آئی ہم خوش ہوئے کچھ مانگ نہ لیں۔ حضرت موسیٰ کی حالات زندگی پر مبنی رضوانہ ساجد کی زبردست پیشکش دلوں کو منور کرتی ہوئی روشن تحریر کا دوسرا حصہ پڑھا۔ دل باغ باغ ہو گیا۔ شعر عباس صاحب جب بھی مغرب سے کچھ رو آمد کرتے ہیں وہ بہت خاصے کی چیز ہوتی ہے۔ فردوسی کے شمارے میں آپ نے میرے خط کا وہ حال کیا ہے جو امریکا بھارو نے دیت نام کا کیا تھا۔“ (خطوط کے آٹھ صفحات میں سے چار آپ کے نام کیسے کر سکتے ہیں..... اگلی بار یہ فارمولہ ضرور بتائیے گا)

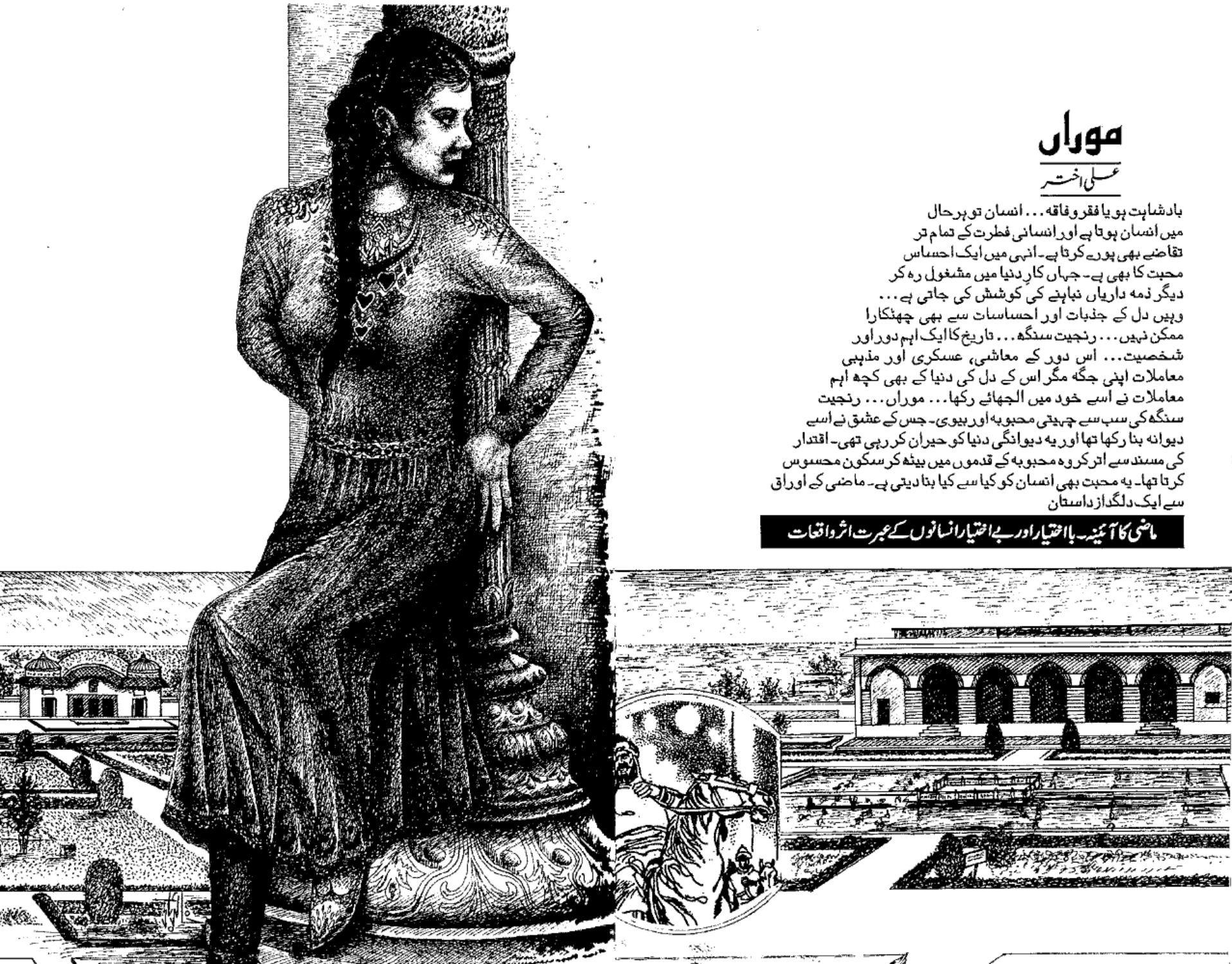
شاہانہ سلطان، جامع کلاچ، کراچی سے خوشی خوشی تشریف لاری ہیں۔ ”ارے واہ واہ یہ صاحب! آپ کے جواب نے تو ہمیں لا جواب کر دیا اور کچھ کچھ شرمندہ بھی..... ہر بار آپ کو یہ کہوں گی کہ ہم نے پہلی بار انٹری ماری ہے (ظاہر ہے جب سالوں بعد تشریف آوری ہوگی تو کون سمجھے گا کہ آپ اسی مکان کے مکین ہیں) اسی ڈر کی وجہ سے ہم نے سوچا کہ اب جلدی جلدی اپنی موجودگی کا احساس دلاتے رہنا چاہیے اور ہم نے سسٹن پڑھتے ہی قلم اٹھا لیا۔ اس بار تاریخی کہانی تھوڑی قلیل تھی۔ علی اختر صاحب پلینڈر ذرا آسان زبان میں تاریخی منظر نامہ دکھائیں۔ ایسے تو ہم بھی ان موتی موتی کتابوں کا مطالعہ کر سکتے ہیں مگر انہیں ہم کون کرے گا۔ ویسے کہانی اچھی تھی۔ اس بار سب سے اچھی کہانی زبیر اعجاز کی میراث تھی۔ سمجھنے والوں نے اسے جو بھی سمجھا ہو مگر ہماری سمجھ میں تو یہی آیا کہ دکھوں کی ایک زنجیر ہے جس نے اس دھرتی پر رہنے والوں کو جکڑ رکھا ہے۔ جانے کب اس زنجیر میں رنگ لگے گا اور وہ کڑی کڑی کر کے ٹوٹی چلی جائے گی۔ حقیقت بھی اچھی تھی۔ لگتا ہے نئے مصنف کی کاوش ہے۔ بہر حال کوشش کامیاب رہی۔ مجرم بھی کئی دلچسپ تھی۔ شاکر لطیف کی نفسیاتی جنگ نے واقعی کمال کر دیا۔ آخری لمحوں تک انجام کا اندازہ نہ ہو سکا، ویلڈن۔ رضوانہ ساجد نے حضرت موسیٰ کا اگلا حصہ بھی بہت خوب لکھا۔ یہ سوانح محض واقعات نہیں بلکہ ان سے اللہ پر بھروسہ دار لوگوں و عقیدوں میں پھیلی پیدا ہوتی ہے، جزاک اللہ..... انجم فاروق کی خطرناک نے بھی مخطوط کیا۔ غریب اس کی راز داں نے لطف دیا مگر وقت دکھوں کی طرح دھیرے دھیرے چل رہا ہے۔ تیزی لائیں حسام بٹ صاحب۔ بہت ست رفتاری کا شکار ہے۔ محمد الیاس کی جمہوریت نے تو پاکستان کا نقشہ کھینچ ڈالا ہے۔ رنگ آسمان بھی اے آرا راجپوت کے قلم سے بہت شاندار اور جاندار ہوتی جا رہی ہے۔ کیا یہ کوئی طویل سلسلہ ہے یا بس چند حصوں پر مشتمل اسٹوری ہے (یہ تو کہانی کے حالات واقعات پر منحصر ہے کہ طوالت کتنی ہو سکتی ہے) محفل شعر و سخن کا انتخاب بہت لا جواب ہوتا ہے۔ تمام اشعار اساتذہ کے کلام کی نشاندہی کرتے ہیں۔ بہت خوب۔ ہمارے قارئین کی حسن نظر کی داد دینا پڑے گی۔ شاد زین رضوان اس بار نادریدہ زخم لے کر آئے اور چھانگئے۔ شاہ زین رضوان نے بھی بہت کچھ مرے میں اپنی جگہ بنالی ہے۔ آپ کے قلم میں بھی جان ہے اور محمد یاسر اعوان نے تو شراکت دار لکھ کر کمال ہی کر دیا ہے۔ جرم بھی آج کل تجربہ مانگتا ہے اور اگر ہمارے بس میں ہوتا تو کیا ہم کو افہام دینا تو ہم نے خبر پر ناہید سلطانہ اختر کو ضرور نوازتے۔ بھی بہت خوب..... بات اگرچہ بہت معمولی ہے جسے والدین نظر انداز کر دیتے ہیں مگر فقط ایک جھلک بچے کے شعور میں ابھی محفوظ ہوجاتی ہے جو کالے نہیں نکلتی..... ناہید ہر بار کسی نہ کسی اچھوتے موضوع پر قلم اٹھاتی ہیں۔ ویلڈن۔ اور جناب اس کے ساتھ ہی دیجیے اجازت..... مدبر و کواب امید ہے کہ ہماری آمدنی بھی نہیں لگی گی۔“ (یہ ہوئی تاہات.....)

اب ان قارئین کے نام جن کے نامے محفل میں شامل نہ ہو سکے۔
ناہید یوسف، اسلام آباد۔ مہتاب احمد، حیدر آباد۔ مہربان ناز، کراچی۔ اعجاز احمد شیخ، ملتان۔ انجم کمال، حیدر آباد۔ محمد جاوید، جہانیاں۔ عامر خان، کراچی۔ سعود احمد، لاڑکانہ۔ نور شاہنواز اعوان، ڈی آئی خان۔

موراں علی اختر

بادشاہت پو یا فقر و فاقہ ... انسان تو ہر حال میں انسان ہوتا ہے اور انسانی فطرت کے تمام تر تقاضے بھی پورے کرتا ہے۔ انہی میں ایک احساس محبت کا بھی ہے۔ جہاں کار دنیا میں مشغول رہ کر دیگر ذمہ داریاں نبھانے کی کوشش کی جاتی ہے ... وہیں دل کے جذبات اور احساسات سے بھی چھٹکارا ممکن نہیں ... رنجیت سنگھ ... تاریخ کا ایک اہم دور اور شخصیت ... اس دور کے معاشی، عسکری اور مذہبی معاملات اپنی جگہ مگر اس کے دل کی دنیا کے بھی کچھ اہم معاملات نے اسے خود میں الجھائے رکھا ... موراں ... رنجیت سنگھ کی سب سے چہیتی محبوبہ اور بیوی۔ جس کے عشق نے اسے دیوانہ بنا رکھا تھا اور یہ دیوانگی دنیا کو حیران کر رہی تھی۔ اقتدار کی مسند سے اتر کر وہ محبوبہ کے قدموں میں بیٹھ کر سکون محسوس کرتا تھا۔ یہ محبت بھی انسان کو کیا سے کیا بنا دیتی ہے۔ ماضی کے اوراق سے ایک دلگداز داستان

ماضی کا آئینہ با اختیار اور بے اختیار انسانوں کے عبرت اثر واقعات



اک کبرام بچا ہوا تھا۔ ایک قیامت اتری ہوئی تھی۔ داخلی گز اور بیرونی حملے سے بچنے کے لیے جنگی اقدامات کر لیے گئے تھے۔ فوج میں بیماری اسلحہ بارود تقسیم کر دیا گیا تھا۔ جنگ دریا کے داخلی اور خارجی راستوں پر مسافروں کو لے جانے اور لانے والی تمام کشتیوں پر پابندی لگا دی گئی تھی۔ صرف ایک کشتی تھی جسے مسافروں کو پالنے کے لیے جانے کی اجازت تھی۔ یہ 27 جون 1839ء کا تھا۔ ”لاہور اخبار“ نے اس کی یوں منظر کشی کی ہے۔

مہاراجا وفات پا گیا۔ رانیاں، کنور کھڑک سنگھ، راجا دھیان سنگھ، جمدار خوشنیل سنگھ اور دوسرے لوگ بلند آواز میں رونے لگے۔ وہ اپنے سروں پر مٹی ڈال رہے تھے۔ زمین پر لوٹ رہے تھے اور پتھروں سے سر ٹکرا رہے تھے۔ لاش کے قریب بے عمل ساری رات جاری رہا۔ محل میں ایک کبرام بچا ہوا تھا۔ ایک قیامت اتری ہوئی تھی۔ جو کوئی لاش کو دیکھتا، بری طرح رونے چلائے لگتا۔“

مہاراجا کی لاش ساری رات زمین پر پڑی رہی۔ اس کے ارد گرد دیے جلنے رہے اور ساری رات گریہ و ماتم جاری رہا۔ راجا دھیان سنگھ سب سے زیادہ روتا ہوا تھا اور اونچی آواز میں چیخ رہا تھا کہ وہ مہاراجا کے ساتھ جل مرے گا۔ کھڑک سنگھ اور دوسرے سرداروں نے اسے اپنا فیصلہ بدلنے پر راضی کرنے کے لیے اس کے بیروں میں اپنی بچڑیاں رکھ دیں۔ تاہم چار رانیاں اور اس کی سات ملازمائیں اس کی چتا کے ساتھ جلنے کا عزم کیے ہوئے تھیں۔ اگلے دن مہاراجا کی لاش کو گنگا جل سے نہلا گیا۔ بحری جہاز سے مشابہ شکل کی صندلی لکڑی سے بنی چتا پر اسے لٹایا گیا۔ اس جہاز کے بادبان ریٹم اور تھل کے بنائے گئے تھے۔ وزیروں اور درباریوں نے چتا پر اپنی اپنی شاخیں ڈال کر تعزیت کا اظہار کیا۔ سستی ہونے والی چار رانیاں اور سات ملازماؤں نے شادی کے لباس اور زیورات پہنے ہوئے تھے۔ لگتا تھا کہ ابھی انہیں ڈولیوں میں بٹھا کر ان کے دلہاؤں کے ساتھ بھیج دیا جائے گا۔

چتا اٹھائی گئی تو وہ چاروں سات ملازماؤں کے ساتھ ننگے پاؤں چتا کے پیچھے بڑی خاموشی سے چلے گئیں۔ وہ وقفے وقفے سے اپنی کوئی چوڑی، کڑا یا زیور تو ڈر فقیروں کے ہجوم میں اچھال دیتی تھیں یا مقدس گیت گانے والے برہمنوں میں سے کسی کو دے دیتی تھیں۔ جنازہ شہر کی تنگ گلیوں سے گزرا جو روتے ہوئے لوگوں سے بھری ہوئی تھیں۔ مکانوں کی چٹوں اور کھلی کھڑکیوں سے بھی لوگوں کی

بڑی تعداد دھواڑیں مار کر جنازے کو دیکھ رہی تھی۔ پھولوں کی چٹیاں اس پر پھونکا دی گئیں۔

شیشاں گھاٹ پہنچ کر چتا رکھ دی گئی۔ ہندو، مسلمان اور سکھوں نے آخری بار مرنے والے کے لیے دعا مانگیں کیں۔ پھر برہمنوں کے مقرر کردہ وقت پر کھڑک سنگھ نے چتا کو آگ دکھادی۔ یہ پنجاب کے حکمران راجا رنجیت سنگھ کی لاش تھی۔ اس کی چاروں رانیاں اور سات ملازماؤں وقفے وقفے سے جلتی ہوئی لاش پر کود کر سستی بن چکی تھیں۔ راجا دھیان سنگھ نے چار مرتبہ چتا پر کودنے کی کوشش کی لیکن لوگوں نے اسے پکڑ لیا۔ دوسری بیوہ ہونے والی رانیاں اور وہاں موجود ہر عمر، مذہب اور جنس کا فرد دھواڑیں مار مار کر روتا ہوا تھا۔

رنجیت سنگھ کی چتا دو دن تک سلگتی رہی۔ تیسرے دن راکھ اور ہڈیاں جمع کر کے مرتابوں میں رکھ دی گئی۔ یہ راکھ ہر دروازے کے مقام پر گنگا میں بہا دی گئی۔ راجاؤں نے تین سو میل تک توپوں کی سلامی دی اور بستی ہوئی راکھ پر اپنی بستی شاخیں نذر کیں۔ لوگ اظہار محبت کے لیے پھولوں اور آنسوؤں کا نذرانہ پیش کر رہے تھے۔

یوں تو پچھلے دو سالوں سے راجا رنجیت سنگھ کی صحت خراب رہنے لگی تھی۔ اپنی آخری عمر میں وہ شراب میں انیون گھول کر پینے لگا تھا اور وہ بھی زیادہ مقدار میں۔ ہولی اور دیوالی جیسے تہواروں میں اور بارش کے دوران وہ بے تحاشا شراب پینے لگا تھا۔ وہ پہلی بار 1826ء میں شدید بیمار ہوا۔ اس وقت اس پر ملیہ یا کاحلہ ہوا تھا۔ حکیم عزیز الدین کی ہدایت پر اس نے لدھیانہ سے ڈاکٹر مرے کو بلوایا۔ جو سات ماہ تک لاہور میں رہا۔ آہستہ آہستہ راجا رنجیت سنگھ کی صحت بحال ہوتی رہی۔ پھر وہ مکمل طور پر صحت یاب ہو گیا۔ 7 اگست 1835ء کو اس پر فوج کا ہلکا حملہ ہوا جس نے اس کے چہرے اور دائیں پہلو کو مفلوج کر دیا۔ اس کی وجہ سے وہ کئی گھنٹے بولنے سے قاصر رہا۔ وہ مجھے دیکھانے والے عطا تیوں کی باتوں کو مان لیتا تھا۔ اسے انگریز ڈاکٹروں کی تجویز کردہ کڑوی دوائیاں تو خصوصاً ناپسند تھیں۔ اس کے ڈاکٹر میک گرگور کو اس سے ہمیشہ بے شکایت رہی کہ۔۔۔

”مہاراجا دودھ کھانے سے گریز کرتا ہے اور مجھے اس کا علاج کرنے میں بہت مشکل ہو رہی ہے۔ اس نے اپنا روزمرہ کام معمول بدلنے سے بھی انکار کر دیا ہے۔“

راجا رنجیت سنگھ نے ڈاکٹر میک گرگور کی نصیحتوں کو پس پشت ڈال کر اپنا روزمرہ کام معمول بدلنے سے انکار

کر دیا تھا۔ وہ رات بھر بخار میں جلتے کے بعد بھی صبح کے وقت پانکی میں سوار ہو کر دیوار پر یا کسی باغ میں چلا جاتا اور واپس آ کر دربار لگاتا۔ جس میں درخواستیں اور خبروں کی بھیجی ہوئی رپورٹیں سننا اور احکامات جاری کرتا۔ جب وہ بہت تنگ ہوتا یا بخار سے بے بس کر دیتا، تب ہی کام سے رکتا تھا۔ تاہم ڈاکٹر میک گرگور نے اسے کسی حد تک نظم و ضبط کا پابند کر لیا اور وہ ایک ماہ کے اندر اندر صحت یاب ہونے لگا۔ یہاں تک کہ ڈاکٹر کو لدھیانہ واپس جانے کی اجازت دے دی گئی۔

”گلتا ہے اب میں بوڑھا ہو گیا ہوں۔ میں اب بہت جلد تنگ جاتا ہوں!“ یہ بات راجا رنجیت سنگھ نے 1836ء میں اپنے نئے معالج بیرون ہیوگس کو کہی تھی۔

1837ء میں رنجیت سنگھ پر دوبارہ فالج ہو گیا۔ اس مرتبہ اس کا پورا دائیں پہلو متاثر ہوا تھا اور وہ تقریباً چھ ماہ مفلوج رہا پھر دوبارہ پہلے کی طرح صحت مند نہ ہو سکا۔ وہ گھوڑے پر خود سوار نہیں ہو سکتا تھا۔ اسے اٹھا کر گھوڑے پر بٹھانا پڑتا تھا۔ 24 جولائی 1838ء کو ہونے والے ایک حادثے سے یہ بات ثابت ہو چکی تھی کہ وہ کس قدر کمزور ہو چکا ہے۔ وہ صبح کی سیر کو باہر گیا ہوا تھا کہ ایک ہاتھی نے اس کی پانکی پر حملہ کر دیا۔ رنجیت سنگھ خود پانکی سے نہیں نکل سکا اور ہاتھی نے پانکی کے شیشے توڑ دیے۔ عطر منڈھ سنگھ حوالہ دیتے ہیں کہ اسے ہاتھی کے پاؤں تلے پکچلے جانے سے بچایا۔ اس نے ہاتھی پر ٹکڑا سے وار کر کے اس کی توجہ رنجیت سنگھ کی طرف سے ہٹائی تھی۔

رنجیت سنگھ پر تیسرا حملہ آگ لینڈ کے دورے کے دوران ہوا۔ وہ اس وقت بے شمار تقریبات میں شمولیت کر رہا تھا۔ جب کرسس کی شام وہ سخت بیمار ہو گیا اور اگلے پانچ دن موت اور زندگی کے درمیان جھولتا رہا۔ اس حملے نے مہاراجا کی بولنے کی قوت پوری طرح ختم کر دی اور اسے اشاروں سے بولنا پڑتا تھا۔ اس کے اشاروں کی زبان صرف دو اشخاص بھائی رام سنگھ اور فقیر عزیز الدین ہی سمجھتے تھے۔ فقیر عزیز الدین تو اس کی بات سننے کے لیے اس کے منہ سے اپنا کان لگا دیتا تھا۔

سردیوں کی بارش اور بخوری کی کاٹ داسر دی نے مہاراجا پر اچھا اثر نہیں ڈالا تھا۔ اس کا نزلہ بکڑ گیا اور اسے شدید کھائی ہوئی۔ فروری میں موسم قدرے بہتر ہوا اور مہاراجا دھوپ میں کمرے سے باہر آنے لگا۔ اس کی صحت بہتر ہو گئی تو اس نے درباریوں کو اپنے بستر کے قریب بلانا

شروع کر دیا پھر مہاراجا مکمل صحت یابی کے لیے امرتسر چلا گیا جہاں کچھ گراس نے بڑی رقم، سونا منڈھے سینگوں والی گائیں، سونے اور چاندی کے ہودے والے ہاتھی، سونے اور چاندی کی کھیمیں خیرات کیں۔ زیادہ خیرات برہمنوں کو دی گئی۔ تاہم باقی سب مذہب کی عبادت گاہوں کو بھی حصہ دیا گیا۔ اب لوگوں کو یہ یقین دلایا جانے لگا کہ مہاراجا کی صحت بہتر ہو گئی ہے لیکن درحقیقت اس کی صحت خراب ہی تھی۔ تب انہوں نے لدھیانہ میں موجود ایجنٹ سے انگریز ڈاکٹر بھیجنے کی درخواست کی۔ لدھیانہ سے ڈاکٹر مرے اور ڈاکٹر سیٹل لاہور آئے۔

ڈاکٹر سیٹل نے ایک ہفتہ لگا کر مہاراجا کا پوری طرح معائنہ کیا اور گورنر جنرل کے لیے ایک خفیہ رپورٹ بھیجی۔ اس نے اپنی رپورٹ میں واضح طور پر لکھا کہ مہاراجا زیادہ عرصہ زندہ نہیں رہے گا۔ اس کی حالت ایسی ہے کہ اتفاقی بیماری اسے موت کے گھاٹ اتار سکتی ہے۔ ممکن ہے وہ اپنی غیر معمولی قوت کی وجہ سے ایک سال تک زندہ رہ جائے۔ اس سے زیادہ عرصہ اس کے زندہ رہنے کا امکان نہیں ہے۔

جون 1839ء تک مہاراجا کے علاج کے لیے چھ یورپی ڈاکٹر اکٹھے ہو چکے تھے۔ ہر مریض ڈاکٹر ہو کر گرنے اسے قلعہ منتقل ہونے کا شور مچا دیا۔ 10 جون کی شام بہت گرمی اور جس زدہ تھی۔ رات کو شدید اندھی جلی۔ لاہور شہر کے دو دروازے اکٹھے گئے۔ قلعے کا بھی ایک دروازہ اکٹھا گیا۔ بے شمار درخت بھی گر گئے۔ شور اور شعلہ کھائی کی وجہ سے رنجیت سنگھ کورات نیند نہ آئی۔ مہاراجا کی حالت دن بدن خراب ہوتی جا رہی تھی۔ مہاراجا نے حکم دیا کہ درج ذیل اشیا کی خیرات کی جائے۔

”سونامنڈھے سینگوں والی گیارہ گائیں، ساشن کے بچھیں بلوسات، سونے چاندی کی دیسی تھیں۔۔۔ سونے کے پانچ اور چاندی کے بہت سے ہرن، دو گھوڑے، ایک ہاتھی دو ہیرے کی انگوٹھیاں، مرجان کی گیارہ مالاکیں اور دو ہزار روپے نقد برہمنوں کو دیے جائیں!“

اس کے علاوہ اس نے جواہرات اور لاقعدا دوسری قیمتی اشیا پورے ہندوستان کے مندروں میں بانٹنے کا حکم دیا۔ اسی روز کوہ نور ہیرا منگو کر جنرل ناتھ کے مندر کو دے دیا۔ اپنی تلواریں، دو ہاتھیں، خنجر، پستول اور توڑے دار بند قوتوں کو فوجوں میں بانٹ دیا۔ اس کے بعد 27 جون کو اس کی بھرپور گزاری زندگی کا سورج غروب ہو گیا۔

☆☆☆

سدا کور اپنے شوہر گر بخش سنگھ کے بعد بٹالہ کی سردار بنی۔ وہ بڑی معاملہ فہم، ذہین اور ریاست کے انتظامات کو بڑی خوش اسلوبی سے چلانے کی اہلیت رکھتی تھی۔ وہ ایک بہادر، طاقتور اور تیز مزاج کی عورت تھی اور اپنے آپ کو ایک غیر معمولی عورت سمجھتی تھی۔

دوسری طرف چاہت سنگھ کا بیالیس سالہ بیٹا مہان سنگھ جو اپنے باپ کی طرح جنگجو تھا، اس نے اپنے آباؤ اجداد کے مقبوضہ علاقوں پر دوبارہ تسلط قائم کر لیا۔ وہ فتوحات کا سلسلہ جاری رکھے ہوئے تھا۔ مہان سنگھ نے جنوں کو فتح کر کے سکر چاکریہ مسل کو گمنامی سے نکال کر نمایاں ترین مقام پر پہنچا دیا۔ انہی لڑائیوں میں سدا کور کا شوہر ہلاک ہو گیا تھا۔

رنجیت سنگھ اسی مہان سنگھ کا بیٹا تھا۔ رنجیت سنگھ کی والدہ راج کور چند کے راجا گجیت سنگھ کی بیٹی تھی۔ جو مہان سنگھ سے بیاہ کر آئی تو اسے اپنے شوہر کے گھر والوں نے مائی ملوان کہنا شروع کر دیا یعنی مالوہ کی خاتون۔ رنجیت سنگھ اپنے بچپن سے ہی غصیلیا تھا۔ شاید اس کے غصیلیا ہونے کی ایک وجہ اس کی والدہ بھی تھی۔ اس نے جب اپنے والد کی وفات کے بعد سلطنت کا انتظام سنبھالا تو اس نے باپ کے مستند منتظم لکھ پتی رائے کو سونپ دیا۔ رنجیت سنگھ کی والدہ کو لکھ پتی رائے پر اعتقاد تو تھا اور اس کی وفاداری بھی کہیں مشکوک نہ تھی لیکن اس کے بھائی دل سنگھ اور سدا کور کو اس پر بھروسہ نہ تھا۔ کچھ اس کے رشتے داروں اور قریب ترین لوگوں نے ان دونوں سے متعلق کئی ایسی باتیں رنجیت سنگھ کے گوش گزار کر دی تھیں جن کی بنا پر رنجیت سنگھ بچپن سے ہی اپنی والدہ اور اس کے آشنائے نفرت کرنے لگا تھا اور وہ اپنا زیادہ وقت گوجر انوالہ کے نواح میں واقع جنگلوں میں ہر لوں اور جنگلی جانوروں کے شکار میں گزارنے لگا تھا۔ شکار نے اسے گھڑ سواری اور نشانے بازی میں ماہر بنا دیا۔ چونکہ شکار کے بعد شراب نوشی کی عادت ہو گئی تھی اس لیے وہ اپنی عمر کے ابتدائی سالوں میں ہی الکحول سے تعارف ہو چکا تھا۔

رنجیت سنگھ مہان سنگھ کی وفات کے اگلے دو سالوں تک ریاست کے انتظامی معاملات سے دور رہا۔ اس کی مصروفیات اور مشاغل نے اس کی والدہ راج کور کو پریشان کر دیا تھا۔ اس نے سوچا کہ اگر رنجیت سنگھ کی شادی کر دی جائے تو ممکن ہے وہ زندگی کی ذمہ داریوں میں دلچسپی لینے لگے۔ اس نے اپنی اس خواہش کا اظہار سدا کور سے کیا۔

سدا کور تو پہلے سے ہی ایک ایسے رشتے کی خواہش مند تھی جس سے اس کی نقل کی اہمیت دوبارہ سے قائم ہو جائے۔ یہ اس کے لیے بہترین موقع تھا۔ چنانچہ اس نے فوراً اپنی بیٹی مہتاب کور سے رنجیت سنگھ کی شادی قبول کر لی۔ جب رنجیت سنگھ برات لے کر گوجر انوالہ سے بٹالہ روانہ ہوا، اس وقت اس کی عمر پندرہ سال سے کچھ ہی اوپر ہوگی۔ دو اہم سنگھ خاندانوں میں قائم ہونے والا یہ رشتہ پنجاب کی تاریخ کا ایک بہت بڑا واقعہ تھا۔ رنجیت سنگھ کی شادی میں پنجاب کے تمام ممتاز سنگھ سردار شریک ہوئے تھے۔

مگر یہ شادی کوئی خوشگوار تاثر نہ چھوڑ سکی۔ اس لیے کہ مہتاب کور کے ذہن سے یہ بات نکالے نہیں نکل پائی تھی کہ رنجیت سنگھ اس کے باپ کے قاتل کا بیٹا ہے۔ چنانچہ وہ اپنی پوری زندگی رنجیت سنگھ سے گریزاں رہنے لگی۔ رنجیت سنگھ جو پہلے ہی رشتوں کی بے وفائی کا شکار تھا، وہ بھی اپنی ذات میں بخوبی گہرا۔ سدا کور کو اس بات کی کوئی پروا نہ تھی کہ مہتاب کور اور رنجیت سنگھ کی گھریلو زندگی کس کج پر جاری ہے۔ وہ بھی اندر سے رنجیت سنگھ کو پسند نہ کرتی تھی۔ اس کی تو بس ایک ہی خواہش تھی کہ مہتاب کور لوگوں کو جنم دے جو سکر چاکریہ کی ریاست کے حکمران بن جائیں۔

دوسرا فائدہ سدا کور کو اس شادی سے یہ نظر آتا تھا کہ مہتاب کور، رنجیت سنگھ کی بیوی بن کر کنبیائوں کے مفادات کا تحفظ کر سکتی تھی۔ شاید اس چالاکی کا رنجیت سنگھ کو بھی علم ہو۔ یہی وجہ تھی کہ رنجیت سنگھ نے وفاداریاں جیتنے کے بجائے تھکمانہ رویہ اختیار کر لیا تھا۔ وہ تو خود کو ایک طاقتور سردار کی حیثیت سے منوانا چاہتا تھا اور اس کے لیے کنبیا خاندان ایک وسیلہ بن چکے تھے۔ سدا کور اور رنجیت سنگھ میں ایک انوکھا محبت اور نفرت کا رشتہ وجود میں آ گیا۔ وہ دونوں برتری کے خواہش مند تھے اور ایک دوسرے کی اس خواہش کو جاننے بوجھتے ہوئے اس کا احترام کرتے تھے جب معاملات اس سردمہری کا شکار ہو کر رہ جائیں تو ایک مقام ایسا بھی آتا ہے جب دونوں کو ایک دوسرے کی خامیوں اور خوبیوں کو قبول کرنا ہی پڑتا ہے۔ لہذا ان دونوں کے درمیان بھی کامل ہم آہنگی اور مفاہمت پیدا ہو گئی۔

سدا کور نے اپنے داماد کو اپنے زیادہ قریب کرنے کے لیے یہ پہل کی کہ 1797ء میں جب اس کی ریاست بٹالہ کو رام گڑھیوں کی طرف سے خطرہ پیدا ہوا تو اس نے رنجیت سنگھ سے مدد مانگی۔ رنجیت سنگھ نے رام گڑھیوں کا بٹالہ پر دباؤ کم کرنے کے لیے اس کے ایک قلعے کا محاصرہ کر لیا۔

رام گڑھیوں نے مفاہمت کے لیے ہاتھ بڑھایا جسے رنجیت سنگھ نے فوراً قبول کر لیا اور اس طرح سدا کور کی ریاست پر سے خطرہ نکل گیا۔

رنجیت سنگھ پر اب اقتدار کا نشہ پوری طرح چڑھ چکا تھا۔ سدا کور کے اس طرح مدد مانگنے سے اس نے اندازہ لگایا تھا کہ اب کنبیا اسے طاقتور نہیں رہے جتنا وہ انہیں سمجھ رہا تھا۔ چنانچہ اس نے سوچا کہ ایک اور نیشنل کو اپنے ساتھ ملانا چاہیے۔ اس نے علیکویں کے سردار سے روابط بڑھانا شروع کر دیے اور 1798ء میں لکھی سرداری بہمن کے ساتھ دوسری شادی کر لی۔ اس کی یہ شادی پہلی شادی سے زیادہ کامیاب رہی۔ اس کی دوسری بیوی اس کی والدہ راج کور کی ہم نام تھی۔ راج کور، رنجیت سنگھ کی لکھی کو بھیجی تھی۔ اسے پتا تھا کہ رنجیت اپنی ماں کے اصل پیار سے ہمیشہ محروم رہا ہے۔ لہذا وہ بڑا پیار بھرا سلوک اختیار کرنے لگی۔ بالکل مادرانہ انداز کا پیار۔ لہذا رنجیت سنگھ بھی اس کا احترام دل و جان سے کرنے لگا۔ اس نے راج کور کو پیار سے داتر کور کا نام دے رکھا تھا یا پھر مائی لکھن کہنے لگا تھا۔

دوسری شادی نے مہتاب کور کے دل میں رنجیت سنگھ کی نفرت میں مزید اضافہ کر ڈالا تھا۔ اب مہتاب کور کو بٹالہ جانے کا ایک اور بہانہ مل گیا تھا۔ دراصل اس کے ذہن میں اور بھی بہت سی باتیں تھیں جن پر وہ رنجیت سنگھ سے عمل کروانا چاہتی تھی۔

جن دنوں رنجیت سنگھ اپنے ازدواجی معاملات طے کرنے میں مصروف تھا، اس عرصے میں سکر چاکریہ ریاست کے انتظامی معاملات لکھ پتی رائے اور رنجیت سنگھ کے ماموں دل سنگھ کی باہمی چچائش کی وجہ سے سنگین مرحلے میں داخل ہو گئے تھے۔ لکھ پتی رائے کو حاصل کی وصولی کے دوران قتل کر دیا گیا۔ اگرچہ قاتل تو گرفتار نہ ہو سکے لیکن یہ افواہیں ضرور پھیل گئیں کہ اس قتل کے پیچھے دل سنگھ کا ہاتھ ہے۔ دوسری طرف مہتاب کور کی بیچی کی ماں زمین کی لیکن بعد میں بیاہ کر آنے والی راج کور (لکھن رانی) کے بہن سے رنجیت سنگھ کا بیٹا پیدا ہوا تھا۔ اس نے اپنے بیٹے کا نام کھڑک سنگھ رکھا۔ بیٹا پیدا ہوا تو اسے اپنی سلطنت کا جانشین بنانے کی خواہش بھی پیدا ہوئی۔ سدا کور ان بات سے مایوس ہوئی تھی کہ اس کی بیٹی مہتاب کور رنجیت سنگھ کے پہلے بیٹے کو جنم کیوں نہ دے سکی۔ تاہم وہ ایک دور اندیش عورت تھی۔ اس لیے اس نے مہتاب کور کا اس معاملے میں دوسرا درجہ بھی قبول کر لیا اور..... رنجیت سنگھ کو مہاراجا کا خطاب اپنانے

کے لیے حوصلہ افزائی دی۔

☆☆☆

پنجاب رنجیت سنگھ کے تحت پر بیٹھنے سے پہلے ایک ایسے خطے کا نام تھا جس کی حدود اور سرحدوں کا پوری طرح تعین نہیں ہوا تھا۔ رنجیت سنگھ کے مہاراجا بننے سے پہلے بانوے سال کا عرصہ پنجاب میں افغان تفری اور انتشار کا زمانہ تھا۔ اٹھارویں صدی پنجاب کے لیے مشکلات اور نقصانات کی صدی بنی رہی، جس میں نادر شاہ کا حملہ، احمد شاہ ابدالی کے نو حملے، مرہٹوں کی یلغار اور سکھ گردی کی لوٹ مار نے پنجاب کے عوام کا جینا حرام کر رکھا تھا۔ رہی سہی کسر اس صدی کی دو قحط سالیوں نے پوری کر دی۔ کھیتی باڑی برباد ہو گئی اور لوگوں کے کاروبار چو پٹ ہو گئے۔ وہ کا شکار اور تجارت پیشہ افراد جو قحط مکانی کر سکتے تھے، وہ پنجاب کا علاقہ چھوڑ کر ملک کے دوسرے حصوں میں چلے گئے۔

پنجاب کو قدرتی آفات نے اجازت کر رکھی تھی، اوپر سے وہ اور اس کے عوام بیرونی حملہ آوروں کے ہاتھوں بھی لٹتے رہے۔ اگر ایک دن احمد شاہ ابدالی مالہ وصول کرنے کے لیے آجھمکتا تو دوسرے دن لیرے سکھوں کی کسی شل کا سردار راگھی کے نام پر پیداوار کا پانچواں حصہ مانگنے آ جاتا۔ لاہور کے کئی مغل اور ترک حاکم بھی لوٹ مار کی وجہ سے بدنام تھے۔

اٹھارویں صدی کے نصف آخر تک پنجاب میں مسلسل لوٹ مار کا بازار گرم رہا۔ سکھوں کی بارہ مشلوں نے مختلف علاقے آجپیں میں بانٹ لیے جن میں پانچ لکھیں زیادہ اہم گردانی جاتی تھیں۔ بھٹیکیوں کی مسل لاہور کے علاوہ امرتسر اور مغربی پنجاب کے بیشتر علاقوں پر قابض ہو گئی۔ کنبیائوں کی شل کے پاس جمالیہ کی ترائیوں کا علاقہ تھا۔ بھٹیکیوں کی مشل کے پاس پٹیالہ اور سرہند کے قریب وجوار کا علاقہ۔ اہلوالیہ کی مشل راوی اور بیاس کے درمیانی علاقے پر قابض تھی۔ جبکہ سکر چاکریہ مشل جو کہ اہم مشل تھی، گوجر انوالہ اور اس کے ارد گرد کی بستیوں پر اپنا قبضہ جمائے ہوئے تھی۔ ان تمام مشلوں کے سردار الگ الگ تھے اور جب بھی کوئی اہم مسئلہ یا دفاعی معاملات ہوتے تو تمام مشلوں کے سردار سال میں دو مرتبہ اکٹھے ہو کر اسے سلجھاتے۔ ابتدا میں یہ سرت خالصہ (کل خالصہ اسمبلی) منظم انداز میں کام کرتی رہی مگر کچھ ہی سالوں میں ایسا ہونے لگا کہ مشلوں کے سردار دل کر کسی غیر ضروری معاملات پر بحث کرتے ہوئے آجپیں میں جھگڑ پڑتے اور معاملہ ہاتھ

پانی تک جا پہنچا جسے دیکھتے ہوئے سربت خالصہ کے اجلاس ہونا بند ہو گئے۔ غرض پنجاب میں ہر طرف افراتفری اور نفسا نفسی کا عالم تھا جس مقدمہ کے لیے سکھوں نے متنبس قائم کی تھیں، وہ دو بار نہ ہوسکا بلکہ اس کی جگہ ان اتفاق نے سکھوں کے اتحاد کو پارہ پارہ کر دیا۔ جب جیسا سنگھ ابوالدہ احمد شاہ ابدالی کی فوجوں سے لڑ رہا تھا تو چنگلیوں نے احمد شاہ ابدالی کی اطاعت قبول کر لی اور پٹیلہ کے صاحب سنگھ کے رابطے ابدالی کے پوتے شاہ زمان کے ساتھ تھے جو کہ شالی ہندوستان پر دوبارہ تسلط قائم کرنے کی منصوبہ بندی کر رہا تھا۔ 1645ء سے 1661ء تک گوجرانوالہ کے ایک سکھ بدھ سنگھ نے اپنے گاؤں کے نام پر ایک مشکل سکر چاکریہ بنائی اور نادر شاہ کے خلاف جنگ لڑی۔ اس کے بعد اس کے لڑکے نودھ سنگھ نے مشکل کی سرداری سنبھالی۔ نودھ سنگھ کے چار بیٹے تھے جن میں چڑھت سنگھ سب سے بڑا تھا۔ نودھ سنگھ کے مرنے کے بعد اس مشکل کی کمان اس کے ہاتھ میں آئی جو کہ راجا رنجیت سنگھ کا دادا تھا جو 1771ء میں ہندو قیام صاف کرتے ہوئے اچانک گولی چلتے سے زخمی ہو کر مر گیا۔ اس کے بعد رنجیت سنگھ کا باپ مہان سنگھ برسر اقتدار آیا۔ مہان سنگھ بڑا دلیر جوان تھا۔ اس نے اس افراتفری کے دور میں اپنے ارد گرد کے علاقوں پر قبضہ کر لیا۔ اس نے کوئی لوہاراں نامی قبیلے پر قبضہ کر کے تمام لوہاروں کو سونے طرزی ہندو قیام بنانے کی ذمہ داری سونپی۔ ایک طرف اس نے رد پتاس کے قلعے پر قبضہ کیا تو دوسری طرف جموں پھر پٹیلہ پر اپنا تسلط قائم کیا۔

رنجیت سنگھ 1780ء میں پیدا ہوا۔ ابھی اس کی عمر دس برس تھی جب اس کے باپ کا انتقال ہو گیا۔ اس کی والدہ مائی ملوان بڑی دانا اور مدبر عورت تھی۔ اس نے سکر چاکریہ مشکل کو مضبوط کرنے کے لیے اس کی شادی اس وقت کی طاقتور مشکل چنگلیوں کے سردار جس کا انتقال ہو چکا تھا، اس کی والدہ سدا کو جو بڑی دانا اور مدبر عورت تھی، کی بیٹی مہتاب کور سے کر دی۔ جس برس رنجیت سنگھ کے والد مہان سنگھ کا انتقال ہوا، وہ گجرات میں اپنے والد کے ساتھ صاحب سنگھ بھنگی کے خلاف جنگ میں مصروف تھا کیونکہ صاحب سنگھ نے خراج دینے سے انکار کر دیا تھا۔ مہان سنگھ محاصرے کے دوران بیمار ہو کر زندگی سے مایوس ہوا تو اس نے اپنے بیٹے رنجیت سنگھ کی پیشانی پر زعفران لگا کر اسے سکر چاکریہ بنا دیا۔ سکر چاکریہ مشکل کا سردار بننے ہی اس نے چنگلیوں کے خلاف جنگ کر کے انہیں اپنا مطیع بنانے

کا فیصلہ کیا۔ بھنگی اس وقت لاہور، امرتسر، گجرات اور شالی پنجاب کے ایک بڑے حصے پر قابض تھے۔ رنجیت سنگھ نے انہیں عبرتناک شکست سے دو چار کر کے ان کے زیر نگین علاقوں کو اپنی مملکت میں شامل کر لیا۔

رنجیت سنگھ بہت بہادر اور نڈر انسان تھا۔ وہ ایک بار جس بات کا تجویز کر لیتا جب تک وہ پوری نہ ہو جاتی، جین سے نہیں بیٹھتا تھا۔ وہ تیرہ برس کا تھا جب وہ اپنے ساتھیوں کو لے کر شکار کے لیے جنگل میں گیا۔ ایک مقام پر آ کر وہ اپنے ساتھیوں سے چھوڑ گیا۔ اسی اثنا میں اس پر اس کے پرانے دشمن حشمت خاں نامی سردار نے حملہ کر دیا۔ حشمت خاں اپنی سرداری بچانے کے لیے کئی بار شکست کھا چکا تھا۔ اب وہ اسے اکیلے دیکھ کر اس پر حملہ آور ہوا تاکہ اپنی ہریمت کا بدلہ لے سکے۔ اس نے جب حملہ کیا تو رنجیت سنگھ کا گھوڑا خوف کے مارے اپنی پچھلی ٹانگوں پر گھڑا ہو گیا جس سے حشمت خاں کا وار خالی چلا گیا۔ رنجیت سنگھ نے فوراً تلوار نکالی اور ایک ہی وار میں حشمت خاں کا سر کاٹ ڈالا اور اسے اپنے نیزے کی نوک پر اٹھا کر واپس اپنے ساتھیوں میں آ گیا۔

رنجیت سنگھ کے بچپن سے متعلق بہت زیادہ معلومات نہیں ملتیں لیکن سوہن لال سوری کے مطابق.....

”رنجیت سنگھ بچپن میں چچک کی بیماری کا شکار ہو گیا تھا۔ شہزادے کی طبیعت خراب تھی۔ برسلہ خاں کی قیادت میں دو موگھڑ سواروں کے ساتھ طیب لالہ حاکم رائے کو شہزادے کے علاج کے لیے بھیجا گیا۔ چچک کی بیماری سنگین ہو گئی تھی۔ اس کے سارے بدن پر چھالے نمودار ہو گئے تھے جن سے مواد بہنے لگا تھا۔ خصوصاً بائیں آنکھ والے چھالے سے اور پھر اس سب اس کی بائیں آنکھ ضائع ہو گئی تھی۔“

اور پھر چچک کے یہ داغ ہمیشہ اس کے چہرے پر قائم رہے۔ رنجیت سنگھ کا باپ مہان سنگھ اپنی معرکہ آرائیوں کی وجہ سے اس کی پرورش پر زیادہ توجہ نہ دے سکا۔ رنجیت سنگھ گرو درارے میں عبادت کے لیے جاتا۔ اس نے سکھ مذہب کے اصولوں کی ابتدائی تعلیم بھی برہمن پنڈتوں سے لی مگر اس نے اپنا زیادہ تر وقت کھیلوں اور شکار میں صرف کیا۔ اسے انہی دنوں گھوڑوں سے بھی لگاؤ پیدا ہو گیا۔ یہ لگاؤ آئندہ زندگی میں جنوں کی حد تک بڑھ گیا۔ رنجیت سنگھ بہت چھوٹا تھا جب اس نے سلطنت کی باگ ڈور سنبھالی۔ وہ اپنی عمر کے ابتدائی برسوں ہی میں الکوحل سے متعارف ہو گیا تھا۔

اس کی شخصیت بھی عجیب و غریب تھی۔ ایملی ایڈن اس کی شخصیت کا یوں احاطہ کرتی ہے۔

”رنجیت سنگھ کا رنگ سیاہ تھا۔ چہرے پر چچک کے داغ تھے اور وہ کان کا تھا (بالکل ایک بوڑھے جیسے) کی طرح خاستری ڈانسی اور ایک آنکھ والا۔“

انگریز مورخ اسے عموماً ”عیار مشرقی“ کے نام سے یاد کرتے تھے۔ جب وہ برسر اقتدار آیا تو اس کی شخصی زندگی اس کے سیاسی کیریئر کی طرح رنگین بن کے رہ گئی تھی۔ اگرچہ وہ ایک بد صورت انسان تھا تاہم وہ اپنے ارد گرد خوب صورت مردوں اور عورتوں کو دیکھنا پسند کرتا تھا۔ اس کا قد اور قامت معمولی تھی لیکن وہ نہایت دلیر انسان تھا۔ متعدد معرکوں میں اس نے اپنی فوج کی قیادت خود کی اور تلوار اپنے ہاتھ سے چلا کر دشمن کے ساتھ مقابلہ کیا۔ وہ انسانوں سے زیادہ گھوڑوں سے محبت کرتا تھا لیکن ہزاروں برسوں میں وہ واحد ہندوستانی حکمران تھا جس نے ملک کی شمال مغربی سرحدوں کے پار سے آنے والے حملہ آوروں کی سرکوبی کی۔ اس نے اپنی سلطنت کے استحکام کے لیے سیکڑوں جاگیرداروں کو اپنا مطیع و فرمانبردار بنایا۔ تاریخ میں کوئی ایسا دوسرا بادشاہ مشکل سے ہی ملے گا جس نے خون بہائے بغیر اتنی بڑی سلطنت قائم کی ہو۔ اس نے پنجاب کے مشکل پیدا کرنے والے سکھوں اور مسلمانوں کو قاتل کر کے اپنے ساتھ ملایا بلکہ کشمیر کے پٹھانوں کو اپنی رعایا بنانے میں کامیاب ہوا۔ یوں اس کی سلطنت شمال میں چین اور افغانستان کی سرحدوں تک جبکہ جنوب میں سندھ کے صحرائں تک پھیل گئی۔

☆☆☆

امرتسر پنجاب کا دوسرا بڑا شہر کاروباری لحاظ سے لاہور سے زیادہ اہمیت رکھتا تھا۔ یہ شمالی پنجاب کا سب سے بڑا تجارتی مرکز تھا۔ وسطی ایشیا سے تجارتی قافلے یہاں آتے اور اپنی اشیاء کے بدلے ہندوستانی اشیاء لے جاتے تھے۔ اس کی تنگ اور پیچ دار گلیوں میں واقع دکانوں میں ہر شے کا کاروبار ہوتا تھا۔ یہاں پریشم، مہل، مسالا جات، چائے، چمڑا، توڑے دار ہندو قیام اور دیگر اعلیٰ جات کے علاوہ سونے اور چاندی کے زیورات بنانے والے بھی بڑی تعداد میں کام کرتے تھے۔ امرتسر امیر شہر ہونے کی وجہ سے جہاں بیرونی حملہ آوروں کی نظر دوڑتی تھی، وہیں سکھوں کے لیے بھی مقدس شہر تھا کیونکہ اس کی بنیاد ان کے چوتھے گرو رام داس نے رکھی تھی اور اسی شہر میں پانچویں گرو ارجن

نے سکھوں کے صحیفے کو ترتیب دیا تھا اور مقدس تالاب کے وسط میں گرو درارہ تعمیر کیا تھا۔ جن سکھوں کے لیے ممکن ہوتا وہ کم از کم سال میں دو مرتبہ اس تالاب میں نہانے، گرو درارے میں چڑھادے چڑھانے ضرور یہاں آتے تھے۔ سکھوں کے لیے امرتسر دنیا کا سب سے اہم شہر تھا۔ جو شخص سکھوں کا راہنما اور پنجاب کا مہاراجا بنے کا خواہش مند ہوتا، اسے امرتسر پر لازمی قبضہ کرنا پڑتا۔ امرتسر تقریباً ایک درجن خاندانوں میں بٹا ہوا تھا جو اس کے مختلف حصوں پر حکمران تھے۔ ان خاندانوں نے اپنے اپنے علاقوں میں چھوٹے چھوٹے قلعے بنا رکھے تھے اور ان کے مسلح کارندے علاقے کے تاجروں اور دکانداروں سے ٹیکس وصول کیا کرتے تھے۔

مختلف سرداروں کے ٹیکس کلکٹروں میں ہمیشہ ٹیکس اکٹھا کرنے پران بن ہو جاتی اور شہر..... کے گلی کوچوں میں خون ریز لڑائیاں اکثر ہوتی رہتی تھیں۔ شہری اس صورت حال سے اکتائے ہوئے تھے۔ انہوں نے رازداری کے ساتھ رنجیت سنگھ سے رابطہ کر کے اسے شہر پر قبضہ کرنے کی دعوت دی۔ رنجیت سنگھ کے ایجنٹوں نے پہلے ہی اطلاع دے رکھی تھی کہ امرتسر کے سرداروں میں اتحاد نام کی کوئی شے وجود نہیں رکھتی۔ جو واحد خاندان کوئی حقیقت رکھتا تھا، وہ بھنگی سرداری کی تھی اور اس کے بیٹے گرو دیپ سنگھ کا تھا۔ بھنگی سردار چار سال پہلے شراب نوشی کی کثرت سے مر گیا تھا۔ اب اس کی بیوہ مائی سکھاں گوند گڑھ کے قلعے پر قابض تھی اور اسے رام گڑھ محل کی حمایت حاصل تھی۔

1802ء کے موسم خزاں میں سکھاں کے کارندوں کی زیادتیوں سے تنگ آ کر شہر کا امیر ترین ساہوکار اردول اپنا کاروبار سمیٹ کر شہر کے دوسرے علاقوں میں چلا گیا اور اس کا اردول کو بے حد صدمہ بھی تھا۔ چنانچہ اس نے بھی رنجیت سنگھ سے درخواست کی کہ وہ شہر کا نظم و نسق سنبھال لے۔

رنجیت سنگھ نے اس سلسلے میں سدا کو اور فاتح سنگھ ابوالدہ سے مشورہ کیا جنہوں نے اس کی حمایت کرتے ہوئے کہا کہ اس سے بہترین کوئی دوسرا موقع نہیں مل سکتا چنانچہ ان تینوں کی متحدہ فوج نے امرتسر کا محاصرہ کر لیا۔ سرداروں کو رنجیت سنگھ کی اچانک کارروائی پر بڑی حیرانی ہوئی۔ انہوں نے آپس میں صلاح مشورے کیے.... بالآخر سرداروں نے شہر کی تفصیل پر توجہیں نصب کر دیں اور مقابلہ کرنے کا فیصلہ کیا۔ بھنگی کی بیوہ نے بھی مزاحمت کرنے کی

تیاری کر لی تھی۔ اسے توقع تھی کہ رام گڑھے اس کی مدد کو آئیں گے مگر وہ بین موقع پر آکر دوغادے گئے۔ رنجیت سنگھ نے تمام سرداروں کو یکے بعد دیگرے شکست دیتے ہوئے شہر کو بہ آسانی فتح کر لیا۔ مائی سکھان نے ہتھیار ڈال دیے۔ رنجیت سنگھ نے اس کی اور اس کے بیٹے کی ایک پٹیشن مقرر کر دی۔

گوند گڑھ قلعے کی فتح ایک اہم کارنامہ تھا۔ یہاں سے رنجیت سنگھ کو پانچ توپیں مالی قیمت کے طور پر ملیں۔ ان میں احمد شاہ ابدالی کے تانبے اور تیشیل سے ڈھالی گئی بہت بڑی توپ بھی شامل تھی۔ یہ وہی توپ تھی جس نے پانی پت میں مرہٹوں کو نیست و نابود کیا تھا۔ اس توپ کو بعد ازاں بھنگیوں نے افغانوں سے چھین لیا تھا اور اب وہ ان کے قبضے میں تھی۔ اسے ”بھنگیوں کی توپ“ کہا جانے لگا تھا۔

رنجیت سنگھ نے اس توپ کو کئی مہمات میں استعمال کیا اور اس کی موت کے بعد انگریزوں اور سکھوں کی جنگ میں اسے استعمال کیا گیا۔ بعد ازاں اسے متروک قرار دے کر لاہور کی ایک مرکزی سڑک پر نصب کر دیا گیا۔

امرتسر کے شہریوں نے رنجیت سنگھ کا گر بجوشی کے ساتھ استقبال کیا۔ وہ امرتسر فتح کرنے کے بعد ہاتھی پر سوار ہو کر شہر کی تنگ گلیوں سے گزرتا ہوا گردوارے پہنچا۔ وہاں اس نے مقدس تالاب میں غسل کیا۔ اس نے سبک مرمر اور سونے کے پتروں سے گردوارے کی تعمیر نو کے لیے خطیر رقم دی۔ امرتسر فتح کرنے سے رنجیت سنگھ کی شان و شوکت میں بہت زیادہ اضافہ ہو گیا اور جو علاقے برطانوی کمپنی کے زیر عمل تھے، وہاں کے لوگ بھی جوق در جوق اس کی سلطنت میں آنے لگے۔

ایسٹ انڈیا کمپنی کی فوج کے سپاہی خصوصاً ہندوستانی اور کچھ یوریشیائی رنجیت سنگھ کی فوج میں شامل ہونے کے لیے آنے لگے۔ مہاراجا پہلے ہی انگریزی فوج کی کارکردگی سے متاثر تھا۔ وہ یہ جانتا چاہتا تھا کہ انگریزی فوج نے اپنے محدود تر وسائل میں کن حربوں سے ہندوستانی نوایوں کی فوج پر برتری حاصل کی اور انہیں شکست سے دوچار کیا۔ انگریزوں کی فوج چھوڑ کر آنے والی ایک پلاٹون نے اس کے سامنے پریڈ کی اور اس نے پہلی مرتبہ فوجیوں کو سادہ سے اٹکا مائی الفاظ پر جنگی اقدام کرتے دیکھا تو راجا رنجیت سنگھ نے انہیں ”ڈرل سارجنٹ“ کی نوکریوں پر اپنی فوج میں بھرتی کر لیا۔ اس نے اپنے نوجوان فوجیوں کو سرحد پار ایسٹ انڈیا کمپنی کی فوج میں بھرتی ہو کر انگریزوں سے

ترتیب لینے کے لیے پہلی بار بھجوا یا۔

سکھ فوجی ہندوستانی سپاہیوں سے تربیت لینے کو اپنی توپیں جانتے تھے۔ وہ گھوڑوں پر سوار ہو کر لڑنے میں فخر محسوس کرتے تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ پیدل لڑنے والے دراصل احمقوں کا نایج کرتے ہیں۔ ان کا یہ دھجوی تھا کہ ایک سکھ ”سوالکھ“ اور پوری پوری فوج پر بھاری ہے۔ اگر کوئی انہیں ہندوستانی سپاہ سے تربیت لینے کا مشورہ دیتا تو وہ آگے سے طنز کرتے کہ ہندوستانی حقیر اور بیچارے ”خالصہ“ کو کیا سکھا سکتے ہیں۔ رنجیت سنگھ کو یہ بات پسند نہیں تھی کیونکہ اس کے من میں سکھوں کو بہترین سپاہ بنانے کا خطہ سایا ہوا تھا۔ لہذا اس نے ایک ترکیب اختیار کی۔ اس نے اپنی فوج میں یہ اعلان کروا دیا کہ جو سکھ ہندوستانی اور یوریشیائی فوجوں میں موجود استادوں سے تربیت لینے پر رضامند ہوگا، ان پنجابی نوجوانوں کو دوسروں سے بہتر معاوضے اور مراعات دی جائیں گی۔

اس کے اس اعلان پر بہت سے فوجیوں نے ان اساتذہ سے تربیت لینے پر آمادگی ظاہر کر دی۔ اس طرح سکھوں کی ایک نئی انٹلری بتائیں تربیت پائی جس کی وہ ہر روز صبح و شام پریڈ دیکھتا اور ان فوجیوں کے ساتھ استادوں کو بھی پر کشش انعامات سے نوازتا تھا۔ اس طرح نو ماہ کی بھرپور تربیت کے بعد رنجیت سنگھ کی ایک نئی فوج تشکیل پائی جس نے پریڈوں اور 1803ء کے موسم خزاں میں دسمبرہ کی تقریبات کے دوران جنگی مشقوں میں نمایاں حصہ لیا۔ اسی سال اس نے ملتان اور جھنگ کو دوبارہ اپنی سلطنت کا حصہ بنانے کے لیے ان پر چڑھائی کا سوچا۔ سارے سرداروں نے اسے روکنے کی کوشش کی مگر اس نے اپنا فیصلہ نہ بدلا۔ احمد خاں سیال نے اپنے ارد گرد کے لوگوں کو اکٹھا کر کے میدان جنگ میں اترنے کا فیصلہ کیا۔ رنجیت سنگھ کی فوج نے جوانی حملے میں ان کے دانت کھٹے کر دیے۔ اس کے ہاتھیوں نے قلعے کے دروازے توڑ ڈالے تو احمد خاں سیال موقع پا کر ملتان فرار ہو گیا۔ رنجیت سنگھ کا اگلا نشانہ ملتان تھا۔ نواب مظفر خاں نے اپنے ارد گرد کے بہادر اور خوفناک قبائل کو اپنے ساتھ ملا لیا۔ اس نے مسلم کاشتکاروں کو اپنی مدد کے لیے بلایا مگر رنجیت سنگھ کی تربیت یافتہ فوج کے سامنے ان کے پاؤں نہ جم سکے اور انہیں بری طرح شکست کا سامنا کرنا پڑا۔ رنجیت سنگھ کے لیے یہ دونوں مہمیں بہت مختصر اور حوصلہ افزا تھیں۔ برطانوی تربیت اور جنگ کے طریقے اپنانے کا فیصلہ اس کے لیے بہت سودمند رہا تھا۔

تربت

ٹالکم پاؤڈر



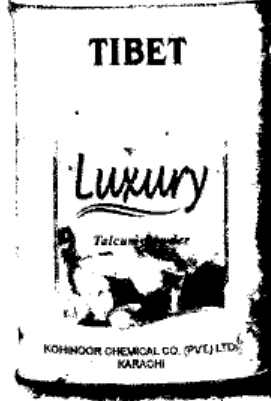
اب 3 نئی خوشبوؤں میں دستیاب



کلاسیک



سلیکٹ



لکڑی

تربت ٹالکم پاؤڈر - صبح سے شام جھپکے مہربانے

اس لیے اس نے اپنی فوج کی تنظیم و تربیت پر زور دینے کا فیصلہ کیا۔

رجحیت نگہ نے امرتسر میں ہونے والی اس تنظیم کو کے بعد اپنی فوج کو ہر حوالے سے بہتر بنانے کی طرف توجہ مرکوز کر دی۔ اسے کوئی جوان تربیت میں کمزور دکھائی دیتا یا اس کی یونین فارم درست نہ ہوتی تو وہ ڈسے دار افسروں کو سزا دیتا۔ وہ ایسے افسروں کی تنزیل کر دیتا اور ان پر بھاری جرمانے لگاتا لیکن وہ عام طور پر اپنے جوانوں کی حوصلہ افزائی کرتا اور انہیں ڈرانے کے بجائے انعامات سے نوازتا تھا۔ وہ اپنی فوج کے ساتھ میدان جنگ میں جاتا اور اپنے جوانوں کی بہادری کا خود مشاہدہ کرتا تھا۔

اور اسی امرتسر کی سرزمین سے مورال کا بھی تعلق تھا۔

☆☆☆

مورال امرتسر کے مردم شناس شہر جہاں زندگی اپنی پوری رعنائیوں کے ساتھ خوشیاں کرتے گزر رہی تھی، اسی کے بازار حسن کی ایک کچی تھی جو اپنی خوب صورتی، حسن اور جوانی میں بے نظیر ہونے کے ساتھ حاضر جوانی اور شوخیوں کی وجہ سے بھی مشہور تھی جب سے تہذیب و ثقافت نے اپنی کروٹ بدل لی تھی، تاریخ کے ساتھ ساتھ الفاظ نے بھی اپنے چولے بدلنے شروع کر دیے تھے۔ اب حداثہ، جان کی امان پاؤں، نعل اہلی، جل جلالہ، عالم پناہ، جنت مکانی جیسے الفاظ دم توڑ چکے تھے اور ان کی جگہ ہزار کیسی لہجی، عزت مآب، عز و دلالتان جیسے الفاظ نے جگہ لیٹی شروع کر دی تھی۔ طوائفیں جو بھی تربیت و تہذیب سکھانے میں یکتا اور ماہر سمجھی جاتی تھیں، اب کساد بازاری کا شکار ہو کر رہ گئی تھیں۔ ناچنے گانے والیوں کی شہرت کے چاند کو گرہن لگ چکے تھے۔ درباروں اور محلوں کی راہدار یاں اداسیوں کی نذر ہو چکی تھیں۔ شہنشاہیت کا جبروت دم توڑ چکا تھا۔ تہذیب و ثقافت نے بھی کروٹ بدل لی تھی۔ وہ کچھیاں جو درباروں میں قدم دھرتے ہی رانیوں اور مہارانیوں کے عہدوں پر پہنچ چکی تھیں، اپنی حرماں نصیبی پر ماتم کر رہی تھیں۔ جوان عہدوں تک نہیں پہنچ پائی تھیں، دوبارہ سے اپنی کھولیاں اور جو بلیاں آباد کرنے لگی تھیں یا پھر سرداروں اور سرماہ داروں کی چار دیواریوں میں فٹنشن کرنے لگی تھیں۔ ایسی کچھیاں جو بھی دوبارہ سرکاری تک چڑھیاں تھیں، اب وقت کی گرد سے اپنا باغی ڈھونڈنے پر مجبور ہو چکی تھیں۔ اب اگر کسی چھوٹی موٹی ریاست کا سردار بھی انہیں بلا لیتا تو وہ اسے اپنا اعزاز جانتی تھیں۔ امرتسر کا مردم

خیز شہر جو کبھی شہر نگاراں بھی سمجھا جاتا تھا، اب بے بسی کی تصویر بن کر رہ گیا تھا۔ فارسی زبان کی مانگ ابڑ گئی تھی۔ اب اس کی جگہ ملی جلی شکل میں نئی زبان نے جنم لیتا شروع کر دیا تھا جس میں کہیں کہیں فارسی زبان کے الفاظ بھی اپنی جھلک دکھانے لگے تھے۔

بازار حسن میں لگنے اور بچنے والے درباروں کا حسن بھی ماند پڑ چکا تھا۔ پلٹے اور سارنگی نواز بھوکے تنگ آ کر دوسرے کام ڈھونڈنے پر مجبور ہو گئے تھے۔ ایسے میں اگر کوئی حویلی آباد رہے تو وہ بڑی قیمت بھی جاتی تھی۔

مورال جوان اور خوب صورت تھی۔ اوپر سے جب وہ چلتی تھی تو یوں لگتا جیسے مورنی چل رہی ہو۔ اس کے گلے میں سرنگیت تو خدا نے کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا۔ جب وہ ناچتی تو لگتا جیسے جنگل میں کوئی مور اپنی مستی میں ناچ رہا ہو۔ کچھ فارسی زبان سے لیا ہوا لفظ جس کا مطلب تھا۔۔۔۔۔

سو نے میں ڈھلی ہوئی پوری طرح کھلی ہوئی۔۔۔۔۔ کسی گلاب کے مانند۔ یہ سچ ہے کہ مورال پر یہ لفظ پوری طرح راج رہا تھا اس کی سماجی دوسری کچھیاں اس سے اس بات پر حسد کرتی تھیں۔ ایک روز جب وہ سب اکٹھی بیٹھی تھیں اور خانم ان سے دور پاندان میں سے پورے پان کی کتر میں لگا کر انہیں تیر کر کے اس میں پڑے نمہ سے کے تلے رکھ رہی تھی، نہ جانے اسے کیا سوچی۔ اس نے ایک آہ بھرتے ہوئے کہا۔

”بھلے دن ہوتے تھے وہ بھی جب مظلوم کے دربار بچتے تھے۔ بھانت بھانت کے لوگوں کی روٹی روزگار ان سے وابستہ تھا۔ ہم جیسے معاشرے کے دھکارے لوگوں کی بیٹیاں شہنشاہوں کے من کو بھاجا تیں تو وہ محلوں میں جا کر راج کرنے لگتیں اور پشت پابست پورے خاندان کے پیش ہو جاتے مگر جب سے یہ موئے انگریزوں نے حکومتوں پر قبضہ کیا ہے، ہماری خوشحالی تو دم ہی توڑ گئی۔ محلوں میں اجاڑ پیدا ہو گئے۔ اب تو وہیش پیش کرتی ہیں جو اپنے جسموں کی سرعام نمائش کرتی اور پچھتی ہیں۔ اللہ زندگی دے میری مورال کو۔ چمکتے چاند ایسا حسن ہے اور اوپر سے نازخڑے ایسے کہ پرانا دور ہوتا تو اس کے قدموں سے کئی لاشے اٹھانے پڑتے۔“

ابھی وہ بات کر رہی تھی کہ مورال بڑے انداز سے سچ بچ کر قدم رکھنے اندر آئی اور کھٹکتی ہوئی آواز میں بولی۔

”کس کی بات ہو رہی ہے۔“

”لوہہ بھی آگئی۔“ ان میں سے ایک بولی۔

”بیٹھ جاؤ اور سن لو روز روز کی راجی۔ جب بھی ذرا

مورال

فرمت ملتی ہے دم لینے کو اور اکٹھے بیٹھنے کا موقع مل جائے تو خانم کی زبان پر تمہارے سوا اور کسی کی تعریف ہی نہیں ہوتی۔ مجال ہے کسی اور کے لیے کوئی لفظ ان کی زبان سے اترے۔“ دوسری نے تنگ کر جواب دیا۔

”اور کیا۔۔۔۔۔ اللہ نے اسے حسن اور دوسری خوبیاں بھی تو اتنی دے رکھی ہیں۔ تمہیں بھلا پائیوں ہو رہا ہے۔“ کسی اور نے پہلی کی بات کاٹتے ہوئے اس پر چوٹ کی۔

”اری کم بختو! اپنی باتوں کے کنگوے (پتنگ) اڑاتی رہو گی یا کام کے بارے میں بھی کچھ سوچو گی۔ یہ وہ حویلی ہے جہاں بھی تماشا بینوں میں خوشبودار تواموں سے بچے پان بانٹے جاتے تھے۔ پھر یہ کڑوں میں بانٹنا شروع ہوئے اور اب ان کڑوں کو بھی وقت نے کتروں میں تبدیل کر دیا ہے۔ سوچو جب یہ بھی نہ رہے تو کیا ہوگا؟“

”خانم! اب ہم اپنے جسموں کے ماس تو جو کھلوں اور کھڑکیوں میں لٹکانے سے رہے۔ یہ تمہاری جیتی جیتی مورال بھی تو ہے۔ سارے بازار میں اس کی خوب صورتی کی دھوم مچی ہے۔ ناچتی ہے تو بقول لوگوں کے لگتا ہے کہ مورال چٹا ہے۔ اس کو بھی کوئی نہیں پوچھتا۔ ہم تو پھر اس سے ہر لحاظ میں کتر ہیں۔“ وہ بھی شاید کتنے دنوں سے بھری بیٹھی تھیں۔

ایک بار ہی بیٹھ پڑیں۔

ابھی ان کی گفتگو جاری تھی کہ دروازے پر دینگ ہوئی۔

”پیاری جان! ذرا اٹھ کر دیکھنا کون آیا ہے۔ یہ موئے ملازم بھی بھوک کر کھڑے ہوئے ہونے لگے گئے ہیں۔“

”جگ کہا ہے۔ دھن کا اوجھا نام!“ خانم نے اکتائے ہوئے لہجے میں کہا۔

پیاری جان بھی کسماتے ہوئے انھی اوڑھیلے قدموں سے دروازے کی طرف بڑھی۔ کچھنی اتار کے ابھی اس نے دروازے کا چٹ کھولا ہی تھا کہ وہ دم سے اندر آ گیا۔ پیاری جان کی آنکھیں دروازے پر اٹکی رہ گئیں اور اس کی آنکھیں جبرانی سے آنے والے کو کھنکھ رہی تھیں۔

اس کے سر پر پگڑی بندھی تھی۔ کربند کے ساتھ ایک طرف طعنے اڑا رہا ہوا تھا۔ دوسری طرف اسے مٹوف میں تلوار لٹکی ہوئی تھی۔ قمیص کے اوپر سپاہیوں کے مخصوص نشان اور سچ لگے تھے۔ فوجی یونٹوں کو اس نے اتارنا بھی پسند نہیں کیا تھا۔ یونٹی دندا تا ہوا وہ خانم کے قریب آ کر اوجھی آواز میں بولا۔

”مورال کون ہے؟“

”کھٹکی پر لٹکانے کے آؤر آئے ہیں اس کے۔“

مورال نے ہنستے ہوئے اسی انداز میں جواب دیا۔ باقی

سب ان کی طرف حیرانی سے دیکھ رہی تھیں۔

”یہ میرے سوال کا جواب نہیں۔ میں نے مورال کا پوچھا ہے۔“ وہ اسی لہجے میں دوبارہ دہاڑا۔

”میں ہوں مورال۔“ مورال نے آگے بڑھتے ہوئے کہا۔

”میں دوبارہ سے آیا ہوں۔ مہاراجا رنجیت سنگھ کے دربار سے۔“

”خیریت ہے، کوئی بھول ہو گئی، اس کرموں ماری سے۔ یقین جان دو روغنی۔ سیاست سے ہمارا کوئی لین دین نہیں ہے۔“ ایک کچھن نے مسکین سامنے بناتے ہوئے کہا۔

”بات تو پوری ہونے دو۔“ سپاہی نے رعب سے کہا تو وہ ایک بار پھر ہنسنے لگا۔

”برا کا ہے کو مانتے ہو روغنی۔ طوائفوں کے پاس دو ہی تو ہنر ہوتے ہیں۔ ایک چوں کاری اور دوسرا حاضر جوابی۔“ مورال نے پھر شوخی سے جواب دیا۔

”مہاراجا رنجیت سنگھ نے مورال کو اپنے دربار میں بلا بھیجا ہے۔“ سپاہی نے بتایا۔

”زے نصیب۔ خوش آمدید۔ کسی نے سچ کہا ہے۔ خوشبو جب پھلتی ہے تو ہر جگہ اپنا جادو پھیلا دیتی ہے۔ بڑی خوش بخت ہے میری بیٹی۔ مورال! اٹھئے مبارک ہو۔“ خانم نے سب چھوڑ چھڑا کر مورال کی بلا میں لینے ہوئے کہا۔

تھوڑے وقف کے بعد وہ پھر گویا ہوئی۔

”کب حاضری ہو گی میری بیٹی کی۔ لاہور کے دربار میں ہی بلا یا ہے یا امرتسر میں کہیں حاضری ہو گی؟“ خانم نے اسی چاہیوسانہ لہجے میں دریافت کیا۔

”لاہور جانا ہوگا۔ آپ تیاری رکھیں۔ جب بھی حکم ہوا سرکاری پیادے آکے اسے لے جائیں گے۔“ سپاہی نے دوبارہ جواب دیا اور پھر واپسی کے لیے مڑا۔

”اے روغنی۔ کچھ کھا پی لو لیے۔ اگر چہ اب ہم گھوڑیوں کے پاس آپ کے شایان شان تو کچھ نہیں مگر پھر بھی۔۔۔۔۔ تھوڑا ٹھہرو۔“ خانم اسی انداز میں بولی۔

”نہیں اس کی ضرورت نہیں۔ آپ بس اسے تیار رکھیں۔ ہو سکتا ہے کل ہی اسے جانا پڑ جائے۔“ سپاہی نے پھر سے بتایا اور واپس چلا گیا۔

☆☆☆

موسم خزاں اور 1796ء کا سال تھا۔ جب شاہ زمان اپنے ملک سے فرار ہوا اور اس نے پنجاب کا رخ کیا۔ یہ اس کا پنجاب پر تیسرا حملہ تھا۔ اگرچہ وہ اپنے پہلے دو حملوں میں

بری طرح سے ناکام ہوا تھا۔ تاہم اس بار افواہیں گرم تھیں کہ وہ اپنی بڑی فوج کے ساتھ حملہ آور ہو رہا ہے کہ ہندوستان کی سلامتی خطرے میں پڑ جائے گی۔ اس نے اپنی بیس ہزار مسلح افغانوں پر مشتمل فوج لے کر دہلی کی طرف پیش قدمی کرنے کے لیے دریائے سندھ کو پار کیا۔ اس نے اپنی کثیر فوج کے علاوہ ہندوستان میں تصور کے نظام الدین کو اپنی مدد کرنے کے انعام میں لاہور کی صوبیداری دینے کا وعدہ کیا۔ ستج کے بار پٹیل کا صاحب سنگھ تھا جو ہر قلعہ کی اطاعت کرنے کی اپنی خاندانی روایت پر پوری طرح سے کاربند تھا۔ پنجاب کی دوسری طرف روہیلہ افغان تھے۔ اودھ کا وزیر اور جنوب میں میسور کا ٹیپ سلطان تھا۔ ان سب نے اصرار کر کے افغانوں کو ہندوستان بلایا تھا۔

شاہ زمان کے ہندوستان پر حملہ کرنے کی خبر چونکہ پھیلی، لوگ جانیں بچانے کے لیے پہاڑوں کی طرف بھاگنے لگے۔ مشنل دار جو کہ لوگوں کو تحفظ دینے کے وعدے پر حاضمی ٹیکس وصول کیا کرتے تھے اور ٹیکس، مالیہ وصول کرتے وقت لوگوں سے انتہائی ظالمانہ سلوک کرتے تھے، وہ بھاگنے والوں میں سب سے آگے تھے۔ دمبر تک افغانوں نے پنجاب میں جہلم تک کا علاقہ فتح کر لیا۔ لاہور تک اب افغانوں کا راستہ روکنے والے دوسرا تھے۔ ایک گجرات کا صاحب سنگھ اور دوسرا لاہور کا رنجیت سنگھ۔ صاحب سنگھ نے پہلے پہل افغانوں کا راستہ روکنے کی کوشش کی لیکن بعد میں حوصلہ کھو بیٹھا اور مشرق کی طرف فرار ہو گیا۔

افغانوں کی توپوں اور ہندوؤں سے مسلح افواج کے مقابلے میں رنجیت سنگھ صرف پانچ ہزار گھڑسوار اکٹھے کر سکا جن کے پاس تفنگیں (لوہے کی لمبی نالیاں جن میں آگے تیر رکھ کر انہیں دھن پر سانس کے زور پر پھینکا جاتا تھا) اور نیزے تھے۔ افغانوں کو روکنے کے لیے ضروری تھا کہ سکھ متحد ہو جائیں اور ان کو جمع کرنے کا واحد مرکز امرتسر تھا۔ رنجیت سنگھ اپنی فوج اور خاندان کو لے کر اس مقدس شہر کی طرف چل پڑا۔ سربت خالصہ کے بلاوے پر بہت سے سکھ سرداروں نے ٹپک کہا اور امرتسر آگئے۔ ان کا اکثریتی فیصلہ تھا کہ وہ میدان چھوڑ کر پہاڑوں میں چھپ جائیں۔ جب افغان ان غالی شہروں کو لوٹ لیں گے، تب وہ چھپ کر ان پر حملے کریں گے۔

لیکن رنجیت سنگھ کی ساس سدا کور نے رنجیت سنگھ کو مشورہ دیا۔

”تم کو سنا ہندوؤں سے تعلق رکھتے ہو جو دشمن پر پیچھے سے چھپ کر وار کر دو گے۔ سکھ ہو کر سکھ قوم کی تنہیک نہ کرنا اور دشمن کی چھائی پر وار کر دو۔ سامنے سے۔ پہاڑوں میں بڑل چھپا کرتے ہیں۔“

”آپ کی بات میرے من کو لگی ہے۔ ہمیں یقیناً افغانوں کے سامنے رہ کر وار کرنا چاہیے۔ پہاڑوں میں نہیں جانا چاہیے۔“ رنجیت سنگھ نے سدا کور کی یہ تجویز اپنی سپاہ اور سرداروں کے سامنے رکھی تو سب نے اس بات کی پُر زور تائید کی۔ وہ سارے اس کی قیادت میں اکٹھے ہونے پر تیار ہو گئے۔ رنجیت سنگھ نے اپنے ساتھیوں سمیت لاہور کا رخ کیا۔ انہوں نے افغان فوج سے جھڑپ کے دوران اسے لاہور کے قرب و جوار سے نکال کر شہر کا محاصرہ کر لیا۔ ہر رات وہ اور اس کے جوان شہر کے کسی نہ کسی حصے پر شہب خون مارتے اور چند افغانوں کو ہلاک کر کے اندھیرے میں غائب ہو جاتے۔

جنوری 1797ء میں شاہ زمان کو اطلاع ملی کہ اس کا بھائی افغانستان میں بغاوت پھا کرنے کی تیاریاں کر رہا ہے۔ اس نے جہل شاپاچی خاں کی قیادت میں بارہ ہزار فوجیوں کو لاہور میں چھوڑا اور خود باقی فوج کو لے کر کابل روانہ ہو گیا۔ واپس جاتی فوج پر سکھوں نے جہلم تک کے سارے راستے حملے کیے اور ان سے بہت سا جنگی سامان اور دوسرا لوٹ مار کا سامان چھین لیا۔ جب اس بات کا علم شاپاچی خاں کو ہوا تو اس نے بھی موقع سے فائدہ اٹھایا اور لوٹ مار کر کے آنے والے سکھوں کو رام گڑھ کے قریب گھیر لیا مگر سکھوں نے اس کی ساری توقعات کو بر باد کر کے رکھ دیا اور اس کی فوج کو بری طرح شکست کا سامنا کرنے پر مجبور کر دیا۔ اس موسم سرما میں رنجیت سنگھ شاپاچی کو شکست دے کر پنجاب کا ہیرو بن گیا۔

ادھر شاہ زمان کو اپنی شکست اور شاپاچی کا اس طرح میدان جنگ میں پارنا اپنی تذبذب لگا اور اسے یہ تدبیریں بڑی دیر تک ٹنک مارنی ہی۔ اس نے کسی نہ کسی طرح اپنے گھر کے مسئلہ کو سلجھایا اور ایک بار پھر ہندوستان پر حملہ آور ہونے کی سوچنے لگا۔ جب ہندوستان کے لوگوں کو اس کے ارادوں کی خبر ہوئی تو وہ ایک بار پھر اپنے گھر بار چھوڑ کر پہاڑوں میں پناہ گزین ہو گئے۔ اکتوبر آتے آتے پنجاب کے سارے بڑے شہر ویران ہو گئے۔ شاہ زمان نے بھی سکھوں سے خوفناک انتقام لینے کی قسم کھائی ہوئی تھی۔ اس نے اپنے ملک کے لوگوں کو کوچ میں شامل ہونے کی ترغیب

مردان

دینے کا اعلان کیا کہ اس کے ساتھ ہر شخص کو ہندوستان میں لوٹ مار کی آزادی ہوگی۔

پنجاب میں ایک بار پھر افغانی پھیل گئی، یہاں جنگ کے امرتسر میں واقع مقدس عبادت گاہ کی حفاظت کے لیے مٹھی بھر محافظ رہ گئے۔ دہلی میں مغل دربار میں حصین اگر ریڈ بڈنٹ کو زکا کہنا ہے کہ سکھوں نے بدترین بزدلی کا مظاہرہ کیا۔

صاحب سنگھ جتنی گجرات چھوڑ کر بھاگ گیا۔ افغانوں نے شہر کو لوٹ لیا اور شہریوں کو تہ تیغ کر ڈالا۔ ہندو اور سکھ تو پہلے ہی فرار ہو چکے تھے۔ افغانوں کی لوٹ مار کا شکار ہونے والے پنجابی مسلمان تھے۔ رنجیت سنگھ خود کو گجرات والہ قرار دیا۔ افغانوں نے گجرات والہ میں بھی خوب لوٹ مار کی اور شہریوں کا قتل عام کیا۔

امرتسر میں منتقل ہونے والے سربت خالصہ کے شرکاء کی اکثریت نے پہاڑوں میں پناہ لینے کا فیصلہ کیا۔ اس بارگی سدا کور نے انہیں احساس دلایا کہ وہ جن لوگوں سے حفاظتی ٹیکس وصول کرتے ہیں، ان کو تحفظ فراہم کرنا بھی ان کی ذمہ داری ہے۔ اس نے کہا کہ اگر پھر بھی انہوں نے پہاڑوں میں جانے کا فیصلہ کیا تو وہ اپنے ساتھیوں سمیت نہیں مرے جیے گی۔ اسی نے ایک بار پھر رنجیت سنگھ کو نہ صرف حوصلہ دیا بلکہ اسے مکمل طور پر یہ احساس دلانے کی کوشش کی کہ امرتسر ایک مقدس اور پوتر شہر ہے۔ اس نے رنجیت سنگھ کو بلا کر کہا کہ وہ ایک سکھ ہونے کی حیثیت سے یہ گوارا کرے گا، کوئی اس کے مقدس شہر کو یوں اجاڑتا

پھر ہے۔

”نہیں۔ کبھی نہیں۔ میں یہ سوچ بھی نہیں سکتا۔“ رنجیت سنگھ نے جواب دیا۔

”جو لوگ یہاں سے بھاگ رہے ہیں، وہ نہ صرف بزدل ہیں بلکہ سکھوں کے نام اور عزت پر ایک دھبا ہیں۔“

راج کر دی دین ہوئی ہے۔ ہم ایک بار پھر شاہ زمان سے فخر لینے کی کوشش تو کریں۔“ سدا کور نے رنجیت سنگھ کو دوبارہ سمجھایا۔

رنجیت سنگھ نے اپنے ساتھیوں کو اکٹھا کر کے ان کے سامنے یہی بات دہرائی۔ رنجیت سنگھ کے ماموں دل سنگھ نے حاضرین کو بتایا کہ افغان اتنے دلیر نہیں ہیں جتنا انہیں سمجھا جا رہا ہے اور سکھوں کے لیے انہیں مار بھگانا مشکل نہیں ہے۔ اس نے خود اکیلے ہی شاہ زمان کے لیے پھل لے جانے والے ایک کارواں کو لوٹا ہے اور اس میں کامیاب رہا ہے۔

دل سنگھ کی باتیں سن کر تمام سرداروں نے ایک بار پھر رنجیت سنگھ کو اپنا سالار منتخب کر لیا۔

افغانوں نے اپنی کارروائی کا آغاز پھر پہلے کی طرح کیا۔ اگرچہ شاہ زمان کا ٹارگٹ سکھ تھے اور اس نے سکھوں کو نیست و نابود کرنے کا اعلان بھی کر دیا تھا اور مسلمانوں کو اس بات کا یقین تھا کہ چونکہ افغان ان کے ہم مذہب ہیں، اس لیے وہ افغان فوجیوں کے ہاتھوں لٹنے سے محفوظ رہیں گے مگر افغان فوج نے اپنی ضرورت کی ہر چیز مسلمان کاشتکاروں سے چھین لی۔

27 نومبر 1798ء کو شاہ زمان لاہور میں داخل ہو گیا۔ اس مرتبہ اس نے اپنی فوج کو شہر میں داخلے کی اجازت نہیں دی۔ اس نے سخت احکامات جاری کر دیے کہ لاہور میں لوٹ مار بالکل نہیں کی جائے۔ جنگ صرف سکھوں کے خلاف تھی۔ اگر سکھوں کو پنجابی مسلمانوں اور ہندوؤں سے الگ کر دیا جاتا تو آدمی جنگ دینے ہی جیتی جاسکتی تھی۔ اس کے علاوہ سکھوں کو مانجھے والوں (ستج کے مشرق درمیان رہنے والوں) اور مالوے والوں (ستج کے مشرق میں رہنے والوں) میں تقسیم کر دیا جاتا تو پنجاب کو ایک گوئی بھی چلائے بغیر فتح کیا جاسکتا تھا۔ شاہ زمان کا یہ منصوبہ بظاہر بہت زبردست لگتا تھا۔ اردگرد کے سردار اپنی اپنی سرداریاں بچانے کی خاطر شاہ زمان کی حمایت کر رہے تھے۔ تصور کے نظام الدین کی یہ خواہش تھی کہ پنجاب کا قبضہ شاہ زمان کے ہاتھوں میں چلا جائے تاکہ اسے لاہور کی صوبیداری مل جائے۔ کانگڑہ کا سناہر چند اپنے آپ کو ہندوؤں کا ترجمان بتاتا تھا جبکہ صاحب سنگھ اپنی روایت نبھاتے ہوئے زمان خاں کا ساتھی اور خود کو مالوے کے سکھوں کا نمائندہ ظاہر کرتا تھا۔ ایسے میں صرف رنجیت سنگھ تھا جو کانٹے کی طرح زمان خاں کو چھوڑنا تھا۔

شاہ زمان نے افغانوں کا ایک لشکر امرتسر کی طرف بھیجا۔ رنجیت سنگھ نے شہر سے پانچ میل باہر آ کر افغانوں کا راست روک لیا۔ تین گھنٹوں کی لڑائی کے بعد افغان لاہور کی طرف بھاگنے پر مجبور ہو گئے۔ رنجیت سنگھ نے ان کا پیچھا کرتے ہوئے لاہور کا محاصرہ کر لیا اور افغانوں کی رسد کے تمام راستے بند کر دیے۔ اس نے نواحی علاقے کی کھڑی فصلوں کو جلوا دیا تاکہ افغانی افواج ان میں نہ چھپ سکیں۔ اس وجہ سے افغان دفاعی جنگ لڑنے پر مجبور ہو گئے۔

دن گزرتے جا رہے تھے کہ کوئی دن ایسا نظر نہیں آ رہا تھا اور نہ ہی کوئی ایسا امکان دکھائی دیتا تھا کہ افغان سکھوں کا

بن جائے گی۔ کچھ اور مانگا ہوتا۔“ دوسری نے اسے چھیڑا۔
 ”تو ایسے کرنا وہاں کسی صوبیدار سے، کسی سردار سے
 میرا بھی حکم لگا دینا۔ بس تم میرا تحارف کروا دینا۔“
 ”اسے پچاس میں خود لوں گی۔“ پہلی نے قہقہہ
 مارتے ہوئے کہا۔
 ”نہ مشرتی لی لی۔ قاضی کا پیادہ میں تو نہیں بن سکتی۔
 خود ہی کوشش کر کے کسی سرکاری درباری کو پچاس لو۔“
 موراں نے پہلی بار اس کو نام سے پکارتے ہوئے کہا۔
 ”اوہو۔ نہ اپنے ایسے نصیب ہوں اور نہ میں کسی
 دربار یا سرکار سے سندیں اس کے کہ مشرتی مرنے جوگی۔۔۔ تو
 بھی کسی کانے، خاک میں مل چوہے کو پسند آگئی ہے۔“
 مشرتی نے جلاپے سے جواب دیا۔
 ”میں تو پہلے ہی کہتی تھی کہ جب سے میری بچی کا
 دربار میں جانے کا سنا ہے، سب جمل کر خاک ہوئی جاتی
 ہیں۔ کیوں دی بدبختو۔ کیوں ٹھہر رکھا ہے۔ موراں کو؟“
 خانم نے ان کو ڈانٹتے ہوئے کہا۔
 ”توبہ ہے۔ یہ کون سا اپنی چال بھول گئی ہے۔
 باتیں ہی ہیں نا۔ ہم نہ کریں گے، دوسرے کریں گے اور
 اب تو پورے امترس میں یہ پھیل چکا ہے کہ موراں نہ رنجیت سنگھ
 کے دربار میں بجا کر رہے ہیں۔“ مشرتی نے چڑتے
 ہوئے جواب دیا۔
 ”چلو پترو۔۔۔ اپنے اپنے کردوں میں اور بیگا جان تم
 میری ذرا۔ بات سنو۔“ خانم نے سب کو جانے کے لیے
 کہا تو وہ سب آہستہ آہستہ چلتے ہوئے اپنے اپنے کمرے
 میں چلی گئیں۔
 ”بیگا جان! تمہیں یاد ہے۔ آج کتنی تاریخ ہوگئی ہے
 اور تم نے ابھی تک کمرے کا کرایہ نہیں دیا۔“
 ”خانم آپ کو پتا ہے۔ کتنے دنوں سے میں بھار میں
 تھی۔ میرے کمرے میں تو جیسے جیسے نہیں ہو سکا۔“
 ”بوا! تمہیں پتا ہے۔ حالات کس طرح کے جارہے
 ہیں۔ پیٹ کاٹ کاٹ کر گزارہ کر رہی ہوں۔ اگر ساری
 نو چیاں یونہی ہاتھ دھر کر بیٹھ رہیں تو خرچ کہاں سے نکلے گا۔“
 ”خانم! جلد ہی حساب چکنا کروں گی۔ ذرا دم لے
 لو۔“ بیگا جان بولی۔
 ”نکر ہو رہی تھی، اس لیے تمہیں کہا۔ سب کے
 سامنے جہیں پتا ہے مجھے بات کہنے کی عادت نہیں ہے۔ سبکی
 ہوتی ہے اس لیے اکیلے میں کہا ہے۔ دوبارہ سے کہنے کی
 ضرورت نہ رہے۔“ خانم نے متنبہ کرتے ہوئے کہا۔

”مہاراجا ہے پورے پنجاب کا۔ مہاراجا تو کاٹھ کا
 اومگی ہو تو مہاراجا جی کہلاتا ہے۔ سچ کہا ہے کسی نے سارا
 ”من دولت میں چھپا ہوا ہے۔ ماس میں نہیں۔“
 ”بچی بات ہے۔ اب مہاراجا دیکھو اور اس کی پسند
 دیکھو! ابھی وہ باتیں کر رہی تھی کہ اندر سے موراں نکل
 آئی۔ اسے دیکھتے ہی پہلی نے دوسری کو کندھامارا۔
 ”موراں آگئی ہے“ تقریباً پہلی کو کھینچتے ہوئے کہا۔
 ”کچھ کچھ ہوا؟ مجھے کونسا کسی سے خوف آتا ہے۔ بات
 بگھی ہے!“ دوسری نے جواب دیا۔
 ”کیا بچ ہے؟“ موراں نے ان کے قریب آتے
 ہوئے پوچھا ماس کی بات سنائی کی کرتے ہوئے وہی بولی۔
 ”اے موراں! کب اتر رہی ہے دربار میں؟“
 ”ابھی تو صرف سندیں آیا ہے۔ اللہ جانے کب کہا
 ڈولی لینے آئیں گے۔“ موراں نے شوشی سے جواب دیا۔
 ”اسے نہیں تو کہتی ہوں، خوب بن سنور لو جتنے دن
 ہیں۔ ابن، مکی، پوڈرہ لانی لالگو۔“ اس نے ہنستے ہوئے
 مشورہ دیا۔
 ”بے سنور تو وہ جو پہلے سے خوب صورت نہ
 ہو۔ اللہ کا شکر ہے اس نے سارے سن کے خزانے موراں
 کی جھولی میں ڈال دیے۔“ موراں نے اسی انداز میں
 جواب دیا۔
 ”میں تو کہتی ہوں، جاتے ہوئے بنے سنور نے کا سارا
 سامان ایک کھڑی میں باندھ کر ساتھ لے جانا اور اپنے ہونے
 والے عاشق پر اچھی طرح کا لینا تاکہ اس کے چہرے کے داغ
 چھپ جائیں۔“ اس نے ہنس کر چوٹ کی۔
 ”مگر کان کی آکھ کا کیا ہوگا؟“ دوسری نے اپنا حصہ ڈالا۔
 ”مہاراجا ہے۔ سب عیب قبول ہیں۔“ موراں نے
 کچھ اس انداز سے جواب دیا کہ وہ شرمندہ سی ہو کر رہ گئیں۔
 ”ہاں بابا۔ بھوکے پیٹ تو پتھر کو چاٹ کر بھی دلا سائل
 جاتا ہے۔ اس نے بات بڑھائی۔
 ”کیوں چلتی ہو۔ اگر میں وہاں ان کے دل میں گھر بنا پائی
 تو تمہیں بھی وہاں بلاؤں گی۔ دیکھ لیتا۔ موراں کیسے رہتی ہے
 ملکوں میں۔“ موراں نے ان کے حسد کو آگ دکھائی۔
 ”اے موراں! مجھے تو ضرور بلانا۔ سنا ہے وہاں
 ولا پتی شراب بھی ملتی ہے۔ بچی۔۔۔ دیکھی شراب پی لی کر
 میرے تو ہونوں پر سر کی جم گئی ہے۔ اب تو پینے میں مزہ
 بھی نہیں آتا۔“ پہلی نے بات بدلی۔
 ”بڑی لالچی ہے۔ خیر سے موراں اب وہاں جا کے رانی

چلا گیا۔ جاتے جاتے اس نے اعلان کیا کہ جو بھی محمود کے
 ساتھ اس کا معاملہ ملے ہو جائے گا، وہ دوبارہ ہندوستان کو فتح
 کرنے کے لیے واپس آئے گا۔
 یقیناً اس نے ایسا کیا۔ پورے بارہ برس کے بعد وہ
 پنجاب میں دوبارہ واپس آیا مگر ایک سہ سالہ لڑکی کی حیثیت
 سے ہندوستان کو فتح کرنے کے لیے نہیں بلکہ لاشی ٹیکتا ہوا
 پناہ کی درخواست لے کر رنجیت سنگھ کے پاس آیا کیونکہ اس
 کے بھائی محمود نے اسے گرفتار کر کے اس کی آنکھوں میں گرم
 اور تھنی ہوئی سلاخیں بچھرا کر اسے ہمیشہ کے لیے اندھا
 کر دیا تھا۔
 ☆☆☆
 بات کو پر لگ گئے تھے۔ منوں میں یہ خبر پورے۔۔۔
 امترس کی کھینوں میں پھیل گئی تھی کہ رنجیت سنگھ نے بازار حسن کی
 موراں کو دربار کے لیے لاہور منگوانے کی دعوت دی ہے۔
 ایک طرف موراں کی خانم اپنی پوری برادری میں
 اخلاقی پھر رہی تھی۔ وہ جس سے بات کرتی موراں کے
 حسن، اس کی گلوکاری اور تانچے کی تعریف کرتے نہیں سکتی
 تھی۔ وہاں اسی کی برادری کی کچھ بچیاں، موراں کی
 بدخواہی میں حسد کی تمام حدود بھلا کر رہی تھیں۔
 ”چشم بدور۔۔۔! میری موراں تو لاکھوں میں ایک
 ہے۔ دیکھو پورے امترس سے مہاراجا کی نظر بھی میری ہی
 موراں پر پڑی ہے۔“ خانم ناراض تھی۔ جب وہ درانظروں
 سے ہٹتی تو سننے والیوں میں سے ایک ناک چڑھا کر بولی۔
 ”ہاں ہاں جاتی ہوں۔ کس کس کی سفارشوں سے
 موراں مہاراجا رنجیت سنگھ کی نظروں میں چڑھی ہے۔ ایزھی
 چوٹی کا پورا زور لگا رکھا تھا خانم نے۔“
 تب دوسری نے بھی اس کی ہاں میں ہاں ملائے
 ہوئے کہا۔
 ”موراں کے مقدر کیا کھلے، خانم کی تو لاٹری نکل آئی
 ہے۔ دیکھتی نہیں کیسے باتیں کرتی کر چھٹکتی ہے۔“
 ”مہاراجا کو بھی تو بس پورے امترس میں یہی دانہ
 پسند آیا۔“ پہلی نے آکھ دہاتے ہوئے جواب دیا۔
 ”دیکھنا تو اب یہ ہے کہ موراں کو مہاراجا پسند آتا
 ہے یا نہیں۔ ایک آکھ اور چہرہ چپک کے داغوں سے بھرا
 ہوا۔ سنا ہے وہ بھی سننے کی طرح کمزور اور قد میں بھی بس
 ایوں ہی ہے۔ اور ماشاء اللہ اپنی موراں تو ہاتھ لگائے میلی
 ہوئی ہے۔“ قریب کھڑی ایک اور بچی نے ان کی باتوں
 میں اپنا حصہ ڈالتے ہوئے کہا۔

محاصرہ تو ڈکروہلی کی طرف پیش قدمی کریں۔ شاہ زمان نے
 پہلے تو پیار کے ساتھ اپنے فوجیوں کو آگے بڑھنے پر اکسایا
 پھر ڈانٹ ڈپٹ بھی کی مگر افغانوں پر سکھوں کی اتنی دہشت
 طاری تھی کہ وہ رات ہونے کے بعد اپنی بیویوں سے نکلنے پر
 تیار نہیں تھے۔
 بالآخر شاہ زمان نے سکھوں کو فتح کرنے کا ارادہ
 ترک کر دیا۔ اس نے سکھ سرداروں کو یہ یقین دہانی کروانے
 کے لیے اپنا ایک ایجنٹ امترس بھیجا کہ وہ سکھوں کی اخلاک
 اور شہریوں کو کوئی نقصان نہیں پہنچائے گا۔ اگر وہ یہ بتا دیں
 کہ وہ کیا چاہتے ہیں۔ سکھوں نے متفقہ طور پر جواب دیا کہ
 وہ اس کے علاوہ اور کچھ نہیں چاہتے کہ افغان اپنے ملک
 واپس چلے جائیں۔ شاہ زمان نے اپنے ایجنٹوں کو یہ ہدایت
 دی کہ وہ سکھوں میں پھوٹ ڈالنے کی کوشش کریں اور اس
 کے لیے سرداروں کو بھاری رقوم کی پیشکش کریں۔ شاہ زمان
 کی یہ چال کامیاب رہی۔ بہت سے سرداروں نے اپنے
 نمائندے لاہور بھیج دیے۔ شاہ زمان خاں نے ان کی خوب
 آؤ بھگت کی۔ اس نے شاہانہ انداز میں انہیں کہا کہ میں یہ
 ملک تمہیں عطا کرتا ہوں۔ آزادی کے ساتھ رہو اور اپنی
 زمینیں کاشت کرو۔
 ادھر عین وقت پر ایک نجات دہندہ اٹھا۔ یہ صاحب
 سنگھ بیدی تھا جس نے سرداروں کو سمجھایا کہ وہ غیر ملکی حملہ آور
 سے مذاکرات نہ کریں۔ سرداروں نے اس کی بات مان
 لی۔ جب دوبارہ شاہ زمان کے ایجنٹ اس سرداروں کے
 پاس آئے تو انہوں نے کہا۔
 ”ہم نے یہ ملک گوار سے حاصل کیا تھا اور گوار ہی
 سے اس کا تحفظ کریں گے۔“
 اس پر شاہ زمان کو بے حد غصہ آیا اور اس نے قسم
 کھائی کہ وہ سکھوں کو جنگ ہی کے ذریعے سبق سکھائے گا مگر
 شاہ زمان کا لشکر ہر وقت سکھوں کے آج تک جملے سے خوفزدہ
 رہتا تھا۔ سکھ رات کو لاہور میں ٹھس آئے اور لشکروں کے فائر
 کرتے۔ ان کا مقابلہ کرنے کے لیے کوئی باہر نہیں نکلتا تھا۔
 شاہ زمان کے بھائی محمود نے ایک بار پھر افغانستان
 میں گزبڑ پھیلا دی تھی۔ شاہ زمان نے کئی ماہ سے اپنے
 فوجیوں کو تنخواہیں بھی ادا نہ کی تھیں اور وہ شہر کو لوٹنے کی
 اجازت مانگ رہے تھے۔ جب شاہ زمان نے حالات کی
 نزاکت کے پیش نظر ایسا کرنے سے انکار کر دیا تو اس کے
 فوجیوں نے مزید جنگ لڑنے سے انکار کر دیا۔ یہ دیکھ کر شاہ
 زمان نے اپنی فتح کے تمام منصوبے ختم کیے اور کامل واپس

”خانم! ایک بات میں بھی کہوں۔“ بیگم جان نے بڑے کمزور لہجے میں بات کی۔

”کہو.....“ خانم نے ملامت سے پوچھا۔

”خانم! سرکار سے دربار سے تمہاری بڑی واقفیت ہے۔ مانا کہ میں موراد سے زیادہ خوب صورت نہیں ہوں۔ ناز واد میں بھی وہ ہم سب سے بڑھ کر ہے۔ میں بڑی دیر سے آپ کی کوششوں کو دیکھ رہی ہوں جو آپ موراد کے لیے کرتی رہی ہو اور یہ سب اسی کا نتیجہ ہے کہ موراد کو مہاراجا کی محفل سجانے کا موقع مل گیا۔ اگر تم اسے خلوص کے ساتھ میرے لیے بھی کوشش کرو اور میرا مقدر بھی کسی دربار، مہاراجے یا سردار کے ہاں کھل جائے تو یقین کرو، آپ کو نہال کر دوں گی۔ میں کتنے دنوں سے بات کرنے کی جرات کر رہی تھی مگر یقین جانو، حوصلہ ہی نہیں پڑ رہا تھا۔“ بیگم جان نے آہستہ آہستہ اپنے دل کی بات خانم پر واضح کر دی، ڈالی تو خانم نے کچھ دیر خاموشی اختیار کرتے ہوئے پہلی بار اسے اپنی نظر میں تو لے ہوئے کہ۔

”بیگم جان! پچھلے ادب کے درخت سے خود بخود تمہاری جھولی میں نہیں آگرتا۔ اس کے لیے محنت کرنے کی ضرورت ہوتی ہے۔ موراد نے جتنی محنت اس مقام تک پہنچنے کے لیے کی ہے، اتنی کوئی پتہ بھی نہیں کر سکتی۔ یہ بات درست ہے کہ میری مدد کے بغیر وہ اتنی اونچی اڑان نہیں بھرتی تھی۔ تم بھی میری بات مانتی رہو۔ میرے قدموں کے نشانات پر قدم دھرتے چلی آؤ گی تو کامیابیوں کے دروازے تم پر بھی کھل جائیں گے۔ مگر پہلے کمرے کے کرائے کا بندوبست تو کر لو۔“ خانم نے موراد کی کامیابیوں کا سارا صلہ اپنی جھولی میں ڈالنے ہوئے کہا اور بیگم جان کو سوچنا چھوڑ کر اپنے کمرے کی طرف چلی گئی۔

☆☆☆

شاہ زمان جب ناکام ہو کر واپس پلٹنے لگا اور اس کی اطلاع امرتسر میں موجود سکھ سرداروں کو ہوئی تو وہ فوراً اپنی اپنی ریاستوں کی طرف روانہ ہو گئے لیکن ان میں سے رنجیت سنگھ ایسا واحد سردار تھا جس نے یہ جنگ اپنے ذاتی مفادات کے لیے نہیں لڑی تھی۔ وہ فوری طور پر افغانوں کے تعاقب میں نکل پڑا اور گوجر والہ کے قریب افغانوں کو عقب سے چالیا۔ دوسری طرف سے اس نے افغانوں کو سامنے سے بھی پھرنے کی کوشش کی تاکہ وہ پنجاب سے نکلنے نہ پائیں مگر افغان اس کے نرنے میں نہیں آئے اور پیچ کر نکل گئے۔ رنجیت سنگھ نے دریائے سندھ کے کنارے

تک ان کا تعاقب کیا اور جب تک وہ ہندوستان کی حدود سے باہر نہیں نکل گئے، ان پر حملے کرتا رہا۔ اب رنجیت سنگھ پورے پنجاب کا ہیرو بن چکا تھا۔ اگر وہ اتنی جرات کا مظاہرہ نہ کرتا تو سارا پنجاب برباد ہو گیا ہوتا کیونکہ ان شمالی وحشیوں کو جنہیں افغان کہا جاتا تھا، ان کے گھوڑے جہاں جہاں سے گزر جاتے، اس زمین پر گھاس تک نہیں اگتی۔

افغانیوں کی شکست خوردہ فوج واپس ہوتے ہی لاہور پر تین سرداروں نے قبضہ کر لیا۔ ان میں چیت سنگھ، صاحب سنگھ اور موہر سنگھ شامل تھے۔ انہوں نے برسرِ اقتدار آتے ہی کھل کھیلنا شروع کر دیا۔ اچانک دولت اور سرداری ہاتھ میں آتے ہی وہ اپنی اوقات بھول گئے۔ وہ ہر وقت شراب نوشی اور زنا کاری میں گزارتے یا آپس میں لڑتے بھجڑتے رہتے تھے جس سے لاہور شہر کا امن و سکون غارت ہو کر رہ گیا تھا۔ سوہن لال کا کہنا تھا۔

”لاہور کے لوگوں پر اسنے ظلم ہو رہے تھے کہ ان کی آہ و فغاں آسمان تک پہنچ رہی تھی مگر حکمرانوں کے کانوں پر جوں بھی نہیں رہتی۔“

نظام الدین کے ایجنٹوں نے لاہور کے ممتاز مسلمانوں سے رابطہ کر کے انہیں تجویز دی کہ وہ ان کے آقا نظام الدین کو شہر پر قبضہ کرنے کی دعوت دیں۔ مسلمانوں نے اس تجویز پر عمل کرنے سے انکار کر دیا بلکہ ہندو اور سکھ شہریوں کے ساتھ مل کر انہوں نے رنجیت سنگھ کو خفیہ طور پر لاہور آنے کی دعوت دی۔

شہریوں کے نمائندے رنجیت سنگھ سے ملے اور اسے ساری صورت حال بتا کر لاہور پر قبضہ کرنے کو کہا۔ رنجیت سنگھ ان کی دعوت سن کر حیران رہ گیا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ یہ دعوت لاہور کے شہریوں نے ہی بھجوائی ہے یا لاہور کے سرداروں نے اسے پھانسنے کے لیے یہ چال چلی ہے۔ اس کا ذکر اس نے شہریوں کے نامہ بروں سے بھی کیا۔ ”لگتا ہے، مجھے لاہور کے سرداروں نے پھانسنے کے لیے یہ چال چلی ہے اور تم سب کو میرے بنا کر میرے پاس بھیجا ہے۔“

”مہاراجا! آپ کا خدشہ بجا نہیں کسی سردار نے نہیں بھجوا یا۔ ہم لاہور کے شہری خود ان سے اسے تنگ اور پریشان آچکے ہیں کہ ان سے جان چھڑانے کے لیے آپ کی مدد مانگنے آئے ہیں۔“ نمائندوں میں سے ایک نے آگے بڑھ کر کہا۔

”اس کا کوئی ثبوت؟“ مہاراجا رنجیت سنگھ نے پوچھا۔

”اگر آپ کو یقین نہیں ہے تو آپ اپنا کوئی با اعتماد

موراد

لامہ امارے ساتھ بھجوا دیں تاکہ وہ صحیح صورت حال کا جائزہ لے کر آپ کو درست اطلاعات دے۔“ وہی نمائندہ ادا رہا بولا۔

”یہ ٹھیک ہے۔“ اس نے کہا۔ میں اپنے با اعتماد ملازم عبدالرحمان کو آپ کے ہمراہ صورت حال کا درست مطالعہ کرنے کو بھجواتا ہوں اور میں اپنے ساتھیوں سے بھی مطلعہ کر کے کوئی قدم اٹھاؤں گا۔“ مہاراجا رنجیت سنگھ نے مہاراجان کو ان کے ہمراہ لاہور روانہ کر دیا اور خود اپنی ماس سدا کوڑ سے مشورہ کرنے چلا گیا۔ عبدالرحمان کو کچھ دن لاہور میں رہ کر وہاں کے ممتاز شہریوں سے گفت و شنید کر کے اس کے پاس ہٹا پہنچ گیا۔

”ہاں جو عبدالرحمان تمہارا کیا اندازہ ہے؟“ مہاراجا نے عبدالرحمان سے پوچھا۔

”مہاراجا! لاہور کے شہریوں نے واقعتاً آپ کو بلایا ہے۔ وہاں کے عیاش سرداروں میں اتحاد قائم نہیں ہے کہ وہ ضروری فوج کا سامنا کر سکیں۔ ان میں سے جو اعدا مل سردار ہے، وہ اس وقت شہر سے دور ہے۔“ عبدالرحمان نے بتایا۔

”آپ کا اس بارے میں کیا مشورہ ہے؟“ رنجیت سنگھ نے اپنی ساس کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

”رنجیت! فوری طور پر اپنی فوج کو اکٹھا کرو اور لاہور پر حملہ آور ہو جاؤ۔ تم فوراً امرتسر جا کر اپنی فوج کو ساتھ لو۔ تاخیر نہیں کرنی اور میری مدد کی ضرورت ہو تو بتانا۔“ سدا کوڑ نے رنجیت سنگھ کو مشورہ دیا۔

سخت سردیاں ہوں یا گرمیاں اپنے پورے عروج پر ہوں تو یہ وقت کسی بھی ملک کے فوجیوں کے لیے بدترین وقت ہوتا ہے۔ جس وقت رنجیت سنگھ نے لاہور پر حملہ آور ہونے کا سوچا، اس وقت گرمیاں اپنے جوبن پر تھیں اور کسی وقت بھی مون سون شروع ہونے کی توقع تھی۔ اگر حملے کے وقت مون سون شروع ہو جاتی تو اس کا مطلب یہ تھا کہ جنگ ہونے والے میدان دلہل میں تبدیل ہو سکتے تھے۔ اس لیے رنجیت سنگھ نے بھی موقع گنوا لے بغیر لاہور پر جلد حملہ کرنے کی غٹائی۔ اس نے اچانک حملہ کر کے عیش و عشرت میں ڈوبے سرداروں کو حیران کرنے کا سوچا اور رنجیت سنگھ نے 10 محرم کو لاہور پر حملہ کر دیا تمام سردار رات کے بعد ’محول کے مطابق اپنی عیاشیوں میں مشغول ہو گئے جو کہ نہ ہاتھ تک جاری رہنے کا پروگرام تھا۔ وہ سب بے نوشی میں معروف تھے۔ جب لاہور پر خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ ماری لٹا سوگ من رہی تھی تو رنجیت سنگھ لاہور سے چند میل

کی دوری پر تھا۔ اگلی صبح کی آکھ کھلنے ہی لوگوں نے اپنی پھتوں پر سے دیکھا کہ ایک چھوٹی سی فوج نے خاموشی کے ساتھ لاہور شہر کا محاصرہ کر لیا ہے۔ سورج کی روشنی پھیلنے تک رنجیت سنگھ کے بھینکے ہزار جوان اپنی اپنی جگہ سنبھال چکے تھے اور وہ دشمن سے دو دو ہاتھ کرنے کے لیے تیار تھے۔

رنجیت سنگھ نے سدا کوڑ اور اس کے جوانوں کو شہر کی مشرقی سمت دہلی دروازے پر چھوڑا اور خود جنوب کی طرف سے اتار گلی بازار تک پہنچ گیا۔ یہاں اسے لاہور کے شہریوں کی جانب سے خوش آمدید کا خفیہ پیغام پہنچا۔ اس نے شہر کی تفصیل میں مختلف مقامات پر بارود رکھوا دیا۔ جو بھی پہلی توپ چلی، لاہوری مسلمانوں کے سالار مہر محکم دین نے فقاہہ بجوا کر اعلان کر دیا کہ لاہور شہر پر مہاراجا رنجیت سنگھ نے حملہ کر دیا ہے اور اس نے شہر کا انتظام سنبھال لیا ہے۔ لہذا شہر کے تمام دروازے کھول دیے جائیں اور مہاراجا کی فوج کو خوش آمدید کہا جائے۔ رنجیت سنگھ اپنے جیسے سمیت جنوب میں واقع لاہوری دروازے سے داخل ہوا۔ سدا کوڑ اپنے گھڑ سواروں کو لے کر دہلی دروازے سے داخل ہوئی۔

حاکمان لاہور شہر کے لیے یہ اچانک اور حیران کن حملہ تھا۔ موہر سنگھ اور صاحب سنگھ کے خاندان کے لوگ اور ان کے ساتھی دوسرے دروازوں سے فرار ہو گئے۔ چیت سنگھ قلعہ بند ہو گیا۔ رنجیت سنگھ نے اعلان کر دیا کہ شہر کے لوگ امن و سکون سے رہیں۔ انہیں کوئی گزند نہیں پہنچائی جائے گی۔ ساتھ ہی اس نے اپنے فوجیوں کو بھی سختی سے حکم دیا کہ وہ شہر میں کسی قسم کی لوٹ مار نہیں کریں گے اور جو فوجی ایسا کرتے ہوئے پایا گیا یا اس نے حکم کی خلاف ورزی کی تو اسے سزائے موت دی جائے گی۔

☆☆☆

لاہور کی فتح رنجیت سنگھ کے لیے بڑی اہمیت کی حامل تھی۔ اس شہر پر قبضہ کرنے سے وہ شمالی پنجاب کا سب سے طاقتور سردار بن گیا تھا۔ لاہور جیتنے ہی رنجیت سنگھ نے سب سے پہلا کام یہ کیا کہ مغل شہنشاہ اورنگزیب کی تعمیر کردہ عظیم شاہی مسجد میں پہلی حاضری دی۔ اس کے بعد وہ مسجد وزیر خاں گیا۔ اس نے قلعے کی تفصیل کے نیچے بادشاہی مسجد کے قریب اپنی فوج کا پڑاؤ ڈالا پھر اپنی ساس کے مشورے پر چیت سنگھ کو ہتھیار ڈالنے اور اپنی اطاعت قبول کرنے پر مجبور کیا۔ چیت سنگھ نے پس و پیش کی تو اس نے کا محاصرہ کرنے کا فیصلہ کیا۔ چیت سنگھ کے حواریوں نے رنجیت سنگھ کے

اور آتش بازی کا زبردست مظاہرہ کیا گیا۔

رجحیت سنگھ کی یہ سیاسی بصیرت اور دانش مندی تھی کہ اس نے مغلوں کی طرح اپنے دربار کی نہ تو شان و شوکت بڑھائی اور نہ ہی خوشامدیوں کی باتوں میں آ کر خود کو مہاراجا بنانے کی کوشش کی۔ اس نے شاہی تاج سر پر پہننے سے انکار کر دیا اور اس کی جگہ دھقانوں والی گچڑی کو ترجیح دی۔ اس نے علی الاعلان کہا۔

”میرے تلواری ہی مجھے سب سے ممتاز بناتی ہے۔ مجھے اس کے علاوہ کسی نام و نمود کی ضرورت نہیں۔“

اس نے تخت پر بیٹھے سے بھی انکار کر دیا اور پہلی طرح ایک معمولی سی کرسی پر بالٹی مار کر بیٹھتا تھا پھر مشرقی روایت کے مطابق قائلین پر غواڑ کئے کے ساتھ نیک لگا کر ملاقاتیوں سے گفتگو کرتا تھا۔ اس نے سیکڑے ڈھالنے کا حکم دیا اور یہ حکم دیا کہ سکوں پر اس کا نام یا شیبہ کے بجائے گرو نانک کی شیبہ نقش کی جائے۔ اس کے ناک ٹانگ شای کا نام دیا گیا۔ اب سدا کوہ رہیم اور ہر معاملے میں رنجیت سنگھ کے ساتھ ساتھ رہنے لگی تھی۔ رنجیت سنگھ نے کاٹھڑہ کار بن کیا تو کاٹھڑہ کا سردار سنسار چندا اپنا حوصلہ ہار بیٹھا۔ رنجیت سنگھ نے سنسار چند کی ریاست کے کچھ حصوں کو اپنی سلطنت میں ملا لیا اور نور پور، نوشہرہ کے علاوہ سیمان پور کے قرب و جوار کا علاقہ سدا کوہ کو دے دیا۔ اسی زمانے میں وہ دہلی، ملتان کے مظفر خاں کو شکست دے کر تروان ادا کرنے کی شرط پر علاقہ مظفر خاں کے پاس چھوڑ دیا اور اپس لا آور کیا۔

روحیت سنگھ نے مند ہو کر واپس آیا تو فتح کی خوشی میں اس نے تین سالہ بیٹے کھوک سنگھ کی منگنی کی تقریبات کا اعلان کیا۔ اس کی منگنی کنہیا محل سے جہل سنگھ کی شیر خوار بیٹی چاند کور سے کرنے کا ارادہ باندھا گیا۔ اسی کھوک سنگھ کی منگنی برمودا کو امر ترسے بلوانے کا بندوبست کیا گیا تھا۔

☆☆☆

اہیت تو موراس کی اسی روز ہوئی تھی جب اسے
نجابت سنگھ کے دربار میں حجرے کا بیچہ غام ملا تھا۔ پورے
مہر کو پتا چل گیا تھا کہ موراس نام کی کچی اس شہر کے بازار
حسن میں موجود ہے مگر جب کتنے دنوں تک دو بار کی طرف
ہے اگلا سندس نہیں ملا تو پھر بیگیاں اپنی موت آپ مر
گئیں۔ باتیں وقت کی گرو تے بیٹھ گئیں پھر اچانک
ایک روز ایک بھتیجی پاگلی اس کے گھر کے دروازے پر
اکر رہی جس کے ساتھ چند خائلی سیاہی بھی موجود تھے۔
بازار حسن میں ایک باجر بھلی سی بچی تھی۔ برکتی اس ٹوہ

۱۔ اہل علم نے اس کی اطاعت قبول کر لی اور اسے ایک باقی
 کے ساتھ بیس ہزار روپے نذرانہ پیش کر دیا۔ اس کے بعد
 اس نے ہجرات کے سردار صاحب سنگھ بنگلی کے خلاف قدم
 اٹھایا جس نے اکال گڑھ کے سردار کے ساتھ مل
 کر کوجر انوالہ پر حملے کی سازش کی تھی۔ صاحب سنگھ بیدی
 اہل انسان تھا جس نے تین سال پہلے سکھوں کو افغانوں سے
 لالے پر متحد کیا تھا۔ اسے جب پتا چلا کہ بنگلیوں اور رنجت
 سنگھ کے درمیان چپقلش جاری ہے تو وہ فوراً ہجرات پہنچا اور
 گرو کے نام پر دونوں فریقوں کو علم دیا کہ اپنے ہتھیار زمین
 پر ڈال دیں۔ سردار اس کا اس قدر احترام کرتے تھے کہ وہ
 صاحب سنگھ بیدی کو بابا صاحب کاربہ دیتے تھے۔ انہوں
 نے اس کے احترام میں اپنی ٹھواریں زمین پر رکھ دیں۔
 موان لال اس منظر کو یوں بیان کرتا ہے۔

”رجحتم ستمہ نے تلوار اپنی کمر سے کھولی اور بابا صاحب ستمہ کے سامنے زمین پر رکھ دی۔ تمام سرداروں نے اس تلوار میں ایک گھنٹے تک زمین پر پڑی رہیں۔ اس کے بعد بابا صاحب ستمہ نے رجحتم ستمہ کی تلوار اس کی کمر سے باندھ دی اور دعا دی کہ اس کے سارے دشمن جلد ہی ہلاکت و نابود ہو جائیں گے اور پورے ملک پر اس کی حکومت قائم ہو جائے گی۔“

چھوٹے مولے بھجڑے نمٹاتے ہوئے اب رنجیت سنگھ وچاب کا قاتک مانا جانے لگا تھا۔ تاہم وہ مہاراجا کا خطاب اپناتے ہوئے بچکچا رہا تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ کوئی لہا قدم نہیں اٹھاتا چاہتا تھا جس سے دوسرے سرداروں کو اس کے خلاف سازش کرنے کا موقع ملے جبکہ اسے یہ بھی علم تھا کہ ایک قانونی خطاب اپنانے کے ۔۔۔ کتنے فوائد ہوتے ہیں۔ جب اس نے مہاراجا کا خطاب اپنایا تو عوام نے اس کے اقدام کو بہت سراہا۔

رنجیت سنگھ باقاعدہ تاج پوشی کے لیے راضی ہو گیا۔

☆☆☆

اب رنجیت سنگھ باقاعدہ تاج پوشی کے لیے راضی ہو گیا تھا۔ اس نے مسندوں، مندریوں اور گھوڑوں میں مہارات کروانے کا اعلان کیا۔ صاحب سنگھ بیدی نے رنجیت سنگھ کے ہاتھ پر عذرانہ لگا کر اس کے پنجاب کے احاطہ ہونے کا اعلان کیا۔ اسے شاہی قلعے سے توپوں کی سلامتی دی گئی۔ سہ ماہی کے وقت جو ان مہاراجا بھی پر سوار ہو کر شہر میں نکلا تو خوشی سے سرشار عوام نے اس پر پھول اور بادلی کے کئے چھڑا دیے۔ رات کو شہر میں چراغاں کیا گیا

حالاتِ رنجیت سنگھ کے ساتھ تھے۔ شہر سے اسے ضروری
رسد مسلسل مل رہی تھی۔ اس کے مخالفوں کے اتحاد میں صرف
ایک قدر مشترک بھی اور وہ قدر رنجیت سنگھ کے ساتھ دشمنی اور
اسے ہر حال میں شکست سے دوچار کرنے کا جذبہ تھا تاکہ
لوگوں کو بتایا جاسکے کہ رنجیت سنگھ بھی اکیلا سورا نہیں ہے۔
ایک ایک سنگھ سولا لاکھ پر بھاری ہے مگر ان کا سالار گلاب
سنگھ صحت و شباب کا دلدادہ تھا۔ وہ جب بھی قازغ ہوتا، نشے
اور ناچنے والیوں میں اپنا وقت گزارنے کو ترجیح دیتا تھا۔
ایک روز ٹھٹھڑ شہر نوشی سے اس کے دامغ کی رگ
پھٹ گئی اور وہ مر گیا۔ اس کی موت نے سکھوں کی اتحادی
فوج کو بے حوصلہ کر دیا اور وہ خاموشی کے ساتھ میدان چھوڑ
کر بھاگ گئی۔ رنجیت سنگھ اپنی فوج کو لاہور واپس لے آیا۔
قسمت نے رنجیت سنگھ پر ایک اور مہربانی کی۔ حکومتی

غیر اجماع پونے کرنے کے لیے دس سال اور دولت کی ضرورت تھی جو رنجیت سنگھ کے پاس بہت کم تھی کیونکہ اس نے اپنی تمام توجہ توپخانے کی منصوبوں پر لگا لی ہوئی تھی۔ ان دس سال کو پورا کرنے کے لیے اس نے سوچا کہ شہر کے ساتھ ساتھ کالوں سے اجازت فرم لے۔ ابھی وہ یہ سوچ ہی رہا تھا کہ شہر کی تفصیل کے باہر واقع ”بدھو دا آدا“ نامی ٹھکانداری سے سونے کی تیس ہزار مہر میں دریافت ہو گئیں۔ دشمن کے بھاگ جانے اور خزانے کے اچانک مل جانے سے لوگوں کو چنتہ نہیں ہو گیا تھا کہ اب رنجیت سنگھ ہی لاہور کا حقیقی حکمران ہے اور وہ پنجاب پر اپنی حکومت قائم کر لے گا۔ اس کی پختہ حیثیت کو دیکھتے ہوئے سارے ملک سے فوج مان سکر جا کر یہ کہ دربار کا رخ کرنے لگے۔ سرداروں کے بیٹے اس کی فوج میں شامل ہونے، عالم اور طبیب اس کی ملازمت حاصل کرنے، دیکھنا اور بہتر مند شاہی سرپرستی حاصل کرنے..... نیز بے شمار کینزیریں بھی اس کا قرب حاصل کرنے کو پہنچ گئیں۔ رنجیت سنگھ قلعے میں رہنے لگا اور باقاعدگی کے ساتھ اپنا دربار لگانے لگا تھا۔ افغانوں کے سالار شاہ زمان نے بھی اس کے لیے صلح کے پیغام کے ساتھ دوستی کا ہاتھ بڑھایا تھا۔ جسے رنجیت سنگھ نے کمال مہربانی سے قبولیت کا درجہ دے کر اسے جوابی تحائف میں اس توپ کے ٹکڑے بھی روانہ کیے جسے شاہ زمان فرار ہوتے وقت پنجاب کے ایک دربار میں گھونپنا تھا۔

لاہور پر قابض ہونے کے بعد رنجیت سنگھ کا اگا
منسوب پورے پنجاب کا حکمران بننے کا تھا۔ ویسے بھی اب
اس کے دشمن بہت زیادہ ہو گئے تھے۔ اس نے جنوں کے
راجے کے خلاف اقدام اٹھانے کا سوچا تو جنوں کے راجا

اقدام سے چیت نکھو گا گاہ کیا۔ اگلے روز چیت نکھ کے
قاصد آئے۔ انہوں نے آ کر کہا کہ اگر رنجیت نکھ ان کے
سرداروں کی جان بخشی کا حکم دیں تو قلعہ بند چیت نکھ نہ
صرف خود کو گرفتاری کے لیے پیش کر دے گا بلکہ قلعہ بھی
رنجیت نکھ کے حوالے کر دے گا۔

رنجیت سنگھ حکومتی معاملات میں بے حد ذہین تھا۔ اس نے سوچا کہ چیت سنگھ پر اگر اس کی جان بخشی کر کے آج احسان کر دے تو وہ تمام عمر اس کے زیرِ نگیں رہے گا اور اس سے خوب فائدہ بھی اٹھایا جاسکتا ہے۔ چنانچہ جو بھی اسے چیت سنگھ کی تجویز ملی، اس نے عالی ظرفی کا مظاہرہ کرتے ہوئے نہ صرف اپنے دشمن کو معاف کرنے کا اعلان کر دیا بلکہ اس کے لیے تاحیات وظیفہ مقرر کر دیا۔

اس طرح 7 جولائی 1799ء کو لاہور قلعے کے دروازے اس اٹھارہ سالہ فاتح پر کھول دیے گئے۔ رنجیت سنگھ قلعے میں داخل ہوا تو اسے توپوں سے سلامی دی گئی۔ دہلی اور آگرہ مغلوں کے دارالسلطنت تھے لیکن لاہور کی ایک اپنی مغرور اور الگ حیثیت تھی۔ ان شہروں کے بعد لاہور سلطنت کا مرکزی شہر تھا۔ لاہور دارالحکومت اور شمال مغربی سرحدی علاقے کے درمیان واقع تھا۔ سکھوں کے نزدیک لاہور امرتسر کے بعد دوسرا مقدس شہر تھا کیونکہ یہ امرتسر کی بنیاد رکھنے والے ان کے چوتھے گرو رام داس کی جائے پیدائش تھا۔ اس بنا پر رنجیت سنگھ اب لاہور کا حکمران بننے یا شاہی پنجاب کا سب سے طاقتور سردار بن گیا تھا۔

رنجیت سنگھ لاہور کے تخت پر کیا بیٹھا، کچھ مثل داروں کا پوشیدہ حساب کھلی نفرت میں بدل گیا۔ شاہ زمان کے خلاف رنجیت سنگھ کے ساتھ مل کر افغانوں کا مقابلہ کرنے والے سابقہ حلیف بھی اب اس کی دشمنی پر اتر آئے تھے۔ انہوں نے لاہور سے نہایت ذلت کے ساتھ بے دخل کیے جانے والے بھنگی سرداروں کے ساتھ اتحاد بنایا۔ نظام الدین خاں بھی جو اپنے آپ کو لاہور کا صوبیدار بننے کے خواب دیکھ رہا تھا، وہ بھی ان کے ساتھ مل گیا۔ رنجیت سنگھ کے سارے دشمن امرتسر میں اکٹھے ہو گئے۔ اس وقت انہوں نے اکٹھے ہو کر امرتسر میں ایک منصوبہ بنایا، کہ کسی طرح رنجیت سنگھ کو لاہور سے بے دخل کر کے اپنی شکست کا بدلہ لیں۔ چنانچہ 1800ء کے موسم بہار میں بھنگیوں کی متحدہ فوج نظام الدین خاں کی فوج کے ساتھ مل کر لاہور کی طرف بڑھنے لگی۔ رنجیت سنگھ نے شہر سے دس میل باہر آ کر بھینسن نامی بستی کے قریب ان کی پیش قدمی کو روک دیا۔ وقت اور

میں تھا کہ وہ کون ہے جس کو لینے کے لیے یہ پاکی اور محافظ آئے۔ ہر کوئی اپنے اپنے دروازے سے مندر نکالے سن گن لینے کے چکر میں تھا۔ باتیں ایک بار پھر اٹھرائی لے کر اٹھ بیٹھی تھیں۔

”پتا چلا ہے موراد کو مہاراجا کے دربار میں لے جانے کا محفوظ آئے ہیں۔“ ایک کمرے کی ادھ کھلی کھڑکی سے ایک چہرے نے آواز نکالی۔

”جب کچھ روز پہلے پیغام ملا تھا میں نے تو اسی روز کہہ دیا تھا کہ موراد بہت بھالوں والی ہے۔“ ایک اور آواز ابھری پھر تو جیسے اس بچی کی برداشت سے یہ سب باہر ہو گیا تھا۔ اس نے دروازے کا ایک پت کھولا اور اس میں سے گردن نکال کر سپاہی کو آواز دی۔

”اے دروغے۔“ داروغہ نے آواز کی سمت کا تعین کرنے کے لیے ادھر ادھر دیکھا تو جیسے قریب ہی سے بڑی مزمن مہی کا ایک فوارہ پھوٹ نکلا تھا۔

”ارے ادھر ادھر کیا کنکڑے اڑا رہے ہو۔ میں ادھر ہوں۔“

داروغہ نے دوبارہ آواز کی جانب دیکھا۔ ”یہ سب کیا ہے۔“ ایک گورے سے بازو نے دروازے کی اوٹ سے نکل کر اشارہ کرنا پوچھا۔ ”دیکھتی نہیں ہے، موراد کا بلاوا آیا ہے مہاراجا کے دربار سے!“ داروغہ نے غصے سے کہا۔

”ارے داری جاؤں۔ کبھی یہ بلاوا ہمارا بھی آ جائے تو جیون بھل ہو جائے۔“ وہ دوبارہ بولی۔ ”آ جائے گا۔ بہت جلد آ جائے گا۔“ داروغہ نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”ارے سچ۔ تمہارے منہ میں گچی شکر۔ تو پھر میں بھی آس لگا رکھوں؟“ وہ ایک بار پھر سے گویا ہوئی۔ ”ہاں ہاں۔ ذرا عزرائیل کو فارغ ہونے دو۔ بلاوا خود بخود آ جائے گا۔“ داروغہ نے تہقید لگاتے ہوئے جواب دیا تو ٹھٹھک سے دروازہ بند ہو گیا۔

”بڑی آئی بلاوا لینے والی۔ سرکار دربار سے بلاوا ایسے آ جاتا ہے جیسے یہ پتھر یا جھتی ہے۔“ داروغہ نے دوسرے سامنے سے کہا۔

ابھی ان کی باتیں جاری ہی تھیں کہ موراد حویلی سے باہر آ گئی۔ یوں جیسے پری آسمانوں سے اتر آئی ہو۔ کوئی حور رستہ بھول گئی ہو۔

”کہاں جانا ہوگا۔“ آواز کی گھنٹیاں بجیں۔ ”لاہور۔ مہاراجا کے تین سالہ بیٹے ٹھٹھک کی منگنی ہے۔ اس کی تقریبات میں شمولیت کرنا ہے۔“ ایک سپاہی نے جواب دیا۔

”پھر یہ پاکی کیوں؟“ موراد نے دوبارہ پوچھا۔ ”آپ اس میں تشریف رکھیں گی تو کہاں آپ کو لے چلیں گے۔“ ایک دوسرے سپاہی نے موراد کی حیثیت بڑھاتے ہوئے کہا۔

”موراد اپنے پاؤں چل سکتی ہے۔“ موراد نے ہنستے ہوئے کہا۔

”لاہور دور ہے۔“ وہی سپاہی دوبارہ بولا۔ ”بیٹھ جا میری بیٹی۔ بسم اللہ کر کے دایاں پاؤں رکھنا پہلے کہ برکت ہوتی ہے۔“ خانم نے موراد کو نصیحت کرتے ہوئے کہا۔ موراد نے خانم کی نصیحت کے مطابق پہلے دایاں پاؤں پاکی میں رکھا۔ جب وہ پیٹھری تو کہاں نہ پاکی اٹھائی۔ دیکھنے والیوں کی نظریں ابھی تک اس کی ایک ایک حرکت کا تعاقب کر رہی تھیں۔

شام ڈھلنے سے پہلے پہلے ان کا چھوٹا سا قافلہ لاہور پہنچ گیا تھا۔ لاہور کی عمارتیں نیچے ٹھٹھک منگنی کی خوشی میں جھجکا رہی تھیں۔ لاہور شہر کو بڑی خوب صورتی سے سجایا گیا تھا۔ موراد کی پاکی اس وقت کے گاؤں مکھن پورہ کے میدان میں اتاری گئی تھی۔ اس پورے میدان کو دھن کی طرح سجایا گیا تھا۔ ایک بڑا سا پنڈال چھوڑ کر ارد گرد چھو لدا رہا۔ کمرے بنائے گئے تھے جن میں ارد گرد کے علاقوں اور راستوں کے آئے ہوئے راجے اور سردار رہائش رکھے ہوئے تھے۔

موراد کے لیے بھی ایک ایسی ہی چھو لدا ری کا کمرہ بنا دیا گیا تھا جسے کم خواب اور بہترین کپڑوں سے سجایا گیا تھا۔ جھلملاتے خوب صورت اور مین پر دے لہر رہے تھے۔ موراد کو اس کے کمرے کے سامنے اتارا گیا تو وہ میدان کی سجاوٹ اور اس کی حسن ترتیب دیکھ کر حیران رہ گئی تھی۔

”کیا دربار میں نہیں اتارو گے؟“ موراد نے پاکی سے باہر قدم رکھتے ہوئے پوچھا۔

”نہیں کا حکم ملا تھا۔ تقریبات کا سارا انتظام ادھر ہی کیا گیا ہے۔ تمام امراء سردار اور روسا ادھر ہی ٹھہرے ہیں۔ آپ کا جلسہ بھی اسی پنڈال میں ہوگا۔“ انتظامیہ کے ایک شخص نے بتایا۔

”واہ ری موراد۔ دل میں کیا کیا امیدیں لگا کر آئی

موراد

نئی اور کہاں آ کے اتاری گئی۔ دل میں تو تھا کہ محل کی روشیں اور راہریاں دیکھنا نصیب ہوں گی مگر ملا کیا۔ ایک چٹیل میدان۔“ موراد نے خود سے باتیں کرتے ہوئے کہا۔

”اچھا۔ محل اپنے نصیبوں میں کر کے نہ چھوڑا تو موراد نام نہیں۔“ ایک دوسری سوچ نے اس کے ارادوں کو ہمیز دی۔ ”اوہو۔ چل ری موراد۔ جوہو، دیکھا جائے گا۔“

اس نے اپنے ساتھ لائے ملبوسات اور سچے سنورنے کا دوسرا سامان اپنے کمرے کی ایک جانب رکھتے ہوئے آہ بھری۔ اس کے سامنے بچے اور ساری نوا زوں کے لیے ایک ایسا ہی الگ سا کمرہ بنا دیا گیا تھا۔ موراد اپنے کمرے میں اکیلی تھی۔ رات کے پچھلے پہر جب ساری نئی معروفیات ختم ہو گئیں تو ایک باگی پھیل چھٹی سی باندی اس کے کمرے میں آئی۔ موراد نے اس کی طرف چرائی سے دیکھا۔ وہ کسی انگریزی گڑیا کی طرح سجی بنی ہوئی تھی۔

”مہاراجا نے یاد فرمایا ہے۔“ موراد جو پہلے سے ہی تیار تھی، مہاراجے کے حکم کی منتظر تھی، جلدی سے اٹھی اور اس کے ساتھ چل پڑی۔ ”یہ کمرہ اسی طرح کھلا رہے گا، اس کے اندر میرا سامان پڑا ہے۔“ موراد نے نکتے سے سوال کیا۔

”یہ رنجیت سنگھ کا شہر ہے۔ پنجاب کے شیر کا گھر ہے۔ یہاں پاکٹ ماروں اور اٹھائی گیریوں اور چوروں کا کیا کام۔“ لڑکی نے اٹھلاتے ہوئے جواب دیا۔

پنڈال کے ارد گرد حیثیت کے مطابق کرسیاں اور صوفے بچے ہوئے تھے اور پورا پنڈال بھرا ہوا تھا۔ اس کے سائندے پہلے سے ہی وہاں موجود تھے سامنے ایک عام سی کرسی پر بائیں مارے دیہاتیوں کی سی پگڑی باندھے جس پر صوفیوں کی جھال لگی ہوئی تھی اور پگڑی کے اوپر مور پٹنگ لگا ہوا تھا۔ اس کی ایک آنکھ موندی ہوئی اور بڑی مونچھوں کے تلے بنی ہوا میں جھولتی ہوئی ڈانڈی تھی۔ پگڑی نظریں وہ ایک مرلے سا چوہا لگتا تھا۔ قہقروں کی روشنی میں اس کے چہرے پر چپچک کے داغ واضح ہو رہے تھے۔

موراد دھیرے دھیرے قدم اٹھاتے ہوئے اس کے سامنے گئی اور جا کر حسب روایت فرشی سلام کیا تو بوڑھے چوہے کی خاستری ڈانڈی نے بھی جھولتے ہوئے اسے خوش آمدید کہا۔

”باندی کا سلام قبول کیجیے۔“ موراد نے دل کھینچنے والی آواز سے کہا۔

”تو گویا تم موراد ہو۔ لگتا ہے چاند زمین پر اتر

آیا ہے۔“ رنجیت سنگھ نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔ موراد ایک چٹیل تھی۔ امر تر جیسے چھٹیل شہر کی جہانمیدہ طوائف۔ جو بندے کو دیکھتے ہی اس کی نیت جان جاتی تھی۔ وہ بھی چھوٹی سی بنی بنس دی۔

”چلو پھر آج ہم بھی نظارہ کرتے ہیں کہ موراد اپنی مستی میں کس طرح ناچتا ہے۔“ رنجیت سنگھ نے رکتے رکتے کہا۔ ”زہے نصیب۔“ موراد نے ایک بار پھر اسے فرشی سلام کیا اور پھر ناچ کے لیے اس کے قدم تھرکنے لگے۔

☆☆☆

”چاند پھر کب ہمارے آگن میں اترے گا؟“ رنجیت سنگھ نے قریب کے آخری روز موراد کو انعام و اکرام سے نوازتے ہوئے دھیرے سے پوچھا۔

”مہاراج اس چاند کو زوال نہیں ہے۔ یہ چاہے اشیوں کا بھی ہو، اسی طرح جگمگاتا اور چمکتا ہے جیسے پورے دنوں کا ہو کر روشنی نکھیرتا ہے۔“ موراد نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

”خوب ہے۔ رنجیت سنگھ کو کہتے ہیں وہی چیزیں پسند ہیں۔ ایک اتھری گھوڑی اور۔۔۔ دوسری اتھری رن (عورت) مجھے تمہارا جواب پسند آیا ہے۔“ رنجیت سنگھ نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”یہ میرا حسن ٹن ہے یا کچھ اور لگتا ہے، چاند کی روشنی اور چکا چوند چمیل میدان اور کھلی جگہ زیادہ چاندنی نکھیرتی ہے۔“ رنجیت سنگھ نے پوچھا۔

”یہ چاند اپنے محل میں اتار کر دیکھیے۔ آپ کے محل کی روشوں اور راہریوں کو بھی ایسے ہی اجال دے گا۔“ موراد نے تڑپتے ہوئے جواب دیا۔

”ہوں۔“ رنجیت سنگھ نے بات ایسے ختم کی جیسے وہ کچھ سوچنے لگا ہو اور موراد کو بھاری انعام و اکرام دے کر رخصت کر دیا۔ رنجیت سنگھ اگرچہ ان عیاشیوں میں پوری طرح ڈوبا ہوا تھا مگر وہ سلطنت کے کاموں سے بھی نظریں نہ چراتا تھا۔ وہ لکھنا پڑھنا نہ جانتا تھا لیکن کسی چیز کا حساب کتاب رکھنا پڑتا تو وہ نرم لکڑی (چوب) پر اسے ہی نشان ڈالتا جاتا تھا۔ وہ انگریزوں کا پکا دوست تھا۔ دانا اور زبردست حاکم بھی تھا جو اپنے افسروں اور ہالکاروں کو اچھی طرح قابو میں رکھتا تھا۔ رعایا بھی اس سے بہت خوش تھی۔ اس نے اپنے پاس بہت سی توپیں اور لشکر جرائع کر رکھا تھا جس کو فراموشی توئی افسروں نے سدھایا تھا اور فن حرب میں یکتا بنا دیا تھا۔ اس نے پنجاب میں ایک بڑی زبردست

سلطنت بنالی تھی اور شیر پنجاب کہلانے لگا تھا۔
انسانی سرشت ہمیشہ سے تصادات کا شکار رہی ہے۔
اگر ایک طرف رنجیت سنگھ بہترین حاکم اور ہر دھڑ پر حکمران
تھا تو دوسری طرف اس کی شخصیت میں بے پناہ خامیاں بھی
موجود تھیں۔ رنجیت سنگھ کے لاہور کے تخت پر بیٹھنے سے پہلے
پنجاب ایک ایسے خطے کا نام تھا جس کی حدود اور سرحدوں
کا تعین نہیں ہو سکا تھا۔ مگر رنجیت سنگھ نے جب اس کی باگ
ڈور سنبھالی تو اس نے پنجاب کی سرزمین کو متحد کیا اسے مضبوط
بنایا اور اس کے دفاع کے لیے ایک جدید طرز کی فوج قائم کی
اور پورے علاقے میں عدل و انصاف کی بنیادیں استوار
کیں مگر بعض تاریخ نگار اس سے اتفاق نہیں کرتے۔ ان
کے مطابق رنجیت سنگھ عیش دوست، حسن پرست تھا۔ اس
کے دور میں استعمال کی چیزیں اور عیاشی کے سامان کی
قیمتیں میں کوئی فرق نہ رکھا گیا تھا۔ یہاں تک کہ ایندھن،
اتاج، سبزیوں تک پر محصول طلب کیا جاتا تھا۔ اس کی
سلطنت میں جگہ جگہ سکیم ہاؤس بنائے گئے تھے جہاں
ہو پاروں کے ساتھ بڑا برسلوکیا کیا جاتا تھا ہر چیز پر کئی کئی
بار چسپائی دینی پڑتی تھی۔ کچلی بار خریداری پر، دوسری بار
دکان کے اوپر جا کے بیچنے پر، تیسری بار دکاندار خود اس چیز
پر محصول وصول کرتا۔ یہاں تک کہ رنجیت سنگھ کے دور میں
کپڑا بنانے والے جولاہوں پر بھی ٹیکس لگا رکھا تھا۔ یہ ٹیکس
دورو پہنے کی کھڑی اور ایک روپیہ فی تانہ بنانے پر لگا دیا گیا
تھا مگر رنجیت سنگھ ان تمام باتوں سے چشم پوش ہو کر اپنی
عیاشیوں میں ڈوبا ہوا تھا۔ اسے جب بھی امور سلطنت کی
دشواریوں سے ڈرافٹ لگتی، وہ اپنی عیاشیوں میں کمی نہ
آنے دیتا۔ اس کے دور میں عیش پرستی زوروں پر تھی۔ وہ
اپنے ارد گرد خوب صورت مردوں اور عورتوں کو دیکھنا پسند
کرتا تھا۔ ارباب نشاۃ کا ایک بڑا طائفہ یا عملہ اس کا دائمی
ملازم تھا اور ایک بہت بڑی رقم ماہوار اس غلے پر مہاراجا
صرف کرتا تھا۔ مہاراجا کچلیوں اور ان ملازم عورتوں کو کچلی
لباس پہناتا۔ ڈھال، گوار اور تیرکانے سے انہیں آرامتہ
کرتا اور اس پر اپنی کشتیوں کی خاطر انہیں آپس میں لڑنے کا
حکم دیتا۔ جب وہ لڑتیں تو ان کی حرکات و سکنات دیکھ کر
تالیاں بجاتا اور خوش ہوتا۔ جب یہ عورتیں اس طرح
سپاہیوں کا لباس پہنتیں تو انہیں مہاراجا کا ہاؤس گاڑ رکھا
جاتا۔ محل شہنشاہ اکبر... اور بہادر شاہ نے دہلی میں اپنے
برائے نام دور میں خوب صورت اور نوجوان لڑکوں کی ایک
اسی طرح کی پلٹن ”پچھیرا پلٹن“ رکھی ہوئی تھی۔ رنجیت سنگھ

نے اس پر یہ اضافہ کیا کہ عورتوں کو مردانہ لباس پہنایا اور
سپاہی بنایا وہ اپنے دوستوں سے کہا کرتا تھا کہ میرے ہاؤس
گاڑ سپاہی مجھے سمجھ کر کرتے ہیں۔ وہ لڑائی میں تو لڑنے کے
لیے نکلے نہیں لیکن ان کی آپس کی لڑائیاں میرا تاک میں دم
کردیتی ہیں۔ سارے پنجاب کا میں نے بندوبست کیا۔
اسے اپنی مرضی اور عوام کی فلاح کے قابل بنایا لیکن ہاؤس
گاڑ کا مجھ سے بندوبست نہ ہو سکا۔ میری ساری تدبیریں
ان کی شرارتوں کے آگے عاجز آ گئیں اور دوسرے ہاؤس
گاڑ ہمیشہ دھوکا دیتے ہیں۔ اس لیے بھی میں نے انہیں
اپنے ہمراہ نہیں رکھا بلکہ ان کی جگہ عورتیں ہاؤس گاڑ رہیں تو
مہاراجوں کی شان و شوکت بڑھتی ہے اور دوسرا ان سے کسی
قسم کا جان کو خطرہ نہیں رہتا۔
اسی طرح جب تاج گانے... کا جلسہ گرم ہوتا تو
رنجیت سنگھ بڑے شوق سے ان خوب صورت چتریوں کو اپنے
ہاتھوں سے شراب کے جام بنانا کرتا متر دیتا تھا۔ ایک
کا جام ختم ہوتا تو دوسرا جام اس کے آگے پیش کر کے وہ بہت
خوش ہوتا۔ خود بھی شراب پیتا۔ کہا جاتا ہے کہ وہ اس قدر تیز
شراب پینے کا عادی تھا کہ اگر بھی وہ شراب نہ پی سکتے
تھے۔ دلائی شراب ہوا اور کچلیاں ہوں جو اپنے کونھوں پر
دیکھی شراب ہی پی لیتی تھیں اور دلائی نت نئی شراب پینے کے
صرف خواب ہی دیکھتی تھیں، وہ مہاراجا کی ایسی محفل میں بی
جان سے شریک ہو کر اس قدر شراب پیتیں کہ صراحیاں چھوڑ
کر منکوں تک کو خالی کر دیتیں پھر جب نشہ زور کرتا تو آپس
میں لڑنا جھگڑنا شروع کر دیتیں۔ ایک کا ہاتھ ہوتا تو دوسری کی
چوٹی کھینچتا تھی ایک ایک دوسرے کے خوب کپڑے پھینچتے۔
غرض کہ ایک طرح کی مکروہات ہوتیں۔ مہاراجا ان کی
حرکات سے نہ صرف لطف اندوز ہوتا، تھپتھپے لگتا، تالیاں
بجاتا بلکہ انہیں اور لڑنے پر اکساتا۔ ان کی خوب کشتیاں
کرواتا۔ خوب دست و گریبان کرواتا اور ان پر روپیوں کی
پوچھاڑ کر دیتا جو کپڑے رات کو پھینچنے دن کو ان سے بہتر اور ہر
قسم کے نقیص کپڑے ان کے ہماروں کو مل جاتے۔ رنجیت سنگھ
کے یہ چونچلے خوب صورت اور جوان عورتوں کے لیے تھے تو
اس کے علاوہ اس کا دوسرا شوق خوب صورت اور اتھرے
گھوڑوں کا تھا۔ وہ صرف ایک گھوڑا حاصل کرنے کے لیے
قتل و غارت بھی کر سکتا تھا۔ رڈ یا رڈ کینگنگ نے رنجیت سنگھ کی
انہی حرکات کو دیکھتے ہوئے کہا تھا۔
”چار چیزیں ہر چیز پر غالب ہیں۔ عورت، گھوڑا،
اقتدار اور جنگ۔“

موران جب تھا تک کے ساتھ بھاری انعام و اکرام
لے کر امرتسر پہنچی تو اس کا پتہ یوں نے والہانہ استقبال کیا۔
خام تو اس کے آگے پیچھے بھی جانی جاتی تھی اور بار بار اس کی
ہلاکتیں لے رہی تھی۔ اس کی ساسی کچلیاں اس کے ارد گرد
جمع تھیں اور بازار حسن کی وہ طوائفیں جن کا موران سے
دہلی اور صاحب سلام بھی وہی آ کر اسے مہاراجا دے
رہی تھیں، جب ذرا فرصت ہوئی تو مشتری اس کے قریب
آ کر بیٹھتی۔
”کیسا رہا تیرا جلسہ۔ مہاراجا سے کوئی بات
ہوئی؟“ مشتری نے لگاؤ سے پوچھا۔
”اری مشتری! بس کیا بتاؤں۔ اتنا شاندار تھا جلسہ
اور مہاراجا کا کیا پوچھتی ہو۔ وہ تو بس مجھ پر لٹو ہوا جارہا تھا۔
مرداروں اور مہاراجوں کا کیا پوچھتی ہو، نوٹوں کی بارش...
بھادی تھی۔ اس طرح کدھن کا منہ بھی اس میں چھپ گیا۔
ہر کوئی تمہاری بہن کے حسن کی تعریف کرتے مزا جارہا تھا۔“
موران نے الفاظ کو خوب سنا سنا کر بیان کیا اور اس کے
اشتیاق کو اور ہوا دی۔
”اب کب جاؤ گی؟“ مشتری نے دوبارہ پوچھا۔
”بہت جلد وہ بھر جائیں گے۔“
”کوئی ایسا بندوبست نہیں ہو سکتا کہ میں بھی تمہاری
مہلت میں لاہور دیکھ آؤں۔ سچی بڑا دل کرتا ہے۔“
مشتری کی خواہش ڈرتے ڈرتے بھی زبان پر آئی تھی۔
”ارے ذرا میرے پاؤں تو جھنجھو۔“ موران نے
بنتے ہوئے کہا۔
”کیا کچھ ملا مہاراجا سے؟“ مشتری کا اشتیاق گویا
باتی تھا۔
”اتنا کچھ کہ تم سوچ بھی نہیں سکتیں۔“ موران نے بتایا۔
”میں نے تو خاتم سے بھی کہا تھا کہ اب موران کے
بعد وہ بھی میرے لیے کچھ کرے۔ اس نے ذمہ داری بھی
لی ہے مگر موران مجھے پتا ہے۔ وہ میرے لیے کچھ نہیں
کر پائے گی۔ حالانکہ وہ ہمیں شادی دربار میں پہنچانے کا
سارا صلہ اپنے کھانے میں ڈال رہی ہے۔“ مشتری نے
بتایا تو موران آگ دم بھڑک اٹھی۔
”اس بوڑھی محوس نے میرے لیے کیا کرنا تھا۔ یہ
تو میری شہرت تھی جو خوشبو کی طرح امرتسر سے لگی اور لاہور
تک پہنچ گئی۔ اس میں خاتم کا کوئی ہاتھ نہیں تھا، یقین کرو۔ وہ
محب جھوٹ کہتی ہے۔“ موران نے غصے میں بتایا۔
”گن مجھے بھی یہی تھا مگر میں خاموش رہی۔“ مشتری

بہترین تحریریں، لکچر، ڈراما اور
کئی داستانیں برائے ڈاکٹرز کے
مرکز شہ کا مطالعہ ضروری ہے

سرگزشت
ماہنامہ

شمارہ مارچ 2018ء
کی جھلکیاں

میل میز

ڈاکٹر ساجد امجد کی لا جواب تحریر
ایک سپر کاسل کی زندگی کے واقعات

تلاش

زوہا اعجاز کے شر بار قلم کا شہکار
ایک بڑی شاعرہ کی حالات زندگی

بلبل بنگال

انور فرہاد کی ایک دلچسپ تحریر،
پاکستان کی مشہور گلوکارہ کا احوال

مزار بیکسی

اس شاعر کا تذکرہ جو دہائی ہند
تھا سگرے بے بسی کی موت ملی

بجھتاوا

فضہ خان کی ایک ایسی
سچ بیانی جو برسوں یاد رہے گی

دھڑ

”شمال سے ٹورنٹو“ ندیم اقبال کا ایک دلچسپ
سفر نامہ۔ ”ناسور“ ایک ایپورنگ آپ بیتی اور بھی
بہت سے سچے واقعات، دلچسپ سچ بیانات

ایک والہانہ محبت کرنے والے کا اپنی محبوبہ کے لیے اصول تحفہ تھا!

☆☆☆

دھنکی کلاں کا گاؤں پاکستان اور ہندوستان بارڈر سے تین میل واکہ امرتسر کی طرف واقع ایک چھوٹی سی آبادی پر مشتمل ہے۔ یہ امرتسر ریلوے اسٹیشن سے تقریباً 35 کلومیٹر دور ہے۔ مہاراجا رنجیت سنگھ کی راستے سے گزر کر امرتسر میں داخل ہوا کرتا تھا۔ دھنکی کلاں میں عین بارڈر کے سرے پر مہاراجا جانے اپنے ٹھہرنے کے لیے ایک بارہ دری بنوائی ہوئی تھی۔ وہ جب لاہور سے زمینی راستے کے ذریعے امرتسر جاتا تو کچھ دیر کے لیے اس بارہ دری میں ٹھہر کر آرام کرتا تھا۔ اس کے لیے اس طرف روانہ ہوتا تھا۔

مغل شہنشاہ شاہ جہاں نے ایک نہر دریائے راوی سے نکال کر شالیمار باغ تک پانی پہنچانے کو نکالی تھی جو دھنکی کلاں اناری سے گزر کر بارگ تک پہنچتی تھی۔ یہ نہر اتنی زیادہ گہری نہ تھی۔ اس کا مقصد صرف پانی..... شالیمار باغ اور ٹھوڑا بہت قریبی زمینداروں کی زمینوں تک پہنچانا تھا۔ نہر چونکہ بارڈر پر تھی اس لیے اس پر آنے جانے کے لیے کسی پل وغیرہ کا انتظام نہ تھا کیونکہ اس زمانے میں زیادہ تر سفر گھوڑوں پر کیا جاتا تھا۔ لہذا امرتسر کو جانے والے گھوڑے نہر میں سے گزر کر جاتے تھے۔

رنجیت سنگھ بھی جب لاہور سے کسی سلطنتی امور کے لیے یا پھر زیارت کے لیے امرتسر جاتا تو یہی نہر عبور کر کے جاتا تھا۔ موران سے اب اس کے تعلقات محبت میں تبدیل ہو چکے تھے۔ مہکن پورہ گاؤں کے قریب دربار مہاراجا رنجیت سنگھ میں ناچنے کے لیے بلائی جانے والی موران اب رنجیت سنگھ کی سوچوں بلکہ اس کے خواب و خیال پر پورے طور پر قبضہ کر چکی تھی۔ یہ موران کی ذہانت تھی۔ ادا میں، حاضر خواہی یا پھر وہ اتھرا پن تھا جس کا رنجیت سنگھ دیوانہ ہو چکا تھا۔ امرتسر کے بازار حسن سے روزانہ لاہور کے دربار میں مہاراجا سے ملنے کے لیے آتا یا مہاراجا کالاہور سے امرتسر... جا کر موران سے ملتا جہاں دونوں کے لیے نامکن تھا، وہاں یہ دونوں کی رسوائی کا سبب بھی بن سکتا تھا۔ لہذا یہ رنجیت سنگھ کی تجویز تھی کہ جب وہ موران کو بلائے گا، اس بارہ دری میں جو کہ اناری سے امرتسر کی جانب تقریباً 500 گز کے فاصلے پر ہے۔ اس کی دائیں جانب ایک سڑک ہے جو اٹال گڑھ کو جاتی ہے۔ اٹال گڑھ سے آگے موڈی گاؤں ہے جہاں جا کر نہر کے کنارے یہ سڑک ختم ہو جاتی ہے۔

”یہ سچ ہے اور میرے دل کی آواز ہے۔“ رنجیت سنگھ بارہ بولا۔

”نوب صورتی، حسن، دل پذیر اور خوش شکل موران کی بہن بھی تعریف کی جائے وہ سچ ہے اور کم ہے۔“ رنجیت سنگھ نے ہنسنے ہوئے مزید کہا۔

”خوشو کی ذرہ نوازی ہے وگرنہ موران کہاں اور مہاراجا ذی وقار کہاں۔ کہاں آسان اور کہاں زمین کی خاک۔“ موران نے جواب دیا۔

”تو آئیے۔ قدم زرخیز فرما لیکن ایک بات کی چلتے چلتے اور اجازت دے دیجیے کہ جب بھی بندے کی طبیعت چاہے وہ آپ کو طلب کرے۔“ رنجیت سنگھ نے اسی انداز میں دوبارہ کہا موران جی جان سے خوش ہو گئی۔

”یہ میری خوش قسمتی اور بلند نصیبی ہوگی۔ آپ طلب فرمائیں اور بندی حاضر نہ ہو۔ اسے موت کیوں نہ آجائے۔ مرجائے ایسی موران جو آپ کی حکم عدولی کرے۔“ موران نے ادا سے جواب دیا۔ وہ باتیں کرتے کرتے پنڈال میں پہنچ گئے۔ رنجیت سنگھ اپنی نشست پر دوبارہ جلوہ افروز ہو گیا۔ رات گئے تک ناچنے والیوں کے ٹھکڑوں کی چھین چھین سنائی دیتی رہی۔ شرائم چلتی رہیں۔ وہ پتا نہیں رات کو کونسا پھر تھا جب موران کو ناچنے کی اجازت ملی۔

مختل میں خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ موران خراماں خراماں مورنی کی طرح چلتی ہوئی پنڈال میں پہنچی۔ اس نے حسب روایت پہلے مہاراجا کی خدمت میں سلام پیش کیا اور پھر ناچنا شروع کر دیا۔ ایک تورت بدلتے کا موسم، بہار آنے کی سوسنوی خوشبو۔ ہلکی ہلکی ٹھنکی نے موسم کو اور بھی دو اتھہ کر ڈالا تھا۔ پھر اوپر سے مہاراجا کی خصوصی توجہ حاصل کرنے کی خوشی میں موران مستی میں آئے مورنی طرح ایسا جھوم کر ناچی کہ اسے خود اپنی سمدھ بدھ نہ رہی۔ ادھر وہ ناچ رہی تھی اور ادھر رنجیت سنگھ اس پر سکون کی بارش کر رہا تھا۔ اس کی دیکھا دیکھی بسنت میلے میں شرکت کرنے والے دوسرے مہمان بھی مہاراجا کی خوشنودی حاصل کرنے اور توجہ اپنی طرف مبذول کروانے کے لیے ٹوٹ اور سکے لٹانے میں ایک سے آگے نکلنے کی کوششوں میں تھے۔ جیسے جیسے رات بھینکی جا رہی تھی، مختل کا حسن اور عروج بتدریج بڑھتا چلا جا رہا تھا پھر نہ جانے کب موران تھک کر بیچ کر گئی۔ رنجیت سنگھ بے ساختہ اٹھا اور اسے اپنے سینے سے لگالیا۔ یہ

اور ایک جگہ حکومتی سرپرستی میں باقاعدہ ناچ گانے کا انتظام کیا جاتا تھا جس میں لاہور کے حکومتی اہلکار، افسران، فوجی سپاہی اور راجے مہاراجے شریک ہوتے تھے۔

اس بار بھی اسی باغ میں ناچ گانے کا ایک وسیع پروگرام ترتیب دیا گیا تھا جس میں رنجیت سنگھ بہ نفس شرکت کر رہا تھا اور اس نے ملک بھر سے طوائفوں کو اس میلے میں شرکت کی دعوت دے رکھی تھی۔ امرتسر کے بازار حسن کی مشہور طوائفوں کو بھی بسنت میلے میں شرکت کے لیے باقاعدہ دعوت نامے بھجوائے گئے تھے۔ ان میں موران کو خصوصی طور پر بلوایا گیا تھا۔

موران بے حد خوش تھی کہ بہت جلد اسے دوبارہ مہاراجا سے ملاقات کا شرف حاصل ہو رہا ہے۔ اس کے ذہن میں مہاراجا کی پہلی ملاقات میں ہونے والی تمام خوشگوار یادیں اور باتیں دوبارہ سے گاننے لگی تھیں۔ اس کا جی چاہ رہا تھا کہ وہ اڑ کر لاہور پہنچ جائے۔ اس بار اسے از خود لاہور شالیمار باغ میں پہنچنے کا حکم ملا تھا۔ رنجیت سنگھ کے حاکم لاہور ہونے سے شالیمار باغ اس کا پسندیدہ تفریحی مقام بن گیا تھا۔ حکومتی اہلکاروں کے علاوہ یہاں دوسری ممتاز شخصیات بھی سیر و تفریح کے لیے آتی رہتی تھیں۔ رنجیت سنگھ تو اکثر جب لاہور شہر کی جس زدہ فضا سے تنگ آ جاتا تو یہاں آ جاتا تھا اب تو بسنت میلانے کے لیے خصوصی طور پر انتظام کیا گیا تھا۔ دلائی شرایوں کی صراحیاں منگوائی گئی تھیں۔ رات گئے جب موران شالیمار باغ پہنچی تو اس وقت باغ میں میلے کی تقریبات شروع ہو چکی تھیں۔ شراب پانی کی طرح بہائی جا رہی تھی۔ ملک کی اطراف و اکناف سے ناچنے گانے والیاں یہاں پہنچی ہوئی تھیں۔ رنجیت سنگھ اپنی مخصوص نشست پر بیٹھا ان کے گانوں اور ناچ سے محظوظ ہو رہا تھا اور کبھی جب انتہائی موڈ میں ہوتا تو تالیاں بجا کر ان کو داد دینے کے ساتھ شراب کا جام بنا کر دیتا۔ گویا یہ اس بات کی نشانی سمجھا جاتا تھا کہ مہاراجا کو اس کا ناچ گانا بہت پسند آیا ہے۔

جب موران شالیمار باغ میں پہنچی تو کسی باندی نے رنجیت سنگھ کو اس کی خبر دی۔ رنجیت سنگھ فوراً اپنی نشست سے اٹھا اور اداری تک موران کا استقبال کرنے پہنچ گیا۔

”زبے نصیب۔ آج پھر دیدار یار ہو گیا۔“ موران کو دیکھتے ہی ہنسنے لگا ہوا۔

”مہاراجا! کیوں شرمندہ کر رہے ہیں۔ اتنا نہ بنائیے کہ بندی اپنی اوقات ہی بھول جائے۔“ موران نے

نے جواب دیا۔

”ٹھیک ہے تم بھی بیٹیں ہو میں بھی ادھر ہی ہوں، چتا چل جائے گا کہ وہ تمہارے لیے کیا کارنامہ سرانجام دیتی ہے۔“ موران نے اسی انداز میں کہا تو مشتری اداس سی ہنسی پیش کر بولی۔

”مجھے پورا یقین ہے وہ کچھ نہیں کر پائے گی۔ بازار حسن میں آنے والے سپاہیوں اور دروغہ صاحبان سے واقفیت ہمارے بازار تک ہی محدود ہوتی ہے۔ وہ بھی اس وقت تک جب تک ہم ان کی مٹھی گرم کرتی رہیں۔ اب اگر ہم یہ کہیں اور دھوکا کریں کہ ہم پورے پنجاب کے صوبیداروں اور فوج کے افسروں سے کام نکلوا سکتے ہیں، جھوٹ ہی تو ہے۔ مجھے علم ہے، غلام ایسی ہانکا کرتی رہتی ہے۔“ مشتری نے اداسی سے کہا۔

”بہر حال تم رنجیدہ مت ہونا۔ مجھے ذرا مہاراجا کی قربت حاصل کر لینے دو، میں تمہیں بھی وہاں تک لے جاؤں گی۔ بس تم صرف دعا کرتی رہو۔“ موران نے جواب دیا تو وہ خاموشی سے اپنے کمرے میں چلی گئی۔

☆☆☆

بسنت کی تیاریاں اس وقت پورے ہندوستان میں بڑے زوروں پر تھیں۔ رنگ برنگ کی چٹائیاں اور کنکڑے بنانے کی اور ڈوریوں لگوانے، انہیں خریدنے میں لڑکے بالے پوری دھچپی لے رہے تھے۔ نوجوان لڑکیاں، عورتیں اور بوڑھیاں بسنتی رنگ کے ملبوسات تیار کر چکی تھیں۔ امرتسر میں بھی لوگ اس روز کو منانے کی تیاریاں مکمل کر چکے تھے مگر سب کی زبان پر یہی الفاظ تھے کہ اگر بسنت کا میلا دیکھنا ہو تو لاہور میں دیکھنا چاہیے۔

لاہور کے شہری شروع دن سے ہی ایسے میلے ٹھیلے منانے میں مشغول تھے۔ یہاں کے لوگ پورے جذبے اور پوری دل جمعی سے ایسے دن تیار ہونے میں اپنی مثال آپ تھے۔

اس بار بھی لاہور کے شہریوں نے بسنت منانے میں اپنا پورا جوش جذبہ لگا رکھا تھا۔ شالیمار باغ میں باقاعدہ حکومت کی سرپرستی میں میلے کا انتظام کیا جاتا تھا جس میں حکومتی اہلکاروں کے ساتھ ساتھ بھگتوں، ناچ اور پیش و طرب کا پورا سامان موجود ہوتا تھا۔ نوجوان لڑکے ڈھول تاشے بجا کر پٹنگوں کے پیچ لڑاتے ہلاکھا کرتے۔ اندر بنائی گئی دکانوں پر کھانے پینے کی ہر چیز مل جاتی تھی۔ لڑکیاں جھولے جھولتیں اور بسنت سے متعلق گیت گاتی پھرتی تھیں

مورال کے لیے یہ حکم تھا کہ وہ بلا دے پر اس بارہ دوری میں آ جایا کرے۔

پھر یہی ہونے لگا۔ رنجیت سنگھ جب بھی مورال کو بلاتا، وہ اس بارہ دوری میں کس طرح پہنچتی تھی، اس بارے میں کسی تاریخ میں کچھ نہیں لکھا۔ ہاں البتہ یہ ضرور ہے کہ مورال رنجیت سنگھ کے بلائے پر سر کے بل چل کر وہاں پہنچ جاتی۔ پھر محبت کے دودھ پلانے جی بھر کر راز و نیاز کرتے۔ مورال رنجیت سنگھ کے سامنے ناچا کرتی اور کچھ دیر گزرا کر وہ واپس امرتسر پہنچ جاتی۔ اب وہ جہاں عوام کی نظروں سے دور ہو کر ملاقاتیں کرتے، وہاں جگدگتی اہلکاروں کی نظروں سے بھی چھپ چھپ کر یہاں ملاقاتیں کرنے لگے تھے۔ مورال امرتسر سے آتی۔ اس نہر کو عبور کرتی۔ پانی کی روانی میں اپنے نازک اور سپید پاؤں دھو کر درمجبوب پر حاضری دینے آ جاتی اور رنجیت سنگھ کے سامنے مور کی طرح ناچتی۔ پیار محبت کی باتیں کرتی اور واپس چلی جاتی۔ اب دونوں کے راستے میں موسم کی سختیاں بھی حاصل نہ ہوتی تھیں۔ مہاراجا رنجیت سنگھ نے مورال کو چاندی کے جوتے بنوا کر دیے ہوئے تھے جنہیں پہن کر وہ عموماً پیدل نہر میں اتر کر اسے عبور کرتی تھی۔

گرمیوں کی تیز اور چھیتی دھوپیں ختم ہو چکی تھیں۔ سردیوں کی آندھی اور ٹھنڈا موسم اتر آ جاتا تھا۔ جب ایک روز مورال کو رنجیت سنگھ کا پیغام ملا اور وہ دھنوی کلاں کی بارہ دوری میں اس سے ملنے کے لیے امرتسر کے بازار حسن سے نکل کر نہر تک آ پہنچی تھی۔ وہ حسب معمول نہر کے اندر اپنے چاندی کے جوتوں سمیت قدم رکھ چکی تھی کہ پاؤں کے ایک تیز ریلے نے اس کے ایک پاؤں سے جوتی کو نکالا اور بہا کر دور لے گیا۔ پانی کی ٹھنڈک نے اس کے پاؤں کو بھی برف کر ڈالا۔ اس نے کچھ دیر تک جوتی کو ڈھونڈا مگر وہ اس کی پہنچ سے نکل کر دور چلی گئی تھی۔ چنانچہ وہ ایک پاؤں میں جوتی اور دوسرا رخ پانی سے سرد پاؤں نے کہ بارہ دوری تک تو پہنچ گئی جہاں رنجیت سنگھ پہلے سے ہی اس کا منتظر تھا۔

”کیا معاملہ ہوا۔“ نصیب و شتمناں طبیعت تو ٹھیک ہے اور یہ چہرے پر اس قدر ہوائیاں کیوں اڑ رہی ہیں۔ اتنا انتظار تو پہلے بھی نہیں کروایا تھا۔“ مہاراجا رنجیت سنگھ نے حیران ہوتے ہوئے پوچھا۔

”سب ٹھیک ہے۔ وہ ادھر آپ کی کم بخت نہر نے میرے ایک پاؤں کی جوتی کھائی جو مجھے اپنی جان سے زیادہ عزیز تھی۔ میرے محبوب کا تحفہ تھا وہ۔ میں اسے

ڈھونڈتی رہ گئی مگر وہ مجھے نہ مل سکی۔“ مورال نے اتراتے ہوئے جواب دیا۔

”بس اتنی سی بات تھی۔ ہم آپ کے لیے نیا جوتا بنوا دیں گے۔“ رنجیت سنگھ نے دلار سے جواب دیا۔

”بات یہ نہیں، مجھے لگ رہا ہے کہ میں اب واپس کس طرح جاؤں گی۔“ مورال بولی۔

”یہ انتظام بھی ہم کر دیں گے۔ آپ کی واپسی بھی ہماری ذمہ داری ہے۔ ہم اپنے کسی خادم کو کہیں گے، وہ تمہیں امرتسر پہنچا دے گا۔“ رنجیت سنگھ نے محبت سے کہا۔ ”آج کیا میری مورلی مجھے اپنا ناچ نہیں دکھائے گی؟“ رنجیت سنگھ نے دوبارہ سے پوچھا۔

”اوں ہوں۔ نہر کے رخ پانی سے گزرتے ہوئے میرے پاؤں ٹھل ہو چکے ہیں۔ بہت تکلیف میں ہوں۔ ایسے موسم اور اسٹے ٹھنڈے پانی سے میں پوری زندگی نہ گزرتی اگر آپ کی محبت کی زنجیر میرے پاؤں میں نہ بندھی ہوتی۔ آج میں محذرت خواہ ہوں۔ امید ہے سرکار کی طبیعت پر میرا یہ انکار گراں نہ گزرے گا۔“ مورال نے بڑے غمزے سے انکار کرتے ہوئے کہا۔

”ہوں۔“ رنجیت سنگھ نے گہرے فکر سے کہا اور پھر اپنے ایک گھڑ سوار خادم کو بلا کر حکم دیا۔ ”اسے امرتسر پہنچا دو۔ جہاں اس کا حکم ہو۔“

”ٹھیک ہے مہاراج!.....“ گھڑ سوار نے کہا اور مورال کو لے کر امرتسر روانہ ہو گیا۔ رنجیت سنگھ اسی وقت لاہور واپس آ گیا۔ اس نے آتے ہی اس جفت ساز کو حکم دیا جس نے مورال کے لیے پہلے جوتا بنایا تھا کہ اسی ساز کے دوبارہ چاندی کے جوتے بنادے اور دوسری طرف اس نے فوراً حکم دیا کہ دھنوی کلاں کی نہر جس کا پانی شاہیہاں باغ کو زندگی بخشتا ہے، اس کے اوپر فوراً پل تعمیر کر دیا جائے تاکہ امرتسر سے لاہور اور لاہور سے پیدل امرتسر آنے جانے والوں کے لیے آسانی پیدا ہو جائے۔

چنانچہ حکم کی تعمیل میں فوراً اس نہر پر پل تعمیر کر دیا گیا۔ یہاں کے رہنے والوں کو رنجیت سنگھ اور مورال کی ملاقاتوں کا تو علم ہو ہی ہو چکا تھا مگر وہ خاموش اس لیے تھے کہ معاملہ لاہور کے مہاراجا رنجیت سنگھ کا تھا۔ پل کیا تعمیر ہوا، دونوں اطراف کے لوگوں کو ایک سہولت مل گئی۔

ان دنوں ناچنے والیوں کی اتنی قدر نہ رہی تھی۔ مغل دور میں جوانی کی حدود میں داخل ہوتی ہوئی تہذیب اور تمدن اپنی آخری سانسوں پر تھا۔ اقتدار کے ختم ہوتے ہی

اقتدار نے بھی اپنا پانسہ بدل لیا تھا۔ نئی زبانوں کے اشتراک سے ایک نئی زبان نے جنم لینا شروع کر دیا۔ پنجابی زبان کے الفاظ سفر کرتے ہوئے نئی زبان سے باہم گلے ملنے لگے تھے۔ بازار حسن میں تہذیب سکھانے والی طوائفوں نے اپنے ہنر لپیٹ لیے تھے اور ان دنوں رقاصوں کی بھی اس قدر وقعت نہ رہی تھی۔ اب انہیں پنجابی پاتر یا نہیں کہا جاتا تھا بلکہ ان کی تہذیب اور تضحیک کے لیے انہیں کجری کہا جانے لگا تھا۔ جب مورال کی سہولت کے لیے اس پل کی تعمیر کی گئی تو اس پل کو کجری کہا جانے لگا اور یہ نام اس قدر مشہور ہوا کہ بہت جلد زبان زد عام ہو گیا۔ رنجیت سنگھ کی محبوبہ نے اس پل کو دیکھا اور پہلی بار اس سے اتر کر بارہ دوری میں داخل ہوئی تو اس کو پہلی بار رنجیت سنگھ کی چاہت کا یقین ہوا۔ اس ملاقات میں اس نے پہلی بار اپنے دل کی بات زبان پر لاتے ہوئے کہا۔

”مہاراج! ہم کب تک دنیا کی نظروں سے چھپ چھپ کر اس بارہ دوری میں ملنے رہیں گے؟ کیا اب بھی آپ کو مورال کی محبت کا یقین نہیں آیا؟“

”یہ تم سے کس نے کہا؟ ہم نے تو پہلے ہی ہی اپنا دل ہار دیا تھا۔“ رنجیت سنگھ نے آگے سے جواب دیا۔

”پھر اس قدر ٹھنڈی کیوں؟“ وہ مزید بولی۔

”مہاراج! تو اپنی محبتوں کو فوراً اپنے غلوں میں ڈال لیتے ہیں۔“ مورال نے یہ کہہ کر خاموش اختیار کر لی۔

”اوہ۔ تو یہ بات ہے۔ دراصل محبت کی لذت ہی اس قدر شدید تھی، چاہت کا مزہ ہی اتنا زیادہ تھا کہ کسی اور طرف ہمارا دھیان ہی نہ گیا تھا۔ ہم آج ہی تمہیں اپنے محل میں ڈالنے کو تیار ہیں۔“ پھر مہتاب کور اور راج کور (مائی نکلیں) کے بعد وہ تیسری عورت تھی جو مہاراجا رنجیت سنگھ نے اپنے محل میں داخل کر لی۔ مورال اپنے مذہب کو گلے لگے مہاراجا رنجیت سنگھ کے محل میں تو آ پہنچی تھی مگر یہ اس کی عالی ظرفی تھی کہ اس نے بھی مورال کو نہ تو مذہب تبدیل کرنے کو کہا اور نہ ہی اس کو دین پر عمل کرنے سے روکا۔ یہ 1802ء کی بات ہے، جب مورال رنجیت سنگھ کے حرم میں داخل ہوئی۔



مغل شہنشاہ جلال الدین محمد اکبر نے جب اس بات کو محسوس کیا کہ جب تک دوسرے مذہب کے لوگوں کو اپنا بیروکار نہیں بناؤں گا میری سلطنت کا قیام نہ ہوگا تو اس نے دل میں ٹھان لیا کہ مذہب اور قومیت سے قطع نظر ہندوستان

کی کل قومیتوں کو اور اس کے باشندوں کو اپنا کر ہی ملک میں استحکام اور ترقی ہو سکتی ہے۔ چنانچہ اس نے زیادہ تر ہندوؤں کی لڑکیوں کو اپنے حرم میں داخل کرنا شروع کر دیا کیونکہ ہندوؤں کی تعداد مسلمانوں سے بھی زیادہ تھی۔ شہنشاہ اکبر کے اس عمل سے ایک مخلوط قسم کی قومیت نے جنم لیا جس میں ہر مذہب کے مردوں اور عورتوں کو یہ محلی چھٹی مل گئی کہ وہ کسی دوسری قوم کے مردوں اور عورتوں سے بلا تفریق رنگ و نسل شادی کر سکتے ہیں اور سردار و مہاراجوں سے ماوراء عام لوگوں کو بھی اس امر کی محلی اجازت معاشرے نے خود ہی دے دی۔ یہ ایک نہ رکنے والا سلسلہ تھا جو دن بدن آگے بڑھتا رہا۔ سکھوں کے دور میں بھی یہ سلسلہ جاری رہا، اس لیے جب مورال کو رنجیت سنگھ نے اپنے حرم میں داخل کیا تو اس کے مذہب پر کوئی پابندی نہ لگائی اور نہ ہی اسے اپنا مذہب اختیار کرنے پر مجبور کیا۔ حرم میں داخل ہونے کے باوجود مورال کے لیے رنجیت سنگھ کے پیار میں کمی نہ آئی۔

انہی دنوں ایک روز مورال اور رنجیت سنگھ محل میں اپنے کمرے میں بیٹھے ایک دوسرے سے مذاق کر رہے تھے کہ اچانک مورال کو نہ جانے کیا سوچھی، وہ بڑے پیار سے بولی۔

”مہاراج! ایک بات پوچھوں۔ اگر آپ کی طبیعت پر گراں نہ گزرتے تو؟“

”پہلے ہم نے آپ کی کسی بات کا برا مانا ہے اور پھر یہ کوئی اہم بات ہے جس کی عقلی اجازت مانگی جا رہی ہے؟“ رنجیت سنگھ نے مسکراتے ہوئے جواب دیا اور پھر اس کے چہرے پر اپنی نظریں گاڑتے ہوئے خاموش ہو رہا۔ کچھ توقف کے بعد دوبارہ بولا۔

”کہو۔ چپ کیوں ہو گئی؟“

”مہاراج! بات بڑی اور منہ چھوٹا ہے۔ مجھے لگتا ہے آپ ناراض ہو جائیں گے۔“ مورال نے محبت بھرے لہجے میں کہا۔

”وعدہ جو کیا ہے۔ نہیں دل کو لگا لیں گے۔ آپ کچھ پوچھو تو سہی۔“ رنجیت سنگھ نے بھی اسی انداز میں اصرار کیا۔

”حضور یہ بتائیں کہ جب خدا خوب صورتی بانی رہا تھا تو..... اس وقت..... آپ کہاں تھے؟“ مورال نے رکتے رکتے کہا۔

”بس اتنی سی بات تھی جسے پہیلی بنایا جا رہا تھا۔ سیدھی سی بات ہے..... جس وقت خدا حسن بانی رہا تھا، اس وقت میں بادشاہت کی تلاش میں گیا ہوا تھا!“ یہ کہہ کر رنجیت سنگھ اور مورال دونوں ہلکھلا کر ہنس دیے۔

موران خوش تھی کہ وہ گناہ کی تاریکی سے نکل کر شاہی حرم میں آ پہنچی تھی۔ موران نے برسوں تک رنجیت سنگھ کی رفیقہ کی حیثیت سے زندگی گزاری۔ اکثر مورچین موران کو رنجیت سنگھ کی بیوی کہتے ہیں جبکہ کچھ اسے مصاحب کی حیثیت دیتے ہیں۔ کچھ بھی ہو، جب سے موران رنجیت سنگھ کے حرم میں داخل ہوئی تھی وہ اس سے بے پناہ محبت کرنے لگے تھے۔ رنجیت سنگھ کے متعلق جو کہا جاتا تھا کہ اسے اتھری گھوڑی اور اتھری رن (عورت) پسند ہے۔ وہ سچ ثابت ہو رہی تھی۔ رنجیت سنگھ کو موران کا چاہلا بہن اور اتھرے انداز بے حد پسند تھے۔ دھنوی کلاں پر تعمیر کیا گیا ”پلنگھری“ اس بات کی واضح دلیل تھا کہ رنجیت سنگھ موران سے کس قدر پیار کرتا تھا۔ یہ نشانی اس وقت کی تھی جب موران رنجیت سنگھ کے حرم میں داخل نہیں ہوئی تھی۔ حرم میں داخل ہونے کے بعد ایک روز اس نے اپنے نکال میں یہ حکم جاری کر دیا کہ موران کے نام کا سکہ جاری کیا جائے۔ اس کے حکم کی فوری تعمیل کی گئی اور ایسٹ انڈیا کمپنی کا ہندوستان میں جاری کیا سکہ جس پر ملکہ وکٹوریہ کی شبیہ بنی ہوئی تھی، اسی طرح ایک نیا سکہ جاری کیا گیا جس پر ملکہ وکٹوریہ کی شبیہ کی جگہ مور کی شبیہ نقش کروائی گئی کیونکہ پنجابی زبان میں لفظ مور کی جمع موران ہوتی ہے۔ یہ تاریخ میں خاص طور پر ہندوستانی تاریخ میں پہلی بار ہوا تھا کہ کسی عورت کے نام کا سکہ جاری کیا گیا ہو۔ موران پردہ نہیں کرتی تھی اور اکثر مہاراجا کے ساتھ رہتی تھی۔ اب وہ کھل کر ریاست کے نہ صرف کاموں میں حصہ لینے لگی تھی بلکہ عوامی فلاح و بہبود کے کاموں کو از خود ترتیب دینے لگی تھی۔

کسی دوسرے مذہب کی عورت کو اپنے حرم میں داخل کرنے اور اسے اس قدر اہمیت دینے پر سکہ قوم کے ماتھے پر اپنے آپ تیوریاں بن گئی تھیں۔ یہی وجہ ہے کہ جب ایک بار امرتسر میں رنجیت سنگھ جیسے داسری اکال تخت صاحب کے سامنے گیا تو وہاں اس سے یہی سوال کیا گیا۔ تب رنجیت سنگھ نے برملا موران کی محبت کا اعتراف کیا۔

جب موران کی حیثیت تسلیم کر لی گئی تو تاریخ اور آرٹ کی بہتری کے لیے دانشوروں نے فیصلہ کیا کہ چونکہ کھنری کا لفظ تشکیک کا باعث ہے اور تاریخ میں جب اس کا بار بار ذکر ہوگا تو ایک مہاراجے کی تذلیل کا موجب ٹھہرے

گا اس لیے امرتسر کے اسکول پیرین ڈالے کی پرنسپل سنوین کو سندھو نے پہلی بار یہ ہم چلائی کہ ”پلنگھری“ کا نام تبدیل کیا جائے۔ بڑی روکد کے بعد نہ صرف امرتسر کی انتظامیہ بلکہ پاکستانی حکام نے بھی سنوین کو سندھو کی تجویز پر عملدرآمد کرتے ہوئے اسے ”پلنگھری“ سے ”پل موران“ میں تبدیل کر دیا۔ تب سے یہ پل موران کے نام سے مشہور ہے۔ شہرت تو موران کے سکے کی بھی ہوئی تھی۔ آج بھی اگر کسی پرانے اور اس دور کے کسی بوڑھے سے پوچھ لیں، وہ آج بھی اس دور کے روپے کو مہراں ہی کہہ کر بلا لیں گے۔ مہراں دو معنی لفظ ہے جس کا ایک مطلب تو مہر کے لیے جاتا ہے یعنی حکومت وقت سے تصدیق شدہ مہر لگا ہوا اور دوسرے معنی موران کے لیے جاتے ہیں یعنی موران کے اعزاز میں جاری کیا گیا سکہ۔ جب ہندوستان کی تقسیم ہوئی اور پاکستان معرض وجود میں آیا تو سرحدی علاقہ ہونے کی حیثیت سے 1965ء میں ہونی جنگ کے دوران پل موران پاکستانی افواج کے قبضے میں تھا مگر 1971ء کی دوسری پاک بھارت جنگ میں یہ پل سکھر رجمنٹ کے قبضے میں چلا گیا۔ ایک تعزیتی ریفرفنس کے ذریعے دونوں اطراف کی حکومتوں نے اس پل کی تاریخی حیثیت کو تسلیم کرتے ہوئے یہاں ایک یادگار بنائی جو دت کی یورش میں آ کر برباد ہو گئی۔ اسے دوبارہ مشرقی آف ٹورازم ہندوستان نے پنجاب گورنمنٹ کی تحویل میں دے کر اس کی تزئین و آرائش بحال کروائی۔ اس پل کے نزدیک ایک چھوٹی سی مسجد یا مندر بھی موجود ہے جسے از سر نو تعمیر کر کے یا حوں کے لیے کھول دیا گیا ہے۔ یہ بارہ دری تین مختلف حصوں میں تقسیم ہے۔ بارہ دری کے نزدیک شیومندر تعمیر ہے جو پل موران کی دائیں جانب ٹانگ شاہی اینٹوں سے بنایا گیا ہے جس کی دیواروں اور چھت کو جھلملاتے اور جھیلے پتھروں سے سجایا گیا تھا اب جس کی چمک وقت کے ساتھ ساتھ ماند پڑنے لگی ہے۔

اس مندر کے قریب ہی پانی جمع کرنے کے تالاب ہیں۔ اس میں رنجیت سنگھ کے زمانے میں قریبی نہر سے پانی لا کر بھرا جاتا تھا۔ یہ تالاب دو حصوں پر محیط ہے۔ ایک کھلا ہوا حصہ مردوں کے نہانے کے لیے ہے اور دوسرا ڈھانچا ہوا حصہ خواتین کے لیے ہے۔ اسی تالاب میں ایک سنگی جگہ بھی موجود ہے جو جانوروں کے پانی پینے کے لیے رکھی گئی ہے۔ ان سے ہٹ کر بارہ دری ہے۔ وہی مشہور زمانہ بارہ دری

جس میں دو محبت کرنے والے ملاقات کے لیے آیا کرتے تھے۔ اس کے چہار اطراف بارہ دروازے تھے جو اب وقت کی گردش اور اس بارہ دری کی طرف توجہ نہ دینے کی وجہ سے ٹوٹ پھوٹ چکے ہیں مگر آج تک اپنی حیثیت برقرار رکھے ہوئے ہیں۔

☆☆☆

محبت اور دھوکا دو ایسے ستون ہیں جن پر پوری دنیا کی تاریخ اپنی عمارت کے لیے کھڑی ہے۔ ہندوستانی تاریخ کو کسی دور سے بھی اٹھا کر دیکھ لیں، انہی دو الفاظ پر یہاں کی تاریخ محیط ہے۔ رنجیت سنگھ کی حکومت بنانے اور اسے پایہ تکمیل تک لے جانے میں بھی یہی دو عمل کا فرما رہے ہیں۔ رنجیت سنگھ اپنے والد کے مرنے کے بعد دس سال کی عمر میں اپنی مہل کا سردار بنا تو اس میں اس کی والدہ راج کور کا بھی بہت بڑا ہاتھ تھا۔ وہ ایک ذہین اور دور اندیش عورت تھی اور انتظامی امور میں بھی بہت ادراک رکھتی تھی۔ بالکل اسی طرح اس کی ساس سدا کور بھی بڑی معاملہ فہم اور بہادر عورت تھی۔ وہ رنجیت سنگھ کے سردار بننے سے لے کر آخر تک اس کے حکومتی معاملات میں اس کا ساتھ دیتی رہی۔ رنجیت سنگھ بھی ہر معاملے میں جب تک سدا کور کا مشورہ نہ لے لیتا تو کوئی اگلا قدم نہیں اٹھاتا تھا۔ سدا کور کو ہمیشہ ایک ہی دھڑکا رہا کہ اس کی بیٹی مہتاب کو اپنے بطن سے رنجیت سنگھ کے لیے کوئی بیٹا کیوں نہیں پیدا کر سکتی۔

جب رنجیت کی دوسری بیوی راج کور (مائی نکینن) کے ہاں بیٹا پیدا ہوا اور رنجیت سنگھ نے اس کی پیدائش پر نہ صرف بہت بڑا جشن منایا بلکہ تین سال کی عمر میں اس کی منگنی کر کے اسے اپنا جانشین بھی بنادیا تو سدا کور کے دل میں حسد پیدا ہو گیا۔ وہ اپنے اندر ہی اندر تھماتی رہتی تھی کہ مہتاب کو کیوں جانشین پیدا نہ کر سکی۔ اس کے اندر چلنے والا حسد اسے رنجیت سنگھ کی سادگی اور اعتماد کو دھوکا دینے کے منصوبے بنانے لگا۔ انہی وہی کسی نتیجے پر پہنچ چکی تھی کہ رنجیت سنگھ ایک اور پری ویش اور دربار مسلمان رقاہہ موران کو اپنے حرم میں ڈالنے کے منصوبے بنانے لگا اور پھر بہت جلد وہ اسے اپنے محل کی زینت بنانے میں کامیاب بھی ہو گیا۔ یہ دیکھ کر اس کے جلانے میں اور بھی اضافہ ہو گیا کہ اگر اس کے بطن سے بھی کوئی کھڑک سنگھ پیدا ہو گیا تو وہ بھی راج سنگھان کا حصہ دار بن جائے گا۔ لہذا اسے جلد از جلد اس کا کوئی تدارک کرنا ہوگا۔ اس وقت تک رنجیت سنگھ لوگوں اور اپنے رشتے داروں کی باتیں سن کر رنج ہو چکا تھا کہ اس

کی والدہ راج کور اور لکھ پتی رائے کے آپس میں ناجائز تعلقات ہیں۔ اس معاملے کو رنجیت سنگھ نے برسرِ اقتدار آتے ہی سمجھ لیا تھا۔ لکھ پتی رائے کو کھال کی وصولی کے دوران کسی نہ کسی کر دیا۔ قاتل گرفتار نہ ہو سکے البتہ یہ انواہیں ضرور گردش کرنے لگیں کہ اسے مردانے میں رنجیت سنگھ کا ہاتھ ہے۔ اس قتل کی بازگشت باقی تھی کہ رنجیت سنگھ نے اپنی والدہ راج کور کو کبھی زبردستی کر دیا یا۔ اب سدا کور کے لیے بھی راستہ صاف ہو چکا تھا۔ کیونکہ رنجیت سنگھ کو کسی ایسے باوقاسی کی ضرورت تھی جو اس کے معاملات میں اس کی مدد کر سکے۔ سدا کور نے بے احسن و خونی ان معاملات کو اپنے ہاتھ میں لیا اور ہمہ وقت رنجیت سنگھ کو بہتر سے بہتر مشوروں سے نہ صرف نوازی رہی بلکہ اکثر مہمات میں رنجیت سنگھ کے شانہ بشانہ کھڑی رہی۔

لیکن اس کا کیا عمل تھا کہ جتنا رنجیت سنگھ سدا کور پر اعتماد کرتا تھا اور اس کے ہر مشورے کو قبول کرتا، یہاں تک کہ جب اس نے اپنی سلطنت کی راج دھانی لاہور محل کی تب بھی وہ سدا کور سے مشورہ کرنے بٹالہ تک سفر کرتا تھا لیکن اس کی بیٹی اور رنجیت سنگھ کی بیٹی بیوی مہتاب کور کو شروع دن سے ہی رنجیت سنگھ سے نفرت تھی۔ دونوں ماں بیٹی کے اپنے اپنے دکھ تھے۔ سدا کور کے دکھ میں کھڑک سنگھ کی پیدائش اور اوپر سے موران سے رنجیت سنگھ کی مصاحبت نے اور بھی اضافہ کر ڈالا تھا۔ پھر اچانک اس کے ذہن میں ایک منصوبہ آیا۔ اس منصوبے پر وہ جی جان سے عمل کر کے اسے پایہ تکمیل تک پہنچانا چاہتی تھی تاکہ وارثان حکومت کے بڑھنے سے پہلے اس کا تدارک کر سکے۔ 1807ء میں جب رنجیت سنگھ کی طرف مہم کے لیے گیا ہوا تھا تو دونوں ماں بیٹی کے لیے یہ وقت انتہائی اہم اور شاندار تھا۔ سدا کور جانتی تھی کہ مہتاب کور جب تک ماں نہ بنی رنجیت سنگھ کے دل میں بھی اپنی جگہ نہ بنائے گی اور وہ صرف مہتاب کور ہی کے ذریعے اپنے داماد پر اپنے اختیارات کو بڑھا سکتی تھی۔ اب اس کے سوچے ہوئے علاقے میں یہ افواہ پھیلا دی کہ مہاراجا کی بیوی مہتاب کور حاملہ ہو گئی ہے۔ اسے اس بات کا قوی یقین تھا کہ جب تک رنجیت سنگھ اپنی اس مہم سے واپس چلے گا، اس وقت تک بچے کی پیدائش کا وقت پورا ہو چکا ہوگا۔ ہوا بھی وہی۔ جب کچھ وقت گزر گیا تو سدا کور نے انتہائی خوشی کے ساتھ اعلان کیا کہ رنجیت سنگھ کی پہلی بیوی مہتاب کور نے بڑواں

بچوں کو ختم دیا ہے۔ مہاراجا کی عدم موجودگی اس کی ساس کے منصوبوں کے لیے بہتر ثابت ہوئی۔ جس رات عوام میں یہ اعلان کیا گیا کہ رانی مہتاب کو رنے جڑوں بچوں کو ختم دیا ہے، اس سے ایک روز بیشتر دونوں بچوں کو ان کے والدین سے خرید اگیا تھا۔ سدا کو رنے ان بچوں کو رانی مہتاب کو رکی گود میں ڈالتے ہی ان کے نام بھی تجویز کر دیے تھے۔ شیر سنگھ کو صلح ہوشیار پور میں ایک جولاء سے خرید اگیا تھا جو ایک جاگیر دار کی حیثیت سے مانی سدا کو رکا ملازم تھا اور دوسرے بچے تارا سنگھ کو سدا کو رنے ایک مسلمان کنیز مانگی کی بیٹی سے خریدا تھا۔

ان دونوں بچوں کی ماؤں اور خاندان کو بہترین نوازشات اور انعام و اکرام سے نوازا گیا تھا تا کہ ان کے منہ ہمیشہ کے لیے بند رہیں۔ سدا کو ر کو معلوم تھا کہ رنجیت سنگھ باپ بن جانے کے تصور کو پسند کرتا ہے لہذا اس نے بھی ان کو بطور اولاد قبول کر لیا اور اپنی پوری زندگی ان کے ساتھ حقیقی اولاد کا سلسلوں کیا۔

شیر سنگھ کی نانی اور رنجیت سنگھ کی ساس سدا کو ر ایک غیر معمولی ذہانت کی مالک عورت تھی۔ وہ رنجیت سنگھ کی طاقت کا سرمایہ اور اس مہاراجا کے لیے ایک ایسی بیڑی تھی جس کی مدد سے وہ عظمت کی چوٹی پر پہنچنے کے قابل ہو سکا تھا۔ وہ اس کی کوششوں میں اس کی ساعی تھی اور اس کی توانائی، سازشوں اور اثر رسوخ کے باعث اپنے ابتدائی کارناموں میں کامیابی حاصل کر پایا تھا۔ وہ ایک بہادر، طاقتور حیز مزاج کی عورت تھی جس نے ایک منصوبے کے تحت اپنے داماد کے اعتماد کو دھوکا دیا مگر اپنی بیٹی کا اپنے داماد کی نظروں میں مقام ضرور بحال کر دیا۔ یوں ایک طرف دھوکا تھا، فریب، خود غرضی اور مکارانہ منصوبوں کی تکمیل کے ارادے تھے تو دوسری طرف محبت تھی۔ صرف محبت جس میں نہ تو کوئی فریب تھا، نہ دھوکا تھا۔ مورال اور رنجیت سنگھ کی یہ محبت اپنے مصمم ارادوں سے پر دان چڑھتی جا رہی تھی۔

بھتوں بھرے ایسے ہی ایک دن مورال نے رنجیت سنگھ کے پیارے معمول رکھوں میں پوچھا۔

”مہاراج! آپ کی یہ کنیز ایک اور بات کی اجازت چاہتی ہے۔“

”مورال! تم کنیز نہیں ہو۔ میرے دل کی رانی ہو۔ سکھ اپنا وطن دے کر بھی اس سے منہ نہیں موڑا کرتے۔“ رنجیت سنگھ نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”مہاراج! جس طرح آپ کے امیروں اور وزیروں کو اس بات کی اجازت ہے کہ وہ اپنے فلاحی اور عوام کے لیے بنائے منصوبوں کی انگوٹھیں کراتے ہیں، بندی کو بھی اس کی اجازت مرحمت فرمادی جائے کہ وہ بھی اپنے من میں سوچے منصوبوں کو مکمل کروا سکے۔“ مورال نے رکتے رکتے اپنی بات پوری کی۔

”یہ تو کوئی بات نہیں۔ تمہیں اس کا مکمل اختیار ہے بلکہ میں آج ہی یہ احکام جاری کر دیتا ہوں۔“ رنجیت سنگھ نے پیارے جواب دیا۔

”میں یہاں ایک بارغ بنوانا چاہتی ہوں۔ موری دروازے کے سامنے۔“ مورال نے بتایا۔

”ٹھیک ہے۔ تم جگہ پسند کرو۔ موری دروازے کے اندر کی جگہ خالی ہے۔ وہاں بارغ بنوا سکتی ہو۔“ رنجیت سنگھ نے کہا۔ ”تم تو یہی سوچ رہی ہو۔ لاہور سے شریچور جانے والی سڑک سے ذرا اتر کر ایک جگہ خالی ہے۔ میں وہاں تمہارے نام سے گاؤں بسانے کا ارادہ کر چکا ہوں اور میرے اس منصوبے پر کام بھی جاری ہے۔“ رنجیت سنگھ نے توقف کے بعد اپنی بات کو آگے بڑھایا۔ ”وہ تمہارے نام پر مورال والا گاؤں کہلائے گا۔“

”میں کسی زبان سے آپ کی محبت کا اعتراف کروں۔ آپ واقعی عظیم ہیں۔“ مورال نے کمال تشکر آمیز لہجے میں کہا اور اپنا سر رنجیت سنگھ کی چھاتی سے لگا دیا۔

☆☆☆

انسانی زندگی وقت کے بحرِ خاں میں ایک کشتی کے مانند ہوتی ہے جو خراماں خراماں چلتے چلتے لہجرات کی لہریں چھیلتے ہوئے اپنے اتم ساحل کی طرف بڑھتی رہتی ہے اور جو بھی وقت آتا ہے، وہ کنارے سے لگ جاتی ہے۔ اس سفر میں آنے والے اٹھریں اور اونچی نیچی لہریں رکاوٹیں بھی پیدا کریں تو منزل کی طرف جانے والے راستے خود بخود دینے پڑتے رہتے ہیں۔ قدرت جہاں منزل تک پہنچنے کا راستہ استوار کرتی ہے، وہاں وہ منزل سے بھٹکا بھی دیتی ہے۔ بہر حال یہ بات طے شدہ ہے کہ انسان پر ایک وقت ایسا بھی آتا ہے جب وہ گناہوں کی دلدل سے نکل کر مذہب کی طرف راغب ہو جاتا ہے۔ یہی اس کی فلاح کا راستہ ٹھہرتا ہے۔

مورال رنجیت سنگھ کے حرم میں کیا اتری، گویا اس کے ذہن نے تسلیم کر لیا تھا کہ اب اس سے آگے بڑھنا اس کے نصیب میں نہیں ہے۔ وہ گناہوں کی دلدل میں بہت دیر تک ساتھ پاؤں مار رہی مگر اسے کہیں بھی ذہنی سکون نہ مل

پایا تھا۔ اب اسے ایک بے پناہ پیار کرنے والے انسان کی اہمائی کیا ملی، اس نے اپنے ذہن کی ساری گندگیوں سے ہمارا حاصل کرنے کا سوچا اور اپنا رجحان دینی، فلاحی کاموں کی طرف لگایا۔ جب سے اس بات کی آزادی ملی تھی کہ وہ جو چاہے منصوبہ بنا کر اس پر عملدرآمد کر سکتی ہے، رنجیت سنگھ نے بھی اس کے ان کاموں کو نہ صرف سراہا تھا بلکہ تمام حکومتی مشینری کو احکامات جاری کر دیے تھے کہ جو مورال کہے، اس پر من و عن عملدرآمد ہونا چاہیے۔ ہوا بھی یہی۔ اس نے جس چیز کی بھی خواہش کی، وہ فوراً اسے میسر کر دی گئی۔ مورال اب نری طوائف ہی نہیں تھی جو امرِ ترس کے بازارِ حسن کی جان بھی بلکہ رنجیت سنگھ کے دل کی ملکہ بھی اور اسے مورال سرکار کا لقب مل چکا تھا۔ اس کے لیے پل مورال بنایا گیا۔ اس کے نام پر مورال والا گاؤں بسایا گیا اور اسی کے نام کا سکڑ ڈھالا گیا جسے ان پڑھ اور عام لوگ موہراں کا سکھ کہتے تھے۔ یہ سارے اعزازات صرف ایک ہی عورت کو ملے تھے جسے تاریخ مورال کے نام سے جانتی اور پہچانتی تھی۔

ان دنوں نہ جانے مورال کے دل میں کیا پایا کہ اس نے شاہِ عالمی اور لوہاری دروازے کے درمیانی بازار میں ایک خالی جگہ دیکھ کر وہاں مسجد بنوانے کا سوچا۔ اس کا ذکر اس نے رنجیت سنگھ سے کیا تو اس نے نہ صرف اس کے ارادوں کو پسند کیا بلکہ وہ بولا۔

”مورال! سرکار! تم نے مسجد کا سوچا۔ یہ بہت ہی اچھا منصوبہ ہے مگر میرے کہنے سے اس میں تھوڑا اضافہ اور کرلو۔“

”کیا مطلب؟“ مورال نے حیران ہو کر پوچھا۔

”مطلب یہ کہ جہاں مسجد میں تمہارے دین اور مذہب کی عبادت کرنے والے لوگوں کا اجتماع ہوگا اور وہ تمہاری بخشش کی دعا کریں گے، وہاں اس علاقے میں رہنے والے لوگوں کا تم پر اور بھی حق بنتا ہے۔“ مہاراجا بات کرتے کرتے رکا۔

”وہ کیا؟ میں ان ہی کے لیے تو مسجد بنوا رہی ہوں؟“ مورال نے کچھ سوچ کر جواب دیا۔

”جیسا کہ لیکن اگر اس مسجد کے ساتھ بچوں کو دینی تعلیم دینے کا مدرسہ بھی بن جائے تو سونے پر سہاگا ہوگا۔“ رنجیت سنگھ نے کہا۔

”مہاراج! آپ کا دل تمام مذاہب کے لیے کس قدر وسیع اور فراخ ہے میں یہ سوچ بھی نہ سکتی تھی۔“ مورال

نے تشکر آمیز لہجے میں کہا۔

”مورال! سرکار! دنیا کے تمام مذاہب گروؤں کے بنائے ہوئے ہیں اور ہمارے مہان گروؤں تک کا کہنا ہے کہ سارے مذہبوں کا احترام کرو۔ رنجیت سنگھ مذاہب کے ساتھ ساتھ ان تمام ملا کی بھی قدر کرتا ہے جو اپنے اپنے دین کی تبلیغ کرتے ہیں۔ میں جانتا ہوں کہ مجھ سے پہلے یہاں حکمرانی کرنے والے سکھوں نے مسلمانوں پر کس قدر مظالم ڈھائے تھے۔ اکثر مساجد، مزارات اور عبادت گاہوں کو تباہ و برباد کیا گیا۔ مسلم بادشاہوں، امراء اور بزرگان دین کے مقابر سے سنگ مرمر اور سرخ پتھر تک اکھاڑ لیے گئے مگر اب یہ نہیں ہوگا۔ میں نے برسرِ اقتدار آتے ہی سب سے پہلے مساجد، بزرگان دین کے مقابر پر سلامتی دی۔ میں نے مولوی غلام حسین چشتی، نور احمد چشتی، لال مسجد کے خلیفہ غلام رسول، مولوی جان محمد اور میاں وڈا کے مدرسوں میں جہاں درس و تدریس کا کام ہوتا ہے، میری نظروں میں وہ جہیں قائل قدر اور قابل احترام ہیں۔ اس لیے میری خواہش ہے کہ میری سرکار جو مسجد تعمیر کرنا چاہتی ہے، اس کے ساتھ بچوں کو دینی تعلیم دینے والا مدرسہ بھی لازمی ہونا چاہیے۔“ رنجیت سنگھ نے تفصیل سے مورال کے ذہن اور اس کی سوچوں میں اضافہ کیا۔

”مہاراج! میں اس بارے میں سوائے مومنیت کے اور کیا کر سکتی ہوں۔ اگر آپ میرے ان منصوبوں کو پا پزیر نہیں ہوئے، تو میں مدد کرتے ہیں تو اس کی جزا میرا آپ کو دے گا۔“ مورال کی آنکھوں کے گوشے جھپک جھپک تھے۔

”تم ابتدا تو کرو۔ کیا ہوا اگر رنجیت سنگھ تمہارے مذہب سے نہیں ہے مگر اس کے ذہن میں تمہارے مذہب کا اتنا ہی احترام ہے جتنا شاید تمہارے اپنے ذہن میں بھی نہ ہو۔“ رنجیت سنگھ نے مورال کی آنکھوں سے اترتے آنسوؤں کو اپنی انگلی کی پوروں پر سنبھالتے ہوئے جواب دیا۔

پھر بہت جلد اس علاقے میں ایک خوب صورت مسجد اور ایک مدرسہ تعمیر ہو گیا۔ صاحبانِ فہم و ادراک حکام بالائے اس کو بھی مانی مورال کی مسجد کا نام دے دیا۔ مانی مورال کے دورِ اقتدار کی یہ تمام نشانیاں آج بھی قائم و دائم ہیں۔

☆☆☆

ستر سال کی عمر میں بھی رنجیت سنگھ کی ساس سدا کو ر کی ریشہ دو دنیاں ختم نہیں ہوئی تھیں۔ اس کے دل میں چھپا ہوا بغض اور حسد ابھی تک زندہ تھا۔ مہاراجا رنجیت سنگھ ابھی اپنی بیماری سے پوری طرح صحت یاب نہ ہوا تھا کہ کئی سال سے

اس نے نیوی بلو سکرٹ اور سفید بلاؤز پہن رکھا تھا۔ بلاؤز کے اوپری ٹین کٹے ہوئے تھے۔ ایسی تصاویر پائیس کی دہائی میں ناولوں اور میگزین کے سرورق پر شائع ہوا کرتی تھیں تاکہ پڑھنے والے ان میں کشش محسوس کریں۔ یہ بات اور بھی کہ ان... کامیگزین یا ناول کے مواد سے کوئی تعلق نہیں ہوتا تھا۔ رچرڈ بھی بچپن میں یہ ناول اور رسالے بڑے شوق سے پڑھا کرتا تھا۔ لیکن وہ کوئی ایسی عورت نہیں تھی جو سرورق کے لیے تصویریں بنواتی اور نہ ہی کوئی مقتدر عورت یا خاتون حکمران جس کا علم ماننے پر مرد مجبور ہو جائیں بلکہ وہ ایک نوجوان

محبت کی چاشنی میں لپٹی دھوکا دہی کی تخیلوں کا قصہ

وقت اور مستقبل کو پوشیدہ رکھ کر اللہ نے انسان پر احسان فرمایا ہے۔ اگر ان کا پہلے سے علم ہو جاتا تو وہ یہ بستی پھر کہاں سے آتی جو طاقتوں مکار اور مجرموں کے حصے میں بھی اکٹرا جاتی ہے۔ جیسے کہ اس نے ایک چھوٹی سی چوری کر کے شاید اپنی پوشیاری کا جشن بھی منایا ہوگا مگر اسے احساس تک نہ ہو سکا کہ محض بھروسے کی بنیاد پر عنقریب ملنے والی کتنی بڑی جائداد اس کے ہاتھ سے نکل چکی ہے کیونکہ... اسے آنے والے وقت کی کچھ خبر نہ تھی۔

نفع، نقصان

تئوری ریاض



دلہائیں دیں، بہت کوششیں کیں مگر رنجیت سنگھ نے اپنا فیصلہ بدلنے سے انکار کر دیا۔ سدا کو روک ملے گا کہ اب لاہور میں اس کی کوئی مدد نہ کرے گا تاہم اگر وہ بٹالہ پہنچ جاتی ہے تو کچھ عرصے کے لیے دربار کی فوج کا مقابلہ کر سکتی ہے۔ پھر بھی اسے مجبور کیا جاتا تو وہ پنجاب انگریزوں کو اپنی مدد کے لیے بلا سکتی تھی۔ وہ خاموشی کے ساتھ لاہور کے دارالحکومت سے گھسک لی۔ تاہم ابھی زیادہ دور نہ گئی تھی کہ رنجیت سنگھ کو اس کا علم ہو گیا۔ اس نے فوری طور پر گھڑ سواروں کا ایک دستہ بھیجا اور اسے قیدی بنا کر واپس لاہور لے آیا۔ دیوان چند اور شام سنگھ کو سدا کو رو کی ریاست کا انتظام سنبھالنے بھیج دیا گیا۔ کہنیا قلعوں پر قبضہ کر کے ان کی ملیشیا کو ریاستی فوج میں شامل کر لیا گیا۔ بٹالہ جو کہ ہینڈا سرداروں کا آبائی گھر تھا، شہزادہ شیر سنگھ کو دے دیا گیا۔ باقی علاقہ کا ٹکڑہ میں ضم کر دیا گیا۔ سدا کو رو قیدی میں مر گئی۔

مہاراجا رنجیت سنگھ اپنے بیٹے کھڑک سنگھ کو اپنا جانشین بنا کر اسے دھیان سنگھ کی سرپرستی میں دے چکا تھا۔ جب 27 جون 1839ء کو اس کا انتقال ہوا۔ مہاراجا کے ساتھ اس کی چار رائیاں اور سات کنیزیں بھی جل کر تھیں ہوئیں۔ اس کے بعد شہر بھر میں اس کا مائی جلوس نکلا۔ تیرہ روز تک اس کی موت کا سوگ منایا گیا۔ شاہی مسجد کے پاس اس کی سادھی تعمیر کی گئی۔ گمانی گمان سنگھ جی کے مطابق مہاراجا نے 8 لاکھ کے 32 رائیاں پھوڑی تھیں جن میں سے چار ستی ہو کر جل گئیں اور باقی زندہ رہیں۔ زندہ رہنے والوں میں موران بھی تھی۔ رنجیت سنگھ کی جیتی اور پیاری جس کے ساتھ رنجیت سنگھ نے پورے خلوص کے ساتھ جی جان سے پیار کیا اور آخر دم تک اس کا ساتھ دیا۔ موران کا انتقال 1874ء میں ہوا۔ اس وقت لاہور کی سلطنت پر رنجیت سنگھ کا سب سے چھوٹا بیٹا دلپ سنگھ حکمران تھا جو کہ مائی جنداں کا بیٹا تھا۔ اسی کے حکم پر موران کی قبر کو پختہ کروایا گیا۔ سچ کہتے ہیں، مرنے والے مرجاتے ہیں، مگر ان کی یادیں اور نشانیاں باقی رہتی ہیں۔ سیانوں کا یہ کہا موران پر بھی صادق آتا ہے!

ماخذات:

• عمدة التواریخ: سوہن لال سوری توجہ: حاکمان پنجاب: اسد سلیم شیخ، تاریخ پنجاب: کنہیا لال مہاراجا رنجیت سنگھ، خوشنونت سنگھ، جملہ نقوش: لاہور نمبر، تاریخ پنجاب مع حالات شہر لاہور: سید محمد لطیف، مہاراجا رنجیت سنگھ: سیتا رام کوہلی، کنجری کا پل (ناول): یونس جاوید، پنجاب اور بیرونی حملہ آور: پروفیسر عزیز الدین احمد

خوب صورت لڑکی تھی جس نے اپنے ہاتھ میں گن پکڑی ہوئی تھی۔ وہ بریٹا 380 پینٹول تھا جس نے اسے دائیں ہاتھ میں مضبوطی سے پکڑ رکھا تھا۔ ہینول کا رخ براہ راست رچرڈ کی جانب تھا جو اس وقت لائبریری میں اپنی میز کے پیچھے بیٹھا ہوا تھا۔ لڑکی نے بائیں ہاتھ کی گن میں ڈائمنڈ کا میٹلس مضبوطی سے پکڑ رکھا تھا جسے پہچاننے میں اسے کوئی دشواری نہیں ہوئی۔ وہ بارہا اس کی مرحومہ بیوی کی نشانی تھا۔

رچرڈ نے نظریں سمٹھا کر دیکھا تو اسے صوفے پر ایک برساتی پڑی ہوئی نظر آئی جو یقیناً اس لڑکی کی ہی ہوگی۔ گویا باہر بارش ہو رہی تھی۔ وہ حیران تھا کہ بارش کب شروع ہوئی پھر اس نے سوچا کہ کتنے دن سے لارائے اس کے لیے کھانا نہیں بنایا۔ وہ کتنے عرصے سے اس کے ساتھ رہ رہی تھی۔ وہ ان دنوں کا حساب نہیں رکھ سکا۔ اس کا دماغ کمزور ہوتا جا رہا تھا۔ اسے کوئی بھی مرض لاحق ہو سکتا تھا، چاہے وہ الزخمر ہو، فالج، ہارٹ، ایک یا بڑھاپے کی وجہ سے ہونے والی کوئی بھی بیماری۔ اسی لیے موت کی خبر دیتے وقت کہا جاتا ہے کہ سب کو ایک دن جانا ہے۔ ممکن ہے کہ اوپر جانے کے لیے کسی خوب صورت عورت کے ہینول سے نکلے ہوئی گولی اتنی بری نہ ہو۔ اس کے باوجود وہ ابھی مرنے کے لیے تیار نہیں تھا۔

اس کہانی کا آغاز اکتوبر کے آخر میں صبح کی ایک سہ پہر سے ہوا۔ خزاں کا موسم شروع ہو چکا تھا اور زرد و سرخ چتے ہر گھاس پر پھیلے ہوئے تھے۔ وہ گھر کی صفائی کے لیے آئی تھی جو کچن کی بیوی کی زندگی میں گھر کی صفائی کی ذمہ داری سنبھالے ہوئے تھی وہ اچانک ہی بند ہو گئی۔ رچرڈ اس کی وجہ نہیں جانتا تھا اور نہ ہی اسے یہ معلوم تھا کہ وہ اس سلسلے میں کس کون کرے پھر اس کی نظر اخبار میں ہاؤس کلیننگ سروسز کے اشتہار پر پڑی جس میں ایک عورت کا مسکراتا ہوا چہرہ نمایاں تھا اور اس کے اوپر پتلی کا نام ایس جے فائن کلیننگ کمپنی درج تھا۔

لارائے اپنے ساز و سامان کے ساتھ اس کے دروازے پر آئی جس میں برش، جھاڑو وغیرہ شامل تھیں۔ وہ ایک پرانے ماڈل کی فورڈ وین میں آئی تھی۔ اس نے کمپنی کا یونیفارم سرخ اسکرٹ اور سفید بلاؤز پہن رکھا تھا۔ بلاؤز کے کنارے نزدیک نیلے رنگ میں اس کا نام کندہ تھا۔ دیکھنے میں وہ تیس کے لگ بھگ معلوم ہو رہی تھی۔ اسے دیکھ کر رچرڈ کو نابالگو کے ناول کی ہیروئن لولیتا یاد آئی جو کم عمری میں ہی کام کرنے کے لیے گھر سے نکل پڑی تھی۔

اس کی آنکھیں حسرت و یاس کی تصویر بنی ہوئی تھیں، جب اس نے اپنا تعارف کروایا تو رچرڈ کو یوں لگا جیسے وہ اس پیشے سے تعلق نہیں رکھتی۔ کوئی بھی اسے دیکھ کر یقین نہیں کر سکتا تھا کہ وہ صفائی کرنے والی عورت ہے۔ رچرڈ نے اسے پورا گھر دکھایا۔ وہ ایک ایک کمرے میں گئے۔ رچرڈ نے غور کیا کہ اس کا یہ بیچارہ کس طرح اس کے متناسب جسم سے چمٹا ہوا تھا۔ نہ چاہے نہ باوجود رچرڈ کی نظریں بار بار اس کے جسم کا طواف کر رہی تھیں گو کہ وہ جانتا تھا کہ عمر کے اس حصے میں کوئی بھی عورت اس کی جانب متوجہ نہیں ہو سکتی اس کے باوجود وہ اپنی نظروں کو نہ کھینکے۔ نہیں روک سکا۔ لڑکی کے ہاتھ میں ایک پروں والا جھانڈا تھا جس سے وہ بار بار میز، الماری اور کھڑکیوں کی طرف اشارہ کرتی۔ اس نے کہا کہ مکان کو مکمل صفائی کی ضرورت ہے اور وہ نہیں سمجھتی کہ اس وجہ سے گرد اور بے ترتیبی میں کوئی کس طرح رہ سکتا ہے۔

”تمہیں شرم آتی ہے کہ اسے اتنے اچھے مکان کا یہ حال کر دیا ہے۔“ وہ تیز لہجے میں بولی، جس میں غصہ اور ناراضگی کی جھلک تھی۔ رچرڈ نے اس کی بات کا برا نہیں منایا بلکہ اسے مکان کی تعریف سن کر خوشی ہوئی۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ وکٹوریہ طرز کا عالی شان مکان تھا۔ بہت سے لوگ اسے حویلی بھی کہتے تھے۔ یہ مکان مرکزی سڑک سے آدھ میل کے فاصلے پر تھا اور وہاں تک جانے کے لیے ایک پینے سڑک تعمیر کی گئی تھی جس کا اختتام وسیع و عریض پارکنگ لائٹ میں ہوتا تھا۔

”یہ مکان بہت بڑا ہے۔“ وہ بڑبڑاتے ہوئے بولی۔ اس نے رچرڈ کو صاف بتا دیا کہ اسے مناسب حالت میں لانے کے لیے ایک ہفتہ یا ممکن ہے کہ ایک مہینہ بھی لگ جائے۔ رچرڈ نے کہا کہ اسے اس پر کوئی اعتراض نہیں بلکہ وہ اس مکان کی صفائی میں... جتنا وقت دے گی وہ اس کے لیے باعث مسرت ہوگا۔ وہ اطمینان اور سکون کے ساتھ اپنا کام کرے۔ وہ اس کے راستے میں نہیں آئے گا۔ اس نے دل میں سوچا کہ کتنا اچھا لگے گا جب ایک پرکشش اور جوان عورت مینٹل پیس اور ٹرنچر سے گھر صاف کرے گی۔ اس کے علاوہ ہاتھ روم، بیڈ روم اور کچن کاؤنٹر کی بھی صفائی کرے گی۔ اسے سب سے زیادہ فکر چاندی کے برتنوں کی بھی جو متناسب توجہ اور صفائی نہ ہونے کی وجہ سے خراب ہو رہے تھے۔

اس مکان کو نظر انداز کرنے اور متناسب توجہ نہ ملنے کی ایک ہی وجہ تھی کہ رچرڈ کو حالات کے مطابق ڈھلنے میں

وقت لگ گیا۔ اس کی بیوی لیزا تیس سالہ رفاقت کے بعد نو ماہ قبل دنیا سے رخصت ہو گئی تھی۔ بیوی کی موت اس کی زندگی میں پیش آنے والے حادثات کی پہلی کڑی تھی۔ اس کے بعد تباہیوں کا ایک سلسلہ شروع ہو گیا۔ وہ یونیورسٹی میں انگریزی کا پروفیسر تھا۔ ریٹائر ہونے کے بعد اس نے اپنے آپ کو مصروف رکھنے کی خاطر پھولوں کی دکان میں جزوقتی ملازمت کر لی۔ ایک دن وہ گاڑی کے لیے پھولوں کا ایک بڑا گل دان اٹھا رہا تھا، اسے یہ گل دان فرش سے اٹھا کر گاؤنٹر پر رکھا تھا کہ اچانک اسے کمرے کے نچلے حصے میں جھٹکا محسوس ہوا۔ اس کی پوری ٹانگ میں درد کی شدید لہر دوڑ گئی۔ آنے والے مہینوں میں کمر کی تکلیف اتنی بڑھ گئی کہ اسے چلنے میں دشواری محسوس ہونے لگی اور چھڑی کا سہارا لینا پڑا۔ اس نے محسوس کیا کہ جسم سے توانائی ختم ہوتی جا رہی ہے۔ وقتاً فوقتاً اس نے مکان میں گھومنے کے لیے ویل چیرز استعمال کرنا شروع کر دی، گو کہ وہ اس کا محتاج نہیں تھا۔ یہاں تک کہ اس نے موٹر سے چلنے والی ویل چیرز کا بھی آرڈر دے دیا جو اس نے ٹی وی کے اشتہار میں دیکھی تھی۔ چند ہفتے اس ویل چیرز پر سواری کرنے کے بعد وہ اس سے آگاہ بہت محسوس کرنے لگا اور اس نے اس کا استعمال ترک کر دیا اور وہ بھی لائبریری کے ایک کونے میں رکھ دی گئی جس پر گرد و غبار کی تہ جم گئی تھی۔

پھولوں کی دکان میں کام کرنے کے دوران وہ لوگوں کے لیے گلدستے تیار کر کے لطف اندوز ہوا کرتا تھا۔ خاص طور پر چھٹیوں مثلاً ویلنٹائن اور درمزدے وغیرہ پر اس کی دلچسپی بڑھ جاتی تھی۔ اسے یہ کام کر کے محسوس ہوتا کہ وہ کوئی نیکی کر رہا ہے۔ وہ جانتا تھا کہ پھول امن، محبت اور خوشی کی علامت ہوتے ہیں تاہم کمر کی تکلیف بڑھتی گئی اور اسے ملازمت چھوڑنا پڑی۔ ویسے بھی اسے کام کی ضرورت نہیں تھی۔ اس کی بیوی بہت دولت مند تھی اور باپ کی جائیداد میں سے اسے معقول حصہ ملا تھا اور اب رچرڈ اس کے اثاثوں کا وارث تھا۔ اصل مسئلہ یہ تھا کہ وہ دن بہ دن تنہا ہوتا جا رہا تھا۔ وہ دن بھر گھر میں اکیلا پڑا رہتا۔ اس سے بات کرنے والا کوئی نہیں تھا۔ اس کے پاس کوئی مصروفیت نہیں تھی۔ سوائے اس کے کہ وہ ٹی وی دیکھے یا کتابیں پڑھنے میں وقت گزارے۔ اس کا قریبی دوست اربل بھی اسی سال کے شروع میں وفات پا چکا تھا۔ دوسرے دوست بھی دنیا سے رخصت ہو گئے یا دوسری ریاستوں میں چلے گئے اور وہ خاص خاص مواقع پر بھی اس کی فون کال کا جواب دینے کی

ذمّت گوارا نہیں کرتے تھے۔ اس کے پاس... کوئی مصروفیت نہیں تھی اور وہ اپنی معذوری کی وجہ سے اتنے بڑے گھر کی دیکھ بھال نہیں کر سکتا تھا۔ پھر لارائے اس کی زندگی میں آ گئی۔ وہ بڑی جھنجھٹی لڑکی تھی۔ گھنٹوں کے بل جھپک کر چمک کر فرش رگڑ رگڑ کر صاف کر لی یا ساری کھڑکیوں کو پانی سے دھو دیتی۔ اس نے پہلے دن کے بعد کچھ نہیں کہا جب اس نے گھر کی حالت دیکھ کر رچرڈ کا مذاق اڑایا تھا تاہم اس کی کچھ باتیں رچرڈ کو بڑی عجیب لگتیں اور وہ انہیں محسوس کیے بغیر نہ رہ سکا۔ اس کا خیال تھا کہ وہ بہت گہری لپ اسٹک اور آبی شیڈ و لگاتی ہے۔ اسے یہ بھی پسند نہیں تھا کہ وہ بار بار بارش میں جاکر سرگیت نوشی کرے۔

ایک ہفتہ گزرنے کے بعد لارائے کہا کہ وہ اگلے سوموار کو آئے گی۔ دوسرے ہفتے کے دوران اس نے رچرڈ سے اس کے گھر والوں خاص طور پر اس کی بیوی کے بارے میں سوالات کرنا شروع کر دیے گو کہ اسے اس کا حق نہیں تھا تاہم وہ ختمہ پیشانی سے اس کا جواب دیتا رہا۔ وہ گفتگو کے دوران بعض مواقع پر ایسا رویہ اپناتی جسے کوئی نام نہیں دیا جاسکتا تھا جس نے رچرڈ کو یہ سوچنے پر مجبور کر دیا کہ وہ منکوحہ کی بیکری حاصل ہے۔

اپنا کام ختم کرنے کے بعد وہ اس سیاہ رنگ کی ٹوپیٹا سڈن کا انتظار کرتی جو اسے گھر لے جانے کے لیے آئی تھی۔ رچرڈ نہیں جانتا تھا کہ وہ کہاں رہتی ہے اور نہ ہی اسے یہ معلوم تھا کہ ٹوپیٹا چلانے والا کون ہے۔ وہ اس کا بوائے فرینڈ بنو ہوا یا کمپنی کا کوئی ملازم ہو سکتا تھا۔ کچھ بھی ہو۔ اس کی موجودگی کے دوران رچرڈ کو وقت گزرنے کا احساس نہ ہوتا، صبح کا فینے یا اخبار پڑھنے کے دوران وہ لارا کو گھر میں منگ منگ کر چلتے پھرتے دیکھتا تو اسے بہت اچھا لگتا اور اسے اپنی جوانی کے دن یاد آ جاتے۔ کبھی کبھی... کام کے دوران وہ کوئی گانا گانے لگتی جسے سن کر رچرڈ مسکراتے لگتا۔

دن گزرتے رہے لیکن وہ یہی کہتی رہی کہ ابھی بہت کام باقی ہے۔ اسے اوپر کی منزل پر قائلینوں، ڈائمنڈ روم کے پردوں اور لائبریری کے فرش کی صفائی کرتا ہے وہ بھی سمجھا کہ لارا کام کو ختم کر رہی ہے کیونکہ وہ اسے فی گھنٹہ کے حساب سے ادا کرتی کر رہا تھا۔ شاید وہ اسی لیے اس کو شش میں بھی کہ اس سے زیادہ سے زیادہ رقم اٹھائے کہ رچرڈ کو اس پر بھی کوئی اعتراض نہیں تھا بلکہ یہ اس کے لیے ایک تفریح

تھی۔ اس کے آنے سے رچڑ کا دل بھل جاتا تھا۔ اگر وہ کچھ نہ کرتی تبھی وہ اسے صرف آنے جانے کے پیسے ہی دیتا رہتا۔ کم از کم اس کی وجہ سے گھر میں عورت کی موجودگی تو محسوس ہو رہی تھی۔

عرصہ ہوا رچڑ کے لیے پیسے کی اہمیت ختم ہو گئی تھی جس کی بڑی وجہ اس کی صحت تھی۔ وہ ذیابیطس، بلڈ پریشر اور ہائی کولیسٹرول کی دوا میں لپٹا تھا۔ اسے سب سے زیادہ غم اس بات کا تھا کہ اس کا کوئی رشتہ دار حیات نہیں تھا جس سے ملنے وہ جاسکتا۔ اس کی پرانی مرسدیز گیاراج میں کھڑی ہوئی تھی۔ اس نے ایک معقول رقم کی سرمایہ کاری کر رکھی تھی جس کی گمرانی اس کے بنکر کرتے تھے۔ اس کی اکلوتی بیٹی تیس سال پہلے کے حادثے میں ہلاک ہو گئی تھی اور سوتیلا پٹا کٹی رانی کرتے ہوئے ڈوب گیا تھا جب وہ لوگ اپنے گھر والوں کے ساتھ تعطیلات منانے گئے تھے۔ اس کے علاوہ ان کی کوئی اولاد نہیں تھی۔ نہ ہی کوئی بھائی، بھتیجا یا بھانجا تھا جس کے نام جاگداد منتقل ہوئی۔ اس کے دیل نے اسے بار بار یہ بات یاد دلائی اور کئی خیراتی اداروں یا درس گاہوں کے نام تجویز کیے لیکن وہ ان اداروں کو کافی طور پر جاگداد منتقل کرتے ہوئے چپکاپ رہتا تھا۔ اس کا ماننا تھا، وارثت کے حقدار صرف خونی رشتے یا وہ ہستی ہوتی ہے جس سے محبت کی جائے۔

لارا مستقل طور پر اس کے ساتھ اس بڑے گھر میں براجمان تھی جو پانچ ایکڑ پر پھیلا ہوا تھا اور اس کے چاروں طرف سبز قطعہ اراضی تھی۔ وہ چھڑی کا سہارا لے کر اس کے ساتھ باغ میں چہل قدمی کرتا۔ وہ اس سے دنیا جہان کی باتیں کرتی حالانکہ رچڑ کو اس کے ساتھ چلنے میں دشواری ہوتی تھی اور وہ فٹابٹ محسوس کرنے لگتا۔ جسم کے ساتھ ساتھ اس کا دماغ بھی کمزور ہوتا جا رہا تھا اور یہ واضح طور پر الزائمر کی علامت تھی جس میں وقت سے پہلے عقل کام کرتا چھوڑ دیتی ہے۔ اسے اعتراف کرنا پڑا کہ لارا دن بہ دن اس کے خیالات پر حاوی ہوتی جا رہی ہے۔ یہاں تک کہ شام کو اس کے گھر چلے جانے کے بعد بھی وہ اسی کے بارے میں سوچتا رہتا تھا۔

کچھ عرصہ رچڑ نے اس کی گمرانی کی کہ وہ کن کن کام میں کام کر رہی ہے لیکن جیسے جیسے وقت گزرتا گیا اس نے بھی اس پر نظر رکھنا چھوڑ دیا۔ اسے یہ بھی معلوم نہ ہوتا کہ وہ گھر کے کس حصے میں کام کر رہی ہے اور نہ ہی وہ اس سے اس بارے میں پوچھتا بلکہ بعض اوقات تو اسے یہ بھی یاد نہیں رہتا

کہ وہ کام پر آئی ہوئی بھی ہے۔ اس کا پتا اسے ویکیم کینٹریا لائبریری ڈائریکٹری آواز سے چلتا۔ جسے کی سہ پہر وہ اس کی اسٹڈی میں آ کر اس ہفتے کا بل دیتی اور وہ خوشی اسے چیک یا نقد رقم کی صورت میں ادا کر دیتی۔

ایک مرتبہ وہ سو موار کے دن نہیں آئی تو رچڑ کو بے چینی ہونے لگی لیکن جب وہ منگل کو بھی نہیں آئی تو اس سے رہا نہ گیا۔ اس نے ایس بے جے فائن کلیننگ کمپنی کا کارڈ اٹھایا جو لارہ نے اسے پہلے روز دیا تھا۔ رچڑ نے اپنی عادت کے مطابق اسے اپنے ڈیبک کی خالی درواز میں رکھ لیا تھا۔ اس نے کارڈ پر لکھا ہوا کمپنی کا نمبر لایا۔

”میں آؤ دوسری طرف سے کسی نے کہا۔“
”میں مس لارا وائٹ کے بارے میں جانتا چاہتا ہوں۔“ رچڑ نے پچھلے پوچھا۔
”کون بول رہا ہے؟“ دوسری طرف سے پوچھا گیا۔
”میرا نام رچڑ آؤ اسٹڈی ہے۔“

چند لمبے خاموشی پر بھی اسی آواز نے کہا۔ ”مسٹر رچڑ! تمہاری اطلاع کے لیے عرض ہے کہ مس وائٹ اب یہاں کام نہیں کرتی۔ اس نے چھپلے ہفتے ہی یہ ملازمت چھوڑی ہے لیکن ہمارے پاس اور بھی ایسے لوگ ہیں اور مجھے یقین ہے ہم تمہارے لیے دوسرا بندوبست کر سکتے ہیں جو تمہیں پسند آئے گا تاکہ آئندہ بھی تمہارے مکان کی صفائی ہوتی رہے۔“

رچڑ خالی نظروں سے اسٹڈی کی دیوار کو گھورنے لگا پھر اس نے کہا۔

”مس وائٹ کے ساتھ کیا ہوا، وہ تمہارے یہاں کام کیوں نہیں کر رہی؟“
ایک بار پھر دوسری طرف خاموشی چھا گئی۔

”میں مس وائٹ کے لیے ہی اصرار کروں گا۔“ اس نے کہا۔ ”میں چاہتا ہوں کہ وہ میرے مکان کی صفائی کرے۔“
”میں مجاہد تمہاری بات کروا دیتی ہوں۔“ اس آواز نے کہا۔

کچھ دیر بعد اسے ایک اور زنانہ آواز سنائی دی۔

”میں تمہاری کیا مدد کر سکتی ہوں؟“
”میں چاہتا ہوں کہ مس وائٹ ہی میرے مکان کی صفائی جاری رکھے۔“

”مجھے افسوس ہے جناب۔“ منیجر نے کہا۔ ”لیکن اب مس وائٹ یہاں کام نہیں کرتی۔“

رچڑ میں ان لوگوں سے بحث کرنے کی مزید طاقت

نہیں تھی۔ اس نے جھلا کر فون رکھ دیا۔ چند قدم چلتا ہوا لڑکی تک گیا اور آنکھیں موند کر بیٹھ گیا۔ وہ سہ پہر ۱ بجے بہت طویل محسوس ہو رہی تھی۔ شام میں بارش شروع ہو گئی۔ اس کی ہینڈ غائب ہو چکی تھی۔ وہ بستر سے اٹھ بیٹھا اور لہائی سے باہر جھانکے لگا۔

ایک اور دن گزر گیا۔ اس نے چھڑی کی مدد سے بارے گھر میں نکل نکل کر وقت گزارا۔ کبھی وہ ایک کمرے سے دوسرے کمرے میں جاتا۔ کبھی ٹیرس پر کھڑے ہو کر بارش کو دیکھتا پھر گھر میں واپس آ جاتا۔ بھرات کی سہ پہر وہ اسٹڈی میں بیٹھا چائے پی رہا تھا کہ دروازے کی کھٹکی بجی۔ اس نے دروازہ کھولا تو سامنے لارا کھڑی ہوئی تھی، البتہ اس نے ہتھکی کی یونیفارم کے بجائے بلیو جینز اور سفید فیص پہن رکھی تھی اور بال بھی ڈائی کروا لیے تھے اور اب وہ سنہری رنگ کے تھے۔ اس کے ہونٹوں میں سگریٹ دبا ہوا تھا اور اس کے ہاتھوں پر سیاہ چشمہ بھی تھا۔ اس کے باوجود یہ حقیقت چھپی ہوئی تھی کہ اس کی بائیں آنکھ ڈائریکٹ اس کا کسی سے جھٹکا ہوا ہوا۔ اسے دیکھ کر رچڑ کو مارلن منرو کی جوانی یاد آ گئی۔

اس کے خیال میں یہی لارا کا اصل روپ تھا۔ ایک بھاری عورت جو مرد کو بہکانے کی صلاحیت رکھتی ہے۔ یہی وہ لارا تھی جسے اس نے اپنی جوانی میں رسالوں کے سرو ورق پر دیکھا تھا۔ وہ تصور کر سکتا تھا کہ ایسی عورتیں قشیتا فروشوں، دلالوں اور چوروں کی ساتھی ہوتی ہیں۔ اس نے پہلے ہی غصے میں یہ تاثر دے دیا تھا لیکن وہ اس پر انگلی نہ اٹھا سکا۔ شاید یہی لارا ملازمت نے اسے ہمیں بدلنے پر مجبور کر دیا تھا۔ وہ اس کے سامنے تنگ جینز اور ٹی شرٹ پہنے یوں کھڑی ہوئی تھی جیسے اس کے لیے پوز بنا رہی ہو اور کہہ رہی ہو، یہ میرا اصلی روپ ہے۔ کیا اب بھی تم مجھ سے محبت کرتے ہو؟

اس کے عقب میں پورے پر کچھ نیا سامان رکھا ہوا تھا جس میں ایک بائیں ایک دائیں دو صفائی کے کپڑوں سے بھرا ہوا ایک بیگ اور کینٹری کی بوتلیں شامل تھیں۔ اس نے ہونٹوں سے مسکرت نکالا اور براہ راست اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بولی۔

”اوپر کی منزل کے کمروں میں کچھ کام باقی ہے۔“
اس نے نرم لیکن سختی ہوئی آواز میں کہا۔ رچڑ کا دل بوچھل گیا اور وہ جواب میں کچھ نہ کہہ سکا۔

وہ اس کے پاس سے گزر کر بیسیوں کی طرف جانے لگا تو رچڑ پوچھ بیٹھا۔ ”کیا بات ہے۔ آج تم کمپنی کی ملازم میں نہیں ہو؟“

”ہاں۔ میں نے کمپنی کی ملازمت چھوڑ دی ہے اور ذاتی حیثیت میں صفائی کا کام کر رہی ہوں۔“
”وجہ؟“ رچڑ نے پوچھا۔

”وہ سب میرے لیے ناقابل برداشت ہو گئے تھے۔“ اس نے سگریٹ کا کش لیتے ہوئے کہا۔
”مجھے بالکل اچھا نہیں لگتا کہ فضول قسم کے لوگوں کے سوالات کے جواب دوں۔ خاص طور پر وہ منیجر جسے یہ بھی معلوم نہیں کہ کمپنیوں سے کس طرح کام لایا جاتا ہے۔“
”میں نے تمہارے بارے میں پوچھنے کے لیے کمپنی فون کیا تھا۔“ رچڑ نے کہا۔

”ہاں۔ میں جانتی ہوں۔“

اس جواب نے رچڑ کو حیران کر دیا لیکن وہ کچھ بولا نہیں۔ بس چپ چاپ کھڑا اسے اوپر جاتے دیکھتا رہا۔ چند منٹوں بعد ہی اوپر سے بالٹی کھینچے اور فرش رگڑنے کی آوازیں آنے لگیں۔ وہ واپس اسٹڈی میں چلا گیا اور وہ ناول اٹھا لیا جسے وہ کئی مہینوں سے پڑھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ ایک بار پھر اس کی نظریں اسٹڈی کی دیوار پر جم گئیں۔ لارا کی موجودگی اسے پریشان کر رہی تھی۔ دوسری جانب وہ اس کے واپس آنے پر خوش بھی تھا۔ یوں لگ رہا تھا جیسے کوئی کھوئی ہوئی چیز اسے دوبارہ مل گئی ہے کوکہ وہ قناعت پسند تھا۔۔۔۔ زندگی نے اسے سکھایا تھا کہ بہت سی چیزیں نقص اور رشتے عارضی ہوتے ہیں پھر وہ لارا کی اتنی پروا کیوں کر رہا ہے جبکہ وہ سمجھتا تھا کہ یہ محض ایک حماقت ہے۔ وہ اس کے بارے میں کچھ نہیں جانتا تھا۔ اس کی نظر میں وہ پرانی فلموں کا ایک زنانہ کردار بھی جواکب حقیقی عورت کے روپ میں اس کے گھر اور زندگی میں داخل ہو گئی تھی اور وہ کوشش کے باوجود اس سے دور نہیں رہ سکتا تھا۔

لارہ نے ایک بار پھر صفائی کا کام سنبھال لیا تھا۔ اسے باتیں کرنے کا مرض تھا اور رچڑ بھی سمجھتا تھا کہ وہ زیادہ سے زیادہ دیر اس کے ساتھ رہے۔ لارا کو کریدنے کی بہت عادت تھی۔ بہت کچھ جان لینے کے باوجود اس کے سوالات کا سلسلہ ختم نہیں ہوتا تھا۔ وہ اب بھی اس کے خاندان، بیٹی اور بیوی کے بارے میں پوچھا کرتی۔ ایک دن وہ سنگ روم کے فرنیچر پر پالش کر رہی تھی کہ رچڑ کو اپنی بیٹی اسیلی یاد آ گئی۔ اس نے بیٹی کی پیدائش سے لے کر اس کے بڑے ہونے تک کے واقعات بیان کر دیے۔ لارا اس کی باتیں غور سے سنتی اور سر ہلاتی رہتی۔ کبھی کبھی وہ اس کی بیوی کے قریبی رشتے داروں کے بارے میں بھی پوچھتی۔ اس

نے باتوں باتوں میں رچڑے اس کے مکان کی مالیت اور دیگر اثاثوں کے بارے میں بھی دریافت کر لیا۔ وہ جاننا چاہتی تھی کہ رچڑے قریبی رشتے داروں میں کون کون زندہ ہے اور اس نے اپنی سادگی میں اعتراف کر لیا کہ ان میں سے اب کوئی بھی نہیں بچا۔

ٹھیک پانچ بجے لارا کو لینے کے لیے ٹویٹا وین آگئی۔ رچڑے نے کھڑکی میں سے گاڑی کو دیکھا، اس کی کھڑکیوں پر سیاہ شیشے تھے۔ اس لیے اسے کبھی بھی ڈرائیور کی شکل نظر نہیں آئی۔ وہ اس کے بارے میں کچھ نہیں جانتا تھا اور نہ ہی لارا نے بھی اس کا تعارف کر دیا۔ یہ بڑی عجیب بات تھی۔ ایک طرف تو اس عورت نے رچڑے سے اس کی ذاتی زندگی کے بارے میں ایک ایک بات پوچھ لی تھی اور دوسری جانب ایسا لگتا تھا کہ ان کے درمیان کچھ ایسی حدود ہیں جنہیں وہ عبور کرنا نہیں چاہتی۔ اب رچڑے کو اس کے بارے میں محسوس ہونے لگا کہ یہ عورت کون ہے جو اس کی زندگی میں دھولے سے داخل ہوئی ہے۔

اس نے ایک بار پھر کمپنی کو فون کر کے اس کے بارے میں مزید معلومات حاصل کرنے کی کوشش کی لیکن وہ صرف یہ تصدیق کر سکے کہ لارا وائٹ نامی عورت نے صرف تین ماہ اس کمپنی میں کام کیا تھا۔ زیادہ سے زیادہ وہ اس کے عرصہ ملازمت کی تاریخیں بتا سکتے ہیں کہ اس نے کس تاریخ کو کمپنی میں شمولیت اختیار کی اور کب وہ چھوڑ چلی گئی۔

لارا کی ڈیوٹی آٹھ گھنٹے کی تھی لیکن اب اس نے دیر تک رکتا شروع کر دیا تھا۔ صبح آٹھ بجے کام پر آئی اور رات نو بجے سے پہلے واپس نہ جاتی پھر ایک دن اس نے ٹویٹا کے ڈرائیور کے بارے میں بھی بتا دیا۔ وہ اس کا بوائے فرینڈ ہی تھا لیکن اب ان میں ٹھیک کی ہوئی تھی۔

”وہ میرے لیے ناقابل برداشت ہو گیا ہے۔“ لارا نے کہا۔ ”ہمارے درمیان آئے دن جھگڑے ہوتے ہیں۔ وہ کوئین کا عادی ہے اور اس کے دوسری عورتوں سے تعلقات ہیں۔ اس سے پہلے کہ وہ مجھے چھوڑ دے۔ میں اسے چھوڑ رہی ہوں۔“

اس کے بعد رچڑے نے اس وین کو ڈرائیوے میں نہیں آتے دیکھا۔ لارا چند ہفتوں تک ٹیکسی سے آتی رہی اس کے بعد ایک اور تبدیلی آئی۔ وہ بھی بچے کا ہی دن تھا جب رچڑے نے کھڑکی سے اسے سوٹ کس سمیت اپنے گھر کی طرف آتے دیکھا۔ اسے یوں لگا کہ جیسے یہ سب کچھ اسی طرح ہوتا تھا اور یہ سب کچھ پہلے سے طے شدہ اور تاثر گیر تھا۔

کہ وہ اس کے ساتھ آ کر رہے۔ لارا نے رسماً بھی رچڑے سے پوچھنے کی ضرورت محسوس نہیں کی بلکہ وہ اس طرح اپنا سامان لے کر آگئی جیسے وہ اس کا اپنا گھر ہو۔ اس پر بھی رچڑے کوئی اعتراض نہیں کیا بلکہ ایک طرح سے اسے خوشی ہو رہی تھی کہ اب لارا مستقل اس کی نظروں کے سامنے رہے گی۔ اس نے لارا کو ایسلی کا کمرادے دیا۔

سردیاں گزر گئیں اور بہار کا موسم آگیا۔ لارا چاہتی تھی کہ اسے ہفتے کے اختتام پر معاوضے کی رقم نقد ادائیگی جائے لیکن جب اسے بتایا گیا کہ قانونی طور پر وہ چیک کے ذریعے معاوضہ ادا کرنے کا پابند ہے تو وہ مان گئی۔ رچڑے نے ٹیکس کے حسابات تیار کرنے کے لیے اس کا پورا نام اور سوشل سیکیورٹی نمبر لے کر کاغذاتی کارروائی مکمل کی تا کہ وہ بھی ایک ایمان دار اور ٹیکس گزار شہری بن جائے۔ وہ اسے فراخ دل سے معاوضہ ادا کرتا جبکہ بعض اوقات صفائی کا کام برائے نام ہوتا اور بعض اوقات بالکل نہیں ہوتا تھا۔

وہ اپنا زیادہ وقت بارش میں گزارتی اور رچڑے اسے اکثر پیشتر سیل فون پر باتیں کرتے دیکھا کرتا۔ لارا نے بتایا کہ اس کے دوستوں کا حلقہ بہت وسیع ہے اور وہ ان سے باتیں کرتی رہتی ہے کیونکہ اس کے پاس وقت گزارنے اور دل بہلانے کا کوئی ذریعہ نہیں ہے۔ یہی وہ لیونگ روم میں بیٹھی اپنے تانوں کو پاش کر رہی ہوتی یا ایک باکس میں سے چاکلیٹ نکال کر کھا رہی ہوتی، وہ چاکلیٹ کے باکس لیونگ روم میں رکھتا تھا یہ اسے اپنی بیوی کی یاد دلاتے تھے جسے چاکلیٹ بہت پسند تھے۔ ایک دفعہ اس نے لارا کو بچن میں کاؤنٹر پر رکھے کی وی پر پروگرام دیکھنے ہوئے پایا۔ ساتھ ساتھ وہ مائیکرو ویو میں گرم کیے ہوئے پاپ کارن بھی کھا رہی تھی۔

ایک روز رچڑے کسی ناول کی تلاش میں لائبریری آیا تو وہ صوفے پر بے خبر سو رہی تھی۔ وہ اگست کا مہینا تھا اور موسم گرم و مطرب ہو گیا تھا۔ اس نے جینز اور شرٹ پہن رکھی تھی اور پچھلے کی ہوائے اس کی ٹیٹھیں کچھ اوپر کھسک گئی تھی۔ وہ بلاشبہ بہت خوب صورت تھی، رچڑے نے سوچا کہ اگر اس کی بیٹی ایسی زندہ ہوتی تو وہ بھی اس جیسی ہوتی۔ اسے اعتراف تھا کہ وہ بیٹی کے ساتھ زیادہ وقت نہیں گزار سکا۔ شاید وہ اچھا باپ نہیں تھا۔ وہ بے خودی کے عالم میں لارا کو دیکھے جا رہا تھا اور اس کے دل میں اس کے لیے پیار اور ہمدردی کے جذبات اٹھ رہے تھے۔

کسی زمانے میں وہ پولیس ڈیپارٹمنٹ کے ایک

لیفٹیننٹ ولیم فیلس کے ساتھ کنسٹرکٹو کلب میں باقاعدگی سے گولف کھیلا کرتا تھا۔ بہت جلد ان دونوں میں گہری دوستی ہو گئی۔ ایک دن اس نے اس بے فائن کھیلنگ کمپنی کو فون کیا اور میجر سے بات کرنے کی خواہش ظاہر کی۔ وہ فوراً ہی لائن پر آگئی۔

”میں پولیس ڈیپارٹمنٹ سے لیفٹیننٹ فیلس پول رہا ہوں۔“ اس نے کہا۔ ”ہم تمہاری ایک سابق ملازمہ مس لارا وائٹ کے بارے میں تحقیقات کر رہے ہیں۔ کیا میں تم سے اس سلسلے میں کچھ سوالات کر سکتا ہوں؟“

اس بار میجر نے کوئی لگی پٹی رکھے بغیر اس کے جانے کی وجہ بتادی۔ ”ہاں۔ ہم نے اسے ملازمت چھوڑنے پر مجبور کیا کیونکہ وہ کمپنی کی کئی چیزیں چوری کر رہی تھی۔ آخر میں اسے پیش رجسٹر سے رقم چراتے ہوئے پکڑا گیا۔ گوکہ ہم کسی جوتی ملازم کا نہیں منظر جاننے کی ضرورت محسوس نہیں کرتے لیکن لارا کے معاملے میں ایسا کرنا پڑا۔ جب اس کا گزشتہ ریکارڈ چیک کیا گیا تو معلوم ہوا کہ وہ ایک سنگین جرم کے سلسلے میں کافی وقت اصلاحی مرکز میں گزار چکی تھی۔“

”شکر ہے“ رچڑے نے کہا۔ ”اگر ضرورت ہوئی تو ہم تم سے دوبارہ رابطہ کریں گے۔“

لارا کے ماضی کے بارے میں جاننے کے باوجود رچڑے کی عنایات میں کوئی کمی نہیں آئی۔ وہ اس پر اسی طرح مہربان رہتا جانتا تھا۔ ممکن ہے کہ بڑھتی ہوئی عمر کی وجہ سے اس کی عقل نے کام کرنا چھوڑ دیا ہو۔ ویل کی شدید مخالفت کے باوجود رچڑے نے اپنی وصیت دوبارہ لکھوائی اور سب کچھ لارا وائٹ کے نام کر دیا۔ اب وہ اس کے تمام اثاثوں بشمول مکان، کار اور لاکھوں کے اس سرٹائٹ کی وارث تھی جو اس نے اسٹاک، بانڈز اور پراپرٹی میں لگا رکھی تھی لیکن اس نے لارا کو اس بارے میں کچھ نہیں بتایا۔ اس کی کوئی خاص وجہ نہیں تھی جس سے وہ چاہتا تھا کہ اس کے مرنے کے بعد لارا کو اس وصیت کے بارے میں معلوم ہو۔

لارا کے شب و روز بڑے مزے میں گزر رہے تھے۔ اس کا دل چاہتا تو تھوڑا بہت صفائی کا کام کر لیتی اور نہ سارا دن ادھر ادھر پھرتی رہتی۔ گھر کی ہر چیز اس کے تصرف میں تھی۔ وہ بھی بارش میں چلی جاتی تو بھی اسٹڈی میں بیٹھ کر کتابیں الٹ پلٹ کرتی۔ رچڑے نے اسے بھی کوئی کتاب پڑھتے ہوئے نہیں دیکھا تھا۔ ایک دن وہ اسٹڈی میں بیٹھی چاکلیٹ کھا رہی تھی۔ رچڑے بھی ٹہلا ہوا اس طرف چلا گیا۔ اس نے دیکھا کہ وہ کھڑکی کے پاس بیٹھی تھی اور اس کی

آنکھوں سے اداسی جھلک رہی تھی جیسے وہ سستی اور اکتاہٹ محسوس کر رہی ہو۔ رچڑے کو اس پر بڑا اثر آ یا اور وہ سوچنے لگا کہ اس لڑکی کو کوئی مشغلہ اختیار کرنا چاہیے۔ اس نے اپنے لیے فراموشی شراب کا پیگ بنایا۔ اس نے لارا سے کہا۔ ”تم اسٹڈی میں خالی بیٹھ کر وقت ضائع کرتی ہو۔ کوئی کتاب کیوں نہیں پڑھیں؟“

لارا نے کھڑکی سے باہر دیکھا اور بولی۔ ”میں زیادہ پڑھی کبھی نہیں ہوں۔“

”کیا تم نے اسکول میں تعلیم حاصل نہیں کی؟“ رچڑے نے پوچھا۔

”میں نے ہائی اسکول میں داخلہ لیا تھا لیکن پڑھائی میں دل نہیں لگا۔ میں کبھی بھی اچھی طالب علم نہیں رہی۔ مجبوراً مجھے اسکول چھوڑنا پڑا۔“

اس نے سگریٹ سلگایا اور لارا کے چہرے پر نظریں جمادیں۔ اس کی سادگی اور مصومیت نے رچڑے کا دل موہ لیا۔ اسے لارا کے سنہری بال، سیاہ چہرے کی پتلون اور ہر کارکن کی قمیض سب کچھ اچھا لگ رہا تھا۔

”اسکول ہر ایک کے لیے نہیں ہوتے ایم۔۔۔۔۔۔“ وہ اسے ایسی ہی کہتے کہتے رک گیا۔ اس نے پچھلے چند ماہ میں اس عورت کے ساتھ جو وقت گزارا، اتنا زندگی بھر اس کی بیٹی کے جیسے نہیں آیا۔ لارا اس کے حواسوں پر بری طرح چھا گئی تھی۔

رات کے کھانے پر لارا نے اس کے لیے بھنا ہوا گوشت اور اسٹیم میں ابالی ہوئی گوبھی بنائی۔ کھانے کے دوران اس نے رچڑے کو دان بھی پیش کی۔ اس نے دیکھا کہ وہ اس کی بیوی کا زیور پہنے ہوئے تھی۔ گلے میں بہروں کا ہار، ہاتھ میں انگوٹھیاں اور زمر کا پریسلٹ۔ وہ سوچنے لگا کہ لارا کب سے یہ زیور پہن رہی تھی۔ اسے یاد تھا کہ یہ زیور ایک مہمان کی کے پاس میں اس کی بیوی کی دوسری چیزوں کے ساتھ بیڈ روم کی الماری میں رکھا ہوا تھا۔ اس نے لیزا کی موت کے بعد اس کمرے کی کسی چیز کو ہاتھ نہیں لگایا تھا اور اب لارا صرف زیور ہی نہیں بلکہ اس کی بیوی کا سیاہ لباس، سیاہ موزے اور اونچی ایڑی کے سیڈل بھی پہنے اس کے سامنے بیٹھی ہوئی تھی۔

رچڑے کو اس بات کی بالکل پروا نہیں تھی کہ لارا نے اس کی بیوی کا زیور یا کپڑے پہنے اس کے برعکس اسے خوشی ہوئی کہ وہ ان چیزوں میں کتنی اچھی لگ رہی تھی۔ وہ عورت جو اس کے ساتھ ہر جگہ موجود تھی۔ اس کے بارے میں رچڑے

نے ایک ہی بات سوچ کر وہ عورت اس کی بن چکی تھی صرف اس کی۔

اس طرح پورا ایک سال گزر گیا۔ لارا بالکل اسی طرح اس کی زندگی کا حصہ بن چکی تھی جیسے بھی اس کی بیوی ہو کر تھی۔ ایک برس قبل یہ ایک مضحکہ خیز بات بھی لیکن اب یقین ہو چلا تھا کہ اسے لارا سے محبت ہو گئی ہے۔ اسے تو یہ بھی یاد نہیں رہا تھا کہ لارا کو اس کے گھر میں رہتے ہوئے کتنے مہینے ہو چکے ہیں۔ وہ صرف یہ سوچ رہا تھا کہ کیا لارا بھی اس سے محبت کرتی ہے اور اس کا جواب اسے بہت جلد مل گیا۔

وہ آخر اکتوبر کی ایک سہ پہر بھی جب لارا اسٹڈی میں داخل ہوئی۔ اس وقت وہ ایک کتاب پڑھ رہا تھا۔ وہ گنگی باندھ کر اسے دیکھنے لگا۔ جیسے وہ وہی عورت تھی جس سے اس نے ساری عمر محبت کی۔ وہ اپنی بیوی اور بیٹی کو کھو چکا تھا اور اب ان کی جگہ لینے کے لیے یہ عورت آ گئی تھی۔

اس نے نیوی بلیو اسکرٹ اور سفید بلاؤز پہن رکھا تھا۔ بلاؤز کے اوپر کی بن کھلے ہوئے تھے جسے دیکھ کر چڑھ کو اپنی جوانی میں رسالوں کے سرورق پر برامان بے باک دوشیرا نیں یاد آئیں۔ تو کیا یہ بھی ان جیسی ہی تھی جو اس کا سکون غارت کر کے آ گئی تھی یا محض ایک سالوں کی خوب صورت لڑکی جس نے ہاتھ میں گن پکڑی ہوئی تھی۔

وہ بریٹا 380 پہنوا تھا۔ اس نے دوسرے ہاتھ میں بیروں کا ہار پکڑ رکھا تھا۔ رچرڈ نے غور کیا کہ اس نے اپنا سوٹ پیس بھی تیار کر لیا تھا جو اس کے عقب میں دروازے کے پاس فرش پر رکھا ہوا تھا۔

”میں زپور لے جا رہی ہوں۔“ اس نے کہا لیکن وہ اس کی آواز میں گھبراہٹ محسوس کر سکتا تھا۔

وہ سوچ رہا تھا کہ کیا بھی اس عورت نے گن کا استعمال کیا ہے؟ اسے اس بارے میں شہ تھا۔ اس وقت بھی وہ پورے میک اپ میں تھی سنو ری کھڑی ہوئی تھی۔ ایک لمحے کے لیے اسے خیال آیا کہ وہ اپنے پرانے میسرے سے اس کی ایک تصویر بنالے۔ وہ سوچ رہا تھا کہ اس کے پاس یہ گن کتنے عرصے سے ہوئی اور کیا اس نے اس کا لائسنس بنوایا ہے؟ اس بارے میں بھی اسے شہ تھا۔ ایک صفائی کرنے والی عورت کے پاس گن کا کیا کام۔ ممکن ہے کہ یہ اس نے اپنے پرانے بوائے فرینڈ سے چرائی ہو جو اسے مارتا یا منشیات کا دھندلا کرتا تھا اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ خود اسی نے یہ گن لارا کو دی ہو۔ شاید وہ دونوں اب بھی مل کر وارداتیں کرتے ہوں۔

رچرڈ نے اطمینان سے سر ہلایا اور اس سے کہا کہ وہ پُر سکون رہے۔ وہ یہ سارا زپور اپنے ساتھ لے جاسکتی ہے۔ اسے ان چیزوں سے محروم ہونے کی بالکل پروا نہیں تھی۔ وہ تو بس ایک بار لارا کو اپنے بازوؤں میں لینا چاہ رہا تھا لیکن جلد ہی اس نے اس فضول خیال کو ذہن سے جھٹک دیا۔ وہ غیر طبعی موت نہیں مرنے چاہتا تھا۔

اسے بتا بھی نہیں چلا کہ کب بارش شروع ہوئی۔ لارا نے لپک کر صوفے سے اپنا رین کوٹ اٹھا لیا اور پہن لیا۔ پھر رچرڈ نے دروازہ بند ہونے کی آواز سنی۔ وہ اپنے ساتھ تمام زپور، نقد رقم اور گھر کی تمام قیمتی چیزیں لے گئی تھی۔ وہ چیزیں جو سوٹ کیس میں بہ آسانی ساسکتی تھیں۔

رچرڈ کو اس بارے میں ذرا سہمی شہ نہیں تھا کہ اگر وہ کھڑکی کا پردہ ہٹا کر دیکھے تو لارا سیاہ رنگ کی ٹوپیا کی طرف جاتی ہوئی نظر آئے گی جس کی ڈرائیونگ سیٹ پر لیری اس کا منتظر ہوگا۔ اس لیے اسے کچھ دیکھنے کی ضرورت نہیں تھی۔ لارا نے صرف اپنا اعتبار جمانے کے لیے لیری سے قطع تعلق کی کہانی سنائی تھی، ورنہ حقیقت یہ تھی کہ وہ اب بھی اس کا شریک کار تھا۔

لیکن جو کچھ وہ حاصل کر سکتی تھی وہ اس واردات میں کوئی مٹی نقدی اور زپورات سے کہیں بڑھ کر تھا یعنی رچرڈ کے مرنے کے بعد... وصیت کے مطابق وہ اس کی لاکھوں کی جائداد اور اثاثوں کی واحد وارث تھی لیکن وہ اس وصیت کے بارے میں کچھ نہیں جانتی تھی۔ اسی لیے اس نے دولت حاصل کرنے کے لیے یہ گھٹیا طریقہ اختیار کیا۔ اگر اسے یہ بات معلوم ہو جاتی تو وہ کبھی چھوٹے سے فائدے کے لیے اتنا بڑا نقصان برداشت نہ کرتی۔ رچرڈ نے سب سے پہلے اپنے وکیل کو فون کر کے وصیت منسوخ کرنے کو کہا۔ اسے نئی وصیت لکھوانے کی کوئی جلدی نہیں تھی اور وہ سوچ کچھ کر یہ کام کرنا چاہتا تھا۔

اس کے بعد نہ چاہتے ہوئے بھی رچرڈ نے فون اٹھایا اور پولیس ڈیپارٹمنٹ میں فون کر کے کہا۔ ”آفسیر ہا میں ایک جرم کی رپورٹ لکھوانا چاہتا ہوں۔“

اسے یقین تھا کہ لارا کے شوٹل سیکورٹی کاڈ کی مدد سے پولیس اس تک پہنچنے میں کامیاب ہو جائے گی۔ اس کا جو نقصان ہونا تھا وہ ہو گیا۔ کم از کم دوسرے لوگ تو اس کی کارروائیوں سے محفوظ ہو جائیں گے۔ اس نے تو ایک بیتی سے اسے فائدہ پہنچانا چاہا تھا لیکن وہ خود ہی اپنا نقصان کر گئی تھی۔

التجا

محمد شوکی

برے وقتوں میں دوست تو دوست ساتھ چلنے والے سائے کی بھی بڑی قدر ہوتی ہے مگر بدقسمتی سے ضرورت کے وقت سب سے پہلے ساتھ چھوڑنے والے بھی ہوتے ہیں۔ وہ خاندان جو طبقاتی اونچ نیچ کا شکار اور پمردی کا مستحق تھا لیکن نفرتوں کے تیر معصوم بچوں کو بھی زخمی کر گئے کیونکہ... اونچی ذات والوں کو ہر طرح سے برتری حاصل تھی جبکہ انہیں کھل کر سائنس لینے کی بھی اجازت نہ تھی۔

بعد از مرگ..... بھگتی روحوں کی درد انگیز التجاؤں کا قصہ

ٹھٹھک ٹھٹھک..... آواز سن کر کمرے میں بیٹھا ساتھ بیٹھنے سال کا ایک آدمی اپنی ٹینک سج کرتا ہوا کمرے سے باہر نکلا اور کچھ کچے بغیر مجھے گھورنے لگا جیسے میں کسی دوسری دنیا کی مخلوق ہوں۔

”جی مجھے کرائے پر کرنا چاہیے۔“ میں نے جلدی سے کہا تو اس کے چہرے پر حیرت مزید گہری ہوئی۔ اس لیے میں نے خود ہی اس کی توجہ اس عمارت کے بالکل اوپر گئے بڑے سے بورڈ پر مرکوز کر دی جس پر لکھا تھا..... ”شہر کے

مرکز میں کرائے پر کرنا..... گراہیہ نہ ہونے کے برابر۔“ جسے دیکھ کر وہ ایسا بیٹھا جیسے کوئی عجیب چیز غیر متوقع طور پر دیکھی ہو..... مگر اسی اثنا میں ایک سونے ی عورت جو اس کی بیوی لگ رہی تھی، باہر نکل آئی اور معاملہ سمجھتے ہوئے خود ہی میرا ایک کھینچتے ہوئے اندر لے گئی۔

”کرائے کے لیے آئے ہو؟“

”جی ہاں۔“ میں نے کہا۔ بس پھر تو وہ خاتون بولنا شروع ہو گئی۔

”بہت اچھا کمرہ ایک..... چوچی منزل پر ہے، بس تھوڑا اوپر ہے۔ خیر تم تو جوان آدمی ہو..... عمارت کے مالک مسٹر تیس نے چوچی منزل پر وہ کمرہ اسٹورم کے طور پر چھوڑ رکھا ہے۔ ویسے چوچی منزل پر رہتا ہی کون ہے، سارا حصہ ہی اسٹورم سمیٹ لو۔“ پھر خود ہی منہ چاڑھنے لگی۔

بانی چوچی منزلوں میں کمرے پر مختلف کمپنیوں کے آفس تھے شاید مگر مجھے کوئی نظر نہیں آیا، نہ کوئی بندہ نہ بندے کی ذات۔ مسٹر تیس میرا بیگ لیے آگے آگے چلنے لگی اور مجھے اشارے سے پیچھے آئے نوکھا۔ مجھے یاد ہے جب میں جانے لگا تو وہی بڑے مہاں جنہوں نے دروازہ کھولا تھا، مجھے حسرت بھرے انداز میں گھورنے لگے۔ آج میں سوچتا ہوں کہ کاش میں نے ان کی نظروں میں چھپا پیغام پڑھ لیا ہوتا جو گویا مجھ سے منت کر رہا تھا کہ یہاں کمرے پر مت رہو۔ شاید بڑے مہاں اس عمر میں اس خرافات عورت سے کوئی جھگڑا مول لینے کے موذ میں نہیں تھے۔

بہر کیف وہ خاتون جس نے اپنا نام مسٹر تیس بتایا تھا، مجھے کمرے کی بے شمار خصوصیات بتاتی رہی جس کا خلاصہ یہ ہے کہ یہ بلڈنگ بہت پرانی ہے اور اس کے مالک مسٹر تیس شہر کے مرکزی حصے میں رہتے ہیں مگر اس وقت مسٹر تیس کی ملکیت میں اس بلڈنگ کے کچھ ہی حصے رہ گئے ہیں۔ بانی وہ بیچ چکے ہیں اور جو باقی ہیں، وہ کمرے پر دے دیے ہیں۔ اور اس مقصد کے لیے مسٹر اور مسٹر تیس کو چوکیدار کے طور پر مقرر کر رکھا ہوا ہے۔

چوچی منزل پر پچھ عرصہ پہلے آگ لگ گئی تھی جس کے بعد مرمت کی نوبت نہیں آئی اس لیے یہ دونوں منزلیں خالی پڑی تھیں جہاں تک مجھے یاد ہے مسٹر تیس نے خالی عمارت ہی کہا تھا مگر میں سمجھا کہ لوگ کم ہوں گے مگر جب میں چوچی منزل پر پہنچا تو مجھ پر کارہ گیا اس لیے کہ پوری راہداری ایک خوفناک منظر پیش کر رہی تھی۔

دیواریں سیاہ اور دونوں جانب ادھ بچے دروازے اور دیواریں..... البتہ آخر کے دو کمرے ٹھیک نظر آ رہے تھے۔ غالباً آگ اس طرف سے شروع ہوئی ہوگی مگر آخر تک پہنچ کر بجھ گئی ہوگی۔ اس منظر کو دیکھ کر میرا دل خراب ہونے لگا اور میں نے کہا: ”میں یہاں میرا دل بہت گھبرا رہا ہے، براہ کرم میں چلتا ہوں۔“ کہیں اور دیکھ لوں گا۔ میری یہ بات سن کر اس نے ترختو اور نظروں سے مجھے گھورا۔

”دوسری بجلیوں کے کمروں کا کرایہ پتا ہے؟ شہر کے اس حصے میں نہیں جانتے کہ... کرایہ کیا ہوتا ہے؟“ اور یہی میری

دکھتی رگ تھی۔ اس لیے کہ یہ میری زندگی کی پہلی جانب تھی۔ میرا آفس شہر کے مرکز میں تھا اور یہ عمارت بھی مرکز میں تھی اور یہاں سے آفس پہنچنا بہت آسان تھا..... اور چونکہ شروع میں مجھے کچھ مہینے انتہائی کم تنخواہ میں بطور ٹرینی کام کرنا تھا اس لیے میرے لیے کسی اور آپشن کا سوچنا بھی ناممکن تھا۔

اسی اثنا میں ہم کمرے کے سامنے آگئے۔ مسٹر تیس نے ایک بڑے سے چابیوں کے گچھے میں سے ایک چابی نکالی اور کمرے کا دروازہ کھولا۔ میری امیدوں کے برعکس کمرہ اندر سے بہت اچھا اور سجا ہوا تھا۔ وہ زائل ہو گیا۔ اس بڑے احصاب پر جو جتنی تاثر چھڑا تھا، وہ زائل ہو گیا۔ اس بڑے سے کمرے میں قالین، بیڈ، میز، کرسیاں وغیرہ سب کچھ تھا..... میری حیرت کو دیکھ کر مسٹر تیس خود ہی بولی: ”اصل میں یہاں ایک اور بھلا ناس لڑکا رہتا تھا، تمہاری ہی عمر کا ہوگا..... بے چارہ۔“ اس نے ایک ٹھنڈی سانس بھری۔

”کیا ہوا..... بے چارہ کیوں کہا آپ نے؟“

”اس لیے کہ اس نے کمرے پر آنے کے چند دن بعد ہی کمرے کی کھڑکی سے چھلانگ لگا کر خودکشی کر لی تھی۔“

”خودکشی کر لی؟“ میں نے گھبرا کر کہا۔

”ہاں..... خودکشی۔“ مگر اس میں کمرے کا کیا قصور..... اس کا خود ہی کوئی نفسیاتی مسئلہ تھا۔ کچھ دنوں بعد ہی کہنے لگا ساری رات آوازیں آتی ہیں۔ بچوں کے دوڑنے کی، بچوں کے کھیلنے کی آوازیں۔ اب بھلا دیکھو، یہ عمارت جب سے جلی ہے کوئی پانچ سال ہو گئے۔ اس کا کس عداوت میں لٹکا ہوا ہے جس کی بنا پر اس کی مرمت بھی نہیں کی جاسکتی اس لیے اگر اب مسٹر تیس نے اونے پونے پر کمرے پر کمرہ چڑھانے کا فیصلہ کیا ہے تو اس میں میرا بھی فائدہ ہے۔ اس بہانے مجھے بھی کچھ کشیشن مل جاتا ہے۔“ مسٹر تیس نے اصل بات بتا دی۔

مسٹر تیس نے ٹھیک ہی کہا تھا۔ میں نے دل میں سوچا مجھے کون سا یہاں سارا دن رہتا ہے۔ صبح سے شام تک آفس، صرف رات کو ہی آتا ہے اور چوچی والا دن تو ویسے بھی اکثر دوستوں کے ہاں ہی گزرتا ہے۔

بہر حال اس طرح میں نے کمرہ کرائے پر لے لیا۔ کرائے پر مگر لینے کے بعد کے چند دن بہت مصروف رہے۔ سامان کی منتقلی کے ساتھ ساتھ کمرے کے نئے دن اکثر اوقات رات گئے واپسی ہوئی اور آتے ہی تین کی وادیوں میں کھوجاتا۔ کچھ دنوں بعد میں اس نئی روشنی کا عادی ہو گیا اور مجھے اس ویران اور ادھ بچے طور کے آخری کونے میں موجود اپنے کمرے سے ایک طرح کی انسیت ہو گئی اور خوف کا جو احساس ساتھ، وہ نہ

صرف قلم ہو گیا بلکہ مجھے اپنی قسمت پر رشک آنے لگا کہ شہر کے اس حصے میں کم..... کرائے پر مجھے کمرہ مل گیا۔

روز جب میں آفس جانے کے لیے بیڑھیوں سے نیچے اترتا تو مسٹر تیس کے کمرے کے سامنے سے ہوتا ہوا گزرتا اور آکر ایسا ہوتا کہ وہ دروازے پر ہوتی یا ان کا مظلوم سا شوہر ہوتا تو مجھے دیکھ کر ہاتھ ہوا میں لہرا دیتا۔ مسٹر تیس کے برعکس مسٹر تیس کی آنکھوں میں نظر آنے والا خوف البتہ مجھے ہر بار بے چین سا کر دیتا تھا۔

کوئی تین ہفتے بعد ایسا ہوا کہ مجھے دفتری ٹریننگ کے سلسلے میں دوسرے شہر جانا پڑا اور شاید میں چاروں بعد رات دیر گئے واپس آیا۔ واپسی پر مجھے حیرت کا ایک جھٹکا سا لگا کیونکہ جس فلور پر رہتا تھا، وہاں کا نقشہ ہی بدلا ہوا تھا۔ ابلی ہوئی عمارت کے بجائے ایک صاف ستھری سی عمارت، صبح سالم کروں کے دروازے..... میں حیران تھا کہ یہ کیا ماجرا ہو گیا۔ اتنی جلدی عمارت کیسے مرمت کر دی گئی..... بہر حال میرا کمرہ اب اس کا توں تھا اور میں جلدی سے بستر پر دراز ہو گیا۔

فالکارات کے کسی سپر میری آنکھ مل گئی۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے اوپر کی منزل پر پہنچے دوڑ رہے ہیں۔ میں بہت حیران ہوا..... کیونکہ اوپر کی منزل خالی بلکہ صرف چھت تھی۔ ہاں ایک دو ملائی کوارٹر سے بنے ہوئے تھے جس کے بارے میں مجھے بتایا گیا تھا کہ یہ پہلے عمارت کے ملازمین کے کمرے ہوا کرتے تھے۔ میں نے کچھ دیر سوئے کی کوشش کی مگر آواز بار بار رہی تھی۔ مجھے کافی کوفت محسوس ہوئی اور سوچا کہ صبح مسٹر تیس کے نکلتے کروں گا۔

رات کو آخر کار کسی پہرینڈ آئی مہی صبح مسٹر تیس کے نکلتے کے لیے سوچا مگر پھر یہ خیال آیا کہ عمارت کی مرمت کے بعد مسٹر تیس لازمی کرایہ بڑھانے کا کہے گی جس سے بیچنے کے لیے میں جان بوجھ کر کئی کئی کرکٹل گیا۔ اسی طرح واپسی پر بھی میں نے کوشش کی کہ مسٹر تیس کے کمرے کے سامنے سے گزرتے ہوئے ان کی نظر نہ پڑنے پائے۔

واپسی پر بھی وہی منظر تھا۔ ایک دو لوگ بھی نظر آئے جو فالکارت سے کرائے دار تھے اور وہ مجھے عجیب عجیب نظروں سے دیکھ رہے تھے۔ ان کے چہروں پر ایک عجیب سی بے نوری اور زندگی سے دوری کا احساس غالب تھا۔ یہ لوگ اپنے لباس اور چہروں میں ہر دور سے مجھے کافی امیر سمجھ کر اور ہنسنے نظر آئے مگر میں نظر انداز کرتا ہوا حسب معمول اپنے کمرے میں جاتے ہی بستر پر دراز ہو گیا اور تین کی وادیوں میں کھوجا۔ رات کے کسی پہر پچھلی رات کی طرح دوبارہ بچوں کے

ماہر ریاضی

ایک اسٹور کے مالک نے نئے ملازم کو گودام دکھا کر کہا۔ ”تمہیں اس گودام کے سارے سامان کی فہرست بتانی ہے۔“

دو پہر کو مالک نے آکر پوچھا۔

”کہاں تک پہنچے؟“

ملازم فخریہ انداز میں بولا۔ ”جناب! ابھی مونگ پھلی کی ایک ہی پوری سے فارغ ہوا ہوں۔ اس میں کل پندرہ ہزار نو سو ساٹھ مونگ پھلیاں ہیں۔ یہ بالکل صاف ہیں۔ سچرے کی کتنی ابھی باقی ہے۔“

اچھی بات

مالک ملازم سے۔ ”بے وقوف لوگ بھی کبھی کبھی اچھی بات کہہ جاتے ہیں۔“

ملازم۔ ”یہ بات آپ نے بہت اچھی کہی ہے۔“

مرسلہ: ریاضیٹ - حسن ابدال

دوڑنے بھاگنے کی آوازوں سے میری آنکھ کھل گئی۔ میں نے سوچا آج اوپر جا کر ذرا ان بچوں کی خبر لیتا ہوں۔ ہمت کر کے میں نے دروازہ کھولا اور چھت پر آ گیا۔ وہاں واقعی چند گندے سندے سے بچے کھیل رہے تھے۔ یہ چہروں سے بڑے مصوم لگ رہے تھے مگر ان کے بچنے پرانے معمولی کپڑے دیکھ کر مجھے بہت ترس آیا۔ مجھے دیکھ کر بچے سہم کر رک گئے۔ میں نے قریب جا کر ایک بچی کو ہاتھ سے پکڑا۔ اس کا ہاتھ برف کے مانند ٹھنڈا ہوا تھا۔ چہرہ ایسا ہوا تھا جیسے جسم کا سارا خون نچوڑ دیا گیا ہو۔ خوف کے احساس سے میں نے گھبرا کر ہاتھ چھوڑ دیا۔ البتہ بچی کی آنکھوں میں موجود ایک گہری مظلومانہ مصومیت سی تھی جو مجھے متاثر کر رہی تھی۔ آخر کار خوف کے تاثر اور رحم کا جذبہ غالب آ گیا۔ میں نے پیار سے پوچھا۔ ”تمہارا نام کیا ہے؟“

”نئی لکھی!“ بچی نے مصومیت سے کہا۔

”تم اپنی رات گئے کیوں کھیل رہی ہو؟“ میں نے پوچھا۔

اسنے میں ایک عورت جو غالباً اس کی ماں تھی کمرے سے باہر نکلتی نظر آئی۔ ”میرا دن بھر بیچاری بچی کام کاج میں لگی رہتی ہے۔ رات کو کبھی بھی بچوں کے ساتھ کھیل لیتی ہے۔“

چودھویں کی رات کے چاند میں ذرا روشنی ہو جاتی ہے تا یہاں۔ اس نے اٹکی سے اشارہ کیا۔ میں نے اوپر دیکھا۔

واقعی چودھویں کا چاند آسمان پر چمک رہا تھا اور بہت خوبصورت لگ رہا تھا۔ میں بچی کی ماں کی بات سن کر مسکرا دیا جیسے کہہ رہا ہوں اچھا کھیلو، خوب کھیلو اور کچھ دیر بعد نیچے آگیا۔ وہ آواز میں نہ جانے کتنی دیر تک اور آتی رہیں مگر جب میری آنکھ ملکی تو دن نکل چکا تھا اور آفس کو دیر ہو رہی تھی۔ اس طرح کچھ دن اور گزر گئے۔ آوازیں اب بھی بھیجی آتی رہتی تھیں مگر میں نے فیسوں کیا تھا کہ میں اس کا عادی ہو چکا ہوں۔ چند دن بعد ایک عجیب بات ہوئی۔ رات کے کسی پیر دروازے پر زور دار دستک ہوئی۔ دروازہ کھولا تو سات آٹھ افراد جن میں مرد اور عورتیں دونوں ہی تھے، ایک وفد کی سی صورت میں کھڑے تھے۔ ان کے ہاتھ میں ایک پرچہ تھا۔ ان میں سے ایک آدمی بولا۔ ”مسز؟“ وہ رکا۔ میں خود ہی بولا۔

”شون۔“

”جی مسز شون۔۔۔۔۔ جیسا کہ آپ جانتے ہیں کہ ہم سب معززین ہیں اور ہم سب کو صبح دفترا جانا ہوتا ہے۔ ملازمین کے بچے جو صحت پر رہتے ہیں، رات بھر شور کرتے ہیں۔ ہماری نیند خراب ہوتی ہے۔ یہاں تک کہ کہہ کر وہ رکا اور میرے چہرے کے تاثرات کا جائزہ لینے لگا پھر دوبارہ کہنے لگا۔ ”ہم یہاں ایک درخواست لکھ کر لائے ہیں جس پر تمام کرائے داروں کے دستخط لے رہے ہیں جس کا مقصد ملازمین اور ان کے بچوں کو سزا دینا ہے۔“

”مسز آؤنا؟“ میں نے نہ سمجھے کے انداز میں کہا۔

”جی ہاں، سب کے دستخط جب ہم لے لیں گے تو اس کا مطلب ہوگا کہ ہم سب ہی کا یہ مطالبہ ہے کہ ملازمین کے بچوں کو سزا دی جائے۔ اس طرح انتظامیہ کو بھی اعتراض نہیں ہوگا اور پھر ہم سب مل کر ان کو سزا دیں گے۔“ یہ کہتے ہوئے اس کے چہرے پر انتہائی سفاکانہ مسکراہٹ آئی۔ میں نے دیکھا کہ تمام لوگوں کے چہروں پر بھی ایسی ہی مسکراہٹ اور مکروہ مسکراہٹ رقص کر رہی تھی۔ اسی لمحے مجھے دائیں جانب کونے میں سڑکی سیٹی وہ بچی اور اس کی ماں نظر آئی جن سے رات کو میں نے بات کی تھی۔ ان کی آنکھوں میں، میں نے ایک واضح احتجاج حس کی۔ مجھے ایسا لگا یہ بغیر کہے مجھ سے ہیک مائیک رہی ہوں کہ خدا را اس پر دستخط کرو۔۔۔۔۔ میرا دل بچ گیا اور میں نے فیصلہ کر لیا کہ دستخط نہیں کروں گا۔ میں نے دل کڑا کر کے کہا۔

”دیکھیں حضرات! آپ شیک کہہ رہے ہیں۔ میں نے خود بھی صبح آفس ہی جانا ہوتا ہے مگر اس کا کل یہ نہیں کہ ہم

یوں ان معصوم بچوں کو سزا دیں۔ اس کا کچھ اور مل چیشہ کر نکال لینا چاہیے۔“

”کیا؟“ یعنی آپ دستخط نہیں کر رہے؟“ اس نے انتہائی کراخت لہجے میں کہا۔ میں نے دیکھا تمام لوگ مجھے کھا جانے والی نظروں سے گھور رہے تھے۔ غالباً اس جواب کی انہیں بالکل توقع نہیں تھی۔

”جی ہاں میں دستخط نہیں کروں گا۔“ میں نے فیصلہ کن انداز میں کہا اور دروازہ بند کر لیا۔ کچھ دیر تک مجھے دروازے سے باہر غصے میں پھری کھسک پھسکی آوازیں آتی رہیں پھر وہ آوازیں آنا بند ہوئیں۔ میں نے سکھ کا سانس لیا اور بستر پر دراز ہو گیا۔ ابھی کچھ دیر ہی ہوئی تھی کہ ایسا لگا دروازے پر کوئی آہستہ سے دستک دے رہا ہو۔ میں جھلا کر اٹھا اور بیڑی سے دوبارہ دروازہ کھولا مگر اس دفعہ دروازے کے باہر وہی مظلوم عورت اور اس کی معصوم بچی کھڑی تھیں۔ ان کو دیکھ کر نہ جانے کیوں ہمیشہ کی طرح میرا دل رجم سے بھر گیا۔

”ہم آپ کا شکریہ ادا کرنے آئے ہیں۔ آپ نے دستخط نہیں کیے۔۔۔۔۔ ورنہ۔۔۔۔۔ ورنہ۔۔۔۔۔“ وہ رکا گئی۔

”ورنہ کیا؟“

”ورنہ یہ ہمیں جان سے مار دیتے؟“

”کیا مطلب۔۔۔۔۔ جان سے کیسے مار دیتے؟“

”جی ہاں، یہ سب لوگ بہت ظالم ہیں۔ پہلے ہمیں بہت مارتے پھر صحت سے دھکا دے دیتے اور یہ کہہ دیتے کہ ہم نے غربت سے تنگ آ کر خود کشی کر لی۔“ عورت روتے ہوئے بولی۔ میں نے دل میں سوچا یہ عورت بھی ڈر اور خوف کی ایک انتہا پر پہنچی ہوئی ہے۔

”نہیں، نہیں۔۔۔۔۔ ایسا نہیں ہوگا۔ آپ جائیں آرام کریں۔“ یہ کہہ کر میں نے اسے بہلا پھسلا کر چلا کر دیا۔

صبح اٹھ کر جب میں آفس جانے کے لیے تیار ہو کر کمرے سے باہر نکلا تو میرے قدم وہیں رک گئے بلکہ خوف کی ایک لہری میری ریزہ کی ہڈی میں دوڑی۔ میری نظروں کے سامنے وہی بلی ہوئی خالی عمارت، ادھ جلتے دروازے تھے۔ ایسا لگ رہا تھا کہ چند دن پہلے جو مرمت شدہ عمارت دیکھی تھی، ابھی یہاں تھی۔ کیا راتوں رات دوبارہ آگ لگ گئی؟ میں نے خود سے سوال کیا پھر جلدی جلدی نیچے آیا۔ اب مسز بیکر کو بتاتے بغیر چارہ نہیں تھا۔ میں نے سارا ماجرا مسز بیکر کو سنایا۔ میری بات سن کر مسز بیکر جو پاس ہی تھے، ہانپتے کا پتہ میرے نزدیک آگئے۔ میں وہ لمحات بھول نہیں سکتا جب مسز بیکر کو میں نے بچی بار بولتے سنا تھا اور ان

لے ملازمین بہلا بھول بھی کیسے سکتا تھا۔

”سارہ (غالباً مسز بیکر کا نام) اب مجھے اس نوجوان کو تباہی لینے دو۔“ مسز بیکر نے لمبا سانس کھینچا جیسے اس نے اٹھارہ ڈال دیے ہوں۔ ”بیٹا اس عمارت کی ایک تاریخ ہے جو ہم سے چھپانا چاہتے تھے اور اس کی وجہ یہی تھی کہ ہم کو اب تک خود نہیں کیا تھا اس لیے ابھی کہ اس بات کو چند ہی تو ہوئے ہیں۔۔۔۔۔ آج سے چھ ماہ اس بلڈنگ میں اس طرح لوگ رہتے بیٹے تھے۔ خصوصاً جو تھا فلور جہاں رہائشی کمرے ہیں اس پر کافی لوگوں نے کرائے پر کمرے لیے ہوتے تھے۔ یہ کچھ امیر قسم کے اور کافی حد تک مغرور اور سخت دل تھے۔ سب سے اوپر کی منزل پر دو کمرے تھے جس میں اس بلڈنگ کے ملازمین کا ایک خاندان رہتا تھا جس کے کچھ بچے بھی تھے۔ کبھی کبھار بچے رات کو کھیل کھیل میں چھت پر اٹھ چادیتے تھے جس کی شکایت ان لوگوں نے عمارت کے مالک سے کی۔ اس پر عمارت کے مالک نے کہا۔ کہ اگر سب مالک یہ شکایت ہیں تو ایک درخواست لکھی جائے جس پر تمام کرائے داروں کے دستخط ہوں۔ اگر سب راضی ہوں گے تو سزا کے طور پر ہر طرف کیا جاسکتا ہے۔ ان کرائے داروں کی اس ایالیت میں مزید یہ۔ کیا کہ سب نے دستخط کرنے کے بعد مظلوم ملازمہ کی بچی کو خود سے بہت مارا تھی کہ زخمی بھی کر دی جس کے کچھ دن بعد بچی مر گئی۔ کچھ دن بعد اس غم میں ان کی ماں نے بھی عمارت سے چھلانگ لگا کر خود کشی کر لی۔ اس پر تنگ دل کرائے داروں نے بجائے افسوس کرنے کے اور خوشیاں منا لیں کہ جان چھوٹی۔ مگر اس اندوہناک واقعے کے چند دن بعد ہی عمارت میں اچانک رات کو آگ لگ گئی اور بہت سے لوگ مر گئے۔ عجیب بات یہ تھی کہ یہ وہی لوگ تھے جنہوں نے ملازمہ کی بچی پر تشدد کیا تھا اور ان کو قاتل کے لیے درخواست پر دستخط کیے تھے۔“

”درخواست؟“ مسز بیکر کو مجھے اچانک کچھ یاد آ گیا تھا اور وہ خوفزدہ سے ہو گئے تھے۔

”کیا ہوا، کوئی خاص بات ہے؟“ میں نے حیرت سے پوچھا ساتھ ہی میں خوفزدہ بھی تھا۔

”ہاں، مسز شون آگ لگنے کے بعد عمارت سے ایک مظلوم، وہی درخواست تھی جس پر سب نے دستخط کیے تھے۔ سب سے عجیب بات یہ تھی کہ وہ بالکل بھی نہیں ملتا تھا۔“ یہ کہہ کر اس نے ایک دراز میں سے ایک پرانا مکتبہ سالم نکالا جس میں کوئی میں نے قریب نام لکھے تھے۔

”یہ آخری نام۔۔۔۔۔ یہ لوگ رہا ہے بعد میں خود لکھا گیا ہے۔“

”آخری نام۔۔۔۔۔؟“ مسز بیکر ہنسی پائی انداز میں چلائی۔ ”یہ نام ان لوگوں کا نہیں لکھا ہوا۔ یہ اس کرائے دار کا ہے جو تم سے پہلے اس کمرے میں رہا تھا۔ اس کمرے میں رہنے کے کچھ دنوں بعد اس نے عجیب عجیب سی شکایات کرنا شروع کی تھیں کہ رات کو بچوں کے کھیلنے کو نے آوازیں آتی ہیں۔ جس پر میں نے غور نہ کیا مگر بعد میں اس نے یہ بھی ذکر کرنا شروع کر دیا کہ اس فلور پر رہنے والے لوگ آگے ہیں اور فلور کی بھی مرمت کر دی گئی ہے اور یہ کہ دوسرے لوگ بھی اس کھیلنے کو نے سے تنگ ہیں اور وہ سب دل کا لک بھارت سے ایک شکایت کی درخواست لکھ رہے ہیں تو میں اس کے نفیاتی ہونے پر کوئی شبہ نہیں رہا اس لیے کہ ایسے لوگ پہلے بھی آتے رہے ہیں لہذا ہم تو اسے عام سا نفیاتی مریض ہی سمجھ کر کیونکہ ہمیں نہ تو نے کرائے دار نظر آئے تھے، نہ ہی عمارت مرمت شدہ نظر آئی تھی۔۔۔۔۔ پھر ایک دن صبح کو اس کی لاش بین کھڑکی کے نیچے مڑک پر پڑی نظر آئی جس پر ہم نے یہی سمجھا کہ اس نے خود کشی کر لی۔ اس کے اگلے دن یہ مکتبہ میں دوبارہ باہر مین اسی جگہ نظر آیا جہاں پہلے ملا تھا اور اس میں واضح طور پر نئے کرائے دار کے نام کا اضافہ بھی ہو گیا تھا۔“

یہ کہہ کر مسز بیکر تو خاموش ہو گئی مگر مجھ پر صورت حال واضح ہوئی تھی اور میرا خیال ہے مسز اور مسز بیکر بھی مجھ جیسے تھے۔ نئے کرائے دار نے درخواست پر دستخط کر دیے ہوں گے جس کا مطلب یہ تھا کہ وہ ملازمہ کی بچی (روح) کو سزا دینے پر راضی تھا جس کے بدلے میں وہ ملازمہ اور اس کی بچی (روحوں) کے انتقام کا نشانہ بنا۔ اس کا صاف مطلب تھا اگر میں کل دستخط کر دیتا تو آج میری لاش بھی ملتی۔ گویا یہ دستخط موت کے پروانے پر دستخط تھا۔

مسز اور مسز بیکر خاموش تھے۔

میں جلالت کے انداز میں ان کے کمرے سے نکل آیا اور اس بلڈنگ سے تھوڑا ہٹ کر لمبے لمبے سانس لے کر اپنے اوسان بحال کرنے لگا۔ اسی اثنا میں میں نے جو مڑک دیکھا تو چوٹی منزل پر اپنے کمرے کی کھڑکی پر میری نگاہ پڑی۔ میں نے واضح طور پر دیکھا اور میں یہ بھول بھی نہیں سکتا کہ کھڑکی کے اس پار وہی ملازمہ اور اس کی معصوم بچی میری طرف دیکھ رہی تھیں اور ان کے چہروں پر ایک مسکراہٹ سی تھی جو میرے لیے اب اجنبی نہیں تھی۔ البتہ میں بیٹے میں شر اور بدشت زدہ انداز میں سوچ رہا تھا کہ کیا میں آج آفس سے واپس اس آئینی عمارت میں رات بسر کرنے دوبارہ آسکوں گا؟

پانچواں حصہ

رنگ آسمان

اے۔ آر۔ راجپوت

ماضی کی تنگ و تاریک مگر خوابناک راہداریوں سے جنم لینے والے ایسے کردار... جنہیں واقعات و شواہد نے خود ترتیب دے کر ان کی زندگی کی بے قراریوں کو ایک ایسے مقصد میں ڈھال دیا جس کا ادھورا پن بے شمار ہلاکتوں کا سبب بن جاتا... لہذا اس کی تکمیل کے لیے وہ باغی فطرت انسان میدان جنگ میں یوں اتراکہ دل کی دھڑکنوں کو بے ترتیب کر دینے والے گداز احساسات کو بھی بھول گیا لیکن... عشق تو پھر عشق ہوتا ہے... کوئی کتنا ہی بھولتا چاہے، عشق اپنا مسکن کبھی نہیں بھولتا۔ جس دل میں بس جائے اسے اپنے ساتھ ہی لے کر جاتا ہے... اور پھر ایک دن اچانک اس کے من کا موسم بھی بدل گیا کیونکہ... وہ فرنگی حسینہ دلی کے اس نوجوان کو دل دے بیٹھی تھی، جس کا ہر قدم آزمائش اور ہر نظر کسی امتحان سے کم نہ تھی، اس کے باوجود... خاک و خون کے اس کھیل میں نہ تو اس نے خوابوں کو بکھرے دیا اور نہ ہی جذبات کو بے لگام ہونے دیا۔ کیونکہ وہ آسمان پر بکھرے رنگوں کا مطلب جان گیا تھا۔

شرق و مغرب کے عجیب استراحت اور تاریخی جنوں خیزیوں کے عبرت

اثر اشعار میں لہرائی دلچسپ داستان



مہاراجا چندر گپتا کے لیے بڑی مشکل صورت حال پیدا ہو گئی تھی۔

اسے مقدس کی کارروائی اور اس دوران ہونے والے جھگڑے کے بارے میں اطلاع مل چکی تھی بلکہ یہ اطلاع ایک شکایت کے طور پر مہاراجا کی بددیانتی کے خلاف راج گھرانے کے گوش گزار کی گئی۔ اس کے ہمراہ اس کا چیلہا پرس رام بھی تھا۔

بددیانتی کے خلاف ایک دھوکا دہی نہیں رہی تھی۔ باقی جسم رہنہ تھا۔ شائے میں مہاراجا تھا۔ ہاتھ پر بڑا سناٹا تھا۔ گھٹنے ہوئے سر پر موتی سی چڑی تھی۔ مہارانی جوبائی بھی چندر گپتا کے بائیں ہاتھ والی ایک نشست پر شاہانہ نمکنت کے ساتھ براجمان تھی۔ بددیانتی کے کوئی نے شکایت کے لیے بلوایا تھا اور اب یہ ظاہر خاموشی سے جھوٹا تھا۔

”حضور آپ کے مہمانوں نے تو مقدمہ ہارتے ہی کالی کے مندر جیسی پوتر جگہ پر دو گنا فساد کر ڈالا۔ میرے پجاریوں کے ساتھ خوب مار پیٹ کی۔“ بددیانتی کے ساتھ نمک مرچ لگا کر ریٹا وغیرہ کے خلاف مہاراجا کو بھڑکانے لگا۔ وہ مکارا آدی تھا۔ اس نے دانستہ شوکت حسین کا نام نہیں لیا تھا، وہ جانتا تھا کہ شوکت کی حیثیت محض ایک ملازم کی سی تھی جبکہ ان کی ”سالار“ ابر ریتا تھی۔

”یہی نہیں حضور“ پرس رام نے بھی لقمہ دینا ضروری سمجھا۔ ”مقدمے کی بارے میں اس فرنگن دو شیرہ کے ساتھیوں کے درمیان آپس میں بھی چھوٹ ڈال دی تھی۔ پھر ان کے ہی ایک مسلے نوکر شوکت نے اپنے ہی مالگوں کے ایک آدی کو بھی گواہی دینے پر پریٹ ڈالا اور جب ہمارے ساتھیوں نے ان کے درمیان سچ بچاؤ کرنا چاہا تو وہ مسٹر اسلامان کے ساتھ بھی مار پیٹ کرنے لگا۔ بہت سرچڑھا رکھا ہے اس فرنگن دو شیرہ نے اپنے اس نوکر کو۔“

”مجھے تو حضور اس رنگین مزاج فرنگن اور اس مسلے نوکر کے درمیان کوئی چکر لگتا ہے۔“ بددیانتی نے مہارانی جوبائی والی آگ کو مہاراجا کے دل میں مزید فروزاں کرتے ہوئے کہا۔

”معاف کیجئے گا حضور اور پر سے ولی محمد نے اس مقدمے کی کارروائی کو کام کر ڈالا تھا، یوں سب لوگوں نے یہ مناظر دیکھے اور اب ریاست میں عام لوگ باگ مشتعل ہو رہے ہیں کہ کالی کے مندر میں دھارک پجاریوں کے ساتھ اس مسلے نوکر اور فرنگن نے بڑا اظہار کیا ہے۔ لہذا انہیں راج

محل سے ہی نہیں بلکہ ریاست سے بھی بے دخل کر دیا جائے۔ ورنہ پرجا پر اس کا برا اثر پڑے گا۔“ پرس رام نے پھر زہریں بجھا لقمہ دیا۔

ان دونوں سازشیوں نے راج محل میں آنے اور مہاراجا چندر گپتا سے ملاقات سے پہلے ہی ایک گل کھلا تھا۔ ایک شریہند ٹولا تیار کر کے ریاست کی طرف روانہ کر دیا گیا تھا، تاکہ وہ عام لوگوں کو راج محل کے مہمانوں کے خلاف بھڑکانے کا کام انجام دے سکے، ساتھ ہی اس بات کی بھی ٹولے کو سختی سے تاکید کی گئی کہ مہاراجا یا راج محل کے خلاف ایک لفظ بھی منہ سے مت نکالیں، کیونکہ یہ جانتے تھے کہ اس معاملے میں مہاراجا چندر گپتا کی قدر سخت تھا، وہ ایک لفظ بھی اپنے خلاف مستند نہیں کر سکتا تھا۔

”یہ سب جھوٹ ہے۔“ اچانک کمرے میں ایک بارعب سی آواز ابھری۔ بددیانتی اور پرس رام نے چونک کر نظر اٹھا کر دروازے کی طرف دیکھا۔ ولی عہد پر تاب بڑی شاہانہ چال کے ساتھ اندر داخل ہو رہا تھا، اس نے ان دونوں شاطریوں کی باتیں سن لی تھیں۔ مہاراجا چندر گپتا کے بائیں بازو پر پیشی مہارانی کے چہرے پر ناگواری کے تاثرات ابھرے تھے، ساتھ ہی وہ کچھ فکر مند سی بھی نظر آتی تھی۔

راج محل میں صرف ولی عہد اور مہارانی کو یہ اعزاز حاصل تھا کہ وہ بغیر اجازت کے مہاراجا چندر گپتا کے کمرے میں داخل ہو سکیں۔

یہ کہنے کے بعد راج کمار پر تاب نے بڑے احترام کے ساتھ باپ کو سلام پیش کیا اور اس کے قریب والی ایک نقشین مسند پر براجمان ہو گیا۔ وہ اب مہاراجا سے مخاطب ہو کے بولا۔

”پنتائی! یہ درست ہے کہ مقدس میں جیت ہماری ہی ہوئی تھی، لیکن بلوے کے ذمے دار وہ مہمان لوگ نہیں بلکہ وہ چارہٹے کئے پجاری تھے جنہوں نے نیبے اور اکیلے شوکی گومارنا پینٹا شروع کر دیا تھا۔“

مہارانی جوبائی جواب تک دانستہ مکارانہ خاموشی اختیار کیے ہوئے تھی فوراً بولی۔

”یہ غلط ہے، جھگڑے کی ابتدا اس آوارہ فرنگن دو شیرہ کے مسلے عاشق شوکت حسین نے کی تھی۔ مقدمے کی شکست پر آگ بگولا ہو کر وہ اپنے ہی ساتھی رابرٹ کو مارنے کے لیے لڑا تھا۔ سچ بچاؤ کی صورت میں اس نے دھارک پجاریوں کو بھی نہ پھوڑا۔“

رنگ آسمان

ایسے میں بددیانتی کے چیلے پرس رام نے مکاری سے کہا۔ ”میرا خیال ہے اگر ہم اسی بحث میں اٹھتے رہے تو کوئی ایک اور مقدمے کی ضرورت پیش آجائے۔ بہتر یہی ہے کہ اب اس تازہ صورت حال سے نمٹنے کے بارے میں سوچا جائے جس سے ریاست اور پرجا پر غلط اثر پڑنے لگا ہے۔ کیونکہ ہم پرجا پر کالی کے مندر کی پرتا پر الزام لگانے والے مقدمہ ہار چکے ہیں اور اب حضور کو اس سلسلے میں فوری طور پر کوئی آخری فیصلہ کر لینا چاہیے۔“

پرس رام اپنی بات پوری کر کے چپ ہو رہا۔ اس نے بڑی مکاری سے اس طرف سے دھیان بنانے کی کوشش کی تھی۔ تب ہی مہارانی جوبائی اپنے بچے سے مخاطب ہو کر بولی۔ ”پنتائی! میرا مشورہ تو یہی ہے کہ اس فیصلے اور احاطہ مسئلے سے ترنت جان چھڑالی جائے۔ جس کا سیدہ اسامہل بھی کچھ میں آتا ہے کہ مہمانوں کو یہاں سے فوری طور پر چلے جانے کا کہہ دیا جائے۔ پرجا شانت ہو جائے گی۔ ریاست اس سے زیادہ کئی اہم معاملات میں اس وقت الجھی ہوئی ہے۔ ان پر توجہ رکھنا ضروری ہے۔“

مہاراجا چندر گپتا اپنی بیوی اور بیٹے پر تاب سے بعض اہم ریاستی معاملات کے سلسلے میں مطلع و مشورہ کیا کرتا تھا۔ مائیکل شا کے اپنی جان پال سے کی گئی اہم نشست کے بارے میں اگرچہ ابھی وہ ان دونوں سے کوئی مشاورت نہیں کر رہا تھا، وجہ یہی تھی کہ مسئلہ تھا۔ تاہم مہارانی، جان پال کے علم و فہم کو دیکھتا تھا کہ برٹش گورنمنٹ اس کے بچے سے کیا چاہتی تھی اور جب جان پال کی آمد ہوئی تو وہ بھانپ چکی تھی کہ سرکار کیلکشیہ ان سے کون سا کام لینے والی تھی۔ چنانچہ مہارانی کا پچھلے چل کر اور مہاراجا چندر گپتا بڑے پریشان کن کچھ میں بیٹے کی طرف دیکھ کر بولا۔

”پر تاب! میں نے تمہیں یہ معاملہ خوش اسلوبی سے نمٹانے کی ہدایت کی تھی لیکن مجھے افسوس ہے کہ تم نے بجائے اس معاملے کو نمٹانے کے مزید اجداد لکھا رکھ دیا ہے۔ کاش! جان پال کے ساتھ میں مصروف نہ ہوتا تو خود ہی اس مسئلے کو حل کرنے کی کوشش کرتا۔ اب ہم کیسے ان مہمانوں کو یہاں سے چلے جانے کا کہیں؟ یہ بات ہماری شان کے ہی خلاف نہیں بلکہ مائیکل شا سے ناراضگی کا بھی سبب بن سکتی ہے اور اس وقت ہم ان کے ساتھ ایک اہم ریاستی معاملہ داری کے معاہدے میں ہیں جو ہٹا ہو سکتا ہے۔“

شوہر کی بات سن کر مہارانی دل ہی دل میں خوش ہوئی کیونکہ آج پہلی بار اس نے اپنی آنکھوں میں ٹھنکنے والے ولی

عہد پر تاب کے لیے شوہر کی زبان سے اس طرح کی عدم اعتمادی کا اظہار کرتے سنا تھا۔ اس نے لوہا گرم دیکھ کر پھر چوٹ کی بولی۔ ”یہ تو پھر واقعی مشکل بڑ جائے گی۔ ریاست کے وسیع تر مفادات میں سرکار کیلکشیہ کو براہ راست کابینہز مناسب نہ ہوگا۔“ وہ زدار کی اور پھر شوہر کی پریشانی کو مزید ابھارتے ہوئے دوبارہ مکاری سے بولی۔

”پنتائی! ابھی تو جرنل مائیکل شا کا رد عمل سامنے نہیں آیا ہے کہ اپنے دوست پر وفیسر ہنری برٹارڈ کی موت پر اس کے دل و دماغ کی کیا کیفیت ہوگی۔ میں نے سنا ہے کہ ہنری، مائیکل شا کے بہت پیارے اور قریبی دوستوں میں سے ایک تھا۔“

”یہی تو میرے لیے سب سے زیادہ چٹا کی بات ہے مہارانی!“ حسب توقع مہاراجا چندر گپتا نے انتہائی ڈھیلے دھجے میں کہا۔ ”مجھے اسی کے رد عمل کا انتظار ہے مگر یہ بھی سوچنا ہوں کہ اسے جواب کیا دیں گا؟ پر وفیسر ہنری کے سلسلے میں جرنل نے مجھے خصوصی طور پر کہا تھا کہ ان کا خیال رکھا جائے لیکن یہاں تو سب کچھ الٹ پلٹ ہو گیا۔“

”پنتائی! آپ ابھی سے اپنے دل پر کوئی بار نہ لیں۔“ مہارانی بولی۔ ”پہلے مائیکل شا کا رد عمل سامنے آنے دیں۔ بلکہ انہیں پہلی فرصت میں ساری تفصیل لکھ کر روانہ کر دیں کہ ان کے مہمانوں نے یہاں کیا گل کھلایا اور اگر انہیں جلد ہی یہاں سے ہجرت کرنے پر مجبور نہ کیا گیا تو صورت حال کسی کے حق میں نہیں رہے گی، پھر دیکھیں وہ کیا۔“

”پنتائی! آپ چٹا کیوں کرتے ہیں؟“ ولی عہد پر تاب اپنی ماں کی بات پر باپ سے بولا۔ ”میں خود ہی اس مسئلے کو خوش اسلوبی سے حل کر لوں گا۔“

”جیسے پہلے کیا تھا؟“ مہارانی، جوبائی، جوبی کی کاکوئی موقع تھا کہ کہیں جانے دیتی تھی فوراً فخریہ لہجے میں پر تاب کی طرف حیلے چٹوٹوں سے دیکھ کر بولی۔ ”تم اب رہنے ہی دو، پہلے کی طرح پھر اسے اچھا دو گے۔ دیکھتے نہیں ہو کہ تمہارے پنتائی پہلے ہی بہت پریشان ہیں۔ میں اپنے بیٹے انیش کمار سے بات کرتی ہوں۔ وہ بہت ذہین اور بھمدار ہے، اگر پہلے ہی یہ مسئلہ اس کے سپرد کر دیا جاتا تو اب تک خوش اسلوبی سے حل ہو چکا ہوتا۔“ مہارانی نے بڑی مکاری سے اپنے بیٹے کی توصیف کر ڈالی۔

”وہ کیا کر سکتا ہے مہارانی! اسے تو سیر سپاٹوں اور پھارم ریوٹوں سے ہی فرصت نہیں ملتی۔“ مہاراجا نے کہا تو

بھونگی ہوں بلکہ کردی گئی ہوں۔ میرا اب دنیا میں آپ کے سوا اور کوئی نہیں ہے۔ خدارا امیری ہو کر کریں۔ میرے پیارے پاپا کو یہاں ایک سازش کے تحت قتل کر دیا گیا ہے اور اسے دانستہ ایک حادثے کا رنگ دیا جا رہا ہے۔

”آپ ضرور سوچ رہے ہوں گے کہ بھلا ایک سادہ لوح انسان کا کون دشمن ہو سکتا ہے؟ تو آپ کی یہ بات صحیح ہے۔ وہ آپ کے بچپن کے اور سب سے عزیز ترین دوست تھے۔ آپ ان کی فطرت جانتے تھے کہ انہیں بچپن سے کتنی محبت تھی۔ اسرارِ محسوس کے سر بستہ راز جاننے کا انہیں کس قدر جنون تھا۔ وہ تحقیق اور ریسرچ کے کس قدر دلدادہ تھے۔ وہ ایک کتاب لکھنا چاہتے تھے ”مشرق کے سر بستہ راز“۔ یہ کتاب وہ انگلستان کی بڑی بڑی یونیورسٹیوں میں متعارف کروانا چاہتے تھے۔ آپ جانتے ہیں کہ یہ کتاب ان طالب علموں کے لیے کس قدر اہم اور دو گار ثابت ہوئی۔ اپنے ملک کا نام پوری دنیا میں روشن ہوتا۔ خیر! میں آپ کو وجہ بتاتی ہوں جو میرے بابا کے قتل کا محرک بنی۔

”دراصل..... ناگروہ میں پہلے ہی سے مخلاتی سازشیں درپردہ پروان چڑھ رہی ہیں۔ پاپائے ایسی ہی کسی درون خانہ پرورش پانے والی سازش سے تادانستہ طور پر پردہ اٹھانا چاہا تھا، جہاں تک میرا خیال ہے۔“

اس کے بعد ریٹانے اطلاع نامے میں مقدمے کی کارروائی سے ملے کر وہ سب بتا دیا تھا کہ کس طرح اب ایک سازش کے تحت انہیں..... ریاست نامہ سے بے دخل کرنے کی ایک نئی سازش تیار کی جا رہی ہے۔ جبکہ وہ اپنے انجمنیاتی کارکنوں کو پورا کرنے کا ارادہ بھی رکھتی ہے، جواب اس کی زندگی کا ایک اہم مقصد بن گیا ہے۔ ”لہذا مانی و نیرا کھل! آپ برائے مہربانی چند گہیتا کے سلسلے میں سخت احکامات جاری کریں کہ وہ آپ کے عزیز دوست اور میرے پیارے قاتلوں کو نہ صرف بے نقاب کریں بلکہ انہیں کیفر کردار تک بھی پہنچائیں۔ میں آپ کا یہ احسان ساری زندگی نہیں بھولوں گی۔“

ریٹانے کچھ اس طرح خط میں آہ و زاری کی بھی کہ مائیکل شا کا دل پیچ گیا۔ یوں بھی اگرچہ اپنے ملک اور قوم کے ساتھ بہت پیچے اور بہت سخت اصول پرست ہوتے ہیں۔ ان کی قوم کا یا ان کے ملک کا جا بے عام آدمی ہی کیوں نہ ہو وہ اگر کسی اور دیش میں قتل یا ہلاک ہو جائے یا اس پر کوئی مشکل آئے تو بڑے تودہ اسے اپنی ضد اور ان کا مسئلہ بنالیتے ہیں اور اس کی مدد کے لیے جہنم کا انتہائی قدم اٹھالیتے سے بھی دریغ نہیں کرتے، جا بے وہ قصور واری کیوں نہ ہو۔ اپنی قوم اور

”اور اگر..... پتاجی نے بتانے پر اصرار کیا تو؟“

”بے وقوف! وہ نہیں کر رہے۔ جاؤ تم۔“ محبوبائی

مہزک کر بولی اور ایش اسی وقت چل دیا۔ اس نے اپنے باپ سے وہی جاکر کہہ دیا جو اس کی ماں نے اسے سکھا تھا۔

اس کے بعد منتقلیہ فیصلے سے درمیانی راہ اختیار کی گئی تاکہ سب زیادہ نہیں تو تھوڑے بہت راضی رہیں۔ مہمانوں کو جو وہ حالات کے پیش نظر نہایت معذرت اور احترام کے ساتھ دریاست سے تو نہیں البتہ راج محل سے ملے جانے کا کہہ دیا جاتا۔ اس کے لیے نجوبائی نے بدری تاتھو کو ٹکھا پڑھا دیا تھا کہ اس فیصلے کے بعد ”غافلہ“ نہ چلیا جائے..... بلکہ اس معاملے کو فراموش ہی کر دیا جائے۔ جب تک کہ رینان کے ملاظ خود سے کوئی قدم نہیں اٹھاتی۔ ایسا ایس کے ایما پر مٹھار کیا جاتا تھا۔ اگرچہ اس کے درپردہ نجوبائی کے دماغ کی کارستانی ہی کا فرما تھی۔ جبکہ بدری تاتھو نے وہی کرتا تھا جو مہارانی نے اسے پہلے سے ہی سمجھا رکھا تھا۔

اب صرف جنرل مائیکل شا کے جوابی خط کا انتظار تھا۔

☆☆☆
دہلی کے قلعہ بند کرے میں بیٹھے جزل مائیکل شاہ کو راج
میں متعین کا اپنے یقین منٹ بروجہ کا اطلاع نامہ ملا تو وہ
مٹے میں آگیا۔

اس نے دوست پرفیسر ہنری کی اس جانگاہ موت پر جہاں
اسے بے حد افسوس ہوا تھا، وہیں وہ بہت برہم بھی ہوا۔
لیف بروجر نے رینا کی زبانی یہ سارا قصہ سننے کے
بعد مرن وں ویسا ہی لکھ دیا تھا، جیسے کہ رینا نے اسے بتایا تھا کہ
اس کے باپ ہنری کی موت کیسے اور کن حالات میں ہوئی
تھی جس کے مطابق..... اس کے باپ کی موت کو جو ایک
سوہی سمجھی سازش کے تحت ایک قتل تھا کراسے حادثاتی موت
کاشخات تر اردیا جا رہا تھا وغیرہ۔

اپنے عزیز دوست کی بیٹی رینا کے اس خط پر جزل
مائیکل شاپچھ اچھن آمیز سوچ کا بھی شکار ہو گیا، بھلا ایک سادہ
لوہر پر وفسر، جو سیاست اور اس قسم کے معاملات سے دور تک
کا بھی واسطہ نہیں رکھتا تھا، وہ بھلا کیونکر کسی سازش کا شکار
ہو سکتا ہے؟

لیکن ایک دور و دور بعد اسے لیف برجر کا دوسرا خط ملا تو وہ اگ بگولا ہو گیا۔ کیونکہ اس خط میں رینانے نہ صرف تفصیل سے بتایا تھا بلکہ لیف برجر نے اپنے بھی کچھ خوش خیالات کا اظہار کیا تھا۔ رینانے لکھا تھا.....

محبوبائی کے ساتھ تھا اور اس کے اشارے پر ہی »
 چلتا تھا۔ محبوبائی کے شاعر اندوہن میں جوتہ کیب آئی تھی، وہ
 اب اس گفتگو کے بعد فوراً اس پر عمل کرنا چاہتی تھی۔ لہذا یہ
 نشست تمام ہوتے ہی وہ فوراً انہایت خاموشی مگر چابک دستی
 سے اپنی راہ رہ گئی۔

مجبوری نے اپنے خاص غلام کچھو رام کو بلایا اور اسے
مہا ہجاری بدری تاجھ کے لیے خصوصی ہدایات دیں اور اسی
وقت کالی کے مندر کی جانب روانہ کرویا۔ وہاں سے وہ اپنے
بیٹے چھوٹے راج کمار ایش کے پاس آئی تو وہ ماں کو دیکھتے ہی
بے چینی سے بولا۔

”ماتا جی! اپنا جی نے مہانوں کے لیے کیا عندیہ دیا ہے؟ کہیں انہیں راج محل سے بے دخل ہونے کا حکم تو نہیں دے ڈالا؟“ کٹاؤ لے بیٹے کی بات سن کر رنجوبائی نے اپنا سر پکڑ لیا اور بولی۔

”کیا ہو گیا ہے تمہیں ایسا! تم آخر یہ بچوں والی باتیں کرنا کب چھوڑ دے گے اور کب جوان ہو گے؟“

”کیا ہوا ماما جی! بہت غصے میں ہیں آج آپ.....؟“
 بیش کمار، ماں کے تپور دیکھ کر فوراً ڈپوسا ہو کے بولا۔ وہ دراصل
 مہنی ماں سے دہتا تھا۔

”فخر تو مجھے اپنے آپ پر ہے کہ تمہارے جیسے بے وقوف اور نامکھ بٹے کو ختم دیا۔“ عجوبائی کا تھا پیٹ کر بولی۔
 ”میں تمہیں ریاست کے بولی عہد کے روپ میں دیکھنا چاہ رہی ہوں اور تم.....“ فخر تو خراشہ اٹھانے لگوں سے کہا لہذا بتائے جن سے
 پوری ریاست کی پر جانفرت کرنے لگی ہے۔“ عجوبائی کا کلاشارہ
 دینا وغیرہ کی طرف تھا۔

”لیکن ماما! او سب جھوٹ اور محض پروپیگنڈا ہے۔“
 ”ایس اے“، عجوبائی کو غصہ آ گیا۔ ہاں کو رہم دیکھ کر ایس
 بھی خفیف سا ہو گیا۔ ”میں تمہیں جو بات کہنے اور سمجھانے آئی
 ہوں، تم صرف اسی پر اپنی توجہ مرکب کئے ہو۔“

”جی ماما جی اعظم کریں، میں سن رہا ہوں۔“ بالآخر
میش نے سر جھکا لیا۔ اسے اب اپنی ماں کا ہر وقت دباؤ والا لہجہ
کھاننے لگا تھا مگر وہ جیب تھا۔

”تم اسی وقت اپنے پہنچنے کے پاس جا کر کہو گے کہ تم یہ سزا سنانی سے حل کرنے کی سکت رکھتے ہو۔ وہ تم سے پوچھیں گے کہ تمہارے ذہن میں ایسا کیا ہے؟ تم نہایت ادب سے ابھی مصلحت اندیشی سے کام لوں گا۔ آپ بس بھی مجھ پر کیوں دھواں کریں اور جرنل مانگیل شاہ کے اولین خط کا انتظار کرنا جائے۔“

2018 年 1 月

محبوبائی ذرا خفا ہو کے شوہر سے بولی۔
 ”آپ تو بس ایسے ہی میرے بیٹے ایش کو بڑا کہتے
 رہتے ہیں۔ آپ کو تو بس ہی اچھا لگتا ہے اور ہر سے
 آپ اسے ہی میرے بیٹے پر فوقیت دیتے رہتے ہیں۔“
 ”بات اچھے بازرے لگنے کی نہیں ہے۔ پر تپاب کی
 طرح ایش بھی میرا بیٹا ہے، میرا ہی خون ہے وہ.....“ بیوی کو
 ناراض بنا کر مہاراجا ہلاک۔

”آپ نے کبھی ایش کو کچھ کرنے کا موقع ہی کب دیا ہے بھلا؟“ پتی کہتی ہوں کہ ایک بار تو آپ کو اس کی ذہانت کو آزمایا لیکن چاہیے۔۔۔“ نجو بانی بدستور اسی لہجے میں بولی تو مہاراجا حیرت سے یہی کی طرف دیکھ کر بولا۔

”ایک بار.....! ہم تو اسے کئی بار آزما چکے ہیں۔ اول
کسی معطلے میں دلچسپی ہی نہیں لیتا اور چارونا چار لیتا بھی
ہے تو الٹی لنگا بہا دیتا ہے۔“

”رہنے دیں اب..... آپ کے لاڈ کی وجہ سے وہ ایسا کرتا ہوگا آپ ایک بار اسے کہہ کر تو دیکھیں۔ وہ خود بھی آنا جاہور ہاتھ آپ سے اس مسئلے کے بارے میں بات کرنے کے لئے“ میں نے پیس بخ کر دیا۔ کیا فائدہ جب آپ اسے اہمیت کی نہیں دیتے۔“

”یہ غلط ہے، ہم اپنے چھوٹے راجہ کو بھی اتنی ہی اہمیت دیتے ہیں جتنی کہ بڑے کوکر.....“ مہاراجا نے دانستہ پنہا جھلرا دھورا اچھوٹا اور بولا۔

”ایچھا ذرا بلاؤ..... ایش کو۔“

”وہ اس وقت مہمانوں کے ساتھ ہے اور ان کی۔۔۔
 یہی کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔“ نوجوانی نے بڑی مکاری سے
 صوف بولا۔ ”آپ کے کہنے سے پہلے ہی وہ اس معاملے کو حل
 کرنے کی کوشش میں معروف ہے۔ مجھ سے کہہ رہا تھا کہ
 کاجی سے کہہ دینا کرنے کی ضرورت نہیں، میں کل تک
 اس پرے مسکے کونوا دوں گا۔“

بیوی کی بات سن کر مہاراجا کو حیرت بھی ہوئی اور خوشی
 بھی مگر پوری طرح وہ مطمئن نہیں ہوا۔ تاہم خاموش رہا۔

درحقیقت نچوٹائی کے شاطرائہ ذہن میں ایسے نازک
تنت میں ایک اور چیلنج کا ری چلنے کی ترکیب بھٹائی دی
گئی۔ کہنا کہ اناس نے خود ہی چھٹا مردہ اس کا ”کریڈٹ“
چنے بیٹے ایش کو مار دیا تھا جس کی تاک میں مہاراجا چندر گپتا کے
میں بھی ایش کے لیے آتی تھی، اہمیت اجاگر ہو گئی تھی کہ
اسے راج مکار برباب کے لیے بھی۔

سازشی عناصر یعنی مہا پجاری بدری ناتھ کا ٹولا مہارانی

اپنے ملک کے فرد واحد کی مدد اور اس کی کامیابی کو وہ اسے پوری دنیا میں اپنی سرخروئی سمجھتے ہیں۔

مائیکل شاپیس فرنگی کا بھی یہی حال تھا۔ دراصل فرنگیوں کو اپنے دیس انگلستان کے مقابلے میں مشرق کا یہ دیس (برصغیر) بہت بھایا تھا۔ وہ اس پر اپنے غاصبان قبضے پر بہت فخر کرتے تھے، جنگی بات تو یہی تھی کہ لندن میں اس وقت الویولا کرتے تھے وہاں کی معاشی و اقتصادی حالت اترتی۔ ہاں! یہ ضرور کہا جاسکتا تھا کہ وہ مسلم مسلمانوں کی تھوڑی سی استفادہ ضرور کرتے تھے اور اب اسی روش پر قائم تھے۔ اگر یہ کتنا ہی متعصب ہو لیکن وہ غیروں کی اچھی اور مفید باتوں سے استفادہ اٹھانے میں کسی قسم کے بغل یا تعصب سے کام نہیں لیتا۔ نفرت اپنی جگہ لیکن اپنے مفاد کو ترجیح دیتا ہے اور شاید یہی ان کی ترقی کا راز بھی ہے۔ پھر برصغیر میں ایک طویل عرصہ گزارنے اور ہندوؤں بیٹوں کے ساتھ گھ جوڑ کے دوران تو ان کی مکاریاں دو چند ہو گئی تھیں۔

رینا سے متعلق اطلاع نامے کی بین السطور پڑھنے کے بعد اس نے آخر میں لیف برودجر کی سطور بھی ملاحظہ کیں۔ اس نے لکھا تھا۔

”آزمنیل میجسٹی جنرل مائیکل شا..... اراج محل میں مجھے کچھ باقی گروپ کے جاسوسوں کی آمد کا شبہ ہے۔ ان کی تعداد تین ہے اور میں ان پر کڑی نظر رکھے ہوئے ہوں مگر انہوں سے کہنا پڑتا ہے کہ اس سلسلے میں مہاراجا چندر گپتا اور ان کے سینا پتی موح سنگھ میرے ساتھ بالکل بھی تعاون نہیں کر رہے ہیں۔ لیکن باوجود اس کے میں اپنی کوششوں میں لگا ہوا ہوں جس کے لیے مجھے آزمنیل میجسٹی نے یہاں تعینات کر رکھا ہے۔“ آخر میں لیف برودجر نے اپنا نام اور عہدہ درج کر دیا تھا۔ اس اطلاع نامے نے جنرل مائیکل شا کو گہری اور چرتوشیں موج میں غلغلان کر ڈالا تھا۔

کوئی اور موح ہوتا تو وہ اپنے متعین کار لیف برودجر کی اس اطلاع پر کوئی ند کوئی ایکشن ضرور لیتا لیکن ابھی وہ مجبور تھا۔ اٹھائے راہ..... اسے مہاراجا چندر گپتا کا بھی اطلاع نامہ موصول ہو گیا۔ اس نے من و عن وہی کچھ لکھ ڈالا تھا جیسا کہ اس کی بیوی مہارانی گجوبائی اور مہاراجا کی بددیانتی نے اسے بتلایا تھا۔ اس خط نے تو مائیکل شا کی سوچوں اور تفکرات کو اور بھی گہرے میں بدل ڈالا۔ وہ پہلے ہی ریاست ناگرہ میں سیاسی چھوڑی پکانے میں مصروف تھا۔ ایسے میں اس نے سوچا کہ اگر وہ مہاراجا کی بات رو کر تا ہے تو اس کے دیرینہ مقاصد کے متاثر ہونے کا احتمال ہو سکتا

ہے اور اگر اپنے عزیز... دوست کی بیٹی کی باتیں رو کر۔ تو انہوں کے وطن کو نقصان نہ پہنچا تھا۔ اس نے کوئی درمیان راہ سوچی اور پھر اس کے بعد اس نے رینا اور لیف برودجر جواب میں لکھ دیا۔

”رینا ڈیڑا تم خود کو بالکل تھامت سمجھنا۔ مجھے اپنے عزیز ترین دوست ہنری کی موت کا دکھ ہے۔ اگر تم واقعی مجھ کو ہو کہ ایسا ہے یعنی وہ کسی سوچی سمجھی سازش کا شکار ہوئے ہیں اس بارے میں شفاف اور غیر جانبدارانہ تحقیقات کے لیے میں ابھی مہاراجا چندر گپتا کو بھی ایک خصوصی پیغام بھیج رہا ہوں۔ کچھ سیاسی مصلحتوں کی وجہ سے ہم ابھی کوئی سخت قدم اٹھانے سے قاصر ہیں لیکن تم فکرمات کرو۔ اپنے طور پر تم جو کچھ وہاں کرنا چاہتی ہو کرتی رہو، تمہیں یا تمہارے ساتھیوں کو راز کا محل یا ریاست ناگرہ سے کوئی بھی بے دخل کرنے کی جرأت نہیں کر سکتا اور اگر ایسا ہو بھی جاتا ہے تو تم حالات کے مطابق کوئی بہتر فیصلہ کر سکتی ہو۔ لیف برودجر وہاں تمہاری مکمل پشت پناہی کرے گا۔ لیکن مائی ڈیڑے بی بی! میں اس وقت مجبور ہوں لیکن میری یہ مجبوری عارضی ہے۔ گوہ شمالیہ میں ہمارے کچھ پتلی حکومتیں قائم ہونے کے بعد جس کا وقت کچھ زیادہ دور نہیں، میں تمہارے یہ سارے مسائل کو اڑکی دھار اور بندوبست کی نال سے بیک قلم حل کر دوں گا۔“

دوسرا خط جنرل شانے اپنے متعین کار لیف برودجر کو لکھا۔

”برودجر! تمہیں جن پر شبہ ہے، ان پر کڑی نظر رکھے رہو کہ تمہیں وہاں اسی اہم مقصد کے لیے اراج محل میں متعین کیا گیا ہے اور ایسا ابھی رضامندی اور مشترکہ مفادات کے لیے ہی کیا گیا ہے۔ ری بات راج محل میں عدم تعاون کی تو ابھی تمہیں یہ کڑا گھونٹ پینا پڑے گا۔ تم جانتے ہو کہ ہمارا ناگرہ میں اصل مشن کیا ہے۔ اتنا لکھنے کو کافی جانو اور جن جاسوسوں پر تمہیں شبہ ہے ان کے خلاف تم خفیہ کارروائی مکمل میں لاسکتے ہو۔ تاہم میں پھر بھی اس بارے میں تعاون کے لیے مہاراجا گپتا کو بھی ایک پیغام رسید کر رہا ہوں۔“

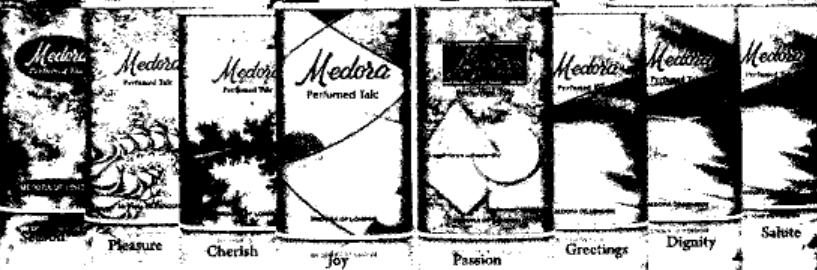
تیسرا خط اس نے گپتا کو لکھا جسے دانستہ مائیکل شانے مختصر ترین رہنے دیا تھا۔ اس میں پروڈیئر ہنری اور رینا سے متعلق اور برودجر سے تعاون کے علاوہ یہ مسئلہ اس کی اپنی (مہاراجا وغیرہ کی) صوابدید پر چھوڑ دیا گیا تھا۔

مائیکل شا..... ابھی مہاراجا کے خلاف کوئی سخت کارروائی کرنے سے قاصر تھا۔ وجہ اس کی یہی تھی کہ وہ ان کے وسیع تر مفادات میں ان کا حلیف تھا۔ جان پال سے کامیاب



Medora
Perfumed Talc

عشوق شو جو دل کو بہلائے
تاریق جو شکر کوئی چاہے



عشوق شو جو دنیا کے 8 شگفتہ احساس

MEDORA OF LONDON

اس کی بات پر گورنر ڈینی نے اپنے سر کو برطانیہ انداز میں اٹھائی جیش دی تھی۔ یہی وہ وقت تھا جب اس کی چست دھماکے نظروں نے قریب کھڑے پست قامت ہندوستانی شیورائے بھولکر کے چہرے کو تڑپا اور مفتی خیر انداز میں مسکرا کر اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

”شیورائے ابریش آرمی تمہارے مشورے کے بغیر ایک انچ بھی جیش قدمی نے کر سکتی۔ تم ان خود مختار ریاستوں کی ساری داخلی صورت حال سے واقف ہو۔“

شیورائے بھولکر اس کی بات کا مطلب سمجھ کر بولا۔

”ہر ایک لپٹی، ان خود مختار ریاستوں کو اندرونی خانہ جنگی کی زد میں لیتے ہوئے جو جواز میں درکار ہے وہ جنگ کی راہ ہموار کرنے کے لیے کافی ہے۔ پھر بھی ہمیں ان نوابوں اور مہاراجوں کے کانڈھے کی محتاجی رہے گی اور یہی روش جنگ کے لیے بہتر بھی رہے گی۔ اسی لیے ان کی عملاتی سازشوں کے نتائج پر نظر رکھتے ہوئے اور ان کے دوسری ریاستوں پر قبضہ کرنے کے خواب اور لالچ کو خفیہ طریقے سے ابھارتے رہنا ہمارے منصوبوں کے لیے مفید رہے گا۔“

”ہوں۔۔۔۔۔“ ڈینی نے ایک سمجھ بھرا خارج کیا تھا۔ شیورائے بھولکر کے رائے ان کے عسکری عزائم کے لیے کافی تھی۔ اس کے بعد ڈینی اپنی رجمنٹ کے کمانڈنگ افسر جرج الیکیم کے ساتھ پہلی آواز میں باتیں کرنے لگا۔ وہ اپنے سر کو اٹھائی جیش دیتا رہا۔ سیاست کے کھیل کے ساتھ بلیئر ڈاکٹریل بھی جاری رہا اور کاروبار حکومت بھی۔۔۔۔۔

سب سے آخر میں یہی طے پایا۔ کہ ایکشن پلان کو وہیں روک کر پہلے جنگی حکمت عملی پر توجہ دینی چاہیے، تاہم اس عرصے کو مختصر رکھا جائے تاکہ باقی مسلم گروہوں کو زیادہ عرصے تک وہاں اپنی خفیہ کمین گاہیں بنانے کا موقع مل سکے۔

فرنگیوں کو اپنے اقتدار کے لیے سب سے زیادہ خطرہ کوہ شالیہ سے تھا۔ اس کی سب سے بڑی مسلم ریاست تریپال تھی جس کے نواب شہباز خان سے انہیں یہی خطرہ تھا کہ۔۔۔۔۔ وہ ان باغی گروہوں کو سپورٹ کر سکتے تھے تاکہ انہیں اپنی بکھری ہوئی طاقت کو نکھارنے کا پورا موقع مل سکے۔ یوں بھی فرنگی یہاں اپنے اقتدار کے قبضہ کا خواب دیکھتے ہوئے تھے۔ لیکن یہ قبضہ کٹھ پتلی کی شکل میں ہی ممکن تھا، یعنی ایسا مہاراجا جونا کی (فرنگیوں کی) غلامی کا دم بھرتا رہے اور ریاستی معاملات کو بھی ان کے حق میں ہموار رکھے۔

اس ”بلیئر ڈوم میٹنگ“ کے بعد مائیکل شاپینی اقامت گاہ میں آکر کمرے میں بند ہو گیا۔ وہ اپنی میز پر بیٹھا

ہاتھ آجائیں تو زیادہ بہتر ہوگا۔ ایکشن پلان تو تیار ہے، نواب وار اسٹریجی کو ابھی محفوظ رکھا جائے، یوں بھی کوہ شالیہ میں ابھی سخت برف باری کے موسم کی آمد ہے۔ تاہم جنگی حکمت عملی کے مکمل ہوتے ہی بہر صورت ایکشن پلان پر عمل کیا جاسکتا ہے۔“

برقیے موٹی اثرات کا ذکر ڈینی نے محض اس لیے کیا تھا تاکہ یہ اس لیے سلیقے سے اپنا کام نہ سنا سکیں۔

”تم کیا کہتے ہو کرل؟“ ڈینی کا شیورائے بھولکر کی طرف دیکھا جو بھڑکی فارسی کی باری کے بعد اپنی باری کی دہری میں تھا۔ وہ جواب دیا۔

”میں مشرڈان کیورٹم کی بات پر اتفاق کرتے ہوئے بھی کہوں گا کہ کوہ شالیہ اس وقت ہمارا سب سے زیادہ ہاٹ اسپاٹ ہے۔ نہ صرف یہ بلکہ ہمارا مقصد صرف پالپ اور تریپال پر چڑھائی کرنا نہیں، بلکہ ناگرہ کو بھی قبضے میں لینا ہے۔ ناگرہ چونکہ ہمارے حلیف کی حیثیت رکھتا ہے لہذا اس پر قابض ہونے کا یہی طریقہ ہوگا کہ وہاں کوئی ایسا حجاز بنایا جائے جو کھس اس کی زد میں آتا ہو۔ ورنہ دیگر ریاستوں کے نواب اور مہاراجے ہماری اس سیاست کو سمجھ جائیں گے اور پھر وہ ہم سے خیر سگالی اور مشترکہ مفادات کی آڑ میں معاہدہ کرنے سے کترائیں گے۔ یوں ہمارا آزاد ریاستوں پر قبضہ کا خواب۔۔۔۔۔ اور مارا جائے گا۔“

”ہوں۔۔۔۔۔“ ڈینی نے ایک بار پھر خیال انگیز ہکاری مہری۔ پھر اس نے استفسار یہ انداز میں بھڑکی فارسی کی طرف دیکھا۔

”میں بھڑکی فارسی۔۔۔۔۔؟“

”سرا میں ان باتوں سے اتفاق کرتا ہوں۔“ کھٹی ہوئی جسامت اور درمیانے قد کے جبے کے مالک بھڑکی فارسی نے ترنت کہا۔

”جنگ کی صورت میں وہاں کتنے پونڈ کی توپوں کی ضرورت پڑ سکتی ہے؟“ ڈینی کا اگلا سوال بریگیڈیئر ڈان کیورٹم کے لیے تھا۔ اس نے جواب دیا۔

”چنانچہ اس کی سختی اور جنگ کی نوعیت کو دیکھتے ہوئے اس پونڈ کی پچھو تو میں کافی ہوں گی۔“

”جزل شالہ۔۔۔۔۔؟“ گورنر ڈینی کا شیورائے کیو (cue) بال کو ”بلیئر ڈوم“ پر رکھتے ہوئے کہا۔

”تمہاری کھٹی گیرسٹین الارم ڈیوٹی پر ہے نا؟“ یہ کہتے ہی اس نے اپنی ہانک سے کیو بال کو ہٹ کیا۔ شالہ کی شکل میں رکھی مختلف رنگوں کی بالز بھیل گئیں اور ان میں سے ایک رنگ کی بال پاکستان ہوئی۔

”میں سرا۔“ جزل شالہ فوراً سر ہلایا۔ 1809ء کے سول اینڈ آرمی معاہدے کے تحت گورنر ڈینی کا شیورائے اختیار واضح تھے۔

”ہوں۔۔۔۔۔“ کھٹکتاتی ہوئی ایک لمبی ہکاری خارج کرتے ہوئے ڈینی کا شیورائے ذرا گھبرا کر میز پر نظری اسٹچ بنایا پھر کیو ہانک کی شپ کو آئیٹ چاک سے رگڑا اور میز پر جبک گیا۔ لائن نہ بن سکی تو دوبارہ کھڑا ہو گیا۔ بولا۔

”آپ ریش کرن انرجنٹ کی تفصیل بتاؤ دوستوں کو؟“

جزل شالہ نے مخصوص شارٹ لیگ کو ڈوم میں مختصر ترین پیرائیں اپنے شمن کی صراحت سے چند منٹوں میں آگاہ کر دیا جو اسوائے شیورائے بھولکر کے سب نے سن کر بڑے توجہ سے انداز میں مسکرا کے اپنے سروں کو اٹھائی جیش دی تھی۔ دیوان بھولکر کی سمجھ میں کچھ نہیں آتا تھا مگر وہ خاموش تھا۔ اس کے چہرے پر کسی قسم کے الجھن یا آمیزش اثرات دیکھنے میں نہیں آتے تھے۔ یوں۔۔۔۔۔ جیسے وہ اپنا کام بہ احسن خوبی نمٹا چکا ہو۔

”گڈ۔۔۔۔۔؟“ ڈینی کے منہ سے نکلا۔ ”بریگیڈیئر! حکمت عملی پلان کرو۔“

ایک لائن اور گھوسٹ بال کا نظری خاکہ تیار ہوتے ہی وہ دوبارہ میز پر جبک گیا۔ تلے اوپر تین بالز پکارتے ہوئے بعد اس نے بھڑکی فارسی کی طرف دیکھا اور خود ایک طرف ہٹ کر کھڑا ہو گیا۔ ڈی فارسی اپنی باری لینے کے لیے آگے بڑھا اور غور سے میز کی سطح پر پھیلی گیندوں کی لائن اسٹڈی کرنے میں مصروف ہو گیا۔

”سر۔۔۔۔۔!“ بریگیڈیئر ڈان کیورٹم نے کہتے ہوئے اپنے قریب کھڑے کرل بھولکر کی طرف ایک نظر دیکھا تھا۔ شالہ سے پہلے ہی ڈسکس کرچکا تھا اور کرل انہیں اپنے قیمتی مشورے سے آگاہ کرچکا تھا۔ بھولکر نے کیورٹم کو سر کا مخصوص اشارہ کیا، جیسے کہ ہاؤ، کہہ دو جو آپس میں ڈسکس ہو چکا ہے۔ لہذا وہ ڈینی سے بولا۔

”ناگرہ میں چونکہ ایک سازش پروان چڑھنے کا انکشاف ہوا ہے۔ ہم چاہ رہے تھے کہ پہلے اس کے نتائج

نشست کے بعد جزل مائیکل شالہ نے تریپال اور پالپ پور سمیت ناگرہ پر اپنا فوجی قبضہ قائم کرنا تھا۔ فرنگیوں کی چال ایسی تھی کہ دشمن کو اپنا حلیف بنا کر اس کے کانڈھوں پر بندھن چلائے، اپنا اوسیدھا کرتے اور پھر آخر میں اسی کی پشت پر چھرا گھونپنے کی صورت میں اپنی فتح کا جھنڈا لگا دیا کرتے تھے۔ وہ لڑاؤ اور حکومت کر دے اس دیرینہ پالیسی پر ہمیشہ سے کارفرما تھے۔ تجارت کا کاروبار کرتے کرتے اب یہ فرنگی ”حکومتوں کا کاروبار“ کرنے لگے تھے۔

جان پال کی اسی روز واپسی کے بعد جزل شالہ نے تریپال اور پالپ پور کے خلاف جنگی حکمت عملی تیار کرنا شروع کر دی تھی۔

یہ جنگی حکمت عملی گورنر ڈینی کا شیورائے شاپاہرہ پالپ گاہ کے ایک کمرے میں۔۔۔۔۔ ”بلیئر ڈوم“ کی میز پر تیار ہوئی تھی۔ تجارت کا کاروبار کرتے کرتے اب حکومتوں کا کاروبار کرنے والے ایسٹ انڈیا کمپنی کے سات اعلیٰ درجہ کے جہادری افسران اس وقت میز کے گرد موجود تھے۔

ان میں اوجیز عمر اور بھاری جسامت کے گورنر ڈینی کا شیورائے جزل مائیکل شالہ، کھٹی اور لیوٹری شکل کا مالک دراز قامت کرل بھولکر، مضبوط اور چوڑے شانوں گردورمانے قد کا مالک میجر ڈی فارسی، جوتیسوی لائٹ کیوری کا کمانڈنگ افسر بھی تھا۔ بریگیڈیئر ڈان کیورٹم کرل بھولکر کی اپنی رجمنٹ کا ایک کمانڈنگ آفیسر جیرالڈ۔۔۔۔۔ اور ساتواں آدمی ایک پست قامت ہندوستانی تھا۔ وہ راج پور کا دیوان تھا۔ تمام حکم ناموں کو قانونی شکل دینا یا کاام تھا۔ اس کا نام شیورائے بھولکر تھا۔ مہاراجوں کی عملاتی سازشوں اور ان کے نتیجے میں ہونے والی تبدیلیوں پر نظر رکھنا، بلکہ ان ”نتیجے“ کو برٹش سرکار کے لیے ”مفید“ کیسے بنانا ہے۔۔۔۔۔ یہ بھی اس کا کام تھا۔ اس کی رنگت۔۔۔۔۔ سیاہ تھی اور چہرے پر جبک کے دارغ تھے، آنکھیں چندی چندی کی تھیں، وہ بار بار اپنی کمر پر بندے خنجر پر ہاتھ پھیرتا تھا، جس پر جواہرات جڑے ہوئے تھے تو اس کی انگلیوں کی ہیرے روشنی میں چمک اٹھتے تھے۔

خانساہا نے ایک ٹرائی کھسکا کر کمرے کے ایک طرف کھڑی کر دی تھی اور خاموشی سے باہر نکل گیا تھا۔ ٹرائی پر ایک دس لپٹ کا براس ٹیک دھرا پڑا تھا، اس پر چھوٹا سا ٹکا لگا ہوا تھا۔ اس کے گرد سات بلوریں پیگ سلیقے سے رکھے ہوئے تھے۔ ٹرائی کے دوسرے نچلے حصے پر ایک بڑا سا بال رکھا تھا جس میں برف کی ڈلیاں رکھی ہوئی تھیں۔ سب نے اپنے اپنے حصے

کچھ کہنے میں مصروف ہو گیا۔

☆☆☆

کوہ شمالی کی سنگلاخ پہاڑیوں اور اس کی شگرفی ڈھلوانوں کے جنگلوں میں ایسا وہ برآمد اور کھرنی کے سایہ دار درختوں اور گل پوش جھاڑیوں پر کاسنی اور شگرفی ڈنڈیوں والے پھولوں نے رنگ بدلتا شروع کر دیا تھا۔ ہنرے سے ڈھکی چٹانوں اور بسنت رچنا کی بہار دکھائی دیتی تھی جیوں پر اب کے کپڑے کا ڈیرا پڑنے لگا تھا۔ ہوائیں سرد اور کاٹ دار ہو چلی تھیں۔ پرندے اپنے اپنے آشیانوں کو محفوظ جگہ پر لے جانے کے لیے پرتوں ہوتے تھے۔

مختلف جانور ٹھہرتے موسموں کی برف باری کے سرد چہنم سے بچنے کی تیاری میں اپنی گھمائیں، غار اور ٹھکانے بدلنے لگے تھے۔

کھربے کے بادلوں نے صبح کے سورج کی روہیلی کرنوں کو روک رکھا تھا۔ ہوا مرطوب اور فضا دھکی دھکی تھی۔ سردی کا احساس بڑھ گیا تھا اور علی رحمان ڈھلوانی جنگلوں کی آڑ لیتا ہوا تیز قدم اٹھاتے مقررہ سمت کی طرف بڑھا چلا جا رہا تھا۔ یوں تو اس کی منزل تریپال تھی، لیکن یہ منزل ابھی اس کے لیے، ہنوز دلی دور است والی بات تھی، مگر اب یہ اس کی راہنمائی کرتے ہوئے یہ ہدایت کی تھی وہ راج محل سے نکلنے ہی پورب کی سمت والی ڈھلان سے تقریباً پندرہ کوس تک پیادہ گام ناک کی سیدھ میں چلتا چلا جائے، پھر کہ جنگل پار ہو جائے۔ جب چھوٹے بڑے پہاڑی ٹیلوں کا سلسلہ شروع جائے تو..... ایک پختہ راہ گزرا جائے گی۔ اس راہ گزر پر اسے چند کوس چلنا پڑے گا کہ سامنے ایک پڑی نظر آئے گی۔ یہ پڑی پورب سے پچھم کی طرف جاری ہوگی، اسے پچھی سمت کی راہ لیتا ہوگی جہاں دائیں جانب ایک پہاڑی ندی بہتی نظر آئے گی۔ اسی ندی سے ایک چٹانی کار یز نکل کر شین کے کھالے سے پڑی کے اوپر ایک ٹکا سا بنارہی ہوگی۔ یہاں کوٹے والے انجن کی ریل کار آ کر ٹکیاں بھرنے کے لیے ٹھوڑی دیر کھڑی ہے۔ وہ اس میں سوار ہو کر تریپال کی سرحد کے قریب سر پہر یا شام سے پہلے پہنچ سکتا ہے۔

علی رحمان اب اریہ کے بتائے ہوئے اسی راستے کی راہ پر تھا۔ اسے سخت سردی بھی لگ رہی تھی، حالانکہ وہ تیز قدموں سے چلا جا رہا تھا، مگر سردی کی کاٹ سونگھی وہ بچھتا لگا تھا کہ وہ عام سے کپڑوں میں ہی نکل پڑا تھا۔ مقصد اور مشن کو پورا کرنے کی دھن میں وہ اس طرف توجہ نہ

دے سکا تھا اور فوراً ہی راج محل سے روانہ ہو گیا تھا۔ ورنہ وہاں سے وہ گرم پوشاکیں یہ آسانی اٹھا سکتا تھا۔

خاصی دیر تک پیدل چلنے کے بعد اس نے ذرا رک کر اندازہ لگانے کی کوشش کی کہ اس نے کتنا فاصلہ طے کر لیا ہوگا۔ مگر وہ کچھ صحیح اندازہ نہیں کر پایا اور ٹھوڑی دیر ستانے کے بعد پھر چل پڑا۔

اس کے لیے یہی طمانیت بھرا یقین کافی تھا کہ وہ بالکل درست راستے اور صحیح سمت پر رواں دواں ہے۔ کچھ اور منزل مارنے کے بعد اسے لگا کہ وہ تقریباً آٹھ نوکوس کا فاصلہ طے کر ہی چکا ہوگا۔

صبح تازہ دم اور بھرے پیٹ ہونے کے باعث..... ابتدائی پیادہ سفر یہ آسانی کٹ گیا تھا مگر اب وہ بھوک کے ساتھ تھکاوٹ بھی محسوس کرنے لگا تھا۔ اریہ نے اسے ایک مقررہ وقت پر کھانے والی جگہ تک پہنچنے کی تاکید کی تھی۔ برصورت دیگر تاخیر کی صورت میں اسے اگلے دن کی صبح کا انتظار کرنا پڑتا کیونکہ ہر روز ریل کار ایک ہی جاتی تھی، البتہ ایک مال گاڑی تین دنوں بعد گزرتی تھی۔ اب یہ اندازہ اریہ لگانے سے قاصر تھی کہ اس روز مال گاڑی کا گزر تھا یا نہیں؟

علی کی کوشش یہی تھی کہ وہ وقت پر پہنچنے کی پوری پوری کوشش کرے گا۔ تاکہ وقت پر مسافر ریل کار پر سوار ہو سکے۔

یہ سوچ کر اس کی ہمت کچھ اور سوا ہوئی اور اس نے آہستہ روی چھوڑ کر ایک بار پھر تیز گامی اٹھائی لیکن کب تک.....؟ آخر کو وہ بھی گوشت پوست کا ایک عام انسان تھا۔ جلد ہی تھک کر چور ہو گیا۔ بھوک کے ساتھ اب پیاس بھی اسے ستانے لگی تھی۔ ہرے بھرے جنگل سے آب و دانہ ملنا کوئی بڑا مسئلہ نہ تھا لیکن بات وقت بچانے کی تھی۔ وہ جلد سے جلد تریپال پہنچ کر وہاں شہباز خان سے ملنا چاہتا تھا۔ خالی پیٹ ہو جانے کی وجہ سے سردی اور زیادہ لگنے لگی تھی۔

بالآخر یہ سوچ کر کہ کھانے سے بغیر کوئی چارہ بھی نہیں اس نے کچھ تازہ ریلے چل کر ڈرکھائے اور انہی سے پیاس بجھائی۔ پانی کے لیے ندی یا چشمہ تلاش کرنے میں وقت صرف ہو سکتا تھا۔ اس نے ریلے چلوں سے ہی کام چلا یا اور ایک بار پھر چل پڑا۔

بادلوں اور دبیز کبر سے سورج کی چھدری چھدری دھوپ پڑنے لگی تھی۔ اسی دھوپ سے علی نے اندازہ لگا لیا کہ وہ منزل سے چند کوس کے فاصلے پر تھا۔ اریہ کے مطابق جب تک دھوپ تیز نہیں ہو جائی، وہ اپنے مطلوب مقام تک بروقت پہنچ سکتا تھا، مگر مسئلہ یہ تھا کہ کبرے اور بادلوں کی وجہ سے

رنگ آسمان

وقت کا صحیح اندازہ نہیں ہو پا رہا تھا کہ دھوپ کتنی لگی آئی تھی اور سورج نے اس کے ساتھ کتنا سفر طے کر لیا تھا۔

ابھی وہ اسی جیسے کا شکار تھا کہ سفید دودھیا پڑے آسمان کا رنگ سنولانے لگا اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے سیاہ پڑ گیا۔ علی رحمان کو تشویش ہوئی۔ یوں بارش پڑنے اور سردی میں اضافے کی ایک نئی مصیبت نازل ہونے کا اندیشہ ستانے لگا۔ لیکن اس کے سر پر بھی بس ایک ہی دھن سوار تھی۔ اس کا بس نہیں چل رہا تھا کہ وہ اڑ کر تریپال پہنچ جائے اور وہاں شہباز خان کو فرنگیوں کی نئی سازش سے فی الفور آگاہ کر دے۔ اسے ڈر تھا کہ اسے تریپال پہنچنے میں ذرا بھی دیر ہوگی تو کہیں فرنگی اپنی اس گھنائونی سازش میں کامیاب نہ ہو جائیں۔ کیونکہ یہ حقیقت تھی کہ بعض حریت پسند مسلمانوں کے خلاف گروپ، کوہ شمالی کے داہنی خیمہ خیمہ گاہ ہی نہیں بلکہ یہاں اپنا مستقل ٹھکانا قائم کرنا چاہتے تھے، تاکہ کہ اپنی بکھری ہوئی قوت کو یکجا کر سکیں۔ ان کی اسی سازش کو سبوتاژ کرنے کے لیے علی رحمان کو ساتھیوں کے ساتھ یہاں روانہ کیا گیا تھا۔ ان کے تین ساتھیوں نے تورہ ہی میں جام شہادت نوش کر لیا تھا جبکہ..... ان ہاتھوں میں صرف علی رحمان اور شاہ زمان ہی باقی بچے تھے اور باہنی جانوں کو خطرے میں ڈال کر اپنے مشن کو پایہ تکمیل تک پہنچانے کے لیے بڑی بہادری، پامردی اور دلیری کے ساتھ مصروف کار تھے۔

علی رحمان اور شاہ زمان نے تو بلکہ اپنی جان جو حکم میں ڈال کر اس سازش کا کھوکھ لگا تھا۔ اپنے تین ساتھیوں کے بدلے میں انہیں اریہ کی صورت میں ایک ایسی مجاہدہ بھی ملی تھی جو تربیت یافتہ تو تھی لیکن اس نے ان پر ظاہر بھی کر دیا تھا کہ وہ کسی تربیت یافتہ ساتھی سے کم بھی نہیں ہے۔ دیکھا جاتا تو علی رحمان اور شاہ زمان یہاں تک اریہ کی مدد سے ہی پہنچے تھے اور آئندہ بھی وہ ان کے کام آنے کا پختہ عزم کیے ہوئے تھے۔

علی رحمان یہ سب باتیں سوچتا ہوا بارش میں بیٹھکا اور ٹھہرتا آگے بڑھا چلا جا رہا تھا۔ جنگل جیک رہا تھا، ترانہاں سے برساتی پانی اب ریلوں کی شکل میں تیزی سے بہہ رہا تھا۔ ڈھلان بھلسواں ہونے لگی تھی۔ جنگل جل تھل ہو رہا تھا۔ آن کی آن میں اڈانے والی کالی گھٹاؤں نے دن میں رات کا سا ساں پیدا کر دیا تھا۔ علی کو ٹھیکر آ میر تشویش پریشانی نے آن گھیرا تھا۔ اسے اپنا مشن کھٹائی میں ڈھکا نظر آ رہا تھا۔ موسلا دھار بارش نے طوقان بادوباراں آسمان پیدا کر دیا تھا۔ اب تو اسے اپنا پیدل سفر کرنے میں بھی

مشکل پیش آرہی تھی۔ نہ ہی وقت کا اندازہ ہو پا رہا تھا۔ بس ایک اندھا جذبہ تھا کہ منزل پر جلد از جلد پہنچ جائے۔ بارش میں سردی بھی بڑھ گئی تھی۔ کئی جگہوں پر وہ پھسلا بھی تھا مگر پھر اٹھ کھڑا ہوا تھا۔ ڈھلان ختم ہو گئی تو اس نے سکون کا سانس لیا۔

اجانک اس کے کانوں سے ایک آواز نکلتی۔ یہ انجن کے دھول کی آواز تھی۔ بارش کے شور میں اگرچہ آواز دل لگی تھی مگر اس کے مخصوص آہنگ سے اس کی شوریدہ ہاتھوں تک پہنچ گئی تھی۔ اس کی خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہ رہا۔ انجن کی دھول کا مطلب تھا کہ وہ منزل کے قریب تھا۔ وہ کسی نے کہا ہے تاکہ بے خبری بھی ایک نعمت ہوتی ہے، علی بھی وقت سے بے خبر تھا مگر سر پر جلدی پہنچنے کی فکر سوار تھی۔ اسی لیے وہ بغیر رکے چلا رہا تھا۔ اگرچہ کہیں کہیں وہ ٹھہر بھی تھا مگر پھر چل پڑا تھا۔ اسی کوشش ہی میں اسے شاید بروقت منزل پر پہنچا دیا تھا۔ امید جاگتی تو ہمت و حوصلہ بھی سوا ہوا۔ وہ رکنا نہیں، اگرچہ اب اس کے چلنے کی رفتار پہلے کی نسبت کم ہو گئی تھی۔ تاہم اب اسے نیا دھڑکا ستانے لگا کہ کہیں ریل کار چھوٹ نہ جائے۔

باوصف کوشش کے وہ اپنی رفتار میں خاطر خواہ اضافہ نہ کر سکا۔ ایک بار بے دم اور تھک کر گرنا تو اچھ نہ پایا۔ وہ موسیٰ کی بیٹکی ہوئی جھاڑیوں پر گرنا سانس بری طرح پھولی ہوئی تھی۔ جسم تھک کر چور ہو رہا تھا۔ اس نے اپنے ٹھکے سیٹ کر اور بازوؤں کے سہارے کھڑے ہونے کی سعی کی اور ذرا اٹھ کر پھر گر گیا۔ مسلسل تیز گامی، تھکاوٹ اور سانس پھولنے کے باعث آئینہ کی کی داغ ہونے لگی تھی اور اس پر طرہ یہ کہ دھواں دھار بارش نے وہی کسی کسر پوری کردی تھی۔ کیونکہ ایسی حالت میں طوقانی بارش بھی آئینہ کی کی کا سبب بنتی ہے۔

یہی وہ وقت تھا جب اس پر غشی طاری ہونے لگی تو اس کی ذوقی ساتھیوں سے ایک تیز کی آواز نکلتی۔ اس کا دل یکبارگی زور سے دھڑکا اور پھر اسے ہوش نہ رہا۔

☆☆☆

لیف بروجر..... بڑا گھاگ اور زبردست دماغ شخص تھا۔ اسے تو پہلے ہی یقین کی حد تک ان تینوں گویوں پر حریت پسند گروپ کے جاسوس ہونے کا شہ تھا اور اب جب اس نے یہ سنا کہ ان کا ایک ساتھی سوئٹس (علی رحمان) مہاراجا اور جان پال کے درمیان ہونے والی اہم نشست (میٹنگ) کے فوراً بعد راج محل سے کہیں نکل گیا ہے تو اس کا ماتھا ٹھکا۔ اسے ان تینوں کو شکوک اور جاسوس ثابت کرنے کے لیے محسوس

کے حالات بھی مزید اسی طرف اشارہ کرتے دکھائی دیتے تھے۔

”مجھے رابرٹ سے ایسی گھٹیا حرکت کی بالکل بھی توقع نہ تھی۔“ رینا نے ہولے سے کہا۔ شوکت نے کن انگوٹوں سے ایک ذرا مسہری پر نیم درازی بیٹھی گاراشیا کی طرف دیکھا اور رینا سے بولا۔

”رابرٹ کی اس حرکت پر ہم سب کو ہی انوس ہے مس رینا!“ وہ صرف تہائی میں رینا کوکس سے نہیں پکارتا تھا، نیز کی تیسرے کی موجودگی پر وہ اس سے گفتگو میں تکلف بھی برتتا تھا۔ ”لیکن کیا کیا جاسکتا ہے۔ ویسے آپ نے اپنے انکل شوکو کو مطلع کر دیا ہے یا نہ؟“

”ہاں!“ رینا نے اس کی طرف دیکھ کر کہا۔ ”میں نے خط میں سب کچھ لکھ دیا ہے مگر میں جیسے نہیں ہوں گی۔ اپنے باپا کے قاتلوں کو نہ صرف بے نقاب کر کے رہوں گی بلکہ انہیں کیفر کردار تک بھی پہنچا کر رہوں گی۔“ کہتے ہوئے رینا کے خوبصورت چہرے پر غم کی چٹکی اور جوش بھرے جذبات کا ارتعاش سافدا تھا۔

”تم کیا کیا کرو گی یہاں۔۔۔۔۔ رینا ڈیر۔۔۔۔۔؟“ گاراشیا نے اس کی طرف دیکھ کر طنز بے گنجی سے کہا۔ ”اپنے باپا کا شرم پورا کرو گی، یا ان کے قاتلوں کو بے نقاب کر دو گی۔۔۔۔۔ یا پھر۔۔۔۔۔ کسی سے محبت کو پروان چڑھاؤ گی۔“ کہتے ہوئے اس نے شوکت کی طرف نیچی نظروں سے دیکھا تھا۔

رینا اور شوکی دونوں ہی اس کی ذومقی بات کا مطلب سمجھ کر کچھ بھر کو خفیف سے ہوتے تھے، شوکت خاموش رہنے پر مجبور تھا لیکن رینا نے گاراشیا کی طرف تیزی سے انگوٹوں سے چھوڑتے ہوئے کہا۔

”اگر تمہارا چہیتا بھائی جھوٹی گواہی نہ دیتا تو آج یہ سب نہ ہوتا۔ ویسے میں تمہاری آخری بات کا مطلب نہیں سمجھی۔ محبت۔۔۔۔۔ کس سے محبت؟ کیا کہنا چاہتی ہو تم۔“

”اوہ۔۔۔۔۔ کس سے محبت۔۔۔۔۔؟“ گاراشیا نے زہریلے طنز سے کہا۔ وہ کتاب بند کر کے مسہری پر پاؤں جھلائے اٹھ بیٹھی۔ پھر ایک نگاہ شوکی پر ڈال کر مزید بولی۔

”ایک نوکر سے محبت تمہیں بہت مہنگی پڑے گی رینا! تم نے میرے بھائی کو ٹھکرانے کے لیے دھمکی مول لی ہے۔ اس نے اگر جھوٹی گواہی دی ہے تو اس کی وجہ تم اور انکل ہنری تھے جنہوں نے ایک نوکر کو ترجیح دی اور اب تم بھی وہی کچھ کر رہی ہو۔“

”اچھا تم تو۔۔۔۔۔ ایسے کہہ رہی ہو جیسے تمہیں اپنے

”کون گولی مارے گا؟“

”یہ کام میں ہی کرتا ہوں تم ذرا گھوڑوں کی ری کو مضبوطی سے پکڑے رکھنا۔“ ناکے کی آواز پر یہ بھاگ نہ کھڑے ہوئے۔“ جیکب نے اس سے کہا۔

”میں انہیں ذرا دور ہی لے جاتا ہوں تم ذرا جلدی اپنا کام تمنا لو۔۔۔۔۔“ روبر نے کہتے ہوئے۔۔۔۔۔ قدم بڑھائے اور دونوں گھوڑوں کی رسیاں پکڑے اس سے چند قدم دور جانے لگا۔

اوجھڑا جیکب نے اپنی بندوق سنجالی، چند قدم پیچھے ہٹا اور نرم گھاس پر بے سدھ پڑے علی ریحان کے سینے کا نشانہ بننے لگا۔ اس کی انکل بلی پر تھرکنے لگی اور پھر اگلے ہی لمحے اس کی بندوق نے دھماکے سے شعلہ اگلا۔ فائر کی آواز سے جنگل گونج اٹھا تھا۔

☆☆☆

مہمان گاہ کے کمرے میں رینا افسردہ سی بیٹھی تھی۔ شوکت اس کے قریب ایک کرسی پر بیٹھا متشکر نظروں سے اسی کی طرف دیکھ رہا تھا۔ ڈائریٹر امجد خان، تندو بابا اور شائستہ مہمان گاہ کے گوشہ عام میں موجود تھے جبکہ رابرٹ باہر کھین تھا۔

البتہ کمرے میں رینا اور شوکت کے علاوہ ایک تیسرا فرد بھی موجود تھا۔

یہ گاراشیا تھی۔ وہ ایک قریب دھری پڑی ایک مسہری پر گاؤں کے پشٹ ٹکائے بے ظاہر کوئی کتاب پکڑے بیٹھی تھی، مگر اس کی ساری توجہ اور گاہے بے گاہے نگاہیں ان دونوں کی جانب اٹھتی تھیں۔۔۔۔۔ اسے ان چند ایام میں ہی ادراک ہو چلا تھا کہ شوکت حسین اور رینا ایک دوسرے کے بہت قریب آچکے ہیں اور گاراشیا اس کی وجہ پروفیسر ہنری کی موت یا انکل اور بعد میں اس کے بھائی رابرٹ کی جھوٹی گواہی دینے کو کھنچتی تھی۔ اگرچہ کچھ دن پہلے گاراشیا نے یہ جھوٹ بول کر شوکت کا رینا سے دل خراب یا اس کی طرف سے مایوس کرنے کی۔۔۔

کوشش کی تھی کہ۔۔۔۔۔ رابرٹ اور رینا ایک دوسرے کو بچپن سے چاہتے آ رہے ہیں اور بہت جلد شادی بھی کرنے والے ہیں۔ مگر اب گویا چند ہی دنوں میں جیسے بہت سا پانی پلوں کے نیچے سے گزر گیا تھا۔

یہی سب تھا کہ گاراشیا کے دل میں رینا کے لیے پہلے سے زیادہ رقیبانہ جذبات پروان چڑھنے لگے تھے۔ اس نے ان دونوں کا جتنا راستہ ٹھکانا کرنے کی کوشش کی تھی وہ اتنا ہی ایک دوسرے کے قریب ہوتے چلے گئے تھے اور اب آئندہ

ضرورت پڑی تو ریل کار کو چیک کرنے کے بعد جانے کی اجازت دیں گے۔“ جیکب نامی اس کے ساتھی نے کہا۔

پہلے والے نے اپنے سر کو شائی جینٹل دے کر اس سے اتفاق کیا۔ اس کا نام روبر تھا۔

دونوں نے اپنے گھوڑے آگے بڑھا دیے۔ اچانک روبر کو اپنے دائیں جانب گیلی۔۔۔۔۔ گھاس پر ایک درخت کے پاس کوئی گرا پڑا نظر آیا۔

”جیکب۔۔۔۔۔!“ اس نے اپنے آگے جاتے سپاہی کو آواز دی۔

”کیا ہوا؟“ جیکب نے اپنا گھوڑا روک کر گردن موڑ کر پوچھا۔

”اس طرف کوئی بے ہوش پڑا ہوا ہے۔“ روبر نے کہتے ہوئے فوراً اپنی نعل میں جھولتے ہوئے کارتوسوں کے تھیلے سے ایک کارتوس نکال کر چانا اور بندوق میں بھر لیا۔ اپنے ساتھی کی دیکھا دیکھی جیکب نے بھی یہی کیا تھا۔

روبر نے فوراً فائر کردہ سمت کی جانب اپنا گھوڑا موڑ دیا اور بے سدھ پڑے آدی کے قریب لے جا کر روک دیا۔ دونوں محتاط انداز میں اپنی بندوقیں سنبھالنے نیچے اترا آئے۔

”ارے۔۔۔۔۔“ روبر کے منہ سے بے اختیار برآمد ہوا۔ ”یہ تو وہی ہے۔۔۔۔۔ ہمارا شکار۔۔۔۔۔ سوشل۔“

”مگر۔۔۔۔۔ اسے کیا ہوا ہے روبر!“ جیکب بولا۔

”دیکھو ذرا۔۔۔۔۔ مرنے نہیں گیا ہے کتنی؟“ روبر آگے بڑھا اور سوشل جودر حقیقت علی ریحان ہی تھا، پر جھک کر اس کا جائزہ لینے لگا پھر سیدھے کھڑے ہو کر جیکب سے بولا۔

”یہ زندہ ہے، ہمارا لگ رہا ہے۔ لگتا ہے سرد موسم اور تھکاوٹ نے اسے نڈھال کر کے بے ہوشی پر مجبور کر دیا ہے۔“

”میرا خیال ہے اسے اوجھڑا کوئی مار کر واپس چل پڑتے ہیں۔“ جیکب نے جان چھڑانے کے انداز میں کہا۔ ”موسم بہت خراب ہو رہا ہے۔ کہاں اس مصیبت کو ساتھ لیے پھریں گے۔“

”تجوز تو تمہاری بری نہیں، لیکن۔۔۔۔۔ لیف برور۔۔۔۔۔“ روبر نے دانستہ اپنا جملہ اوجھڑا پھوڑا تو جیکب بولا۔

”اس کی پروا مت کرو۔۔۔۔۔ بتا دیں گے کہ ہمیں دیکھ کر فراہو نے کی کوشش میں جاتی ہوئی ریل کار پر سوار ہو رہا تھا، ہم نے گولی مار دی۔“ جیکب نے تجویز بھیجی۔

”چلو پھر جلدی کرو۔“ بالآخر روبر نے اس کی سفاکانہ تجویز پر صاف دے کر دے ہوئے کہا۔

ثبوت کی ضرورت تھی۔ تاکہ وہ سینا اپنی موج سنگھ کو نہ توڑ جواب دے سکے۔

اس کا ذہن تیزی سے کام کرنے لگا۔ اس نے سب سے پہلے سرحدوں پر ناکا بندوں کو کئی ریمان کا ناکا نقشہ بنا کر ہوشیار کر دیا۔ اس کے بعد بہت غور و خوض کے بعد وہ اپنے فوجی دماغ کے ساتھ سوچنے لگا کہ سوشل (حلی) ریمان کی ریاست کی حدود پار کرنے کے لیے خفیہ اور چور راستہ ہی اپنا سکتا ہے۔ ریاست سے باہر نکلنے کے دو ہی چور راستے تھے۔ ایک ایسٹ اور دوسرا تھو ویسٹ۔ ایسٹ کا راستہ اس عظیم کوہستانی سلسلے سے باہر نکلتا تھا اور وہ بہت زیادہ طویل اور دشوار گزار تھا۔ متوقع طور پر میٹنگ کے اغراض و مقاصد جان لینے کے بعد سوشل بھی اپنی اتنا طویل راستہ اختیار نہیں کر سکتا تھا، جبکہ دوسرا چور راستہ تھو ویسٹ کا تھا اگرچہ یہ بھی دشوار گزار تھا مگر اس راستے کے ڈھلوانی راستے پر پڑی تھی۔ وہاں سے ہر روز ایک ریل کار اور دوسرے تیسرے روز مال گاڑی گزرتی تھی۔ اسے شک تھا کہ سوشل، یا ان پور یا تریپال جینٹل کی کوشش کر سکتا تھا۔ اول الذکر طویل راستہ اس نے بعد میں چیک کرنے کا سوچا تھا، اس کے گھڑو سار سپاہیوں کے لیے بھلا کیا مشکل تھا۔ چنانچہ اس نے اپنے دو سپاہی الگ الگ گھوڑوں پر تھو ویسٹ والے راستے پر روانہ کر دیے۔

ابھی وہ راستے ہی میں تھے کہ بارش نے انہیں آن لیا۔ ڈھلوان پھسلواں ہوئی تو انہوں نے اپنے گھوڑوں کی رفتار آہستہ کر دی۔ گھوڑے پھسلنے لگے تھے، تاہم سدھانے ہوئے تھے اسی لیے ڈھلوان سے اترنے لگے۔ انہوں نے لمبے رین کوٹ پہن رکھے تھے۔

ابھی یہ جنگل میں ہی تھے کہ ان کا سامنا خونخوار بھیڑیوں کے ایک غول سے ہو گیا۔ انہیں ایسی ”افاد“ کا تجربہ تھا۔ ایک سپاہی نے سوراہا گائے کی چرنی والا ایک کارتوس چاٹ کر (منہ سے کھول کر) بندوق میں ڈالا اور غول کے پیچ میں فائر کر دیا۔ دھماکا ہوا بھیڑیوں کا غول ایک طرف کو بھاگ کھڑا ہوا۔

اسی وقت انہیں کسی ریل کے انجن کی دھل سنائی دی۔ ”جیکب! لگتا ہے ہم منزل کے قریب پہنچے ہیں۔“

ایک فرنگی سپاہی نے گرد و پیش کے طوفانی مناظر میں ایک نظر ڈال کر اپنے ساتھی سے کہا۔ ”لیکن اس جاسوس کا ہمیں پتا نہیں چل رہا ہے۔“

”ریل کار کی سیٹی گونجی تھی۔ پڑی تک پہنچتے ہیں،

سینس ڈائجسٹ

نے اپنی پوشاک سے ایک خط نکال کر شوکی کو تھمایا اور لے سے بولی۔

انہوں نے ہی اسے اپنا نائب سالار مقرر کیا تھا اور یہ اب بھی

رنگِ آسمان

”دل..... لیکن میں بھلا کیسے اتنی دور سمندر پار جا سکتی
مارچ 2018ء

مجھے تو یہاں کے جنگلوں سے بڑا خوف آنے لگا ہے۔“ وہ آخر میں تھر تھرا کے بولی۔

”ہم راکا کی ڈیوادی میں ڈیرا ڈالیں گے۔“ رینا نے جیسے یہ ایک قلم ان کی ساعتوں میں دھماکا کر ڈالا۔ ہاسوائے شوکی کے سب کے چہروں سے خوف کے آثار جھلکتے گئے۔

☆☆☆

لیف برودر نے اپنے دونوں گھڑسوار سپاہیوں کو علی ریحان کے تعاقب میں روانہ کرنے کے بعد فوراً اریہ اور شاہ زمان کو طلب کرنے کا حکم جاری کر دیا۔

اریہ اور شاہ زمان اپنے دل و دماغ میں ہزار قسم کے دوسو لیے اس کے روبرو حاضر ہو گئے۔ اریہ نے یہاں اپنا نام دینا کوری، شاہ زمان کا بھوپت جیسے اپنا شوہر کہا جبکہ تیسرے علی ریحان کا نام سوشل بتاتے ہوئے اسے اپنا بھائی ظاہر کیا تھا۔

لیفینٹ برودر..... سینا پتی موج ستھ کی تادیب کے بعد ذرا محتاط بھی تھا ہی لیے وہ ان سے سخت لہجے میں تو بات کر سکتا تھا اور دھماکا بھی سکتا تھا لیکن جسمانی طور پر وہ انہیں ہاتھ بھی لگانے کا جاز نہ تھا۔ تاہم اپنے چہرے پر خوشنوازی لاتے ہوئے اس نے پہلے پریش نظروں کے ساتھ دونوں کو گھورا اریہ اسے چکامدے کر بھاگ گئی تھی، وہ بھی اس کے دل میں تھا لیکن ابھی وہ اس بارے میں کوئی بات کرنے کے موڈ میں نہ تھا، یوں بھی اریہ کے ساتھ شاہ زمان بھی تھا۔

”تمہارا تیسرا ساتھی کہاں ہے؟“ لیف برودر نے دانستہ اریہ کو نظر انداز کرتے ہوئے شاہ زمان کو گھورتے ہوئے سوال کیا۔ اریہ نے جواب دینے کے لیے منہ کھولنا چاہا تھا کہ برودر نے نہایت درشتی سے اپنا ایک ہاتھ اٹھا کر اس سے کہا۔

”جس سے میں سوال کروں، صرف وہی اپنا منہ کھولے۔“

”ہاں تو بھوپت! کیا کہتے ہو؟“

”جناب! وہ اپنے گھر گیا ہے۔“ شاہ زمان نے ناراض لہجہ اختیار کرتے ہوئے جواب دیا۔

”گھر..... کون سا گھر.....؟ کیا تم لوگوں کا گھر بھی ہوتا ہے؟“ برودر نے ترش لہجے میں طنز کیا اور آگے بولا۔

”جہاں تک میری معلومات ہیں تم پابندے ڈو منوں کا گھر تو نہیں ہوتا۔“

”ہم پابندے یا خانہ بدوش نہیں ہیں جی! کوئیے ہیں..... کا بچا گرا پنا پیٹ پالتے ہیں۔ یہ عجیب ہے ہم بھی

یا گرام گرم بحث و مباحثے سے منع کر رکھا تھا، بلکہ رابرٹ اور گارشیہ صاف لفظوں میں کہہ دیا تھا کہ اس تو ان کا بھی ان کے ساتھ (رینا اور شوکی کے ساتھ) رہنے کا کوئی جواز باقی نہیں بچا ہے لہذا۔ وہ لیف برودر سے رابطہ کر لیں تاکہ وہ ان کی ریاست سے دلی روائی کا بندوبست کر دے۔ آج کا سارا دن ان کے پاس تھا لیکن..... چونکہ رابرٹ اور گارشیہ کے ”معاہدات“ ایسی ہیج رہتے کہ وہ..... رینا اور شوکی کا ”ساتھ“ چھوڑنے سے قاصر تھے۔ رابرٹ، سونجنا پر ڈورے ڈالے ہوئے تھا، نیز وہ شوکی اور رینا کا راستہ کھونا کرنے کا دل میں تہیہ کیے ہوئے تھا، وہ پیش بھی کینا اور بغض گارشیہ کے دل میں بھی تھا۔ اسے راج محل سے تو کوئی لینا دینا نہیں تھا مگر وہ شوکی کو حاصل کرنے کے لیے بے چین تھی۔ اس نے بھی اپنے دل میں نیکاراوہ باندھ رکھا تھا کہ اگر شوکی اس کا نہ ہو سکا تو وہ اسے رینا کا بھی نہیں ہونے دے گی۔ مگر یہ ظاہر مکاری سے کام لیتے ہوئے انہوں نے رینا سے یہی کہا تھا کہ..... وہ رینا کو شخص کو کروں کے رحم و کرم پر نہیں چھوڑ کر جاسکتے۔ الایہ کہ رینا ان کی بھی ”ڈسے داری“ ہے۔ کل کلاں رینا کو کچھ ہو گیا تو وہ اکل شا کو کیا منہ دکھائیں گے اور انگلستان کس منہ سے لوئیں گے وغیرہ۔ رینا ان کے دو غلے میں کو تو کچھ زیادہ محسوس نہ کر سکی البتہ شوکت حسین ان شریہ پندہ بن بھائی کی مکاری کو اچھی طرح سمجھ رہا تھا، جبکہ امجد خان اور مندو بابا کا معاملہ شوکی جیسا ہی تھا، یعنی وہ رینا کے ساتھ خلص ہی تھے۔

چنانچہ سردست رابرٹ اور گارشیہ نے بھی کسی بحث یا لڑائی میں پڑنے کے بجائے یہی سوال اٹھایا۔

”آخر اب ہم جاہیں کہاں.....؟“

”اگر تم لوگوں نے میرے ساتھ رہنے کا فیصلہ کر ہی لیا ہے تو میں نے سوچ رکھا ہے کہ ہمیں کہاں جانا ہوگا۔“ رینا نے گہری متانت سے کہا۔

”یہاں سے بھلا ہم کہاں جاسکتے ہیں؟ راج محل کے باہر اور ریاست کے اندر ہی کسی دور افتادہ گوشے میں خیمہ زن ہو جائیں گے، جیسا کہ پہلے اکل ہماری بھی چاہتے تھے۔ ان کا ارادہ آزاد ہی سے اپنا کام کرنے کا تھا اور وہ اس مقصد کے لیے جس کیب قائم کرنا چاہتے تھے۔“

”لیکن برادر اچم بھول رہے ہو کہ ہماری ریاست میں حدود مقرر کر دی گئی ہیں جس کے تحت ہم راج محل سے ایک محدود فاصلے پر رہتے ہوئے کیب لگا سکتے ہیں۔“ گارشیہ نے کہا۔ ”اس حساب سے تو ہم آبادی سے بہت دور ہو جائیں گے۔ یعنی جنگل میں ڈیرا ڈالنا پڑے گا۔ اف.....!

اڑتے ہوئے حسرت سے دیکھا کرتی ہوں۔“ سوچنا نے بھی اپنے اندر کا اظہار کر ڈالا اور رابرٹ اسی طرح اس کے اندر کو ابھار کر اسے جاننے اور پرکھنے کی کوشش کرتے ہوئے آگے بولا۔

”تمہاری یہ راج محل کی زندگی کلی بندی ہے۔ دولت کے ڈھیر میں محض ایک بچہ رہے۔ صبح و شام ایک ہی طرح کے..... نہ کوئی روتی نہ کوئی کشش..... کہیں جاؤ تو تم لوگوں کے ساتھ پچاس لوگ ہوتے ہیں۔ انہی کے دائرے میں قید رہتے ہوئے تم کہیں باہر ہوتے ہوئے بھی ایک قیدی ہی تو ہوتی ہو۔ مزہ تو اکیلے اپنے کسی ایک دل پسند ساتھی کے ساتھ آزاد ماحول میں ٹھونسنے پھرنے کا ہے۔ ایسا ساتھی جو تمہیں بہت چاہتا ہو، تم سے بے حد پیار کرتا ہو۔ جیسے میں اور تم.....“ چالاکی سے یہ کہتے ہوئے رابرٹ نے سوچنا کے چہرے کی سرخ پڑی رنگت کو نور اور چھائی ہوئی نظروں سے دیکھا۔ وہ اس وقت ایک بھوکا مگر شاطر لومڑ دکھائی دے رہا تھا جو اپنے کسی شکار کو پھانسنے کی کوشش میں لگا ہوا۔ اس نے دیکھا کہ سوچنا اس کی بات پر شرمائی تو ضرور کی مگر ایک آہی بھر کر اس نے رابرٹ کو ایک حسرت زدہ سی مسکراہٹ سے بھی نوازا دیا تھا۔ رابرٹ مزید جسارت کرنے اور چکر چلانے کے موڈ میں تھا مگر کسی کی آمد پر اسے اپنا یہ سلسلہ موقوف کرنا پڑا۔

رابرٹ..... تصور میں سوچنا کو ایک سونے کی ایسی چڑیا سمجھنے لگا تھا جسے وہ حقیقتاً ایک ہی بار ذبح کر کے..... سارے انڈے تھمھ لیتا چاہتا تھا۔ اسے یہ کہہ کر وہ یہاں سے سونے کی گھڑی کے ساتھ ہی..... بھگالے جانا چاہتا تھا۔ کیونکہ یہاں رہتے ہوئے رابرٹ نے ایسے ایسے نادر و نیش قیمت نمونے دیکھے تھے، جن کی انگلستان میں بڑی کھپت اور مانگ تھی۔ خود رابرٹ انگلستان میں ایک تیسرے دورے کی زندگی گزار رہا تھا مگر سوچنا سے وہ یہی کہتا تھا کہ اس کا باپ بہت امیر کبیر اور جاگیر دار شخص تھا۔ لندن کے مضافات میں ایک بڑی کاؤنٹی کا مالک، جس کے مرنے کے بعد اب وہی مالک تھا۔ وغیرہ۔

☆☆☆

راج محل سے بے دخلی کی سبکی کو سب سے زیادہ رابرٹ اور اس کی بہن گارشیہ نے محسوس کیا تھا۔ یہ لوگ سب مہمان گاہ میں موجود تھے اور رینا کے ایما پر ڈرائیور امجد خان مندو بابا اور شاہی مہمان گاہ کے گوشے میں موجود چہرے لٹکائے موجود تھے۔

رینا نے کسی نفسا کو گرم دیکھتے ہوئے کسی بھی قسم کی لڑائی

ہوں؟“ سوچنا نے بھی اندر ہی اندر رابرٹ کے کھینچے ہوئے نقشے سے لطف اندوز ہوتے ہوئے کہا۔

”پانی کے جہاز میں.....“ وہ بولا۔ ”کیا ہے سفر بھی تم نے پانی کے جہاز میں؟“

”نہیں تو.....“ سوچنا نے سادہ لوحی سے نفی میں اپنا سر ہلایا۔

”تو پھر کیا دیکھا ہے تم نے دنیا میں.....؟“ رابرٹ اس کے معصوم سے تجسس کو ابھارتے ہوئے بولا۔ ”بھی کر کے دیکھو پانی کے جہاز میں سفر..... کتنا مزہ آتا ہے، بیکراں پھیلے ہوئے سمندر کی گود میں بھگورے لیتے ہوئے۔“

”ہے بھگوان! مجھے تو سمندر بہت اچھا لگتا ہے، مگر کبھی دیکھا ہی نہیں میں نے۔“ وہ بولی۔

”معاف کرنا..... تم کہنے کو تو ایک راج کمدی ہو..... لیکن سچی بات کہوں گا تمہاری حیثیت یہاں ایک قیدی سے بڑھ کر کچھ نہیں۔“ وہ مکار لومڑی طرح بولا۔ ”ان پہاڑیوں اور جنگلوں میں گھری ہوئی یہ قلعہ بند زندگی بھی کوئی زندگی ہے۔ ہونہ۔“

سوچنا کو رابرٹ کی باتوں میں بے حد کشش محسوس ہو رہی تھی پھر وہ اس بھی ہوئی جسے رابرٹ کی لومڑی مکار آنکھوں نے فوراً تازہ کیا۔ یوں اسے ایک ذرا ”جسارت“ کا موقع ملا اور اس نے سوچنا کی نرم و نازک گھڑی پر ہاتھ رکھا سوچنا کچھ نہیں بولی تو وہی ہاتھ پھیل کر سوچنا کی گردن اور پھر اس کے دائیں مہین سے گال تک چلا گیا۔

سوچنا جیسی ان چھوٹی دوشیزہ کے لیے ایک بھر پور مرد کے کھرورے ہاتھ کا یہ کس بہت مستی خیز اور دلگ انوکھے پن کا احساس دلاتا محسوس ہوا۔ وہ سرخ ہونے لگی اور دیر سے اس نے اپنا کل سا چہرہ تھوڑا پیچھے سرکا لیا۔ وہ اپنے لطیف اور عناد و چود پر ایک جوان مرد کے کسی گری کو برداشت نہیں کر پارہی تھی۔

”سوچنا! آج کہتا ہوں۔ یہ کوئی زندگی نہیں۔“ وہ بہت کر کے آگے بولا۔ ”بے شک تم ریشم و کم خواب میں سوتی ہو، شاہانہ زندگی گزارتی ہو لیکن تم نے ان چو باروں سے کھلے نیلے آسمان پر اڑتے آزاد پنجیوں کو دیکھا ہے؟ کتنے خوش ہوتے ہیں..... اپنی آزادی پر..... بیکراں پھیلے آسمان کی وسعتوں پر اڑان بھر کے انہیں خوشی ہوتی ہے۔ آؤ مالو..... بھی انہیں سونے کے بچہ میں بند کر دو، یہ ایک دم اداس ہو جائیں گے۔“

”ہاں! میں اکثر ان آزاد اور مست المست پنجیوں کو

بخاروں کی طرح ہی زندگی گزارتے ہیں لیکن.....
 ”بس!“ بروجر نے اچانک اسے چپ کرا دیا۔
 ”جو پوچھوں اسی کا جواب دو۔ سوئیل کو تم نے کہاں بھیجا ہے؟“
 ”اپنے گھر۔“ شاہ زمان نے وہی جواب دہرا دیا۔
 ”گھر کہاں ہے؟“

اسی دوران شاہ زمان نے محسوس کیا کہ اریبہ بہت بے چینی سے نظر آرہی تھی۔ جیسے وہ اس سوال کا جواب دینا چاہ رہی ہو۔ ضرور اس کے ذہن میں کچھ تھا۔ شاہ زمان نے جلدی سے سوچا۔

درحقیقت بروجر کے ہاں اس طرح اچانک چلی ان کی توقع کے خلاف تھی۔ انہیں نہیں معلوم تھا کہ بروجر جی ریحان کے یوں اچانک راج محل سے چلے جانے سے واقف ہو چکا ہے۔ ورنہ وہ اس کے لیے ذہنی طور پر تیار رہتے۔ تاہم اس بات کا امکان ان کے ذہن میں تھا کہ کئی کیوں اچانک روانگی پر اور کوئی نہیں تو بروجر ضرور شکست کھاتا ہے۔

بہر طور..... اسی سبب شاہ زمان نے ایک دم بہانہ بناتے ہوئے اپنے ساتھ کھڑی اریبہ کی طرف ایک نظر ڈالنے کے بعد بروجر سے کہا۔

”وہ جی..... سچی بات یہ ہے کہ میں تو اس وقت سویا ہوا تھا جب اس کا بھائی اچانک کہیں چلا گیا تھا۔ اسی لیے آپ کے سوال کا صحیح طرح جواب میری پتی مینا کو ہی دے سکتی ہے۔“

”ہوں.....“ بروجر نے پرخیاں سی ہرکاری خارج کی اور اریبہ کی طرف سوالیہ مگر درشتی سے دیکھا تو وہ فوراً بولی۔
 ”حضور.....! ادھر پان پور میں مغرب ایک میلان لگنے والا تھا۔ سوئیل وہی معلوم کرنے گیا ہے۔ کب اور کس دن میلان لگے گا، تاکہ ہم بھی یہاں سے اپنی تیاری باندھ لیں۔“ اریبہ نے دانستہ ریاست تریپال کا نام لینے سے اجتناب برتنا تھا۔

”تم نے سوئیل کو بغیر مہاراجا کی اجازت کے کیوں راج محل سے باہر بھیجا؟“ بروجر نے اریبہ سے اگلا سوال کیا۔
 ”سرکار.....! ہم اتنے کہاں اہم ہیں کہ کسی سے پوچھتے پھریں۔ وہ تو آپ جیسے بڑے لوگ ان باتوں کا خیال رکھتے ہیں۔ ہم تو کم ذات کے چھوٹے لوگ ہیں حضور.....! یوں بھی مہاراجا صاحب نے ہم پر تو ایسی کوئی پابندی نہیں لگا رکھی ہے۔“

”بہت چالاک بن رہی ہو تم.....“ کہتے ہوئے بروجر نے اسے بڑی سنسناتی ہوئی نظروں سے گھورا۔ وہ ان کے

جواب سے قطعاً مطمئن نہیں ہو رہا تھا۔ اس کا بس نہیں چل رہا تھا کہ وہ ان دونوں میاں بیوی کو الٹا لٹکا کر اور ان کے جسموں کو برہنہ کر کے ان پر کڑے برسا کر جھانکے۔

اریبہ تو انہیں البتہ شاہ زمان کی چست نظریں ضرور بروجر کے چہرے پر اس کے اندر کے اٹھنے والے جوار بھانا کو تازہ رہی تھیں اور یہ بھی کہ وہ ان کے منہ سے اگوانے کے لیے کوئی بھی راستہ اختیار کرنے کی نیت رکھے ہوئے ہے، مگر کسی وجہ سے وہ یہ سب ان کے ساتھ نہیں کر پا رہا۔ وجہ ظاہر یہ بھی تھی کہ انہیں چارشی طور پر کسی راج محل کے شاہی گولیوں کی حیثیت حاصل تھی لیکن یہ حقیقت اریبہ اور شاہ زمان دونوں ہی نہیں جانتے تھے کہ لیف بروجر کی اس معاملے میں سینا پتی سے بھی گرامر بحث ہو چکی تھی، یا پھر شاید انہیں ایسا ہی کچھ اندازہ تھا۔

بروجر نے اسی وقت ان دونوں کو ساتھ لیا اور موج سنگھ کے پاس پہنچا۔ پھر سارا حال اس کے سامنے رکھ دیا۔ سینا پتی موج سنگھ کو بھی اپنے عہدے اور اپنی ذمہ داریوں کا احساس تھا۔ بے شک اس کی دوا یک روز پہلے لیف بروجر سے تو ٹکرا ہو چکی تھی، مگر بہر حال یہ دونوں مشترکہ مفادات اور مصلحت کوئی کے پیش نگاہ ایک دوسرے کی باتوں کو سننے اور اس پر غور کرنے پر مجبور بھی تھے۔

موج سنگھ کے سامنے جب لیف بروجر نے یہ سوال رکھا تو اس کے فوجی ذہن نے بھی اسے کھد پڑا کہ بات غلط نہیں تھی۔ الایہ کہ اپنی جگہ جواب طلب بھی ضرور تھی، لہذا اس نے پہلے تو ان دونوں کی طرف باری باری بہت غور سے دیکھا اور پھر جیسے دونوں کو مخاطب کرتے ہوئے ذرا سخت لہجے میں کہا۔

”دیکھو! ہم تم پر چاسوں ہونے کا شبہ تو نہیں کرتے مگر ہمیں یہ دھڑکا تو ہر کسی سے ضرور لگا رہتا ہے کہ وہ چاسوسوں کے کسی جھانے یا لالچ میں آکر ایسا کوئی خطرناک کام نہ کر ڈالیں جو تم لوگوں کی بھیا کھ موت کا سبب بنے۔ کیونکہ ان لوگوں کی رسائی بہ آسانی راجاؤں اور نوابوں کے حالات تک پہنچتی ہے۔ کوئی بھی نہیں اپنے مفادات کے لیے استعمال کر سکتا ہے۔ اگر ایسی کوئی بات ہے بھی تو بتا دو ہمیں..... میرا وعدہ ہے میں معاملہ ادھر ہی ختم کر دوں گا اور معافی بھی دلا دوں گا۔“

لیف بروجر موج سنگھ کے اس سوال پر اندر ہی اندر بری تمنا طرح رہا تھا جبکہ وہ ان دونوں کے ساتھ کسی قسم کی بھی نرمی برتنے کے حق میں نہیں تھا۔ وہ جانتا تھا کہ ریاست کا یہ سینا پتی ان سے خست باز پرس کرے۔

رنگ آسمان

”ارے حضور! کیسی باتیں کرتے ہو، ہم غریب گویے ایسا خطرناک کام کیوں کرنے لگے۔ اگر ایسا ہوا بھی تو ہم سب سے پہلے آپ کو خیردار کریں گے۔ ہم تو نوجوان لڑکے والے لوگ ہیں ہمیں بھلا ایسا خطرناک اور مشکل کام کہاں آتا ہے۔“

اریبہ نے چالاکی سے کہا۔
 ”تو پھر تم نے اپنے ساتھی سوئیل کو کہاں بھیجا ہے؟“
 موج سنگھ نے پوچھا۔

”بتایا نا..... حضور! وہ پان پور گیا ہے۔ وہاں گھنٹش دیوتا کا عقرب میلان لگنے والا ہے۔ اس کے بارے میں پتا کرنے گیا ہے کہ کون سے دن کو لگے گا۔“ اریبہ نے بتایا تو اسی وقت لیف بروجر نے موج سنگھ کے کان میں کچھ کہا۔ اریبہ اور شاہ زمان کا دل اندر سے ہی طرح دھڑکا جا رہا تھا۔ انہیں خدشہ تھا کہ اگر موج سنگھ، لیف بروجر کے پکائے میں آ گیا تو ان کے ساتھ برا ہو جائے گا۔

موج سنگھ نے اپنے کان میں پڑی بروجر کی سرکشی پراشبات میں سرکونش دی اور ان سے بولا۔
 ”کب تک لوگے کا سوئیل؟“
 ”دو..... دو تین روز میں.....“ اریبہ کے منہ سے نکلا۔
 اس کی آواز تھوڑی اڑکھڑائی لگی تھی۔

”ٹھیک ہے، ہم ابھی اپنے کچھ آدمی اس کے پیچھے روانہ کرتے ہیں۔ اگر وہ وہاں نہ ملا تو ہم تمہارے اس جواب کو جھوٹ پر محمول کرتے ہوئے اپنے شبہ کا اظہار بھی مہاراجا صاحب سے کر دیں گے۔ پھر وہی تم لوگوں کے بارے میں آخری فیصلہ کریں گے۔ لیکن اب یہ بات یاد رکھنا۔ تم دونوں میں سے کوئی بھی بغیر اجازت کے راج محل سے باہر نہیں جائے گا۔ سمجھ گئے؟“

”سمجھ گئے حضور..... سمجھ گئے۔“ دونوں نے جلدی سے اپنے سروں کو اٹھائی جنبش دیتے ہوئے ساڑی سے کہا۔
 اس کے بعد موج سنگھ نے ان دونوں کو جانے کی اجازت دے دی۔ وہ دونوں کمرے سے نکل گئے تو لیف بروجر نے سینا پتی سے کہا۔

”میں اپنے دو سپاہی پہلے ہی روانہ کر چکا ہوں۔ لیکن ان دونوں پر بھی یہاں کڑی نگاہ رکھنا ضروری ہے۔“

”ہاں! تم نے اچھا کیا۔ ہم بھی اپنے آدمیوں سے کہہ دیں گے۔“ موج سنگھ نے اس سے پچھا جھڑاتے ہوئے کہا۔
 دراصل موج سنگھ کو فرنگی سپاہیوں کی راج محل میں گھنٹائی شروع ہی سے ایک آنکھ نہیں بھائی تھی۔ یوں بھی بروجر اس کا ہم منصب نہیں تھا۔ تاہم برٹش گورنمنٹ کے دور میں

☆☆☆

سہ پہر کا وقت تھا۔ سردی کی کاٹ کسی وقت بھی شروع ہونے والی برف باری کا پتا دیتی تھی۔ قلعے کی جنوب مشرقی سمت کی فصیل کی دھولوانی راہ گزر پر ڈاک گاڑی تیار کھڑی تھی۔ (ڈاک گاڑی اس زمانے کی گھوڑا گاڑی کو کہتے تھے۔ جو بالکل بند ہوتی تھی اور عموماً سخت سردی اور بارش اور برف باری کے موسم میں چلا کرتی تھی) اس کے اندر مہارانی نوجوانی اور بچہ ورام بیٹھے تھے۔ بوڑھے کوچاں نے ان کے سوار ہوتے ہی ڈاک گاڑی میں بٹے ہوئے دو گھوڑوں کو پکے سے چابک مار کے ٹکارا اور پھر وہ چل پڑی۔
 نئے تاریک جنگلوں میں گھری اس راہ گزر پر ڈاک گاڑی مناسب رفتار سے دوڑتی ہوئی کالی کے مندر تک جا پہنچی۔ مندر کے گرد و جوار میں آسمانی سناٹا طاری تھا۔ ایک ٹھنڈا ہوا لگا اندھیرا مندر کو اپنے حصار میں لیے ہوئے تھا۔ مہارانی اپنا لباس سنبھالی ہوئی بچہ ورام کے سہارے سے نیچے اتری اور پھر تیز تیز قدموں سے چلتی ہوئی اندر داخل ہو گئی۔

اندر ہال کمرے میں ایک شخص جیسے اسی کا... منتظر کھڑا تھا۔ اس نے نوجوانی کو نہایت احترام کے ساتھ پرنام کیا اور اسے لیے ایک اور کمرے میں آگیا۔ بچہ ورام بھی ساتھ تھا۔
 اس کمرے میں مہاراجا کی کے ساتھ اس کا خاص چیلہ پرس رام بھی موجود تھا۔ اس نے بھی کھڑے ہو کر مہارانی کو پرنام کیا اور پھر دونوں آئے اس کے سامنے ایک کونے میں بھیجی نشستوں پر براجمان ہو گئے۔ ان نشستوں کا بندوبست خاص طور پر کیا گیا تھا جبکہ پرس رام اور بچہ ورام ایک طرف فرش نشست پر پانچھی مار کے بیٹھ گئے تھے۔

”حالات قابو ہیں آپکے ہیں بدری نا تھا اتم نے آگے کیا سوچا ہے اب.....؟“

مہارانی نے چھوٹے ہی مہاراجا سے پوچھا۔ بدری نا تھا نوجوانی کی بات کا مطلب سمجھتا تھا، بولا۔

”مہارانی جی! میں نے بہت محنت سے اور خود کو خطرے میں ڈال کر دلی عہد کی کھانکھڑی کرنے کے لیے ایک پورا ٹھکانہ بنایا تھا۔ مگر آفسو وہ آپ کی وجہ سے ضائع چلا گیا۔“
 ”میری وجہ سے..... ہو یا تمہاری ترنت کاری (جلد بازی) کی وجہ سے ہوا.....؟“ مہارانی نے بھی اسی لہجے میں جواب دیا۔

کے انداز میں خود سپردی تھی۔

”اربیہ! تم بہت بہادر ہو، آخر تک تک تم خود کو ہماری خاطر خطرات میں ڈالتی رہو گی؟ ہم ڈکٹی اور ترکیب بھی سوچ سکتے ہیں۔“

”تمہاری خاطر.....؟“ اربیہ آہستگی سے جدا ہو کر بولی۔ ”ہرگز نہیں، میں جو کچھ کر رہی ہوں تمہاری خاطر نہیں بلکہ اس نیک مقصد کی خاطر کر رہی ہوں۔ لیکن ذرا سوچو زمان! ہمارے پاس اس کے سوا اور کوئی چارہ بھی نہیں ہے۔ ہمارا بھی یہاں قیام ضروری ہے۔ تم دعا کرو میری کامیابی کی..... اور میرا ساتھ دو۔ بس اسب ٹھیک ہو جائے گا۔“

شاہ زمان سوچتا رہ گیا۔ وقت گزرا چلا جا رہا تھا۔ اربیہ نے اس کی طول پکڑی خاموشی کو اثبات میں جانا اور پھر اس سے اجازت لے لی۔

☆☆☆

لیف بروجر..... اپنے کمرے میں پشت پر دونوں ہاتھ باندھے بے چینی سے ٹہل رہا تھا کہ اچانک اس کے کانوں سے ہلکے شور کی آواز گونجی۔ اس نے ایک سپاہی کو آواز دے کر اندر بلا یا اور اس شور کا سبب پوچھا تو اس نے بتایا کہ باہر وہ دونوں گویے میاں بیوی کے درمیان جھگڑا ہو رہا ہے۔ لیف بروجر چونک سا گیا اور یہ ”ظفار“ دیکھنے کے لیے خود ہی..... کمرے سے باہر آ گیا۔ کیا دیکھتا ہے کہ بیٹا کوری اپنے شوہر بھوپت کا گریبان پکڑے اس کے لئے لے رہی تھی۔

”تو اس کیتا کو یہاں کیوں بلانا چاہتا ہے میں خوب جانتی ہوں۔ میرے بھائی سوشل کیا گئے یہاں سے تم نے پھر وہی رنگ روپ دکھانے شروع کر دیے۔“ اربیہ، شاہ زمان کا گریبان پکڑے مسلسل یہ کہے جارہی تھی اور لیف بروجر قدرے حیرت سے یہ ”ظفار“ دیکھنے میں ٹوٹا۔ اس کے چہرے کی تڑپ اس میں نظر آ رہی تھی کہ اچانک ایک ”خاص“ قسم کی دھچکی میں بدل گئی تھی۔

”میرا دشوار کمرے میں! تم غلط سمجھ رہی ہو مجھے۔ کا مٹا کو میں اسی لیے.....“

”مت لو بار بار اس حرفہ کا نام میرے سامنے..... آئیے دوسرے سوشل بھیا کو۔ پھر میں تمہیں مزہ چکھاتی ہوں۔“ اربیہ غصے سے شاہ زمان سے بولی۔ شاہ زمان کو بھی غصہ آ گیا۔ اس نے ایک چھڑا اربیہ کے چہرے پر بڑا دیا۔ پھر تو جیسے قیامت آ گئی۔ اربیہ نے چلائے ہوئے اس کا منہ لوپٹے کے لیے اپنے دونوں ہاتھ اس کے چہرے کی طرف بڑھائے۔ شاہ زمان اس کی انگلیوں کے لیے ناخنوں سے بچنے

”تمہاری بات ٹھیک ہے، لیکن اس طرح ہمارا راج محل چھوڑنا ان کے یقین کو پختہ بنا دے گا۔“

”جہاں تک صرف اس فرنگی افسر بروجر کے شکوک کی بات تھی تو مجھے اس کی پروا نہ تھی، لیکن علی بھائی کے یوں اچانک راج محل سے روانگی نے لگتا ہے بیٹا ہتی موج سنگھ کو بھی شک میں مبتلا کر دیا ہے۔ یہ ایک خطرناک علامت ہے۔“

”وہ تو ٹھیک ہے اربیہ! لیکن باوجود اس کے ہم یہاں سے چپ چپاتے فرار نہیں ہو سکتے۔ اس طرح..... ان کا شبہ یقین میں بدل جائے گا اور کوئی بعید نہیں کہ وہ جنگی پلان میں تہذیبی کرلیں، اگر ایسا کیا گیا تو ہماری ساری محنت اور قربانیاں اکارت چلی جائیں گی۔“ شاہ زمان نے گہری ٹھیک سے کہا۔ اربیہ کو بھی یہ بات سمجھ آ رہی تھی اسی لیے وہ بھی چندھوں کے لیے چپ سی ہوئی۔ دونوں مدغم سی سرگوشیوں میں باتیں کر رہے تھے۔ شاہ زمان نے مزید کہا۔

”جب تک علی تریپال پہنچ کر نواب شہباز خان سے مل کر اسے مائیکل شاہ اور چند کہتا ہے خطرناک عزائم سے آگاہ نہیں کرویتا، ہمارا یہاں سے کوچ کرنا اس مشن کو نام بنانے کے مترادف ہوگا۔ بلکہ مشن کے زیادہ سے زیادہ سودمند نتائج حاصل کرنے کے لیے ہمارا بھی ادھر ہی قیام کرنا بہت ہی اہم ہے۔“

اربیہ فطرتاً بہت زیرک و ماہر تھی۔ بعض خاص قسم کے حالات میں اس کا ذہن تیزی سے کام کرتا تھا۔ وہ کوئی منصوبہ بناتی تھی۔ جب ہی جیسے اس کا چہرہ ایک دم پرسکون نظر آنے لگا جو اس بات کی غمازی کرتا تھا کہ وہ کسی نتیجے پر پہنچ چکی تھی اور پھر اسی لمحے میں وہ شاہ زمان سے بولی۔

”میرے ذہن میں ایک منصوبہ آیا ہے، اس میں خطرہ تو ہے مگر کامیابی کی بھی اتنی ہی امید ہے۔“

”کیسے منصوبہ؟“ شاہ زمان نے اس کے چہرے کے مددگار نقش پر نظر پڑا تو اس کا منہ کھل گیا۔ اربیہ اسے اپنے منصوبے سے آگاہ کرنے لگی۔ جسے سننے کے بعد شاہ زمان کا اپنا پھر دست کر دیا۔ بولا۔

”نہیں اربیہ! میں تمہیں اس خطرناک منصوبے پر عمل کرنے کی اجازت نہیں دے سکتا۔ مجھے اپنی پروا نہیں، لیکن تمہاری زندگی میرے لیے اہم ہے۔“

”کیا مشن اہم نہیں.....؟“ اربیہ نے خفیف سی ایک اداسے مکان سے اس کی طرف دیکھ کر کہا۔ شاہ زمان کو اس کا دل نہیں انداز اس قدر ہلکا کہ اس نے بے اختیار اربیہ کو دھکے دے دیے۔ اربیہ کے حلق سے سکاری نکل گئی، اس

”تمہاری صاحبہ! اب یہ تو کرنا ہی پڑے گا۔ اس کے سوا اور کوئی چارہ نہیں رہا ہے۔“

”ایک کام کرو، بددی! ابھی تمہارا کارگر رہنے دو..... پورن ماشی کے تہوار میں ولی عہد کو ساپوں سے ڈسوا دیتے ہیں۔“ نجوبائی نے سفاکی سے کہا مگر اس کے لہجے سے قدرے جھنجھلاہٹ ستر تھی، اس پر بددی نے اکتھیں پھیل گئیں اور وہ اسی حیرت و پریشانی سے بولا۔

”ہی..... کیا کہہ رہی ہیں تمہاری جی آپ.....؟“ دوبارہ اسی ہتھیار کو آزماتا ہمارے لیے خطرناک ہو جائے گا۔ بڑی مشکلوں سے تو ہم نے اس فرمشن سے جان چھڑائی ہے، سب کو ہم پر شبہ ہو جائے گا۔ یہ زہریلے سانپ ہمارے پالتو ہیں۔ ہم دھریے جائیں گے۔ مندر اور ہماری ساکھ متاثر ہوگی۔“

تمہاری نجوبائی بولی۔ ”مجھے اس کی پروا نہیں ہے۔ بس امیرا کام ہوتا چاہیے۔ وہ سب سے زیادہ اہم ہے۔ اور پھر تم کیوں چپتا کرتے ہو بددی؟ ایک بار ریاست کی باگب عتوان ہمارے بیٹے کے ہاتھوں میں آجائے دو، ہم بھی محفوظ رہو گے۔“

”وہ تو ٹھیک ہے تمہاری صاحبہ! لیکن سمجھنے کی کوشش کریں۔ اب حالات وہ نہیں رہے، بھانڈا اچھوٹنے کا اندیشہ یہاں بھی ہے، بلکہ یہاں زیادہ خطرہ ہے۔ آپ کو میں بالکل صحیح مشورہ دے رہا ہوں۔ پانی والے زہر میں خطرہ ہوتا ہے، مگر خشک زہر میں نہیں۔“

تمہاری بات کی بات سن کر نجوبائی کچھ ٹانے کے لیے پُرسوج انداز میں چپ رہی اور سوچنے لگی کہ بددی ہاتھ کی بات مانتا ہی پڑے گی۔ دونوں کے مفادات مشترک تھے۔ اس کی سانپ والی ترکیب کی طرح خشک زہر والی ترکیب کارگر ہو سکتی تھی۔ نیز یہ کہ اب بددی ہاتھ کی صورت میں بھی سانپ والا ہتھیار دوبارہ نہیں آزماتا۔

”ٹھیک ہے، کب تک مجھے زہر دے دو گے؟“ بالآخر تمہاری نے پوچھا۔

”کل تک دے دوں گا۔“ بددی ہاتھ نے جواب دیا۔

☆☆☆

”اب ہمارا بھی یہاں رہنا خطرے سے خالی نہیں رہا شاہ زمان۔“ تمہان گاہ کے اپنے گوشے میں آکر اربیہ نے فکر مند سے کہا۔ شاہ زمان بھی کچھ ایسے ہی حالات میں خطرے کی بونٹھ رہا تھا۔ اربیہ کی بات کی تائید میں اپنے سر کو شانی جنبش دیتے ہوئے بولا۔

”آپ کو مجھے نے اور وہی لوگوں کے بارے میں مطلع کرنا چاہیے تھا کہ وہ راج محل میں مقیم ہیں۔“ بددی ہاتھ بولا۔ تمہاری نجوبائی کو تمہاری پکاری کا یہ جواز لنگھوا لولا محسوس ہوا۔ بولی۔

”مطلع کرنا میرے لیے کوئی ضروری بات نہ تھی بددی ہاتھ!۔“ نجوبائی نے بلی مگر عجب دار آواز میں کہا۔ ”مگر تم نے اتنا اہم ہتھیار ایک عام سے جنگی پروفیسر پر کیوں ضائع کر ڈالا؟ اور پھر بھلا اسے ہلاک کرنے کی کیا ضرورت تھی؟“

”وہ ہماری راہ پر گئے ہوئے تھے۔“ بددی ہاتھ نے جواب دیا۔ اسے اپنی آواز دور سے آتی محسوس ہوئی۔ ”تو پھر کسی اور عام طریقے سے یہ آسانی اسے ٹھکانے لگا دیتے۔ کیا ضروری تھا ساپوں سے ڈسوانا؟“

اب پجاری بددی ہاتھ تمہاری نجوبائی کو کیا بتاتا کہ اس کے لیے وہیشوں کا کالی کے مندر میں مدخلت کرنا کتنا خطرناک تھا۔ کیونکہ وہ یہاں پوجا بات کی آڑ میں ایک عرصے سے جو گھنٹا ڈاٹا اور پراسرار ٹھیل، ٹھیل رہا تھا، اس کے بارے میں صرف وہی جانتا تھا یا پھر اس کے سیوک کار۔ مگر وہ تمہاری سے بحث بھی کرنا نہیں چاہتا تھا، کیونکہ ان دونوں کا مفاد ایک دوسرے سے ٹھیک تھا۔ وہ خاموش رہا۔

”ٹھیک ہے، اب جو ہوا سو ہوا.....“ بالآخر نجوبائی نے بھی اسے خاموش یا کر بات ختم کرنا چاہی۔ آگے بولی۔

”اب کوئی اور طریقہ سوچو..... مگر جلدی۔ سیاسی حالات بدلنے والے ہیں۔ میں چاہتی ہوں کہ اس سے پہلے کچھ ہو جائے۔“

”تمہاری جی! اب آپ کو ہی کچھ سوچنا اور کرنا پڑے گا۔ ترکیب میں بتائے دیتا ہوں، جو بہ ظاہر سادہ سی ہے، مگر ہے بڑی چترانی ہوئی۔“ پجاری بددی ہاتھ نے بڑی مکاری سے تمہاری سے کہا۔ وہ اب مزید رسک لیتا نہیں چاہتا تھا۔

”کون سی ترکیب ہے اب، بتاؤ مجھے؟“

”میں آپ کو ایک خطرناک سانپ کے زہر کو سکھا کر اس کی پڑیا بنائے دیتا ہوں، وہ کسی دودھ وغیرہ میں ڈال کر ولی عہد پر تپ کو پلا دیں، قصہ ختم۔“

”ہوں..... بڑی چترکاری بتا رہے ہو ہمیں.....“

تمہاری طنز یہ لہجے میں بولی۔ ”تمہیں معلوم ہے کہ راج محل کے اندر کسی بھی فرد کے لیے زہر کا استعمال خودی سازش کا پویل کھول دیا کرتا ہے؟ میں ولی عہد کی موت کو حادثے کی شکل میں ہوتا دیکھنا چاہتی ہوں تاکہ خشک کی ذرا سی بھی گنجائش باقی نہ رہے۔“

RUMATIL

نور کی



... بنی آرام کی

100% Natural

موج، پٹھوں کا کچھاؤ، کمر درد، جوڑوں کے درد کے لیے

Pain Relief Oil

رومائل

درد سے آرام



 مَسْرُوحِيَا

 1972

RUMATIL

PALE PABEL
DI

50 ml

Ditrdasarkan
Merkatula Labordat (P) (P)

مسکراہٹ عود کر آئی تھی۔ شاہ زمان اسے روکنا نہ گیا مگر اسیہ نے شخص سے سختناتی ہوئی فرنگی سپاہی کے ساتھ چلی گئی۔

☆☆☆

تیز بارش کے پانی کی بروت..... علی رحمان کے
چہرے پر پڑتی رہی تھی... اسی لیے وہ جلد ہی بے ہوش سے شہ
بے ہوشی کی حالت میں آگیا اور فرہادی جب اسے خرد کا بھی
یارا ہونے لگا تو اس نے کچھ آواز بر نہیں... کسی کھوڑے کے
ہنہانے کی اور پھر ایک انسانی آواز.....

“جیکب.....!”

”کیا ہوا؟“

”اس طرف کوئی بے ہوش پڑا ہوا ہے۔ ارے..... یہ تو
 یہی ہے..... ہمارا شکار..... سوئیل۔“

اپنے فرضی نام پر علی نے بے حرکت رہتے ہوئے ایک آنکھ کی جھری بنا کر دکھا سوائے اتفاق وہ اسی رخ پر بڑا تھا۔ وہ بدمعاش سے روب اور چیکب گھوڑوں پر چلے آ رہے تھے۔ وہ قریب پہنچ چکے تھے پھر اس نے ان کو قریب آتے دیکھا۔ کیا ہوا ہے روب! دیکھو رابا..... تو نہیں گیا ہے کہیں؟“

”یہ زندہ ہے، بیمار لگ رہا ہے۔ لگتا ہے سردیوں اور
 ٹھنڈا ٹھنڈا ہے اسے۔ نہ حال کر کے بے ہوئی پر مجبور کر دیا ہے۔“
 ”میرا خیال ہے اسے اجڑی گولی مار کر دوا میں چل
 دیتے ہیں، موسم بہت خراب ہو رہا ہے۔ کہاں اس مصیبت
 کو ساتھ لے بھریں گے۔“

”خجور تو تمہاری بری نہیں لیکن..... لیف بروجر.....“
 علی رحمان کا ماتھا ٹھکا۔ وہ لیٹے لیٹے ہی اپنے حواس مجتمع کرنے لگا۔ جان گیا تھا کہ ایک سفاک موت اس کے پر کھڑی ہے۔

”اس کی پروا امت کرو..... بتا دوں گے کہ ہمیں دیکھ کر
ارہ ہونے کی کوشش میں چلتی ہوئی ریل کار پر سوار ہو رہا تھا تو
مے نے گولی مار دی۔“

”چلو پھر جلدی کرو۔“

”کون کونسا مارے گا؟“

یہ سفاکانہ گفتگو علی ربیعان کے دماغ میں ہتھوروں کی
روح خیزیں لگائی محسوس ہو رہی تھی۔ وہ جھگڑا تھا کہ اسے سر پر
ٹڑی موت سے خود ہی تیراؤ اڑانا پڑے گا۔ یہ اپنا بار بٹکا
دینا چاہ رہے تھے مگر وہ ہتھاتھا۔ پتوں وغیرہ اس نے اسی لیے
تھوپیں رکھا تھا کہ پکڑے جانے کی صورت میں ایک کو یہ
پاس سے ہتھار مانا کسی کو بھی اس کی طرف سے شک و شبہ

مارچ 2018ء

کے لیے پرے ہٹ گیا۔
 ”الو کی جی! اب تو عورت کی عورت ہی رہی۔ جتنی نہ بن
 سکی۔ بلاوجہ کا ٹھک کے جا رہی ہے۔“ پھر شاید اسے خود ہی
 سمجھتا دیا، وہی اور وہ ایک بار پھر ار پیہ کو نہانے سمجھانے کے
 لیے اس کی طرف بڑھا۔

ایسی وقت بروجرنے..... ایک سپاہی کو اشارہ کر کے اپنے پاس بلایا اور اس کے کان میں کچھ کہہا۔ سپاہی فوراً حرکت میں آیا اور ان دونوں کی طرف بڑھا اور انہیں خاموش ہونے کی تلقین کرتا رہا۔ بروجرنے دیکھا کہ بیٹا اپنی سوتلی ساری کے پیلو میں مزدبے ایک طرف کھڑی ہوئی چلی گی اور بھوپت اسے منانے کی کوشش میں اس کے پیچھے ہو گیا۔

ھوئی دیر بعد دونوں اپنے کمرے میں آئے اور اندر آتے ہی شاہ زمان بے اختیار ہو کر..... اریہ کے اسی نرم گال کو چومنے لگا گیا جہاں اس نے پھیرا تھا وہاں ہلکی سی سرخی آگئی تھی۔ کیونکہ اریہ کا رنگ اسی قدر گورا اور جلد شفاف اور نازک تھی کہ ایک ذرا پھرتا تو اس پر پڑ جاتا۔ یہ تو پھر شاہ زمان کے بھاری ہاتھ کا پھیر تھا۔ وہ بچا کر مات تو ذرا سے میں وہ حقیقت کا رنگ نہ پھر پاتا ہی لیے اریہ نے شاہ زمان کو سختی سے تاکید کی تھی کہ وہ کوئی رعایت نہ کرے۔

....."اریہ! تھوڑو سے لگاتار تھیں....." شاہ زمان نے
.....الگ ہو کے بڑے دھکی لچے میں اس سے کہا۔

”بائیں جی نہیں، اپنے خوب کی مار بھی پھونکی کی جھڑی لگتی ہے اور کون سا تم نے مجھے کچھ مچی مارا تھا۔“ ازیہہ محبت سے اٹھلا کر بولی۔ شاہ زمان ایک بار پھر اسے خود سے پچھنے کا ارادہ کر رہا تھا کہ ازیہہ نے روک دیا۔

”اُڑے..... رے رے..... یس! ورنہ ڈرامے کا سارا راز کھل جائے گا۔ ابھی دیکھو کیا ہوتا ہے۔“

وہی ہوا..... لگ بھگ کوئی نصف گھنٹے بعد اس پر یہ کی توقع کے عین مطابق ایک فرنگی سپاہی اندر داخل ہوا اور اس پر یہ سے تحکمانہ انداز میں بولا کہ اسے ”صاحب“ نے فوراً بلایا ہے۔

سپاہی کی متوجہ آمد سے وہ دونوں پہلے ہی ہوشیار تھے۔
اسی لیے منصوبے کے عین مطابق دونوں نے پہلے والا
”مغز“ ختم کر تہ تیہ دے دیا تھا۔ یعنی شاہ زمان، اریہ کو مرنے کی
کوشش میں جتا ہوا تھا۔

”میں ضرور جاؤں گی صاحب کے پاس..... اور اس سے کہوں گی کہ میرے سوا کسی اور دُشمنی کو راج محل میں نہ بٹھائے۔“ اریبہ نے واپستہ اس فرنگی سپاہی کے سامنے غصے سے شاہ زمان سے کہا جس پر سپاہی کے ہونٹوں پر ہلکی سی معنی خیز

سینس ڈائجسٹ

اچانک اس کا دل کچھ عجیب طرح کی بے چینی محسوس کرنے لگا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ ایک دم کیوں بے چین ہونے لگا تھا؟ پریشانی اپنی جگہ لیکن..... اس کے دل کی بے چینی کسی اور ہی بات کی طرف اشارہ کرتی محسوس ہو رہی تھی۔ یہ بے چینی اس کی چھٹی حس سے بیدار ہو رہی تھی جس کا تعلق اس سین سے تھا۔ تب ہی دفعتاً وہ چونکا۔

اس نے ایک نگاہ یونہی بینک بیڈ پر کیبل اوڑھے گہری نیند میں مستغرق آدمی کی طرف دیکھا اور اپنے اندر کی اسرار بھری بے چینی کو سواہوتے محسوس کیا۔ وہ ایک دم کھڑا ہو گیا۔ اس کے وجدان میں فوراً ہی ادراک ہوا کہ اس کی نامعلوم بے چینی کا تعلق مکمل میں سوئے پڑے اسی آدمی سے تھا۔ تب ہی جانے کیوں اس کے جی میں آئی کہ وہ ایک ذرا اس آدمی کا مکمل سر کا کر دیکھے تو..... بس یونہی ایک خیال اس کے ذہن میں ابھرا تھا۔

وہ کھڑا ہو گیا۔ باہر تار یک جنگلوں اور پہاڑیوں میں دھواں دھار ہونے والی بارش کا شور جاری تھا۔ گاڑی رکی ہوئی تھی۔ ایک بار اس کے انہن نے عجیب سا تاثر چھوڑی وصل دی تھی۔

وہ دھیرے دھیرے قدموں سے چلتا ہوا رنگ آلود اور سا لٹوڑہ سے بینک بیڈ کے قریب آیا اور چند لمبے کھڑے ہو کر اسی طرح مکمل اوڑھے سوئے ہوئے شخص کو گھورتا رہا۔ وہ پشت کے بل لیٹا ہوا لگتا تھا۔ علی نے اپنا ایک ہاتھ اس کی طرف بڑھایا تو اسے اپنے ہاتھ میں ارتعاش نمایاں طور پر محسوس ہوا..... پھر جب اس نے سر کی طرف سے اس کا مکمل چھو کر آنکھیں سے ہٹایا تو اسے ایک بھیاں تک چہرہ اپنی پھیلی ہوئی آنکھوں سے اسے گھورتا ہوا محسوس ہوا۔

ٹھیک اسی وقت بجلی کا زوردار کڑا ہوا تھا اور علی ریحان جیسا مضبوط دل گردے کا آدمی بھی اس بھیاں تک متھڑکی تاب نہ لاتے ہوئے بری طرح دلی کر چند قدم پیچھے ہٹ گیا۔

☆☆☆

کالی کے مندر کے مہا پجاری بدری ناٹھ کا مکمل منصوبہ اور مقصد کیا تھا، یہ مہارانی نوجواں کی کو پتا نہیں تھا۔ یہی نہیں مہارانی، بدری ناٹھ کے... گھٹاؤنے راز سے بھی واقف نہ تھی کہ اس نے ولی عہد کے لیے تیار کیا ہوا ہتھیار پروفیسر ہنری پر کیوں آزمایا تھا؟ جبکہ اسے بتایا یہی کیا تھا کہ ایسا ناٹھ علی یا علی سے ہو گیا کہ اس کے در پر وہ حقیقت کچھ اور تھی۔

در مکمل بدری ناٹھ کے لیے ولی عہد پر تاب نہیں بلکہ پروفیسر ہنری "خطرناک" ثابت ہونے لگا تھا۔ لہذا یہ کہا جاسکتا

ہیکے جنگلوں اور سنگلاخ چٹانوں کے درمیان میں سانپ کی طرح بل کھاتی مال گاڑی مناسب رفتار سے دوڑی چلی جا رہی تھی۔ اس کی رفتار پہلے سے تیز ہوئی تھی۔

علی ریحان کی ہڈیوں کے اندر تک اتری ہوئی ٹھنڈک کم ہوئی تو اس کا ذہن کچھ سوچنے سمجھنے کے قابل ہوا۔ اس نے ایک نظر بینک بیڈ پر دراز مکمل اوڑھے شخص کی طرف دیکھا۔ وہ سوچنے لگا کہ یہ شخص بے مدد سو رہا ہے۔ اسے جھپٹ کر مناسب نہیں۔ سوٹا اس نے نہیں تھا، سرحد پار کرتے ہی اور تریپال میں داخل ہونے کے بعد وہ فوراً مال گاڑی سے خاموشی کے ساتھ اتر جائے گا۔

لہذا اس نے یہی کیا اور خاموشی سے اسی طرح آگیشی کے پاس بیٹھا رہا۔ رات کا جانے کون سا پہرہ سر رک رہا تھا۔ مال گاڑی اپنی مخصوص..... کھٹا کھٹ..... کھٹا کھٹ..... کی آواز سے منزل کی جانب گامزن تھی۔ وقت گزرتا جا رہا تھا۔ اس نے ناگہ سے تریپال تک کے اپنے سفر کے دورانے پر غور کیا۔ یعنی ناگہ سے مال گاڑی میں روڈ کی کوا سے بس سے چھٹیں منٹ ہو چکے تھے۔ اس نے ریل کار کی رفتار پر بھی دھیان دیا۔ جس کی رفتار اس کے مطابق اندازے کے مطابق درمیانی رفتار سے کم ہی تھی۔ درمیان میں اگرچہ ٹھوڑی دیر کے لیے رفتار بڑھی تھی مگر پھر کم ہو گئی تھی۔ بس اتنی ہی تھی کہ ایک انسان اپنی پوری رفتار سے دوڑتے ہوئے اس پر چڑھ اور اتر سکتا تھا۔

اس نے اپنی معلومات کو دنگ نگاہ رکھتے ہوئے سوچا۔ وہ ناگہ کی حدود کے بعید ترین گوشے میں موجود تھا۔ مزید میں سے پچیس منٹ کے بعد وہ اس کی حد سے پار ہو سکتا تھا۔

ٹھیک اسی وقت شرانے دار بارش پھر شروع ہو گئی۔ بارش کا زور ایک دم ہی پھوٹ پڑا تھا۔ تب ہی اس نے محسوس کیا کہ گاڑی کی رفتار بھی بتدریج ٹھکی ہوئی تھی۔ جیہوتے ہوتے اتنی باقی رہ گئی کہ کوئی بھی مسافر (اگرچہ یہ مال گاڑی تھی) نیچے اتر کر ضروریات سے فارغ ہونے کے بعد دوبارہ... بہ آسانی سوار ہو سکتا تھا۔

علی شکر سوار ہو گیا۔ ابھی وہ پڑھوچ انداز میں اسے ہونٹ سمجھتے ہوئے کچھ سوچ ہی رہا تھا کہ گاڑی رک گئی۔ اب صرف ماحول میں تیز شرانے دار بارش کے شور کے سوا کچھ سنائی نہیں دیتا تھا۔ اس نے ٹھوڑی سا کھڑکی سے باہر جھانکا تو اسے گھور غصہ پڑی ہوئی سردرات کے برستے ہوئے اندھیاروں کے سوا کچھ دکھائی نہ دیا۔ وہ دوبارہ آگیشی کے پاس آکر بیٹھ گیا جس کے کونوں کی سنگن بھی اب مانند پڑنے لگی تھی۔

اندراک ہی مختصر سا کہیں تھا۔ دو چور چھوٹی کھڑکیاں تھیں۔ ان کے درمیان میں دروازہ تھا جو بند تھا۔ کھڑکیوں میں سے ایک بندھی، جبکہ دوسری کا ایک پٹ ٹوٹا ہوا تھا اور اس کے خلا کو پُر کرنے اور سرد ہواؤں کے گزر کو روکنے کی مقصدور بھر کوشش کرنے کے لیے اس پر کوئی کتا سا لگا دیا گیا تھا۔ وہی کتا ہٹا کر علی نے اندر جھانکا تھا۔

اندراک ہی پر قان زدہ روشنی تھی۔ درمیان میں لوہے کی ڈنگ آلود گول اسٹول نمایاں نصب تھی۔ اس پر درخت کا کھڑا تھا۔ پاس ہی کرسی تھی۔ دائیں بائیں لوہے کی دیواروں سے دو بینک بیڈ نصب تھے۔ ایک پر کوئی موٹا سا بوسیدہ مکمل اوڑھے سو رہا تھا۔ لائٹن اسی اسٹول پر پرچی تھی جس کی لوہہ بھی..... اندرا سے کونوں کی ایک آگیشی بھی ملتی نظر آتی تھی۔

علی کا سر دی سے برا حال ہو رہا تھا۔ اس نے دروازے کو آہستگی سے اندر دھکیل کر کھولنے کی کوشش کی مگر حسب توقع دروازے کو اندر سے بندھی پایا۔ وہ ہونٹ پیچھ کر دیوں کھڑا رہ گیا۔ گاڑی کی اس چھوٹی سی بوٹی میں دونوں طرف چھت تھی۔ اس کا فرش لوہے کی پٹیوں کے چٹچ میں چوبی پٹے نصب کر کے بنایا گیا تھا۔ علی جگہ پر کھڑا تھا۔

ریل کا دھانی انہن رات کی تاریکی میں دل دیتا ہوا اپنے پیچھے مال بوگیوں کو بانڈھے مناسب رفتار سے چلا جا رہا تھا۔ دائیں جانب تاریک جنگل تھا اور بائیں طرف گہری سنگلاخ کھائیاں اور چٹانیں تھیں۔ ان کے درمیان ریل مل کھاتی پڑی پر گامزن تھی۔

علی نے بالآخر اس کھڑکی کو تختہ مشق بنانے کا فیصلہ کیا جس کا ایک پٹ ٹوٹا ہوا تھا اور اس کے خلا میں گتے کا ٹکڑا پھنسا لیا ہوا تھا۔ اس نے کتا یہ آسانی آکھڑا اور کھڑکی سے سکڑ کر بہ مشکل کہیں کے اندر آ گیا۔

کہیں کے اندر آتے ہی بے اختیار اسے سکون کا احساس ہوا۔ کہیں کا محدود ماحول سنگین آگیشی کی وجہ سے کچھ گرم تھا۔ علی نے اس کرم نوازی پر خدا کا لاکھ شکر ادا کیا اور جلدی سے کتا دوبارہ سے وہیں لگا دیا تاکہ سردوار بر قاب ہواؤں کا زور کم سے کم رہے۔ اس کے بعد وہ آگیشی کے قریب آکر بیٹھ گیا اور آگ تانے لگا۔

اچانک گاڑی کسی چٹانی سرنگ کے اندر داخل ہو گئی۔ اس سے کہیں کا ماحول کچھ دیر کے لیے ہی سہی اور بھی گرم ہو گیا۔

سر شہر تری رات..... اور کاٹ دار بریلی ہواؤں کو جرتی، محاق کے چاند کی مدد ملتا سنا روشنی میں بارش سے ہیکے

ادھر گھوڑے کی سواری سے جوا میر بندھی تھی وہ تھوہوئی۔ وہ کسی بھی صورت میں کسی کی گرفت میں نہیں آنا چاہتا تھا۔ اسے معلوم تھا کہ ابھی تک وہ ریاست ناگہ کی حدود کے اندر ہی تھا۔ حدود کے اختتام پر ضرور اس پڑوسی پرچی ناگہ بنایا گیا ہو گا لیکن تریپال بھی جلد سے جلد پہنچنا ضروری تھا۔ بالآخر اس نے یہی فیصلہ کیا کہ وہ اسی طرح اللہ کے بھرے سے پرتار میں ہی اس پڑوسی کی راہنمائی میں گھوڑے پر چلتا رہے گا اور گرد و پیش سے بھی پوری طرح چوک رہنے کی کوشش کرے گا۔ جہاں ذرا سا بھی خطر محسوس ہو گا وہ گھوڑے سے اتر کر سرحد پار کرنے کی کوشش کرے گا۔

چنانچہ اس نے گھوڑے کو بھی رفتار سے دوڑانا شروع کر دیا۔ دو پہلیا پار کرنے کے بعد پڑوسی رات کی تاریکی میں دائیں جانب سانپ کی طرح بل کھاتی جا رہی تھی اور جب وہ ایک مقام پر بالکل سیدھی ہوئی تو وہ چونک پڑا۔ وہ سرخ جی کی روشنی تھی۔

پہلے تو وہ اسے سنگل سمجھا لیکن دوسرے ہی لمحے اسے دل کی آواز سنا دی۔ اس آواز کو اس کا دل بے پایاں مسرت تلے زور سے دھڑکا تھا۔ ریل کار اس کے آگے آگے جا رہی تھی اور سرخ روشنی لائٹن نما وہ جتنی بھی جو ریل کے آخری ڈبے پر باندھی جاتی ہے۔ اسے حیرت بھی کر دل پر کار تو کب کی اس سے چھوٹ چکی تھی۔ کہیں یہ مال بردار گاڑی تو نہیں تھی؟ جس کی رفتار یوں بھی دھبی ہوئی تھی۔

بہر کیف..... کچھ بھی تھا اس نے گھوڑے کی رفتار اور تیز کر دی اور جلد ہی آخری بوگی کے قریب پہنچا تو اس کا اندازہ درست ثابت ہوا۔ یہ مال گاڑی ہی تھی جس کے آخر میں بوسیدہ سا گاڑ کا ڈبہ بچھی تھا۔

اسے اندر گاڑ کی موجودگی کا ڈر بھی تھا تاہم وہ اللہ کا نام لے کر بڑھتا رہا، حتیٰ کہ ڈبے کے قریب پہنچ گیا۔ اس نے ہوشیاری سے خود کو گھوڑے کی پشت سے الگ کیا اور ایک ہاتھ بڑھا کر ڈبے کے عقبی کھلے گوشے میں نصب فولادی ریلنگ کو تھام لیا اور گھوڑے کی پشت سے اپک کر ڈبے میں سوار ہو گیا۔ گھوڑا ٹھوڑی دیر تک آخری ڈبے کے پیچھے ساتھ ساتھ دوڑتا رہا اس کے بعد جلد علی نے مخصوص انداز میں اسے زور سے ایک اشارہ کرتے ہوئے ٹھار مارا تو وہ راستہ بدل کے جنگلوں کی طرف نکل گیا۔

علی ریحان پلٹا۔ اس نے اپنے دونوں ہاتھوں کی ہتھیلیوں کو آپس میں زور سے رگڑ کر سردی کے احساس کو کم کرنا چاہا۔

”امرد“ دھوکا کر رکھ دیا۔ اس کی بات غلط بھی... تو نہیں تھی۔
رینا نے سوچا تھا۔ پھر اس نے سراٹھا کر ولی عہد کے چہرے کی طرف دیکھا۔

یہ حقیقت بھی تھی کہ رینا کو ولی عہد سے انصاف دلانے کی پوری امید تھی۔ اگر رابرٹ ذاتی عناد کی آگ میں جل کر... جمہوری گواہی نہ دیتا تو آج حالات ان کے حق میں ہو سکتے تھے لیکن ولی عہد کے یوں اظہار معذرت ومعافی نے رینا کو الزحد متاثر کر ڈالا، کیونکہ یہ کسی عام انسان کے اس سے معافی مانگنے کی بات نہ تھی۔ ریاست کا ولی عہد اس کے سامنے مجرموں کی طرح کھڑا تھا۔ یہ اس کا بڑا پلہ تھا۔ رینا کو اسی بات نے متاثر کیا تھا، وہ بولی۔

”راجکار صاحب! آپ نے یقیناً ہمارے لیے جو کرنا چاہا تھا اس میں آپ کی نیک نیتی کا ہی دخل ہوگا لیکن جس انداز سے ہم مقدمہ ہار بیٹھے اس کا مجھے بے حد قلق ہے۔ آپ کو تو کوئی دوش نہیں لیکن...“ یہ کہتے ہوئے رینا نے دانستہ قریب کھڑے اپنے کزن رابرٹ کی طرف ترش نگاہوں سے دیکھا تھا۔ پرتاب نے بھی اسی کی طرف دیکھتے ہوئے رینا سے دوبارہ مخاطب ہو کر کہا۔

”میں نہیں جانتا کہ آپ لوگوں کے اندرونی معاملات کیا ہیں۔ لیکن اتنا ضرور کہوں گا کہ آپ لوگ جہاں بھی جائیں، جہر بھی اور جب بھی ہماری ضرورت پڑے مجھے ضرور یاد رکھیے گا۔ رینا صاحبہ! خاص کر آپ کے لیے میرے یہ الفاظ ہیں۔ انہیں یاد رکھیے گا، چلتے ہیں۔“ بگوان آپ کی رکھشا کرے۔“

ولی عہد یہ کہہ کر واپس لوٹ گیا۔ گارڈیاں تڑپتی اور معنی خیز نگاہوں سے رینا کے ہک دک سے چہرے کو کھینچ لگی تھی جو جاتے ہوئے راج کمار کی طرف ہک دک دیکھے جا رہی تھی۔ گارڈیاں کو شوکی علاوہ اب ایک نئی چھڑی کھینچنے کی پوائے ملی تھی۔ گارڈیاں کی مثال گندمی بھی کی سی تھی۔ وہ اس گندم سے ایک گند خیال اخذ کرنے کی کوشش کر رہی تھی جو اس کے لیے کسی طرح ”سودمند“ ہو سکتا تھا۔

رینا چند تپتے تو خاصی گہری اور خیال انگیز سوچ میں مستغرق رہی۔ اس کے دل کو ایک بار پھر ولی عہد پرتاب کی باتوں سے ڈھارس ہوئی تھی۔ آج اس نے پرتاب کی آنکھوں میں اپنے لیے ایک خاص جذبے کی تپش کو بھی محسوس کیا تھا۔ اسی بات نے رینا کو بہت کچھ سوچنے پر مجبور کر دیا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ وہ رواں گئی کی تیاری کے دوران بھی کافی دیر تک کھولی کھولی سی رہی تھی۔ اس کے دل و دماغ میں ہنوز راج کمار پرتاب کے

معترض تھے۔ باقی سب رینا کے ہر حکم کے آگے سرخم کیے ہوئے تھے۔ وہ کیا شوکی تو اس نے پہلے ہی رینا کے ہر حکم کا ساتھ دینے کا عہد کر رکھا تھا۔ تاہم اسے ہی نہیں بلکہ امجد خان وغیرہ کو بھی اس بات کی حیرت تھی کہ رینا کے ساتھ شدید مخالفت کے باوجود... رابرٹ اور گارڈیاں کیوں ان کے ساتھ تھیں تھے؟ وہ واپس شہر کارخ بھی کر سکتے تھے؟ رینا کا ساتھ چھوڑنے میں آخراں کو کیا مسئلہ درپیش تھا؟ وہ ان دونوں بہن بھائیوں سے یہ سوال پوچھنے کے لیے بے چین تھے مگر نہیں پوچھ سکتے تھے کیونکہ ملازموں کا کام صرف حکم ماننا ہوتا ہے سوال کرنا نہیں۔۔۔۔۔

بہر کیف... رابرٹ اور گارڈیاں کی کوئی بھی... پیش رینا کے آگے نہ چل سکا۔ یہ لوگ راج محل سے اپنا پورا یا بستر سمیٹے گئے۔ مہمان گاہ کے اس گوشے میں باتوں کی جھنجھٹ بھی جاری تھی جسے ڈاؤر بعد اچانک بریک لگ گئی۔

ولی عہد پرتاب اندر داخل ہوا تھا۔ ڈرائیور امجد خان، دھند بابا اور شانتا احترام سے سر جھکا کر دوسرے گوشے کی طرف سرک گئے۔ شوکت حیدر بڈ رہا، کیونکہ اسے رینا کی طرف سے ایسی کوئی ہدایت نہ تھی۔ تاہم ولی عہد کے سامنے وہ اس کیفیت کا شکار رہا تھا۔ رینا نے نگاہ اٹھا کر خود ہی پاس کھڑے شوکی کو نگاہ اٹھا کر دیکھا تو وہ بھی اٹھ چلا گیا۔

اب صرف وہاں رابرٹ اور گارڈیاں سمیت رینا اور ولی عہد رہ گئے تھے۔

پرتاب کی نظریں رینا کے چہرے پر جمی ہوئی تھیں اور... رینا نے ایک نگاہ راجکار پر ڈالنے کے بعد جھکی تھیں تاہم اسے ادب سے سلام ضرور پیش کیا تھا، جبکہ رابرٹ اور گارڈیاں نے بھی اسے سلام کیا تھا۔ اب ان دونوں کی نظریں پرتاب اور رینا کو تکانے میں لگی ہوئی تھیں۔

ولی عہد پرتاب نے رابرٹ اور گارڈیاں کی موجودگی کو محسوس کرتے ہوئے رینا کو ہونے سے مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

”رینا! ہمیں اس طرح آپ کے راج محل سے جانے کی اجازت دے دو۔ یہاں ہمیں اس بات کا فہم ہے کہ ہمیں آپ سے کیا کیا پناہ دے پورا نہ کر سکے۔ کوشش ہماری بھی تھی کہ آپ کو پورا پورا انصاف دلایا جائے... مگر ہم ایسا نہیں کر سکے۔ ہم آپ سے یہاں اس بات کی معافی طلب کرنے آئے ہیں۔ لیکن اس بات کو دیکھتے ہیں کہ اس میں ہمارا بھی کوئی قصور نہ تھا کہ آپ اپنے سامنے جمہوری گواہی نہ دیتے۔“

رینا... جس نے پرتاب کی اس طرح آمد کو محسوس نہیں کیا، ولی عہد کی اس ”معافی“ والی بات نے بے اختیار اس کا

لگا دیا ہے۔ وہ آج رات تک بتا دیں گے۔“ پرس رام نے جواب دیا۔

”اور سنو پرس رام...!“

”کہو گوی!“

”تذکرہ کی پڑیا پچھادی تھی؟“

”ہاں! گرو پچھادی تھی۔“ پرس رام نے جواب دیا۔

”پر گرو کی ایک بات میں سوچ رہا ہوں۔“

”کیا بات؟“

”اگر اب کے بھی مہارانی نجوبائی سے یہ کام نہ بن پڑا تو وہ پھر ہمارے گلے پڑ جائیں گی۔ ڈرنا ہوں اس کی وجہ سے کہیں ہمارا کام نہ بگڑ جائے۔“

”اس کی چٹانست کرو پرس رام!“ مہا پجاری نے سانپ کی سی چٹکار سے مشابہ آواز میں کہا۔ یہ محلات کی مہارائیاں کوئی نہ کوئی کل کھلائی دیتی ہیں۔ جہین ان کے من میں کہاں... ہوتا ہے۔ میں دیکھ لوں گا۔ مغرب سنی کی رسم کو میں پروان چڑھانے والا ہوں۔ پھر دیکھنا سب کچھ ہمارے ہاتھ میں ہوگا۔“

”اوش... اوش... (ضرور) گرو جی...! کیوں نہیں۔“ پرس رام خوشامد لہجے میں ہاتھ جوڑ کر بولا۔

☆☆☆☆

ان سب کو اپنے آئندہ کے وہ عزائم پیارے تھے جو انہوں نے اپنے سینوں میں چھپا رکھے تھے۔ اسی لیے مخالفت اور ناپسندیدگی کی اس مکدر فضا کے باوجود وہ سب رینا کا حکم ماننے پر مجبور تھے کیونکہ رابرٹ اور گارڈیاں ان سے جدا ہونا نہیں چاہتے تھے۔ تاہم پھر بھی وہ اس آئینی بستی میں ڈیرا ڈالنے کا سن کر کانپ گئے تھے۔

رابرٹ نے رینا سے جرح کرنے کے انداز میں کہا۔

”ریاست میں اپنا نہیں کیس قائم کرنے کے لیے جگہ کی کیا گئی ہے، کیا ضروری ہے کہ ہم اسی آئینی سنی کارخ کریں؟“

بھائی کی دیکھا دیکھی اس کی تائید میں گارڈیاں نے بھی رینا سے مخاطب ہو کر کہا۔ ”رینا! لگتا ہے صدر سے تمہاری سوچنے سمجھنے کی صلاحیتیں چھین لی ہیں۔ کیا تم نہیں جانتی ہو کہ وہاں ہم نے کن عجیب و غریب لوگوں کو دیکھا تھا؟ میں یقین سے کہتی ہوں کہ وہاں کسی وچ ڈاکٹر کی حکمرانی ہے اور وہ بد رجوں کی بستی ہے۔“

”وہاں نہ کوئی وچ ڈاکٹر رہتا ہے نہ ہی وہ بد رجوں کی بستی ہے۔“ رینا نے ہموار لہجے میں جواب دیا۔

اس کے منصوبے میں صرف یہی دونوں بھائی بہن

تھا کہ بد رجی تاجہ نے غلطی سے نہیں بلکہ جانتے بوجھے ہوئے ہی پروفیسر ہنری کا قتل کر دیا تھا کیونکہ ہنری اس کے ایک بھائی کے منصوبے سے پردہ چاک کرنے والا تھا جو بد رجی تاجہ کو کسی صورت میں بھی گوارا نہ تھا کہ وہ راز آشکار ہوتا۔ بے شک اس کا مفاد بھی مہارانی نجوبائی کے مفادات سے متضام تھا مگر اپنا مفاد بد رجی تاجہ کو زیادہ عزیز تھا۔

اپنی اس شاندار رخ کے بعد وہ بہت خوش تھا۔ وہ اس رخ کو اپنے خفیہ منصوبے کے لیے اچھا لگن رکھ رہا تھا۔ ریاست میں اس کی عزت اور شہرت بڑھ گئی تھی۔ یہی بد رجی تاجہ چاہتا بھی تھا۔ وہ ریاست میں ایک ایسا مذہبی راہنما بن کر ابھرنا چاہتا تھا کہ ساری... رعایا کے لیے وہ سب سے زیادہ قابل احترام اور عزت دار دھارمک کی حیثیت اختیار کر لے۔ یہ اس کے شیطانی منصوبے کا ایک ابتدائی اور... اہم حصہ بھی تھا۔ وہ مذہب کی آڑ میں اپنے خفیہ شیطانی منصوبے کا فروغ چاہتا تھا۔

اب پروفیسر ہنری کو موت سے ہمکنار کرنے کے بعد بد رجی تاجہ کی شیطانی نظر رینا اور اس کے ساتھیوں پر مرکوز ہوئی تھی۔ اس نے اپنے چیلے پرس رام کو ہدایت کر رہی تھی کہ وہ ان پر کڑی نگاہ رکھے۔ آج وہ یہی پتا چلانے کے لیے راج محل کی طرف گیا تھا اور اب مندر لوٹ کر وہ اپنے گرو گھنٹال کو ایک نئی خبر سے مطلع کر رہا تھا۔

”گرو! وہ فرنگن ہے نا... کیا نام تمہاری... ہاں رینا... وہ تو اپنے ساتھیوں کے ساتھ راج محل چھوڑ رہی ہے۔“

”یہ اچھی خبر ہے۔“ پجاری بد رجی تاجہ نے خوش ہو کر کہا۔ ”پر تو یہ بتا پرس رام کہ انہیں صرف راج محل سے بے دخل کیا گیا ہے یا... ریاست سے؟“

”نہی تو بری خبر ہے گرو! انہیں ریاست سے نہیں کیوں راج محل سے بے دخل کیا گیا ہے۔“ پرس رام نے جواب دیا تو بد رجی تاجہ کی سانپ جیسی آنکھوں میں یکا یک تیشوٹیل کے سامنے نمودار ہو گئے، بولا۔

”ممکن ہے وہ لوگ اب بد رجی ہو کر خود ہی ریاست سے بھی نکل جائیں۔“

”اگر ایسا ہوتا تو ہمارا جان خود ان کی شہرہ آفاق کا بندوبست کروا دیتا۔ جس کا اس نے ان سے کہا بھی تھا، پر تو اس فرنگن نے انکار کر دیا۔ اب پتا نہیں اس سسری کا اور کیا ارادہ ہے؟“

”تم یہ پتا چلانے کی کوشش کرو کہ وہ لوگ کہاں گئے ہیں؟ اب ان کا کیا حکم نا اور آئندہ ان کے عزائم کیا ہیں؟“

”میں نے دوساتھیوں کو ان کے تعاقب میں

الفاظ گونج رہے تھے۔ ”جدھر بھی اور جب بھی ہماری ضرورت پڑے مجھے ضرور یاد رکھیے گا۔ رہنا صاحب! خاص کر آپ کے لیے میرے یہ الفاظ ہیں۔ انہیں یاد رکھیے گا۔ چلتے ہیں۔ بھگوان آپ کی رکھشا کرے۔“

شوکی نے بھی اس درمیان میں یہ محسوس کیا تھا کہ ولی عہد کے جانے کے بعد رہنا کچھ زیادہ ہی کھولی کھولی سی ہو گئی تھی۔ حتیٰ کہ اس سے بھی کوئی بات کرنے کی ضرورت محسوس نہیں کی گئی۔

یہ لوگ ایک مختصر قافلے کی صورت میں راج محل سے باہر نکل آئے تھے۔ ولی عہد پر تاب نے ان کے لیے سواری کا بندوبست کر دیا تھا۔ وہ سواری دو گھوڑوں کی ڈاک گاڑی تھی۔ ڈاک گاڑی نے تقریباً نصف گھنٹے بعد انہیں راکاشی ہستی کی طرف جانے والے راستے پر اتار دیا اور وہ ایس لوٹ گئی۔ ایسا رہنا کے کتنے پر ہی ہوتا تھا۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ ڈاک گاڑی اس ہستی میں داخل ہو۔ یوں بھی وہ ہستی یہاں سے زیادہ دور نہیں گئی۔ وہ لوگ اپنے اپنے سفری بیگ پشت پر لادے پیدل چل پڑے۔ اپنے اس سفر میں انہوں نے آنجنابی پر وفیسر ہنری برنارڈ کو بہت یاد کیا تھا۔

سر بہرہ پوچھی تھی۔ شام کی لمباہٹ دور پہاڑی چوٹیوں پر اتار تھی محسوس ہو رہی تھی۔ ان کے گرد گھٹنے جنگل کا حصار تھا۔ وہاں جانے کیوں مجیدوں بھری خاموشی کا گمان ہوتا تھا۔ تھوڑی دیر بعد ہی یہ لوگ راکاشی ہستی کی وادی کے دامن میں فروکش ہو چکے تھے۔ اس ہستی میں آتے ہی انہیں یہاں ایک ایسی ہی عجیب سی ٹھنڈک کا احساس ہونے لگا تھا۔

☆☆☆

مہارانی نوجوانی کو خشک ذہن کی پڑ پانچواں گئی تھی اور وہ اس نے پچھورام کے حوالے کرتے ہوئے سرسرائی سرگوشی میں کہا۔

”پچھورام.....! یہ کام آج ہی ہو جانا چاہیے۔ تم کام ہو جانے کے بعد اپنی چھوٹی کو بھر ہوا ہوا گے۔“

”آپ چنانہ کریں مہارانی صاحب! آپ کا غلام یہ کام آج ہی نشتا دے گا اور اوش (ضرور) نشتا دے گا۔“ چندی چندی آنکھوں والے پچھورام نے کہا۔ انعام کے لالچ سے اس کا دل خوشی سے پلیوں اچھل رہا تھا۔

اس نے اسی رات وہ ڈیروں ولی عہد کے دودھ کے اس گلاس میں ملا دیا جسے ایک ملازمہ نرملاسی کے کمرے میں پہنچاتی تھی۔ دودھ کا گلاس پہنچانا اسی کے ذمے تھا۔ ہر کسی کے گلاس مختلف سائز اور سطح کے تھے۔ ولی عہد کا گلاس مخروطی اور کھلے پینڈے والا تھا۔ پچھورام نے نرملاسی کی غیر موجودگی تاک

کر، رات کو تین وقت پر بڑی ہوشیاری سے زہر کی پڑیا کو ولی عہد پر تاب کے دودھ والے گلاس میں ملا دیا تھا۔

راجہ حانی کے کینوں میں صرف تین افراد ایسے تھے جو رات کو دودھ کا ایک گلاس پینے کے عادی تھے۔ مہاراجا چندر گپتا، راجکمار سونچیا اور ولی عہد پر تاب۔ بلکہ پر تاب کو تو دودھ سے بنا نیند ہی نہیں آتی تھی۔ البتہ سونچیا اور مہاراجا کو جب نیند زیادہ ستاتی تو دودھ کے پانا جاتا تھا اور وہ بغیر دودھ پیے سو جاتے تھے۔ البتہ ولی عہد پر تاب کا معاملہ الگ تھا۔ وہ رات کو دودھ پیتا ہی اسی لیے تھا کہ اسے نیند آ جائے۔ دودھ پیے بنا اسے نیند ہی نہیں آتی تھی۔

جبکہ راجکمار سونچیا اور اس کے بیٹے، یعنی چھوٹے راج کمار انیش کا معاملہ مختلف تھا۔

رات اپنے ابتدائی پہر میں تھی۔ ولی عہد اپنے کمرے میں مسہری پریم دراز سوچوں میں مستغرق تھا۔ اس کی آنکھوں سے نیند کو سوں دور تھی۔ پر وجہ یہ چہرہ رنجور سا نظر آتا تھا۔ وجہ یہی تھی اس کی کہ اسے رہنا کے جانے کا دکھ تھا۔ وہ اندر ہی اندر اس معصوم صورت اور نازک اندام کی نیلی آنکھوں اور کھل چہرے والی پری مثل رہنا کو چاہنے لگا تھا۔ اسے اس بات کا بے حد رنج بھی تھا کہ وہ اس کے باپ کے تالوں کو بے نقاب نہیں کر سکا تھا اور نہ ہی اسے انصاف دلا سکا تھا۔ اگرچاس میں اس کا بھی کوئی تصور نہ تھا لیکن بہر حال وہ رہنا سے کیا گیا پنا وعدہ پورا نہیں کر سکا تھا۔ اس کا دل رہنا کے لیے آج بہت بے چین ہو رہا تھا۔ ایک تڑپ بھی شدت کی کہ وہ..... یہاں سے رخصت ہوتی رہنا کو بجا کر روک لے..... اسے جانے نہ دے یہاں سے..... اس کے آگے رو پڑے، اس کی نہیں کرے مگر وہ یہ نہیں کر سکا تھا۔ اس کا مرتبہ، رہنا اور اس کے درمیان نامعلوم تعلق کے سامنے مانع ہوتا تھا۔ اسے پہلی بار لمحہ بھر کو کسی حیرت بھی ہوئی تھی کہ اسے یہ کیا ہو گیا تھا؟ وہ ایک فرنگن دوشیزہ کی محبت میں کیونکر گرفتار ہو گیا تھا؟

رہنا ہی کے بارے میں سوچتے سوچتے کافی رات بیتنے لگی۔ وہ سوچا پتا تھا اب..... تب ہی اس نے مسہری پر لینے قریب ہاتھ بڑھا کر دودھ سے بھر لگاس اٹھا لیا۔

اب بھی اس کا دھیان ایک لمحے کے لیے بھی رہنا کی طرف سے ہٹا نہیں تھا۔ انہی سوچوں میں غلطیاں اس نے دودھ کا گلاس اپنے منہ سے لگا لیا اور چند لمحوں میں خالی کر دیا۔

اگلے دن کا سورج..... راج محل میں ایک کھرام بپا کرتا طلوع ہوا تھا۔

(جاری ہے)

الفاظ گونج رہے تھے۔ ”جدھر بھی اور جب بھی ہماری ضرورت پڑے مجھے ضرور یاد رکھیے گا۔ رہنا صاحب! خاص کر آپ کے لیے میرے یہ الفاظ ہیں۔ انہیں یاد رکھیے گا۔ چلتے ہیں۔ بھگوان آپ کی رکھشا کرے۔“

شوکی نے بھی اس درمیان میں یہ محسوس کیا تھا کہ ولی عہد کے جانے کے بعد رہنا کچھ زیادہ ہی کھولی کھولی سی ہو گئی تھی۔ حتیٰ کہ اس سے بھی کوئی بات کرنے کی ضرورت محسوس نہیں کی گئی۔

یہ لوگ ایک مختصر قافلے کی صورت میں راج محل سے باہر نکل آئے تھے۔ ولی عہد پر تاب نے ان کے لیے سواری کا بندوبست کر دیا تھا۔ وہ سواری دو گھوڑوں کی ڈاک گاڑی تھی۔ ڈاک گاڑی نے تقریباً نصف گھنٹے بعد انہیں راکاشی ہستی کی طرف جانے والے راستے پر اتار دیا اور وہ ایس لوٹ گئی۔ ایسا رہنا کے کتنے پر ہی ہوتا تھا۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ ڈاک گاڑی اس ہستی میں داخل ہو۔ یوں بھی وہ ہستی یہاں سے زیادہ دور نہیں گئی۔ وہ لوگ اپنے اپنے سفری بیگ پشت پر لادے پیدل چل پڑے۔ اپنے اس سفر میں انہوں نے آنجنابی پر وفیسر ہنری برنارڈ کو بہت یاد کیا تھا۔

سر بہرہ پوچھی تھی۔ شام کی لمباہٹ دور پہاڑی چوٹیوں پر اتار تھی محسوس ہو رہی تھی۔ ان کے گرد گھٹنے جنگل کا حصار تھا۔ وہاں جانے کیوں مجیدوں بھری خاموشی کا گمان ہوتا تھا۔ تھوڑی دیر بعد ہی یہ لوگ راکاشی ہستی کی وادی کے دامن میں فروکش ہو چکے تھے۔ اس ہستی میں آتے ہی انہیں یہاں ایک ایسی ہی عجیب سی ٹھنڈک کا احساس ہونے لگا تھا۔

☆☆☆

مہارانی نوجوانی کو خشک ذہن کی پڑ پانچواں گئی تھی اور وہ اس نے پچھورام کے حوالے کرتے ہوئے سرسرائی سرگوشی میں کہا۔

”پچھورام.....! یہ کام آج ہی ہو جانا چاہیے۔ تم کام ہو جانے کے بعد اپنی چھوٹی کو بھر ہوا ہوا گے۔“

”آپ چنانہ کریں مہارانی صاحب! آپ کا غلام یہ کام آج ہی نشتا دے گا اور اوش (ضرور) نشتا دے گا۔“ چندی چندی آنکھوں والے پچھورام نے کہا۔ انعام کے لالچ سے اس کا دل خوشی سے پلیوں اچھل رہا تھا۔

اس نے اسی رات وہ ڈیروں ولی عہد کے دودھ کے اس گلاس میں ملا دیا جسے ایک ملازمہ نرملاسی کے کمرے میں پہنچاتی تھی۔ دودھ کا گلاس پہنچانا اسی کے ذمے تھا۔ ہر کسی کے گلاس مختلف سائز اور سطح کے تھے۔ ولی عہد کا گلاس مخروطی اور کھلے پینڈے والا تھا۔ پچھورام نے نرملاسی کی غیر موجودگی تاک



جسس

ناہید سلطان اختر

دور چاہے قدیمی ہو یا جدید... ظالم مظلوموں پر ظلم کی انتہا کرتے رہے ہیں... جرم کی نہ کوئی سمت ہوتی ہے نہ قسب۔ یہ واقعہ بھی اگرچہ تیس سال پرانا ہے مگر آج بھی دور حاضر کے حالات پر نوحہ کثرت ہے۔ خبیثت روحیں ہر دور میں بدی پھیلاتے ہوئے اپنے انجام کو یکسر فراموش کر دیتی ہیں۔

معصوم بچوں کا بچپن چین لینے والے لسنڈل اور عالم انسانوں کا ماجر

دادی اسے اپنے گھر کی رونق اور پایا چیر بکس کہا کرتے تھے۔ بھیا کی وہ دوست تھی اور ماما کی گڑیا جو لڑتی تھی۔ جس کی خوب صورت آنکھوں میں جتنو جیتنے لگتی تو بچوں بکھر جاتے۔ جو روتی تو موتی برستے

لگتے۔ اسکول کی ابتدائی جماعت میں وہ پہلے ہی دن اپنی ٹیچر کی من پسند بن گئی تھی۔ اسکول سے گھر واپس لوٹتے ہی چیر بکس گل جاتا۔ وہ دروازے سے بعد میں داخل ہوتی، اس کی زبان پہلے ہی چلنے لگتی۔

”دادی! آج تھری اسٹارڈیہ ہیں ٹیچر نے۔“
 ”دادی! آج تھری فرینڈ نے مجھے گراؤنڈ میں دھکا دے دیا۔“

”ماما! بچہ بہت مزیدار تھا۔۔۔۔۔ کل بھی آپ یہی دینا۔“
 ”دادی! اہمارے اسکول میں فینر ہوگا۔۔۔۔۔ آپ چلو گی؟“

”ماما! میرے شو کی لیس کھول دیں۔“
 ”اُف اللہ دادی! آج تو میں بہت تھکی گئی۔“
 ”دادی مسکرا دیتیں۔“ ”کیوں تھک گئی میری رانی؟“
 ”کام بہت تھا نا۔“
 ”کیسا کام؟“

”اُف اللہ! آپ کو یہ بھی نہیں پتا۔۔۔۔۔ بچی اسکول میں بڑھنا ہوتا ہے، بہت سا لکھنا ہوتا ہے۔۔۔۔۔ پتا ہے کیا آج ٹیچر نے پوچھ بھی یاد کرائی؟“ ”تاہم اس کی فرمائش پر وہ لہک لہک کر پوچھ سنا لیتی۔“

پانچ منزل عمارت کی تیسری منزل پر واقع چھوٹے سے فلیٹ میں اس کی آواز خوشبو میں گھری رہتی۔ بھی ماما سے فریج فریج کا تقاضا، بھی پیپا سے آئس کریم کھلانے کی فرمائش۔۔۔۔۔ بھی دادی سے کہانی سننے کا اصرار تو بھی بھیا سے ہلکی پھلکی ٹوک جھوک۔

”ہی! بھیا اسے چھیڑتا۔“
 ”ماما! بھیا کو دیکھیں، مجھے ہی کہہ رہے ہیں۔“
 ”میاؤں! بھیا آواز نکالنا اور انگلیاں موڑ کر بچے دکھاتا۔“
 ”دادی! وہ ٹھنکی۔“

”بھئی کیوں ستارہ ہے ہو، ہوں کو؟“ دادی اپنے کمرے سے ہانک لگاتیں۔
 ”دادی! ابلی کوئی نہیں تو کیا چاہا کہوں۔“
 ”اوں! وہ مٹیوں سے اپنی آنکھیں رگڑنے لگتی۔“
 ”پاپا آئیں گے تو شکایت کروں گی ان سے۔“

بھیا اس کی نقل اتارتا۔ زبان چڑاتا، وہ منہ بسورنے لگتی۔ بھیا نیش دیتا۔ اسے لگدگاتا۔ ”ارے یار مذاق کر رہا تھا۔۔۔۔۔ تم تو میری پیاری سی جانوسی بہن ہو۔۔۔۔۔ ایک ہی تو بہن ہے میری۔“

”آپ بھی تو ایک ہی بھیا ہو۔“ وہ مسکرا دیتی آسانی سے من جاتی۔
 ”ہاں تو پھر جھگڑا کیسا۔۔۔۔۔ میں تمہارا ایک ہی بھیا تم میری ایک ہی بہنا۔۔۔۔۔ دوستی کرونا پھر۔۔۔۔۔ بھیا اپنے

سیدھے ہاتھ کی پکلی دوا لگائیں جو ڈکراس کی طرف بڑھاتا۔ وہ بھی جویا ایسا ہی کرتے ہوئے دادی جان کے سکھائے الفاظ دہرائی۔ ”لڑائی لڑائی ختم۔ دوست بنے ہم۔“

پاپا کے ساتھ گھر سے باہر نہیں جاتے ہوئے اس کی زبان تالو سے نہ لگتی۔ سوال یہ سوال اور پھر خود ہی جواب۔ پاپا اس کا سر پیار سے چھو کر کہتے۔ ”تمہارے اتنے چھوٹے سے سر میں اتنی بہت سی باتیں کہاں سے آتی ہیں؟“
 ”دادی بولتی ہیں باتیں دماغ سے آتی ہیں۔“
 ”اچھا!“ پاپا معنوی حیرت سے کہتے۔
 ”ہاں جی۔“

”تمہارے پاس دماغ ہے؟“
 بھیا ساتھ ہوتا تو لقمہ دیتا۔ ”پاگلوں کے پاس دماغ کہاں ہوتا ہے۔“
 ”پاپا! بھیا کو دیکھیں، مجھے پاگل کہہ رہے ہیں۔“

”بھیا کی پٹائی کروں گا میں۔“
 ”ہا! بھیا کی پٹائی لگے گی۔“ وہ تالیاں پیٹنے لگتی۔
 ”ماما کہیں۔“ ”گڑیا گھر میں نہ ہو تو گھر سنانا ہو جاتا ہے۔“
 ”دادی کہیں۔“ ”گھر میں رونگڑا رانی کے دم سے ہے۔“
 ”صبح اے اسکول چھینے کے لیے تیار کرتے ہوئے ماما

اس کے ریشمی بالوں کو سچ سچ سلجھاتیں، سنوآرتی، کلپ اور ہیز بیڈ لگاتیں پھر دھیرے دھیرے اسے موٹر انجنک لوٹن لگاتیں۔ اپنی انگلیوں کی پوروں سے اس کی گردن پر پاؤڈر لگاتیں۔ ماما اسے پری کی طرح تیار کرتیں۔ اسکول دین ساڑھے سات بجے آتی۔ پاپا اسے ساتھ لے کر باغ سات منٹ پہلے ہی نیچے جا کھڑے ہوتے۔ گھر سے نکلنے سے پہلے دادی منہ میں آیات حفاظت پڑھ کر اس پر دم کرتیں۔ بھیا کا اسکول دور تھا۔ وہ ساڑھے چھ بجے ہی گھر سے نکل چکا ہوتا۔ پاپا کہتے تھے، نویں جماعت کے طالب علم کو خود ہی اسکول آنے جانے کا عادی ہونا چاہیے۔ بہر کے جاتے وقت دادی اس پر بھی ضرور دم کرتیں۔ دادی بوڑھی تھیں۔ افراد خانہ میں سے کوئی گھر سے باہر جا رہا ہوتا تو دادی آیات حفاظت پڑھ کر اس پر دم کرنے کے بعد نہایت مطمئن ہی ہو جاتیں۔

☆☆☆
 برسوں پہلے میں ان دونوں شہر کے ایک تعلیمی ادارے میں معاون پرنسپل کے فرائض سرانجام دے رہی تھی۔ ادارے میں داخلے کے سخت قواعد و ضوابط کے باعث

ابتدائی جماعت میں بچوں کا داخلہ میرٹ کی بنیاد پر کیا جاتا۔ بعد ازاں بھی طلبہ اعلیٰ جماعتوں میں ترقی پاتے جاتے۔ چنانچہ اعلیٰ جماعتوں میں نئے طلبہ کے داخلے نہ ہونے کے برابر ہوتے۔ کوئی غیر معمولی لائق طالب علم، کوئی ٹرانسفر کیس یا پھر کوئی بڑی سفارش اعلیٰ سال کا آغاز ہوتے ہی داخلے کے خواہشمندوں کے لیے نوٹس بورڈ پر جلی حروف میں یہ نوٹس لگا دیا جاتا کہ پہلی جماعت میں داخلے مکمل ہو چکے ہیں، دیگر جماعتوں میں نئے داخلوں کی کوئی گنجائش نہیں۔ اس کے باوجود اعلیٰ سال کے ابتدائی چند ہفتوں میں داخلے کے خواہشمند طلبہ اور ان کے والدین کا جھگڑنا لگا رہتا۔ امیدوار کی غیر معمولی اہلیت یا کسی بڑی سفارش کی بنیاد پر گئے چنے داخلے ہو بھی جاتے۔

دادی کے بقول گھری رونق، پاپا کے جیڑ بکس، ماما کی گڑیا اور بھیا کی دوست۔۔۔۔۔ بھیا کا داخلہ پاپا کے اثر رسوخ کی بنا پر نویں جماعت میں ہوا۔ داخلہ بیٹ میری گھرائی میں ہوا۔ لڑکا لائق بھی تھا۔ والد کا اثر رسوخ سونے پر سہاگے کا کام کر گیا۔

گہری سانوئی رنگت، دراز قامت اور بڑی بڑی روشن آنکھوں والا وہ نوجوان طالب علم آج بھی میری یاد کے لہاں خانوں میں محفوظ ہے۔ صبح جب راتنگ اسمبلی کے لیے طلبہ اپنی اپنی جماعت کی علیحدہ علیحدہ صفیں بنا کر کھڑے ہوتے تو وہ ان طالب علموں میں ہوتا جو اپنی دراز قامتی کے باعث نمایاں ہوتے۔

میںقات دوم امتحانات کے نتائج سے والدین کو آگاہ کرنے تک میری اس کے والدین سے کئی مرتبہ ملاقات ہوئی۔ ماما اور پاپا جب آتے، آکھٹے۔ ماما کھلتی رنگت کی حامل ایک خوش شکل اور جوان عمر خاتون، پاپا درمیانی عمر کا مکمل، خوش لباس اور خوش کلام فرد۔ دونوں بیٹے کی تعلیمی ترقی کے بارے میں خاصے فکر مند اور پرجوش لگتے۔ وہ ان والدین میں سے تھے جو بچوں کو ایک مرتبہ اسکول میں داخل کروا کے انہیں بھول نہیں جاتے بلکہ ان کی مادر علمی سے مسلسل رابطہ رکھتے ہیں۔ بچوں کی تعلیمی ترقی کا احوال معلوم کرنے کے لیے گرجوش دکھاتے ہیں۔ امتحانات کے نتائج جاننے کے لیے مضطرب رہتے ہیں۔ نتیجتاً ایسے بچوں پر اساتذہ اور اعلیٰ معیار کی توجہ بھی بڑھ جاتی ہے، سو والدین کی غیر معمولی دلچسپی اور احساس ذمہ داری کے باعث وہ بھی جلد ہی ہم مساب کی نگاہوں میں آ گیا۔

میںقات سوم شروع ہونے کے چند ہی دن بعد اس کی اسکول سے مسلسل غیر حاضری شروع ہو گئی۔ میںقات سوم کا اختتام سالانہ امتحانات پر ہوتا تھا، سو یہ دورانیہ نہایت اہم تھا۔ اساتذہ کو اس کی مسلسل غیر حاضری پر تشویش ہونے لگی۔ یہ تشویش مجھے تک پہنچی۔ میں نے والدین سے رابطہ کیا۔ والدین نے بہت مشکل سی آواز میں فقط اتنا کہا۔ ”میں آپ کو اسکول آکر بتاؤں گا میڈم۔“ میرے دل نے کہا شاید وہ بیمار تھا یا شاید کوئی اور مسئلہ۔۔۔۔۔ باپ کی آواز بلا وجہ مشکل نہیں ہو سکتی تھی۔

تین چار دن یا شاید ایک ہفتہ گزرا، ماما اور پاپا دونوں اسکول آ گئے۔ وہ ساتھ نہیں تھا۔ والدین دونوں نہایت اداس اور دل شکستہ دکھائی دیتے تھے۔ ماما کی آنکھوں کے پونے متورم تھے جو عموماً بہت زیادہ روتے رہنے سے ہو جاتا کرتے ہیں۔ پاپا نے ایک درخواست میرے سامنے رکھ دی۔ میں نے درخواست پر تیزی سے نظر دوڑائی۔

”سالانہ امتحانات نزدیک ہیں۔ آپ اس وقت اس کا اسکول لیوٹو سرٹیفکیٹ کیوں لینا چاہتے ہیں؟ کہاں داخل کرائیں گے اسے؟ اس وقت تو کوئی اسکول بھی اسے داخل نہیں دے گا۔“ میں نے درخواست پڑھنے کے بعد کہا۔

”کچھ پتا نہیں میڈم۔“ پاپا نے ایک ٹھنڈی سانس کھینچی۔
 ”کیا مطلب؟“ میں چونکی۔

پاپا نے ایک نظر اپنی رفیقہ حیات کو دیکھا۔ وہ رونے لگی۔

”کیا ہوا؟“ میں تشویش میں پڑ گئی۔
 ”میڈم! ایک حادثہ ہو گیا ہے۔ جس کا ہم نے کبھی تصور بھی نہیں کیا تھا۔“ پاپا نے نہایت دل گرفتگی سے کہا۔
 ”کیسا حادثہ!“ میں نے پوچھا۔

پاپا نے پھر ایک ٹھنڈی سانس بھری اور اپنے نزدیک بیٹھی اہلیہ کے شانوں پر اپنا بازو دراز کرتے ہوئے بولا۔ ”مہر کرو۔“

”نہیں ہوتا۔“ اس نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا اور ہلک ہلک کر رونے لگی۔ میرے کمرے کے باہر بیٹھانا غب قاصد کمرے میں جھانکنے لگا۔ میں ملتی ہوئی خانوں کو پانی پلانے کے لیے خود بھی۔
 خانوں کے آنسو تھے تو شوہر نے اپنی آنکھوں کو

مہلت

شعبہ سب

قدرت کے کارخانے میں سزا ہمیشہ خطاوار کے لیے رکھی گئی ہے... مگر کبھی کبھی سزا کا انداز بڑا مختلف ہوتا ہے... قدرت کسی ایسے رشتے میں دکھ رکھ دیتی ہے جو دل کے بہت نزدیک ہوتا ہے اور جسے دی جانے والی انذیتیں دل پر بہت ستم ڈھاتی ہیں۔ وہ بھی اپنے اس رشتے کو دنیا بھر سے چھپا کر رکھنے کا خواہش مند تھا مگر حالات اسے چھپنے نہ رہے تھے اور نہ ہی کسی ایک جگہ پر نکلتے نہ رہے تھے... اور پھر زندگی سے اس نے محض ادھے گھنٹے کی مہلت مانگ لی جس کے بعد اس کا سفر ختم ہو گیا۔

محفوظ ہاتھوں میں اپنا اہم رشتہ دے کر ایک مجرم باپ کے اطمینان کا قصہ

جولائی کی گرم دوپہر میں اخباری نمائندے مائیک گرامر کا انتظار کر رہے تھے۔ انہیں زیادہ دیر انتظار نہیں کرنا پڑا کیونکہ گرامر ہلاک ہوئے میں رہتا تھا جو سینٹرل اسٹیشن ہاؤس کے بالکل قریب ہی تھا۔ ویسے بھی گرامر کا زیادہ وقت ہیڈ کوارٹر میں واقع چھوٹے سے دفتر میں ہی نہ رہتا اور وہ صرف سونے کے لیے ہوئے جاتا تھا۔ چوتیس سال سے اس کا یہی معمول تھا۔

جیسے ہی راہداری میں اس کے قدموں کی آہٹ ہوئی،



”پتا ہے کیا میڈم..... اسکول سے گھر واپس آ کر دروازے سے گھر میں داخل ہوتے ہی وہ ایک آواز لگتی تھی۔“
داؤ جان امیں آگئی..... وہ آواز نہیں سنائی دیتی اب۔“
ماں نے کہا۔ ”میں اس آواز کو پورے گھر میں ڈھونڈتی پھرتی ہوں..... پر نہیں ملتی۔“ ماں پھر ہلکے بلکے رونے لگی۔

”اس حادثے نے ہماری زندگی بدل کر رکھ دی ہے میڈم۔“ باپ کی آواز میں رقت تھی۔
گھر گھر سرٹیکٹ لے آیا۔

”تحقیق یویری جی میڈم۔“ باپ نے کہا۔
”خدا آپ کی آئندہ زندگی میں آسانیاں عطا فرمائے۔“ میں نے دونوں کو ہمدردانہ نظروں سے دیکھا۔
”آمین۔“

دونوں اٹھے اور چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتے ہوئے نہایت متعطل سے انداز میں میرے دفتر سے نکل گئے۔ مجھے ان کی زندگی بدل جانے کا شہرت سے رنج ہوا۔
آج سوچتی ہوں زندگی تو اس گھر آنے کی بھی بدل ہی گئی ہوگی جس کے ایک فرد کے شیطانی فعل نے ایک بیٹے بے گناہ بننے سے اس کی خوشیاں جھین لی تھیں کیا اس کے اس فوج فعل کے بعد اس کے اپنے گھر والے معاشرے کا سامنا کر پائے ہوں گے؟ زندگی پہلے کی طرح جی پائے ہوں گے..... اور کیا وہ خود..... جرم اور سزا کے بعد اگر رہا ہوا ہوگا تو کیا کبھی آئینے کے سامنے ٹھہر سکا ہوگا..... آئینہ تو اسے گڑیا کی سہتی، گزرتی روتی اور بلباتی شبیں دکھاتا ہوگا، ڈراتا ہوگا!

گڑیا کی زندگی سے بھرپور فہمی کو فضاؤں میں گم ہونے کم و بیش چھپیں سائیکس برس گزر چکے مگر شیطانی ٹھیل آج بھی جاری ہے۔ بچوں جیسوں کو سٹل جانے کا بیج سلسلہ تھا نہیں۔ شیطان کے چیلے آج بھی ہمارے گھروں کے آس پاس، ہمارے گلی کوچوں میں، ہمارے گھروں کے اندر تک ہمارے بچوں کے ارد گرد منڈلا رہے ہیں۔

اس دنیا میں ایسی صبح کب ہوگی جب مشرق سے طلوع ہونے والا سورج ہمارے بچوں کو بلکہ ساری دنیا کے بچوں کو امن و تحفظ کی نوید دے گا؟

جیوان نما انسانوں کی بہیمیت کا شکار ہونے والے ہر بچے کو انصاف آخر کب ملے گا؟ کیا صاحب اختیار کو یوم آخر کا یقین اور خوف نہیں.....؟

”عموماً ہم دودن بعد دیتے ہیں لیکن اگر آپ آدھ یون گھنٹا انتظار کر سکتی ہو تو میں آج ہی بنوا دیتی ہوں۔“
”جی..... ہم انتظار کیے لیتے ہیں۔“

فوری طور پر سرٹیکٹ کے اجراء کے لیے مجھے پرنسپل کے دفتر میں جا کر ساری صورت حال ان کے گوش گزار کرنا پڑی۔ سرٹیکٹ پر دستخط و بہر حال انہی کو کرنا تھے۔ چونکہ ادارے میں ایک ماہ شغلی فیس لینے کا طریقہ رائج تھا لہذا واجبات کا کوئی مسئلہ نہ تھا۔ سرٹیکٹ کی فیس میں نے خود ادائیگی اور آفس کلرک کو جلد از جلد سرٹیکٹ کی خانہ پری اور پرنسپل کے دستخط کروا کر میرے دفتر میں پہنچانے کی ہدایت کرنے کے بعد میں اپنے کمرے میں آئی تو میاں بوی دونوں خاموش بیٹھے تھے

”بس تھوڑی دیر انتظار کر لیجیے۔“ میں نے ان سے کہا۔
”اب تو انتظار ہی ہے میڈم کہ اس معصوم سے دوبارہ کب ملنا ہوگا۔“ باپ نے کرب سے کہا۔

میں اب تذبذب میں تھی کہ اس دربانہ جوڑے سے کیا کہوں..... چند ماہ پہلے جب وہ بیٹے کو ادارے میں داخل کروانے آئے تھے تو ان کا روپ کچھ اور تھا اور آج کچھ اور! اصمدہ اور وہ بھی ایسا جاں نسل، انسان کو کیا سے کیا کر دیتا ہے۔

”میڈم!“ باپ نے کرب ناک خاموشی کو توڑ کر میری مشکل آسان کر دی۔ ”بعض حادثے ایسے ہوتے ہیں کہ انسان یہ سوچنے پر مجبور ہو جاتا ہے کہ مرنا مشکل کیوں ہے..... میری ضعیف والدہ جو اپنی پوتی کو گھر کی رونق کہا کرتی تھیں، اس حادثے کے بعد مسلسل بیمار ہیں کم و بیش

ہیں..... یہ میری بیگم جو بیٹی کو پیار سے گڑیا کہا کرتی تھیں، سوتے میں بھی اسے پکارنے لگتی ہیں۔ یہ کہتی ہیں وہ روزان کے خواب میں آتی ہے اور آنکھ کھلے پر جب انہیں احساس ہوتا ہے کہ گڑیا اب اس دنیا میں نہیں رہی تو یہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگتی ہیں۔ دیواروں سے اپنا سر ٹکراتی ہیں۔ یہ اس کے کپڑوں، جوتوں، کھلونوں، کتابوں اور دوسری چیزوں کو دیکھ کر روتی رہتی ہیں..... میں تو اسے چیخ کر کہتا تھا۔ نہ جانے کیسے وہ اتنی باتیں کر لیتی تھی..... شاید اس لیے کہ اسے زیادہ دن ہمارے ساتھ نہیں رہنا تھا..... بھائی کہتا ہے..... میری بہنا، میری دوست چلی گئی..... وہ ہنسی کھو گئی

میڈم جو ہم سب کو زندگی کے خوب صورت ہونے کا احساس دلاتی تھی۔ ہمارا گھر سناٹوں میں ڈوب گیا ہے..... قبرستان کی طرح۔“ دیکھی باپ بولتا چلا گیا۔

تمام رپورٹرز پر ایس دوسرے باہر نکل آئے اور اس کا تعاقب کرتے ہوئے دفتر میں پہنچ گئے۔ وہ محکمہ کو اپنی میز پر پہنچا، ٹیلی فون کو دیکھ کر متنبہ بنایا۔ جیسے توقع ہو کہ وہ اسے کوئی اطلاع پہنچائیں گے اور پھر اپنی گھونٹنے والی کرسی پر بیٹھ گیا۔ اس دوران اس کی زبان سے ایک لفظ بھی ادا نہیں ہوا۔

ٹریبون کے نمائندہ شون نے پوچھنے میں پہل کی۔ وہ گراہم کو کافی عرصے سے جانتا تھا۔ ”تمہیں معلوم ہے کہ ڈینی ٹریبل نے انٹیلیجنس پولیس کے آڈی ٹول کر دیا ہے؟“

گراہم نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ”قدرتی بات ہے۔“

”تمہیں اس کا کوئی سراغ ملا؟“ یہاں پر سوال ایک نوجوان رپورٹر نے کیا تھا جسے گراہم نے نظر انداز کر دیا۔ وہ اپنی معلومات اور کارروائی کے بارے میں کوئی بات نہیں کرتا تھا۔

”اب تم لوگ جانتے ہو۔“ اس نے اخباری نمائندوں سے کہا۔ ”مجھے بہت کام کرنا ہے۔“

تمام نمائندے باہر امدادی میں آ گئے۔ ہیڈ لائن کا رپورٹر بڑبڑاتے ہوئے بولا۔ ”اس شخص میں ڈراما سبھی رکھ رکھاؤ نہیں ہے۔ میں نے اس سے زیادہ سردہر آدی نہیں دیکھا۔“

شون لاؤنچ میں جاتے ہوئے بولا۔ ”پولیس والے ایسے ہی سخت گیر ہوتے ہیں اور مائیک گراہم بھی ان میں سے ایک ہے۔ وہ کوئی انسان نہیں بلکہ علامت ہے۔ بے حس، انکڑ اور جھگڑا۔ میں یہاں رک کر کسی خبر کا انتظار کرنا چاہیے۔“

گراہم کے کمرے میں تین فون تھے۔ ایک دفتر کے اندر بات کرنے کے لیے، دوسرا مین بورڈ سے منسلک اور تیسرا برائے نمبر تھا۔ پولیس کمشنر نے اس پر اعتراض کیا تھا لہذا گراہم اس کے بل کی ادائیگی اپنی جیب سے کرتا تھا۔ یہ ٹیلی فون اس کا واحد معاون اور اطلاعات پہنچانے کا بہترین ذریعہ تھا کیونکہ اس کے خبر سرکاری فون پر بھروسہ نہیں کرتے تھے۔ رپورٹرز کے جانے کے بعد گراہم نے پرائیویٹ فون اپنی طرف کھینچا اور کسی اطلاع کا انتظار کرنے لگا۔ کچھ دیر بعد فون کی گھنٹی بجی۔ اس نے ریسپونڈ کیا اور اپنی بھاری آواز میں بولا۔ ”گراہم؟ دوسری طرف سے جو کچھ کہا گیا، اسے سننے کے بعد وہ بولا۔ ”تمہاری اطلاع درست ہو سکتی ہے۔“

وہ اپنی جگہ سے اٹھا اور عجیب دروازے سے نکل کر اس گلی میں چلا گیا جہاں اس کی کار کھڑی ہوئی تھی۔ نوجوان رپورٹر نے اسے دیکھا تو بولا۔ ”میں اس کا پیچھا کرنا چاہیے۔“

شون نے طنزیہ انداز میں کہا۔ ”نہیں۔ اگر اس نے

ڈینی کو تلاش کر لیا تو ہمیں قبرستان میں پیچھ کر خبر بنانا پڑے۔“ کیونکہ ان میں سے ایک یقینی طور پر وہاں جانے کا اور گراہم کی زیادہ امید ہے۔“

ڈینی ایک ایسا خطرناک مجرم تھا جو کبھی پولیس کے ہاتھ نہیں آیا اور کچھ لوگوں نے تو یہاں تک کہنا شروع کر دیا کہ یہ پولیس کا ہی تحقیق کردہ ایک کردار ہے اور ہر غیر حل جرم اس کے نام ڈال دیا جاتا ہے اور شون جیسے لوگوں پریش کوئی تھی کہ وہ بہت جلد جرم کی دنیا کا لیجنڈ بننے والا ہے اگر وہ واقعی اس راہ پر گامزن تھا تو پھر وہ کوئی فرضی کردار نہ بلکہ زندہ حقیقت تھا۔ وہ مائیک گراہم سمیت تمام پولیس والوں سے نفرت کرتا تھا۔

صرف چند ماہ قبل وہ ڈینی اور ہوشیار مجرموں نے، کا سرغزہ رہ چکا تھا، وہ خود ایک اعلیٰ تعلیم یافتہ شخص تھا۔ وہ بد معاشوں کے ساتھ نہیں رہا اور نہ ہی کسی جکی آبادی پیداوار تھا۔ اس کے بارے میں یہ بھی کہا جاتا تھا کہ وہ شاد شدہ تھا اور ایک باعزت، بائیں علاقے میں رہتا تھا۔ اب اس کا کوئی گروہ نہیں تھا جس کا سرگراہم کے سر جاتا تھا۔

گراہم قانونی پیچیدگیوں میں الجھنے کے بجائے مجرم کے خلاف براہ راست کارروائی پر یقین رکھتا تھا، جب اسے معلوم ہوا کہ ڈینی اور اس کے تین ساتھی مارٹی کے سیلون عقبی کمرے میں ملاقات کرنے والے ہیں تو وہ اس کی تلاش میں چلا گیا۔ اس گروہ نے بینک کے پیغام رساں اور دو پولیس ڈا کوئل کیا تھا۔ گراہم نے زوردار لٹ مار کر دروازہ توڑ دیا۔ گن سمیت اندر داخل ہو گیا۔ اس وقت ڈینی وہاں موجود تھا۔ گراہم نے دروازے میں کھڑے کھڑے اس کے تین ساتھیوں پر فائر کھولا اور انہیں ہلاک کر دیا۔

اس کے بعد صرف ڈینی ہی زندہ بچا۔ اس بارے میں افواہ تھی کہ وہ شہر چھوڑنے والا ہے لیکن جان سے پہلے گراہم کو قبرستان پہنچا کر جانے کا اور اس نے انتظار کارروائی کے طور پر ایک انٹیلیجنس پولیس کے سپاہی کو کر دیا تھا۔

گراہم نے اپنے خبر کے بتائے ہوئے پتے ایک بلاک کے فاصلے پر کار کھڑی کی اور بقیہ فاصلہ پیوٹے کیا۔ اس نے اس چھوٹی سی پارکسٹ بلاک پر نظر انداز اور سر ہلا کر رہ گیا۔ ڈینی جیسے شخص کے چھپنے کے لیے بہترین جگہ تھی۔ اس عمارت کے دیگر بائیں غالباً دفتر میں کام کرنے والے کلرک اور کارکن تھے۔

عمارت کے صدر دروازے پر کوئی چوکیدار نہیں تھا۔

ڈینی کے فلیٹ کا نمبر 307 بتایا تھا۔ گراہم نے اس کے دروازے پر ہاتھ رکھا۔ یہاں تک کہ کسی رہائشی نے آؤٹینک ڈور کھول دیا۔ وہ عمارت میں داخل ہوا اور لفٹ کو نظر انداز کر کے بیڑیوں کے ذریعے تیسری منزل پر پہنچ گیا۔

تین سوسات کے باہر کھڑے ہو کر اس نے اپنی گن نکالی اور دروازے سے کان لگا کر کھڑا ہو گیا۔ اندر سے کسی قدموں کی چاپ سنائی دے رہی تھی۔ اس نے آہستہ دروازے پر دستک دی اور خود چو کنا ہو گیا۔ قدموں کی چاپ خود یک آئی۔ جیسے ہی دروازہ کھلا وہ تیسری سے اندر داخل ہو گیا لیکن اپنے سامنے ایک لڑکی کو دیکھ کر اس کی

”تمہارے ساتھ کیا مسئلہ ہے؟“ لڑکی نے پوچھا۔

گراہم حیرت زدہ رہ گیا۔ اس نے کمرے پر نظر ڈالا کہ شاید اسے وہاں کوئی بد معاش نظر آ جائے لیکن وہاں لڑکی کے علاوہ کوئی نہیں تھا۔

”کیا تم آؤ گے؟“ اس نے پوچھا۔

گراہم نے اپنے ہاتھ پیچھے کیے اور بولا۔ ”لڑکی۔“

”میں نہیں جانتی۔“ لڑکی نے کہا۔ ”انہوں نے وعدہ کیا تھا کہ جلد ہی گھر آ جائیں گے۔“

گراہم کو اپنا رشتہ میں کھانا پکینے کی خوشبو محسوس ہوئی۔ اس نے پوچھا۔ ”تمہاری ماں یہاں ہیں؟“

لڑکی نے ٹپکی میں سر ہلایا تو وہ بولا۔ ”مجھے یہ کھانا کون دیا ہے؟“

”میں۔“ لڑکی نے جواب دیا۔

”تمہارا نام کیا ہے؟“

”بینی۔ آج میں آٹھ سال کی ہو گئی ہوں۔“

گراہم نے گن ہولٹر میں رکھی اور جیب سے ڈینی کی برائی تصویر نکال کر اس کے سامنے کرتے ہوئے کہا۔

”یہ تمہاری ماں کی تصویر ہے؟“

”بالکل میرے پاپا ہیں۔“

”تم بتا سکتی ہو کہ یہ کون ہے؟“

”کسی بھی وقت۔“ بینی نے کہا۔ ”وہ میرے لیے

پاپا ہیں۔“

گراہم نے دروازہ بند کرتے ہوئے کہا۔ ”میرا

”تم مجھے انتظار کر لیتا چاہیے۔“

”تم کب تک میں آ جاؤ۔“ بینی نے پیشکش کی۔

”میں پاپا

وہ اس کے چھوٹے سے بچن میں چلا گیا اور ایک اسٹول پر اس طرح بیٹھا کہ اس کی نظریں اپنا رشتہ دروازے پر رہیں۔

”بینی برتن دھوئے ہوئے بولی۔ ”تمہارا نام کیا ہے؟“

”گراہم۔ مائیک گراہم۔“

”کیا تمہاری کوئی چھوٹی بہن ہے؟“

گراہم نے ٹپکی میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ”ابھی میری شادی نہیں ہوئی۔“

”پاپا کہتے ہیں کہ ہر ایک کو شادی کرنا چاہیے۔ ہم بہت جلد ایک دوسرے شہر جانے والے ہیں جہاں وہ کسی خوب صورت عورت سے شادی کر لیں گے جو میری ماں بن سکے۔“

”اچھا خیال ہے۔“ گراہم نے کہا۔

”پاپا کے ساتھ کوئی مسئلہ نہیں ہے۔“ بینی بولی۔ ”وہ بہت خوش شکل ہیں۔“

بچن میں بہت گرمی ہو رہی تھی۔ گراہم نے کہا۔

”میرا خیال ہے کہ مجھے چلنا چاہیے۔“

بینی بولی۔ ”کھاؤ کھا کر جانا۔ پاپا بس آتے ہی ہوں گے۔“

”شاید میں دوبارہ آؤں۔“ گراہم نے کہا اور دروازہ کھول کر امدادی میں چلا گیا۔ وہ گراؤنڈ فلور پر پہنچا ہی تھا کہ اسے ڈینی آتا ہوا دیکھا۔ ڈینی اس کے ایک ہاتھ میں چابی اور دوسرے میں آؤ گس کریم کا بیگ تھا۔ گراہم اس کا ایک ہی اس کے سامنے آ گیا۔ ڈینی نے تھینکنے کی کوشش کی لیکن جیسے ہی اس نے بیٹول کی طرف ہاتھ بڑھایا، گراہم نے اس کے سر پر زوردار ضرب لگائی۔ وہ ٹھٹھوں کے بل جھکا اور آؤ گس کریم اس کے ہاتھ سے نکل کر فرش پر گر گئی۔ گراہم نے اسے کالر سے پکڑا اور سڑک پر گرادیا۔ اس سے پہلے کہ وہ اٹھنے کی کوشش کرتا، گراہم نے اس کے ہاتھوں میں پھنکڑی ڈال دی۔

اب وہ اس کا قیدی تھا۔ اسے اس کی بالکل بھی توقع نہیں تھی۔ ڈینی نے ایک پولیس والے کو بل کرایا تھا اور اس نے قسم کھائی تھی کہ وہ زندہ گرفتاری نہیں دے گا۔ اس طرح گراہم نے بھی عہد کیا تھا کہ وہ اسے زندہ نہیں چھوڑے گا لیکن اب اس پر قابو پانے کے بعد اس کے پاس اس کے سوا کوئی اور راستہ نہیں تھا کہ وہ اسے ہیڈ کوارٹر لے جائے۔

اسے ایک کھٹنے تک بینی کا خیال نہیں آیا۔ وہ ڈسٹرکٹ اتارنی کے دفتر میں سرکاری وکیل اور اخباری نمائندوں کے ساتھ بیٹھا ہوا تھا۔ سرکاری وکیل کے چہرے سے خوشی چھوٹی پڑ رہی تھی۔ اس نے کئی تصویریں بنوائیں

اور اخباری نمائندوں کے سامنے اس یقین کا اظہار کیا کہ ڈینی کو سزائے موت سے کوئی نہیں بچا سکتا۔

شون نے گراہم کی یادداشت کو جھکا دیتے ہوئے کہا۔ ”ایک افواہ یہ سننے میں آئی ہے کہ ڈینی کی ایک بیٹی بھی ہے۔ تم اس بارے میں کیا جانتے ہو؟“

گراہم نے غراتے ہوئے کہا۔ ”یہ کیا بکواس ہے؟“ شون طنز پر انداز میں مسکراتے ہوئے بولا۔

”ذرا سوچو کہ جب اس کی تین کالم میں تصویر شائع ہوگی تو تمہارے لیے جواب دینا مشکل ہو جائے گا۔“

گراہم اپنی جگہ سے کھڑے ہوتے ہوئے بولا۔ ”میرے پاس فضول باتیں سوچنے کے لیے وقت نہیں ہے۔“

یہ کہہ کر وہ کمرے سے باہر چلا گیا۔

راستے میں ایک جگہ رک کر اس نے آئس کریم کے دو پیکٹ خریدے اور ڈینی کے فلیٹ پر پہنچ گیا۔ دروازہ کھینچنے نے ہی کھولا تھا۔ اس نے آئس کریم کے پیکٹ اسے پکڑا دیے۔

وہ مسکراتے ہوئے بولی۔ ”پاپا ابھی تک نہیں آئے۔ تم اندر آ جاؤ اور میرے ساتھ ڈنر کرو۔“

گراہم ایک قدم پیچھے ہٹتے ہوئے بولا۔ ”میں کھانا کھا چکا ہوں۔“

وہ جلدی سے بولی۔ ”لیکن میں ابھی تک بھوکی ہوں۔“

کھانا خاصا بد مزہ تھا جس کا اعتراف ڈینی نے بھی کیا لیکن گراہم اس کا دل رکھنے کے لیے بولا۔ ”بہت مزے کا ہے۔“ پھر اس نے محتاط لہجے میں کہا۔ ”ڈینی! تمہارا کوئی رشتہ دار ہے؟“

”صرف پاپا۔ لیکن وہ ابھی تک کیوں نہیں آئے؟“

”پریشان مت ہو ڈینی۔ ممکن ہے وہ کسی سے ملنے چلے گئے ہوں یا چند دنوں کے لیے کسی کام میں مصروف ہو گئے ہوں، جب میں آخری بار اس سے ملا تو اس نے کچھ ایسی ہی بات کی تھی۔“

”تم ان سے کب ملے تھے؟“

”زیادہ عرصہ نہیں ہوا۔“ وہ اپنی پلیٹ پر نظریں جھکاتے ہوئے بولا۔

وہ سوچ رہا تھا کہ اگر واقعی ڈینی کی تصویر اخبار میں شائع ہوگئی تو اس کے لیے بہت مشکل کھڑی ہو جائے گی۔

”دیکھو ڈینی۔“ اس نے کہا۔ ”میرا نہیں خیال کہ تمہارے پاپا آج رات گھر واپس آئیں گے۔ فرض کرو میں تمہیں اپنے ساتھ لے جاؤں۔“

اس نے مزید سوچنے کی بھی زحمت گوارا نہیں کی اور ڈینی کو لے کر کمر میں بیٹھ گیا لیکن اب وہ سوچ رہا تھا کہ اسے لے کر کہاں جائے۔ وہ دو گھنٹے تک بلا متعدد گڑی چلاتا رہا یہاں تک کہ ڈینی کی آنکھیں بند سے پھول ہو گئیں۔

اسے اپنے ہونٹوں میں لے جاسکتا تھا اور اگر ہیڈ کوارٹر لے جانا تو وہ اسے یقینی طور پر دارالاطفال بھیج دیتے اور گراہم ایسا نہیں چاہتا تھا۔

اچانک اسے جان پال کا خیال آیا جو شہر کے وسط میں ایک ریسٹوران چلاتا تھا اور بال بچوں والا تھا۔ شاید وہ کوئی تجربہ کیے بغیر ڈینی کو اپنے پاس رکھ لے۔ گراہم اس کے ریسٹوران پہنچا۔ جان پال پولیس والوں سے دوستی کرنے کا شوقین تھا اور ویسے بھی گراہم نے اس سے پہلی بار کوئی فرمائش کی تھی لہذا وہ ایک رات کے لیے ڈینی کو اپنے فلیٹ لے جانے پر رضامند ہو گیا اور گراہم.... ہیڈ کوارٹر واپس آ گیا۔

ویسے تو گراہم ہر وقت ہی کام کرتا رہتا تھا لیکن شیڈول کے مطابق اس کی ڈیوٹی نصف شب سے صبح آٹھ بجے تک ہوتی تھی۔ ابھی آٹھ بجے نہیں بیچے تھے کہ جان پال کا فون آ گیا۔

”گراہم! تم نے آج کے اخبارات دیکھے؟“

”نہیں۔“

”بہتر ہوگا کہ تم انہیں دیکھ لو۔“ جان نے مشورہ دیا۔ ”اور براہ کرم اس بچی کو یہاں سے لے جاؤ۔ میں کسی مشکل میں پڑنا نہیں چاہتا۔“

”تم آرام سے بیٹھو اور اپنی زبان بند رکھو۔“ گراہم نے اسے تسلی دینی اور فون بند کر دیا۔

اخبار کی خبر پڑھ کر گراہم کے ہوش اڑ گئے۔ اس کے مطابق ڈینی نے اپنے ایک دوست کو ڈینی کی دیکھ بھال کے لیے گھر بھیجا تھا لیکن وہ اسے وہاں نہیں ملی۔ وکیل صفائی نے اپنے ایک بیان میں الزام لگایا کہ پولیس نے ڈینی پر دھاوا ڈالنے کے لیے بچی کو اغوا کیا ہے لیکن ڈسٹرکٹ انٹارنی نے اس الزام کی تردید کی اور کہا کہ اس طرح قیدی کے لیے ہر در کی جذبات پیدا کیے جا رہے ہیں۔ خبر کے مطابق پولیس بچی کو سرگرمی سے تلاش کر رہی تھی۔

گراہم نے اخبار ایک طرف رکھا اور چیف سے بات کرنے کے لیے فون اٹھایا لیکن اسے اپنے میسر کی آواز سنائی دی۔

”سوچ کیا رہے ہو چیف کو بتا دو کہ بچی تمہارے پاس ہے۔ وہ اسے بچہ چیلنج دیں گے جہاں اس کی پرورش لاوارثوں کی طرح ہوگی۔ اس کا بچپن اور

رہائی جیل کی محدود دنیا کی نذر ہو جائے گی اور اسے افرے میں کوئی مقام نہیں مل سکے گا۔“

گراہم کو یہ سوچ کر ہی جھرجھری آئی اور اس نے بون رکھ دیا۔

سربرہاڑیوں کے دامن میں واقع کھیتوں میں رنگ لگے پھول بہاؤ دکھا رہے تھے۔ ان کھیتوں میں مکی اور گندم لاکھت ہوئی تھی۔ ڈینی کے لیے یہ مناظر بالکل نئے تھے۔

اساتھ راستے گراہم سے سوالات پوچھتی رہی اور وہ اپنی کچھ باتیں جواب دیتا رہا پھر اس نے ہتھ پیر ڈال دیے۔

”دیکھو ڈینی۔ میں دیہات کے بارے میں کچھ نہیں جانتا کیونکہ وہاں مکی نہیں رہا۔“

”پھر ہم یہاں کیوں آئے ہیں؟“

اس نے نالے کی غرض سے کہا۔ ”میں نے سوچا کہ کادن شہر سے باہر گرا کر جائے۔“

یہ جگہ شہر سے قریب تھی اور وہ جب چاہے یہاں آسکتا تھا۔ اس نے ایک سروس اسٹیشن سے فارم کا پتا پوچھا اور اس سے دو میل کا فاصلہ طے کرنے کے بعد وہاں پہنچا۔

وہ ایک چھوٹا سا پرانا پتھر کا بنا ہوا مکان تھا جس کے ساتھ کھلیاں، پانی کا تالاب، ایک گائے کچھ مرغیاں اور ایک لے بالوں والا کتہ بھی نظر آیا۔ کار سے اتر کر گراہم نے

بچہ کی طرف قدم بڑھا دیے جہاں ایک بوڑھی عورت کھڑی تھی۔ اس نے اپنے ہاتھ صاف کر دی تھی۔

اس سے بات کرنے کے بعد گراہم نے واپسی کا ارادہ کیا لیکن وہ عورت جس کا نام ویلیس تھا، اصرار کرنے لگی کہ وہ کھانا کھا کر جائے۔ گراہم نے گزشتہ تین سالوں میں

کھانا کھانا نہیں کھایا تھا۔ اس نے کچھ زیادہ ہی کھالیا تھا۔ اسے غنودگی محسوس ہونے لگی ابھی تک سورج کی تیش

سوز ویلیس نے تجویز پیش کی کہ وہ شام میں واپس آئے لیکن اس نے یہ کہہ کر معذرت کر لی کہ اسے آٹھ بجے

روانہ ہونے سے قبل ڈینی نے اس سے وعدہ لیا کہ وہ اسے روز ضرور واپس آئے گا لیکن عملاً یہ ممکن نہیں تھا۔

اسے سوچا کہ وہ کم از کم ایک ہفتہ ڈینی کو وہاں رکھے گا۔

تک اخبارات میں اس کی گردش کی سے متعلق خبریں پڑیں گی اور وہ خاموشی سے ڈینی کو حکام کے حوالے

کے گا اور اس کی کوشش ہوگی کہ ڈینی کو بچہ چیلنج نہ بھیجا جائے۔

اس نے اس بارے میں کچھ اور ہی سوچ رکھا تھا۔

اسی دوران ایک دن گراہم ایک بدعاش کا تعاقب

شاعری

ایک زمانہ تھا کہ شاعری اور عشق یا عشق کو لازم و ملزوم سمجھتے تھے اور ایسا سمجھنا بے وجہ نہ تھا۔

اول تو خود شعر کا حدوث ہی دنیا میں اس جوش اور دلولے سے ہوا ہے جو عشق اور محبت کی بدولت

انسان کے دل میں پیدا ہوتا ہے اور شعر کی ذات میں جو ایک آتش گیر مادہ ہے وہ بھی اپنے مشتعل

ہونے میں کسی آگ کی اشتعال کا محتاج ہے پھر قوم کا کام بھی جہاں تک دیکھا گیا اخیال کی

تائید کرتا تھا۔ غرضیکہ ایک مدت تک یہ حال رہا کہ عاشقانہ شعر کے سوا کوئی کلام پسند نہ آتا تھا بلکہ

جس شعر میں یہ جاشنی نہ ہوتی تھی اس پر شعر کا اطلاق کرنے میں بھی مضائقہ ہوتا تھا۔ خود بھی

جب بھی یہ سودا اچھلا آنکھیں بند کیں اور اسی شارب عام پر پڑے جس پر راہ گیروں کا تانتا

بندھا ہوا تھا۔ قافلے کا ساتھ راہ کی ہمواری اور راہ گزر کی فضا چھوڑ کر دوسرا راستہ اختیار کرنے کا بھی

خیال بھی نہ آیا۔ مگر آفتاب عمر نے پلٹا کھایا اور دن ڈھلنا شروع ہوا۔ وہ تمام سیاحتی جلوے جو

خواب غفلت میں حقائق سے زیادہ دل فریب نظر آتے تھے رفتہ رفتہ کا نور ہونے لگے۔ غزل و

نقشب کی امگال انتقال کے ساتھ بدل گئی اور جس شاعری پر ناز تھا اس سے شرم آنے لگی۔ ہر

چند سمجھا گیا کہ غزل کہنے کے دن اب آئے ہیں مگر یہی جواب دیا گیا کہ غزل کہنے کے دن

اب گئے۔ جو لوگ عاشقانہ گوئی کے چٹارے سے واقف ہیں وہ جانتے ہیں کہ یہ خون جہاں

منہ کو لگا کر پھر ذرا مشکل سے چٹا ہے گزرنے کی ضرورتوں نے سبق پڑھایا کہ دلفریب مگر مکی

باتوں پر آفریں سننے سے دل شکن مگر کام کی باتوں پر نفیس سننا بہتر ہے اور حاکم وقت نے یہ حکم دیا

کہ پروانہ و ملیں کی قسمت کو تو بہت رو چکے بھی اپنے حال پر بھی دوا نسو بہانے ضروری ہیں۔

انتخاب: نحمدہ و نصلیٰ علیٰ نبیہا و علیٰ آلہہ

کرتے ہوئے ایک اسٹور میں پہنچ گیا۔ وہ بد معاش چوری کی کئی وارداتوں میں مطلوب تھا۔ اس اسٹور میں خواتین کے ملبوسات اور دیگر اشیاء فروخت ہوتی تھیں۔ اس بد معاش کو بالکل بھی اندازہ نہیں تھا کہ اس کا تعاقب کیا جا رہا ہے۔ وہ وہاں ایک لڑکی سے ملنے آیا تھا۔ اس لڑکی نے دل کھول کر خریداری کی اور اس بد معاش نے ان چیزوں کی قیمت ادا کی جیسے ہی دونوں اسٹور سے باہر آئے، گراہم نے انہیں پکڑ لیا۔ دوسرے دن وہ پھر اسی اسٹور میں گیا اور سبز گرل سے کہا کہ وہ بچی کے لیے ایک خوب صورت لباس خریدنا چاہتا ہے۔ اس نے بغیر سوچے سمجھے ٹھکر سے کہہ دیا کہ جب لباس تیار ہو جائے تو وہ اس کے دفتر پہنچا دیا جائے۔ جب اسٹور کا باوردی ڈیپوڑی مین دوسرے دن دو ڈبے لے کر پولیس ہیڈ کوارٹر پہنچا اور اس نے سار جٹ ہانگن گراہم کے دفتر کے بارے میں جاننا چاہا تو استقبال پر ٹھکر معنی خیز انداز میں مسکادی، تھوڑی ہی دیر میں یہ خبر پرسن روم میں پہنچ گئی کہ سخت گیر سار جٹ گراہم نے کسی عورت کے لیے خوب صورت لباس خریدے ہیں۔ زیادہ تر رپورٹرز کو اس افواہ پر یقین نہیں آیا تاہم شون کا خیال اس سے مختلف تھا۔ اس نے کہا۔

”جو بظاہر سخت نظر آتے ہیں۔ وہی پھسلے بھی ہیں۔ میں دیکھنا چاہتا ہوں کہ تم میں سے کون اس کے پاس جائے گا۔“

ٹائمر کے نمائندے نے کہا۔ ”میں تو نہیں جاؤں گا۔“

”ٹھیک ہے۔ وہ جب یہاں آئے گا تو ہر اس سے پوچھ لیں گے۔“ شون بولا۔

گراہم اس روز پرسن روم میں نہیں آیا۔ پیچیس سالوں میں یہ دوسرا موقع تھا کہ اس نے دفتر سے چھٹی لی تھی۔ وہ اسی ارادے سے فارم ہاؤس گیا تھا کہ چینی کو واپس لا کر متعلقہ حکام کے حوالے کر دے گا لیکن وہاں پہنچ کر وہ شش و پنج میں پڑ گیا۔

چینی نے مختصر سا پلے سوٹ پہن رکھا تھا جو اس کے بدن کو چھپانے کے لیے کافی تھا۔ اس کے جسم کی رنگت بھی تبدیل ہو کر سفید سے گولڈن براؤن ہو گئی تھی۔ وہ ایک کرسی پر کھڑی اپنے کپڑے استری کر رہی تھی۔ جیسے ہی گراہم کمرے میں داخل ہوا، وہ دوڑ کر اس سے لپٹ گئی۔ گراہم گھبرا گیا اور اسے شرمندگی محسوس ہونے لگی۔

”دیکھو لڑکی۔ تمہیں ایسا نہیں کرنا چاہیے۔“

”ان ہڈیوں میں کیا ہے؟“ چینی نے پوچھا۔

”کچھ نہیں۔“ وہ کھیانا ہوتے ہوئے بولا۔

”تمہارے لیے کچھ چیزیں ہیں۔“ وہ فرش پر بیٹھ کر کھولنے لگی۔ وہ ایک ایک چیز کو اپنے جسم پر رکھ کر دیکھ رہی تھی۔ اس کی غویت کو دیکھتے ہوئے گراہم کو یہ کہنے کا موقع ہی نہ مل سکا کہ وہ اس کے ساتھ شہر جانے کے لیے تیار ہو جائے۔ اس سے پہلے کہ چینی کی فیشن پر یہ ختم ہوتی، مسز ویلس کمرے میں داخل ہوئی۔

”چینی کتنی اچھی لگ رہی ہے۔“ وہ جھٹکتے ہوئے بولی۔ ”گرمیاں ختم ہونے سے پہلے اس کی رنگت بالکل براؤن ہو جائے گی۔ کیا تمہیں ایسا نہیں لگتا۔“

”ہاں۔ میرا بھی یہی خیال ہے۔“ گراہم نے کہا۔

چینی نے اسے وہ سب کچھ بتایا جو وہ فارم پر سیکھ رہی تھی۔ اس نے گائے کا بھی تعارف کروایا۔ اس کا نام ایلینس تھا۔ چینی نے اپنے کپڑوں پر استری کرنا بھی سیکھ لیا تھا۔ اس کی نظر گراہم کے سسلے ہوئے سوٹ پر پڑی تو اس نے اس پر بھی استری کرنے کی پیشکش کر دی، جس میں اسے اپنی بے عزتی محسوس ہوئی۔ بعد میں جب اس نے مسز ویلس کے سامنے یہی پیشکش دہرائی تو وہ شرمندہ ہو گیا اور اس کی سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ کس طرح اس کی زبان کو روکے۔ اس کا ایک ہی حل تھا کہ وہ کمرے میں جا کر اپنی چٹلون اتار کر دروازے سے باہر پھینک دے اور چٹلون استری ہو جانے کا انتظار کرے۔

چینی نے اپنا کام مدگی سے کیا کہ چٹلون پر دہری کر یز بن گئی تھی لیکن پھر بھی وہ بہتر نظر آ رہی تھی۔ گراہم چینی کو لیے بغیر ہی ڈیوٹی پر چلا آیا البتہ اس کے کپڑے استری شدہ تھے۔ یہ دیکھ کر ڈیوٹیک ٹھکر اپنی حیرت پر قابو نہ پاسکی۔ اس نے شون سے کہا۔

”گراہم اور ایک عورت کے بارے میں جو خیال تھا، اس میں ضرور کوئی سچائی ہے۔ مجھے تو اسی وقت شک ہو گیا تھا جب زمانہ کپڑے یہاں آئے تھے لیکن اب اس کے استری شدہ کپڑے دیکھ کر میرا شک یقین میں بدل گیا۔ اس نے جب سے یہ سوٹ خریدے، اس پر استری نہیں ہوئی۔“

اس کے بعد گراہم چار مرتبہ چینی کو لینے گیا لیکن ہر مرتبہ اس کا ارادہ کرور پڑ گیا۔ بالآخر اس نے یہ خیال دل سے نکال دیا۔ وہ خود بھی چینی کو بھائی کے مرکز میں نہیں سمجھتا چاہتا تھا لیکن اس کا صرف ایک ہی طریقہ تھا کہ وہ چینی کو گوڈ لے لے۔ یہ سوچتے ہی اسے ٹھنڈے سپینے آنے لگے لیکن اُسے چینی کو اپنے پاس رکھنا تھا تو یہی کرنا ہوگا۔ اس نے اپنے طور پر محتاط طریقے سے معلومات

حاصل کیں تو پتا چلا کہ ڈینی کی زندگی میں اس کی اجازت کے بغیر وہ چینی کو گوڈ نہیں لے سکتا۔ اس بارے میں گراہم نے بہت زیادہ سوچ بچار کرنے کے بعد فیصلہ کیا کہ اسے ڈینی سے بات کر لینا چاہیے۔ وہ یہ نہیں جانتا تھا کہ اس کے رومانس کی کہانی جیل کے اندر بھی پہنچ گئی ہے۔ اس سے پہلے کہ وہ ڈینی سے ملنے کے لیے انڈین ہاؤس ۱۳۳ ڈینی نے اسے بلا بھیجا۔

وہ بے وقوف نہیں تھا۔ اس نے دو اور دو جمع کیے اور سچ معلوم کر لیا۔ جب گراہم ملنے کے لیے اس کے سیل پہنچا تو ڈینی نے لگی لپٹی بغیر کہا۔ ”تم میری چینی کو لے گئے ہو۔ وہ تمہارے پاس ہے۔ تم مجھے بے وقوف نہیں بنا سکتے۔“

وہاں کوئی اور موجود نہیں تھا۔ اس لیے وہ کھل کر بات کر سکتے تھے۔

”میں تمہیں بے وقوف نہیں بنانا۔“ گراہم نے۔

”ہاں وہ میرے پاس ہے۔“

ڈینی اس کے بالکل قریب آیا اور اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بولا۔

”اس دنیا میں مجھے صرف اپنی چینی کی پروا ہے۔“

”بہت خوب۔“ گراہم نے کہا۔ ”لیکن میں بھی ایسا ہی محسوس کرتا ہوں اور اسے گوڈ لینا چاہتا ہوں۔“

ڈینی واہیں اپنی لوہے کی کرسی پر بیٹھ گیا۔ یوں لگ رہا تھا جیسے اس نے بہت زیادہ پی پی ہو۔ گراہم اپنی بات جاری رکھتے ہوئے بولا۔ ”تمہیں پچائی ہو جائے گی اخبارات کو تمہاری چینی کی کہانی چاہیے۔ میں اسے بہت دور لے جاؤں گا۔“

”کیوں؟“ ڈینی نے پوچھا۔

گراہم نے ٹھنڈی سانس بھری اور بولا۔ ”کاش میں جان سکتا۔“

ڈینی کافی دیر تک خاموش بیٹھا رہا پھر بولا۔ ”گراہم! میں تم سے شدید نفرت کرتا ہوں۔ تم ایک بے حس اور جذبات سے عاری انسان ہو۔ بے شک میری بیٹی مر جائے لیکن میں اسے تمہارے حوالے نہیں کر سکتا۔ تم ابھی اسے میرے پاس لے کر آؤ۔ ورنہ میں تمہیں جان سے مار دوں گا۔ یہ میرا وعدہ ہے۔“

”تم کسی کو نہیں مارو گے۔“ گراہم نے خشک لہجے میں کہا اور وہاں سے چلا گیا۔

وہ ڈینی کی دھمکیوں سے پریشان نہیں تھا۔ وہ جیل میں رہتا تھا اور جس دن اسے پچائی پر لڑکا یا جاناے گا تو وہ اس مسئلے سے آزاد ہو جائے گا۔ اسے صرف یہ فکر تھی کہ کہیں ڈینی

اخباری نمائندوں اور ڈسٹرکٹ انٹاری کو نہ بتادے کہ اس کی بیٹی گراہم کے پاس ہے اس طرح اس کے خلاف اسکیڈل بن جائے گا۔

گراہم بڑی باقاعدگی سے اخبارات دیکھ رہا تھا لیکن ایک ہفتہ گزر جانے کے باوجود بھی اسے اپنے اور چینی کے بارے میں کوئی خبر نظر نہیں آئی تو اس نے فون کر کے مسز ویلس کو بتایا کہ وہ اگلے روز چینی سے ملنے کے لیے آ رہا ہے۔ اس نے وعدہ کیا کہ وہ ان کے لیے پکک تیار کرے گی اور پورے دن کے لیے فارم ان کے حوالے کر دے گی کیونکہ وہ اپنی بیٹی سے ملنے کے لیے دوسری کاؤنٹی جانا چاہتی ہے۔

گراہم کو ابھی تک اس شرمندگی سے نجات نہیں ملی تھی جو چینی کے سوٹ پر بیس کرنے کی وجہ سے اسے ہوئی تھی۔ لہذا اس مرتبہ اس نے جانے سے پہلے اپنا سوٹ اچھی طرح استری کر لیا تھا۔ اس کا ارادہ ڈیوٹی ختم ہونے کے فوراً بعد علی الصبح روانہ ہونے کا تھا لہذا اس نے استری شدہ سوٹ پہن لیا۔ ڈیوٹیک ٹھکر نے اسے غور سے دیکھا اور چند منٹوں میں یہ خبر پکھیل گئی کہ گراہم اپنی بیٹی سے ملنے جا رہا ہے۔

بائیک گراہم کی کار میں ریڈیو نہیں تھا۔ اسے یہ بات پسند نہیں تھی کہ دفتر سے وائرلیس کے ذریعے اسے بتایا جائے کہ وہ کیس کو کس طرح پینڈل کرے گا چنانچہ خراس کی اس خوشگوار صبح بھی وہ کار ریڈیو کے بغیر ہی چینی سے ملنے جا رہا تھا۔ کار کی پیچلی نشست پر چینی کے ٹخنے رکھے ہوئے تھے۔ ریڈیو نہ ہونے کی وجہ سے اسے یہ اطلاع نہ دی جا سکی کہ ڈینی جیل تو ڈکرافر ہو گیا ہے۔ بائیک اس صورت حال سے لاعلم تھا۔ وہ اپنے خیالوں میں ڈوبا ہوا بے فکری سے کار چلا رہا تھا اور اسے یہ غم ہی نہ ہو سکا کہ مناسب فاصلے سے اس کا تعاقب کیا جا رہا ہے۔

چینی فارم کے گیٹ پر ٹپل رہی تھی۔ اس نے ٹچ پیک کر لیا تھا اور اس کا انتظار کر رہی تھی۔ گراہم نے سوچا کہ پہاڑی پر چڑھتے وقت اس کا کندھا نمایاں ہو جائے گا۔ اپنا اس لیے اس نے تھوڑی سی چٹکا ہٹ کے بعد۔۔۔ اپنا ہولسٹر اور گن کار کے خانے میں رکھ کر منتقل کر دی۔ وہ چینی کے ساتھ فارم کے عقب میں واقع جنگل میں چلا گیا۔۔۔

شکاری کتا ان کی راہنمائی کر رہا تھا۔

گراہم پیدل چلنے کا عادی نہیں تھا۔ لہذا ایک گھنٹے کے سفر کے بعد وہ ٹھنڈی گھاس پر چٹ لیٹ گیا اور چینی کی باتیں سننے لگا۔۔۔ بالآخر اس نے اسے ٹوکا اور بولا۔ ”چینی!

کیا تم میری بیٹی بننا پسند کرو گی؟

”میرے پاپا کہاں ہیں؟ وہ کب آئیں گے؟ میں ان کی بیٹی ہوں۔ کیا میں غلط کہہ رہی ہوں؟“

گراہم نے ٹھنڈی سانس بھرتے ہوئے کہا۔ ”نہیں تم شیک کہہ رہی ہو۔“ پھر کچھ دیر توقف کرنے کے بعد بولا۔ ”کیا تمہارے پاپا تم سے بہت پیار کرتے تھے بیٹی؟“ اس نے تائید میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ”ہاں۔“ بھی کبھی وہ مجھے رات کو جگہ کر پیار کرتے تھے۔“

”غرض کرو کہ وہ واپس نہیں آئے پھر تم میری بیٹی بننا پسند کرو گی؟“

بیٹی نے بڑے اعتماد سے کہا۔ ”وہ ضرور واپس آئیں گے۔“ اس کے بعد گراہم نے اس بارے میں کوئی بات نہیں کی۔ وہ سہ پہر کے بعد واپس آئے۔ اس وقت سورج ڈھل رہا تھا۔ گراہم خوش تھا کہ وہ اپنا کونٹ اور ہوسٹرا تار کر آرام سے بیٹھے گا لیکن اس کی خوشی خاک میں مل گئی جب اس نے کچن میں ڈینی کو بیٹھے دیکھا۔ وہ انہی کا انتظار کر رہا تھا۔ ایک چھوٹا آٹو بیگ ہسٹول اس کے ہاتھ میں تھا جس کی ٹال کا رخ اس نے گراہم کی جانب کر لیا۔

گراہم کی نظر اس پر اس وقت مچی جب اس کے پاس کچھ کرنے کے لیے وقت نہیں تھا۔ اس صورت حال میں وہ کچھ کہہ بھی نہیں سکتا تھا۔ لہذا وہ خاموش کھڑا اس کی اگلی کارروائی کا انتظار کرتا رہا۔

بیٹی خوشی سے چلائی اور دوڑتی ہوئی ڈینی کے پاس جا پہنچی۔ ”اوہ پاپا میں جانتی تھی کہ تم ضرور واپس آؤ گے۔“ ڈینی نے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا اور اسے ایک طرف کر لیا تاکہ ہسٹول کی ٹال کا رخ گراہم کی طرف رہے پھر گراہم کو مخاطب کرتے ہوئے بولا۔ ”بیٹھے جاؤ۔“

گراہم کرسی پر بیٹھ گیا لیکن اس کی نظریں ڈینی پر تھیں۔ بیٹی اس کے گلے لگتے ہوئے بولی۔ ”تمہارے ہاتھ میں گن کیوں ہے؟“

”تم اس کی فکر مت کرو۔“ ڈینی نے کہا۔ ”سڑک پر سب کے درخت کے پیچھے ایک کار کھڑی ہوئی ہے۔ تم اس میں جا کر بیٹھ جاؤ اور میرا انتظار کرو۔“

”لیکن ہم کہاں جا رہے ہیں؟“

”جو میں نے کہا ہے وہ کرو۔“ اس نے تیز آواز میں کہا۔

گراہم کو ڈینی کے چہرے پر ابھرنے والے تاثرات اچھے نہیں لگے۔ ”بہتر ہے کہ وہی کرو جو تمہارے پاپا کہہ رہے ہیں۔“ وہ غراتے ہوئے بولا۔ ”شاید مجھ سے

کچھ بات کرنا چاہتے ہیں۔“

”لیکن میں پاپا کو وہ سب چیزیں دکھانا چاہتی ہوں جو تم میرے لیے لائے ہو۔“ وہ چلا تے ہوئے بولی۔

اس نے اپنا بازو پھیرا اور ڈینی کے روکنے کے باوجود کمرے سے چلی گئی۔ انہوں نے ایک دوسرے کو گھورا اور بیٹی کے قدموں کی آواز سننے رہے جو بیڑھیاں چڑھ رہی تھی۔

”میں نے عہد کیا تھا کہ تمہیں زندہ نہیں چھوڑوں گا۔“ ڈینی نے کہا۔ ”مجھے تین دن پہلے معلوم ہو گیا تھا کہ تم نے بیٹی کو کہاں رکھا ہے لیکن مجھے جیل سے فرار ہونے کا موقع آج ملا۔“ گراہم غراتے ہوئے بولا۔ ”مجھے چاہیے تھا کہ تمہیں گرفتار کرنے کے بجائے اسی وقت شوٹ کر دیتا۔“

”تمہارے پاس موقع تھا پھر اس سے فائدہ کیوں نہیں اٹھایا؟“

گراہم.... ناک چڑھاتے ہوئے بولا۔ ”تم اس بچی کے ساتھ کیا کرو گے؟“

”اسے تمہاری دسترس سے دور لے جاؤں گا۔“

گراہم کچھ دیر توقف کرنے کے بعد بولا۔ ”میں جانتا تھا کہ تم ایک قاتل ہو پھر بیٹی نے مجھے بتایا کہ تم اسے کتنا چاہتے ہو اور ہمیشہ اسے وقت دینے کا وعدہ کرتے رہے تب میں نے سوچا کہ شاید میں غلطی پر ہوں۔ ممکن ہے کہ اس کڑواہٹ کے پیچھے شائستگی چھپی ہوئی ہو۔ بہر حال تم اس کے باپ ہو اور جب تم نے اخبارات کو یہ نہیں بتایا کہ بیٹی میرے پاس ہے تو میں نے سوچا کہ تم نے اس کی محبت میں ایسا نہیں کیا لیکن میں غلطی پر تھا۔ تم شخص ایک قاتل ہو۔“

ڈینی کا چہرہ زرد پڑ گیا۔ ”تم نے اسے میرے بارے میں تو کچھ نہیں بتایا؟“

”نہیں۔ ابھی تک تو کچھ نہیں بتایا۔“

بیٹی کمرے میں داخل ہوئی۔ اس نے بہت خوب صورت لباس پہن رکھا تھا۔ وہ دونوں اپنی گفتگو روک کر اسے دیکھنے لگے۔

”دیکھو پاپا! یہ کتنا خوب صورت لباس ہے۔ یہ مائیک نے میرے لیے خریدا ہے پاپا۔ کیا ہم یہاں نہیں رہ سکتے؟“ پھر وہ گراہم کی طرف گھومتے ہوئے بولی۔ ”کیا یہ اچھا نہیں ہوگا۔ اگر پاپا یہاں رک جائیں؟“

ڈینی نے غصے سے کہا۔ ”یہاں سے نکلو اور کار میں جا کر بیٹھو۔ ہمیں جلدی یہاں سے روانہ ہونا ہے۔ جلدی کرو۔“ اس کی آنکھیں میگ لگیں اور وہ بھرائی ہوئی آواز

میں بولی۔ ”لیکن پاپا ہم ہمیشہ ہی جلدی میں جگہ بدلنے رہتے ہیں۔ تم نے وعدہ کیا تھا کہ ایک دن ہمارا اپنا گھر ہوگا اور میں کتنا پال سکوں گی۔ میں اس جگہ کو چھوڑنا نہیں چاہتی اور اگر ہم یہاں سے دور چلے گئے تو میں مائیک سے کبھی نہیں مل سکوں گی۔“

گراہم نے اپنی آنکھیں ڈینی کے چہرے پر جمایا رکھی تھیں۔ اس نے بیٹی سے کہا۔

”تمہارے ڈیڈی کا کام ہی ایسا ہے کہ وہ کسی ایک جگہ زیادہ دیر نہیں رہ سکتا۔“

”لیکن میں یہاں بہت اچھا محسوس کر رہی ہوں۔ مجھے مسورن اور ویلس سے محبت ہوگئی ہے اور مائیک کا کہنا ہے کہ میں سڑک پار کر کے اسکول جا سکتی ہوں اور دوسرے بچوں کے ساتھ کھیل سکتی ہوں۔“

اس کی باتیں جاری تھیں کہ گراہم کی نظر ڈینی کی گن پر مچی جو اس نے بے دھیانی میں نیچے کر لی تھی۔ اس نے دیکھا کہ ڈینی کے چہرے سے وحشت اور نفرت غائب ہو چکی تھی۔ اس کی جگہ مایوسی اور اضطراب نے لے لی تھی۔ گراہم نے مداخلت کرتے ہوئے کہا۔ ”بیٹی! تم اوپر جا کر ٹیلا لباس پہنو اور بالوں میں بھی کھنکھی کرو۔“

اس کے جانے کے بعد ڈینی نے کہا۔ ”اس کا مطلب ہے کہ وہ کچھ نہیں جانتی۔“

گراہم نے نفی میں سر ہلا دیا۔ گراہم اپنا چہرہ پوچھتے ہوئے بولا۔ ”میں نہیں جانتا کہ تمہیں قل کیوں نہیں کیا۔ حالانکہ میں یہ ارادہ کر کے آیا تھا۔ مجھے تمہاری ہر بات سے نفرت ہے۔“

”شاید میں نے بھی اسی وجہ سے تمہیں نہیں مارا۔“

ڈینی دروازے کی طرف بڑھتے ہوئے بولا۔ ”میں نے تمہیں بتایا تھا کہ یہ بچی میرے لیے سب کچھ ہے۔ ہم یہاں سے جا رہے ہیں۔“

گراہم سر ہلاتے ہوئے بولا۔ ”تم کہیں نہیں جا سکتے۔ تم نے کئی گیل پیں اور ہم تمہیں تلاش کر کے ہی رہیں گے۔ تم اس بچی کو لے کر کہیں بھی چلے جاؤ لیکن جب ہم تمہیں پکڑ لیں گے تو بیٹی کو ایک مجرم کی بیٹی ہونے کی قیمت ادا کرنا ہوگی۔“

ڈینی اپنے ہونٹ ترکرتے ہوئے بولا۔ ”میں تم سے ایک سودا کرنا چاہتا ہوں ممکن ہے کہ تم اس کی پرورش مجھ سے اچھی کر سکو۔ تم اسے اپنے پاس رکھ لو اور مجھے جانے دو۔“

”میں پولیس آفیسر ہوں ڈینی اور تم سے کوئی سودا نہیں

کر سکتا۔ جیسے ہی تم ہارنگلو گے، میں تمہارا پیچھا کروں گا۔“

”تم مجھے صرف آدھا گھنٹا دے دو۔ بیٹی کی خاطر۔“

”آدھے گھنٹے میں تم کسی محفوظ جگہ تک نہیں پہنچ سکو گے۔“

ڈینی کا چہرہ زرد ہو چکا تھا۔ ”میں بہت تیز گاڑی چلاتا ہوں آدھے گھنٹے میں بہت دور نکل جاؤں گا۔“

گراہم نے گھڑی دیکھتے ہوئے کہا۔ ”ٹھیک ہے۔ صرف آدھا گھنٹا۔ اس کے بعد میں تمہارے پیچھے آ رہا ہوں۔“

ڈینی نے سیز جیوں کی طرف دیکھا اور اس نے باہر کی طرف دوڑ لگا دی۔ گراہم نے ایک بار پھر گھڑی دیکھی اور سگریٹ سلگا لیا۔ بیٹی جب نیچے آئی تو باپ کو نہ دیکھ کر رونے لگی۔ گراہم نے اسے اپنے پاس بٹھایا اور پیار سے سمجھاتے ہوئے بولا۔

”بیٹی! تمہارے ڈیڈی کو ایک لمبے سفر پر جانا تھا۔ وہ تمہیں بہت پیار کرتے ہیں لیکن ان کا جانا بھی ضروری تھا۔ ممکن ہے کہ کسی دن تمہاری ان سے پھر ملاقات ہو جائے۔“

”اب میں ان سے کب مل سکوں گی مائیک؟“

”تمہیں اس دن کا انتظار کرنا ہوگا۔“

وہ تھوڑی دیر اس کے کندھے سے لگ کر روتی رہی پھر اسے نیند آ گئی۔ گراہم نے گھڑی دیکھی۔ آدھا گھنٹا ختم ہونے والا تھا۔ اسی وقت مسز ویلس اندر داخل ہوئی اور معذرت کرتے ہوئے بولی۔ ”معاف کرنا۔ مجھے آنے میں دیر ہوئی۔ کچھ فاصلے پر ایک بہت بڑا حادثہ پیش آیا ہے۔ ایک کار بہت تیزی سے جا رہی تھی کہ چٹان سے ٹکرا کر الٹ گئی۔ اس میں ایک ہی آدمی تھا۔ وہ موقع پر ہی مر گیا۔“

”وہ واقعی بہت خطرناک موڈ ہے۔“ گراہم نے آہستہ سے کہا اور بیٹی کو گود میں اٹھا کر اس کے کمرے میں لے گیا۔

مسز ویلس کچن کی طرف جاتے ہوئے بولی۔ ”مجھے بیٹی کو محفوظ اور مطمئن دیکھ کر بہت سکون ہوا ہے۔“

گراہم ٹھنڈی سانس لیتے ہوئے بولا۔ ”ہاں اب وہ واقعی محفوظ اور مطمئن ہے۔“ وہ سوچ رہا تھا کہ اس نے گراہم کو آدھے گھنٹے کی مہلت دے کر کوئی گھانے کا سودا نہیں کیا تھا۔



آوازِ حق

سردار محمد بیگ

جب صبر اور قناعت کی جگہ پوس اور زرپرستی لے لے تو انسان کو زندگی نشیب و فراز کے دائرے میں سفر کرتے ہوئے ایک ایسے دوراں پر لاکھڑا کر دیتی ہے جہاں سوچ کی کئی سمتیں اسے الجھا دیتی ہیں۔ کچھ ایسا ہی منظر عدالت کا یہ کمرہ بھی پیش کر رہا تھا جہاں بیگ صاحب ایک ایسی ہی جان بوجھ کر کی جانے والی غلطی کو سدھارنے کی کوشش کرتے نظر آ رہے ہیں۔ وہ اپنی موجودہ پوزیشن سے مطمئن نہ تھا اور خیالات کی بلند پروازی اسے بہت اونچی اڑان بھی دے رہی تھی کہ اچانک ایک ہی قلابازی نے اس کی آنکھیں کھول دیں... قسمت اچھی تھی کہ سنبھالنے والے ہاتھ موجود تھے وگرنہ ہر ایک کو ایسی مسیحائی میسر نہیں آتی۔

بیرون ملک جا کر روزگار کے خواہش مند لوگوں

کے لیے ایک عبرت اثر واقعہ

ممکن ہے، سوئس سے دو چار ہیکرونگ ایجنٹ ایمان دار، سچے اور کھرے بھی ہوں۔ وہ اپنی زبان کا پاس کرتے ہوں اور اپنے کلائنٹ کو کوئی چکما دیے بغیر معینہ مدت میں وہ اسے بیرون ملک بھجوا دیتے ہوں مگر ایسی خوشخبریاں بہت کم سننے اور دیکھنے میں آتی ہیں۔ زیادہ تر ہیکرونگ ایجنٹس کے بارے میں ہمارے معاشرے کے خاص و عام کی رائے یہی ہے کہ یہ لوگ جھوٹے اور دھوکے باز درجہ اول ہوتے ہیں۔ اپنی چھ دار باتوں سے یہ کلائنٹ کے دماغ کو اس طرح شگفتے میں لے لیتے ہیں کہ اس کے سوچنے سمجھنے کی صلاحیت ختم ہو کر رہ جاتی ہے۔ جب اس کی آنکھ کھلتی ہے تو سب کچھ لٹ چکا ہوتا ہے۔

اس تمہید کے بعد میں اس واقعے کی طرف آتا ہوں۔ وہ موسم سرما کے ابتدائی دن تھے۔ کراچی کے باسی موسم سرما کی حقیقت سے بخوبی آگاہ ہیں کہ یہاں پر جاڑا صرف

کاروبار کوئی بھی ہو، اس کے معاملات کو چلانے کے لیے صاف گوئی کے ساتھ بہر حال کسی حد تک غلط بیانی کا عنصر بھی شامل کرنا پڑتا ہے، چاہے اسے مصلحت کا نام دے کر خود کو مطمئن کر لیا جائے یا گندھے اچکا کر خاموش اختیار کر لی جائے، اس سے حقیقت بدل نہیں جاتی۔ اگر سچ میں جھوٹ کا تناسب ”آٹے میں نمک“ کے اصول کا آئینہ دار ہو تب معاملہ گڑبڑ نہیں ہوتا اور کاروبار اپنی مخصوص رفتار سے خوش اسلوبی کے ساتھ آگے بڑھتا رہتا ہے لیکن اگر کوئی بھی کاروباری شخص اس اصول کو توڑ کر نمک میں آٹا ڈالنے کی روش پر چل نکلے تو ایسی آمیزش سے معاملات کا توازن برقرار نہیں رہتا۔ نتیجے کے طور پر ڈالنے کی تیزی سے کڑواہٹ کی جانب بڑھتے ہوئے فریقین کے بیچ تینوں کی تلخ کوحال کر دیتا ہے۔ ہیکرونگ کا بزنس بھی کچھ اسی نوعیت کا ہے!

جھک دکھانے کے لیے آتا ہے۔ "چاردن کی چاندنی، پھر اندھیری رات" کے مصداق "چاردن کی سردی، بھرونی گرمی" والا معاملہ ہے کراچی کے موسم سرما کا۔

بارہ نومبر کی ایک سہ پہر میں اپنے آفس میں بیٹھا ہوا تھا۔ ان دنوں رات میں بھی ٹھنکی نفاٹیں اتر آتی تھیں تاہم دن میں ابھی انٹرکنٹینٹر کا استعمال جاری تھا۔ میں حسب معمول اپنے کام میں مصروف تھا کہ ایک خاتون اور ایک مرد مجھ سے ملنے آ گئے۔ عورت کی عمر تینیس کے قریب رہی ہوگی۔ وہ درمیانے قد اور متناسب بدن کی مالک ایک خوش شکل عورت تھی۔ اس کے ساتھی مرد کی عمر کا اندازہ میں نے تیس اور چالیس کے درمیان لگایا۔ وہ ایک دبلا پتلا اکبر سے جسم کا مالک شخص تھا اور اس نے ہلکی چمکی ڈاڑھی بھی رکھی ہوئی تھی۔

میں نے پیشہ ورانہ مسکراہٹ سے ان کا استقبال کیا اور بیٹھنے کے لیے کہا۔ جب وہ دونوں میری میز کی دوسری جانب رکھی کرسیوں پر براجمان ہو چکے تو میں نے سوالیہ نظر سے ان کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"جی فرمائیں..... میں آپ کی کیا خدمت کر سکتا ہوں؟"

"وکیل صاحب! ان کا نام صائمہ ہے۔" ڈاڑھی والے مرد نے اپنی ساتھی عورت کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "یہ ایک مصیبت میں پھنس گئی ہیں۔ انہیں آپ کی مدد کی ضرورت ہے۔"

میں نے کاغذ قلم سنبھالتے ہوئے اس شخص سے پوچھا۔ "آپ کی تعریف.....؟"

"میرا نام سلطان شاہ ہے۔" اس نے بتایا۔ "میں ان کا مکمل دار ہوں۔ انسانی بھردی کے ناتے ان کے ساتھ آگیا ہوں۔ آپ ان کی پستان لیں تو آپ کی مہربانی ہوگی۔"

"میں یہاں پر اپنے موکلات کی دیکھ بھری کہانیاں سننے کے لیے ہی بیٹھا ہوں۔" میں نے براہ راست صائمہ کی طرف دیکھتے ہوئے گہری سنجیدگی سے کہا۔ "آپ بتائیں، مسئلہ کیا ہے؟"

"مسئلہ نوید کا ہے وکیل صاحب۔" وہ بھڑے ہوئے لہجے میں بولی۔ "میں اس کی وجہ سے سخت پریشان ہوں۔" پریشانی کی نوعیت کیا ہے؟ میں نے رف پیلہ پر قلم چلاتے ہوئے کہا۔ "اور اس سے بھی پہلے یہ بتائیں کہ نوید کون ہے.....؟"

"نوید میرا شوہر ہے وکیل صاحب۔" صائمہ نے بتایا۔ "اس کا پورا نام نوید باری ہے اور ہماری پریشانی یہ

ہے کہ ایک ایجنٹ نے دو سال سے ہمیں عجیب و غریب چکر میں ڈال رکھا ہے۔"

"کوئی ایجنٹ ایجنٹ؟" میں نے سوالیہ نظر سے اس کی طرف دیکھا۔ "کوئی پراپرٹی ڈیلر.....؟"

"نہیں وکیل صاحب۔" وہ نفی میں گردن ہلاتے ہوئے بولی۔ "میں ویز ایجنٹ کی بات کر رہی ہوں۔"

"اوہ اچھا..... ریکروٹنگ ایجنٹ۔" میں نے گہری سانس خارج کرتے ہوئے کہا۔

"جی جی..... وی۔" وہ جلدی سے بولی۔

"کیا چکر دے رکھا ہے اس ایجنٹ نے آپ لوگوں کو؟"

میں نے استفسار کیا۔

"بات دراصل یہ ہے جناب کہ....." صائمہ کے بجائے سلطان شاہ میرے سوال کا جواب دیتے ہوئے بولا۔ "دو سال پہلے ایک ایجنٹ کے ذریعے نوید نے آسٹریلیا جانے کی کوشش کی تھی۔ اس سلسلے میں نوید نے اس ایجنٹ کو کچھ رقم ایڈوانس میں بھی دے دی تھی لیکن دو سال گزر جانے کے باوجود بھی اس ایجنٹ نے ابھی تک نوید کو آسٹریلیا نہیں بھجوا دیا۔ وہ ہر روز کوئی نئی کہانی بنا کر نوید کو مطمئن کر دیتا ہے۔ صائمہ صاحبہ یہ چاہتی ہیں کہ آپ قانونی چارہ جوئی کر کے انہیں ایجنٹ سے وہ رقم واپس دلادیں جو انہوں نے ایڈوانس میں اسے دے رکھی ہے۔"

"باقی باتیں بعد میں۔" میں نے قلم کو پیڑ پر رکھتے ہوئے کہا۔ "پہلے مجھے یہ بتائیں کہ نوید باری کہاں ہے؟"

"وہ اس وقت اپنی دکان پر ہے۔" صائمہ نے بتایا۔ "اسے پتا نہیں کہ میں کسی وکیل کے پاس گئی ہوں۔"

"کیا آپ نے دانستہ یہ بات اپنے شوہر سے چھپائی ہے؟" میں نے نونٹے والی نظر سے صائمہ کی طرف دیکھا۔

"اس نے اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے کہا۔ "جی۔"

"اس کا کوئی خاص سبب؟"

"اگر میں یہ بات نوید کے علم میں لے آتی تو وہ مجھے آئے نہیں دیتا۔" صائمہ وضاحت کرتے ہوئے بولی۔ "وہ ایجنٹ پر بہت بھروسہ کرتا ہے اور اس کے خلاف کسی بھی قسم کی کارروائی کے حق میں نہیں ہے۔ اسے ابھی تک یہی یقین ہے کہ وہ ایجنٹ اسے نہیں نہیں ضرور بھجوادے گا۔"

"میں اسی لیے ان کے ساتھ آپ کے پاس آیا ہوں کہ نوید ایسی کسی بھی کوشش کے خلاف ہے۔" سلطان شاہ نے اپنی پوزیشن کلیئر کرتے ہوئے کہا۔ "صائمہ بھائی نے مجھ سے درخواست کی اور میں انسانی بھردی کے ناتے

یہاں چلا آیا۔"

"شاہ جی! میں آپ کے جذبات کی قدر کرتا ہوں۔" نوید نے سانس کی نظر سے سلطان شاہ کی جانب دیکھتے ہوئے کہا۔

"لیکن اس معاملے میں ایک ٹھنکی خرابی ہے.....!"

"کیسی خرابی وکیل صاحب؟" وہ ابھرن زدہ نظر سے مجھے دیکھنے لگا۔

میں نے سلطان شاہ سے پوچھا۔ "نوید نے آسٹریلیا جانے کے لیے اس ایجنٹ کے ساتھ کتنے میں معاملہ طے کیا تھا؟"

"تین لاکھ کی بات ہوئی تھی۔" اس نے بتایا۔ "ایک لاکھ ایڈوانس اور باقی کے دو لاکھ ویز الگ جانے پر۔"

یہ واقعہ آج سے تیس تینتیس سال پہلے کا ہے۔ آج کل اس نوعیت کے کام کے ریٹ بہت ہائی ہیں۔ میں نے سلطان شاہ سے دریافت کیا۔

"کیا یہ ایڈوانس والی ایک لاکھ کی رقم آپ نے ایجنٹ کو دی تھی؟"

"نہیں جناب۔" وہ نفی میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔

"آپ نے.....؟" میں نے معنی خیز انداز میں صائمہ کی طرف دیکھا۔

"وہ میرے سوال کی تہ میں اترتے ہوئے بولی۔

"میں وکیل صاحب! رقم تو خود نوید نے ایجنٹ کو دی تھی۔"

"اور آپ کے شوہر یعنی نوید باری رقم کی واپسی کر لیے ایجنٹ کے خلاف کوئی قدم اٹھانے کے لیے تیار نہیں ہیں؟" میں نے تعجب سے اس کا جواب دیا۔

"جی..... ایسی ہی بات ہے۔" وہ دھیرے سے بولی۔

"اگر ایسی ہی بات ہے تو پھر آپ دونوں کی یہاں آمد بے سود ہے۔" میں نے صاف گوئی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔

"کیا مطلب ہے آپ کا جناب؟" سلطان شاہ نے ابھرن زدہ انداز میں پوچھا۔

"یہ معاملہ دراصل نوید باری اور اس... ریکروٹنگ ایجنٹ کے بیچ ہے۔" میں نے بھڑے ہوئے انداز میں وضاحت کرتے ہوئے کہا۔ "لہذا آپ دونوں غیر متعلقہ افراد ہیں۔ اس کہانی میں نوید کا کردار ایک مدعی ایسا ہے۔ جب تک وہ رقم کی واپسی کے لیے رضامند نہیں ہوگا، کوئی کام نہیں کر سکتا۔ نہ پولیس اور نہ کورٹ چمکری.....!"

"میں نوید کو راضی کر لوں گی۔" صائمہ بڑے اعتماد سے بولی۔ "آپ بس میری کہانی سن لیں اور مجھے بالکل صاف صاف بتادیں کہ کیا آپ قانونی چارہ جوئی

کر کے اس ویز ایجنٹ سے ہماری رقم واپس دلوا سکتے ہیں!"

"میں آپ کی کہانی ضرور سنوں گا اور پوری توجہ سے سنوں گا۔" میں نے صائمہ کے چہرے پر نگاہ جماتے ہوئے کہا۔ "اور اس بات کا فیصلہ کہانیاں کے اختتام پر کیا جائے گا کہ میں اس سلسلے میں آپ کی کوئی قانونی مدد کر سکتا ہوں یا نہیں لیکن ایک بات طے ہے کہ اگر میں یہ کیس لوں گا تو آپ کو میری فیس کے علاوہ تمام دیگر عدالتی اخراجات بھی برداشت کرنا ہوں گے!"

"مجھے منظور ہے۔" وہ غصے سے بولی۔

میں نے اسے اپنی فیس کی رقم کے بارے میں بتایا اور کہا۔ "میں فیس ایڈوانس میں لیتا ہوں۔"

"یہ بھی منظور ہے وکیل صاحب۔" وہ پرامتداد انداز میں بولی۔

اس کے بعد صائمہ نے مجھے اس معاملے کی تفصیلات سے آگاہ کر دیا۔ کہانی تو خاصی طویل ہے لیکن میں اس میں سے غیر ضروری باتوں کو حذف کر کے خلاصہ آپ کی خدمت میں پیش کرتا ہوں تاکہ آپ اس کیس کے پس منظر سے واقف ہو جائیں۔ ایک امر کی وضاحت کر دوں کہ اس داستان میں سے بعض باتیں میں نے دانستہ چھپائی ہیں۔ ان کا ذکر عدالتی کارروائی کے دوران میں مناسب موقع پر کیا جائے گا تاکہ کہانی میں جیس کا عنصر برقرار رہے۔

☆☆☆

نوید باری کی رہائش کراچی کے ایک علاقے "اعظم بستی" میں تھی۔ کسی زمانے میں یہ علاقہ خاصا بے سماندہ ہوا کرتا تھا، اسی لیے اس محلے کے نام کے ساتھ "بستی" کا لفظ لگا ہوا ہے۔ موجودہ زمانے میں بھی اعظم بستی کوئی ماڈرن علاقہ نہیں بن گیا تاہم میں اور اب میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ جیسا کہ آپ کو پتا چل چکا کہ صائمہ، نوید کی بیوی تھی۔ ان کی ایک چار سال کی بیٹی بھی تھی جس کا نام فرزانہ تھا۔ ان کی شادی کو چھ سال کا عرصہ گزر گیا تھا۔ نوید کی محمود آباد کے مین بازار میں کپڑے کی ایک چھوٹی سی دکان تھی۔ کام ٹھیک ٹھاک تھا لیکن انسان کی فطرت میں ناشکرے پن کی بھی کوئی کمی نہیں۔ قدرت انسان کو چاہے کتنا بھی نواز دے وہ بھرپور شکر ادا نہیں کرتا۔ اگر وہ کسی حد تک شکر ادا کرتا بھی ہے تو ساتھ ہی مزید کا خواہاں بھی ہوتا ہے۔ یہی معاملہ نوید کے ساتھ بھی تھا۔ وہ اتنا کم لیتا تھا کہ اس کی مختصر سی فیملی کا بڑا ٹھیک ٹھاک گزارہ ہو جاتا تھا لیکن اس کے سر پر ملک سے باہر جانے کا بھوت سوار ہو گیا تھا۔ یہ ایک

☆☆☆

سپینس ڈائجسٹ

ایسا دماغی کیزا ہے کہ جس نے بہت سے خاندانوں کو سپردِ عذاب کیا ہوا ہے!

نوبید کے جاننے والوں میں شاکر نامی ایک شخص تھا۔ شاکر کی بینک میں کام کرتا تھا۔ مذکورہ بینک کی برانچ لاٹوحی کے علاقے میں تھی تاہم اس کی رہائشی آخر کالونی میں تھی۔ نوبید کی اکثر شاخوں سے ملاقات ہوا جی کیونکہ آخر کالونی اور اعظم ہستی ایک دوسرے کے پڑوسی تھے اور کچھ پتا نہیں چلتا، کب ایک ختم ہوا اور کب دوسرا شروع ہو گیا۔

شاکر کو بیرون ملک کی خاصی معلومات تھیں۔ ان کی جب بھی ملاقات ہوتی تو زیادہ تر اسی موضوع پر گفتگو ہوا کرتی تھی۔ شاکر نے نوبید کو بتا رکھا تھا کہ اس کا ایک جاننے والا لوگوں کو ملک سے باہر بھجوانے کا کام کرتا ہے۔ ایک روز نوبید نے شاکر سے کہا۔

”یار! مجھے اس بندے سے تو ملوؤ..... وہ جو یو ایگلو کر دیتا ہے۔“

”کیا تم بھی ملک سے باہر جانا چاہتے ہو؟“ شاکر نے پوچھا۔

”ہاں یار.....“ وہ ایک ٹھنڈی سانس خارج کرتے ہوئے ناٹھ کرے پن سے بولا۔ ”یہاں کیا رکھا ہے۔ میں بھی ملک سے باہر جا کر دولت کماتا چاہتا ہوں۔“

”نوبید! میں تمہیں اس بندے سے ملواتو دوں گا۔“ شاکر نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ ”لیکن اس کے بارے میں چند باتیں میں تمہیں پہلے ہی بتا دیتا ہوں۔“

”کون سی باتیں؟“ نوبید بہت خوش ہو گیا۔

”میرا ایک، وہ بندہ بہت اطمینان سے کام کرتا ہے۔“ شاکر نے بتایا۔ ”اس لیے تم جلدی کی کوشش نہیں کرتا۔ اگر کام میں دیر ہو رہی ہوگی تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ کام پکا ہو رہا ہے۔ اگر تمہارے اندر صبر کا مادہ ہے تو اس کام میں ہاتھ ڈالو ورنہ کوئی فائدہ نہیں ہے خواہ وہ اپنا خون جلانے کا اور دوسرے کا وقت ضائع کرنے کا۔“

”میں انتظار کروں گا۔“ نوبید نے جذبات سے مغلوب آواز میں کہا۔ ”وہ بندہ جتنے دن بھی کہے گا، میں برداشت کروں گا۔ میرے اندر بڑا صبر ہے۔ بس، کام پکا ہونا چاہیے۔“

”ایک دم لو ہلاٹ کام ہوگا۔“ شاکر ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا۔ ”اس کی تو تم ٹکری نہ کرو۔“

”تو ٹھیک ہے.....“ نوبید نے اضطرابی انداز میں

استفسار کیا۔ ”پھر کب ملو رہے ہو مجھے اس بندے سے؟“

”تم جب کہو گے، ملو ادوں گا یار، یہ کوئی مسئلہ نہیں ہے۔“ شاکر بے پروائی سے بولا۔ ”ابھی تو میں تمہیں اس بندے کے بارے میں بتا رہا تھا.....“

”ہاں ہاں..... بتاؤ۔“ نوبید تھوڑا سا آگے جھکتے ہوئے بولا۔

”یہ تو ہو گیا کہ وہ بندہ بہت دیکھ بھال کر پورے اطمینان کے ساتھ کام کرتا ہے۔“ شاکر نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ”اس کے علاوہ وہ کچھ لم ایڈوانس میں بھی لیتا ہے.....“

”نقئی رقم؟“ شاکر کی بات مکمل ہونے سے پہلے ہی نوبید نے سوال داغ دیا۔

”یہ تو مجھے نہیں پتا۔“ شاکر سادگی سے بولا۔ ”اس بارے میں تمہیں شیر بھائی ہی بتائیں گے۔“

”شیر بھائی.....“ نوبید نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ ”یہ کون صاحب ہیں؟“

”ارے یار! میں اسی بندے کی بات کر رہا ہوں۔“ شاکر وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ”اس کا نام شیر ہے۔“

”ٹھیک ہے۔ تم مجھے شیر افضل سے ملو ادو۔“ نوبید نے کہا۔ ”ہاں باتیں میں خود ہی اس سے پوچھ لوں گا۔“

”ایک بات ذہن میں رکھنا نوبید۔“ شاکر نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”میں تمہیں شیر افضل سے ضرور ملو ادوں گا لیکن اس کے ساتھ سارے معاملات تم خود ہی طے کرو گے، خاص طور پر رقم کا لین دین۔ میں کسی چیز کا ذمے دار نہیں ہوں گا۔“

”ٹھیک ہے!“ نوبید نے اعتماد دہرے لہجے میں کہا۔ ”بس، مجھے اتنا بتا دو کہ وہ بندہ توجہ سے؟“

”ایک دم صحیح ہے۔“ شاکر نے ٹھوس الفاظ میں کہا۔ ”میں اس کے کام سے مطمئن ہوں۔ میں کئی ایسے لوگوں کو جانتا ہوں جنہیں شیر افضل نے ملک سے باہر بھجوا دیا ہے اور وہ وہاں سے کم کم کر دیتے ہیں۔“

شاکر کی وضاحت نے نوبید کو مطمئن کر دیا۔

چند روز کے بعد وہ تینوں کالوں کے نزدیک چائے کے ایک ہوٹل میں بیٹھے ہوئے تھے یعنی نوبید، شاکر اور شیر افضل۔ شیر افضل کی شخصیت نے نوبید کو بڑا اٹھکھا تھا کہ شاکر کی تھکا شاکر نہیں ایک دوسرے سے متعارف کرانے کے بعد کسی ضروری کام کا بہانہ کر کے وہاں سے رخصت ہو گیا تھا۔ اب نوبید اور شیر افضل ایک دوسرے کے روبرو تھے۔

آواز حق

شیر افضل کا بہنہ اور رکھ رکھاؤ شاندار تھا۔ اس زمانے میں سیل فون کا کوئی وجود نہیں ہوتا تھا۔ کسی انسان کی حیثیت کو چیک کرنے کے لیے اس کی گھڑی اور لباس کو سب سے پہلے دیکھا جاتا تھا۔ شیر افضل کی کلائی پر سنہری کیس اور سنہری چین دلی ایک قیمتی گھڑی سو جو جی اور اس نے جدید تراش کا ایک بیش قیمت لباس زیب تن کر رکھا تھا جس پر اس نے اعلیٰ درجے کی بریفنگ کی اس پر سے کی ہوئی تھی۔

گفتگو کے آغاز میں شیر افضل نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”نوبید صاحب! پہلے میں آپ سے چند سوالات کروں گا۔ اس کے بعد آپ کا جودل چاہے، پوچھ لیجیے گا۔ آپ کا پاسپورٹ تو بنا ہوا ہے؟“

”جی ہاں! میں نے پچھلے سال ہی بنوایا ہے۔“

”اس کا مطلب یہ ہوا کہ ابھی آپ کے پاسپورٹ کو چار سال تک استعمال کیا جاسکتا ہے۔“ شیر افضل سوچ میں ڈوبے ہوئے لہجے میں بولا پھر پوچھا۔ ”آپ نے اس پاسپورٹ پر بیرون ملک کوئی سفر کیا ہے؟“

”جی نہیں!“ نوبید نے نفی میں گردن ہلا دی۔

”ٹریول ہسٹری ہاں نہیں ہے۔“ شیر افضل نے کہا۔ ”پاسپورٹ کورا ہے.....!“

”اس سے کوئی فرق پڑتا ہے؟“ نوبید باری نے الجھن زدہ انداز میں پوچھا۔

”اگر ویزا چاہیے ہو تو فرق پڑتا ہے۔“ شیر افضل نے بتایا۔ ”ایمپلائی منٹ ویزا پر نہیں لہذا آپ کو فکر مند ہونے کی ضرورت نہیں۔“

”میں تو ویزا کی اقسام کے بارے میں کچھ نہیں جانتا جناب۔“ نوبید سادگی سے بولا۔ ”بس میری یہ خواہش ہے کہ میں پاکستان سے باہر جا کر محنت کروں اور اپنے بیوی بچوں کے لیے زیادہ سے زیادہ روزی کما سکوں۔“

”محنت مزدوری کرنا اور روزی کمانے..... کا تعلق ایمپلائی منٹ سے ہے۔“ شیر افضل نے کہا۔ ”لہذا آپ کو ایمپلائی منٹ ویزا چاہیے ہوگا یعنی ورک پرمٹ والا ویزا۔“

”دونوں ویزا میں بنیادی طور پر کیا فرق ہے؟“ نوبید نے استفسار کیا۔

”ویز ویزا پر آپ سیر و تفریح کے لیے کسی بھی ملک جاتے ہیں اور ویزا کی مدت ختم ہونے سے پہلے آپ کو واپس آنا ہوتا ہے یعنی آپ اس ملک میں طویل قیام نہیں کر سکتے اور یہ مدت عموماً پندرہ دن یا ایک ماہ یا تین ماہ یا چھ ماہ ہوتی ہے۔ علاوہ ان میں اس مختصر قیام کے دوران میں آپ

وہاں ملازمت بھی نہیں کر سکتے۔“ شیر افضل وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ”جبکہ ایمپلائی منٹ ویزا پر آپ وہاں کی کسی کمپنی سے جاب کنٹریکٹ کر کے جاتے ہیں لہذا آپ وہاں قانوناً قیام بھی کر سکتے ہیں اور نوکری بھی اور یہ کنٹریکٹ عموماً ایک سال یا دو سال یا تین سال کا ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ.....“ وہ سانس ہموار کرنے کے لیے متوقف ہوا پھر اضافہ کرتے ہوئے بولا۔

”ویز ویزا کے لیے آپ کے پاسپورٹ کی ویلٹیٹیٹی کم از کم تین ماہ اور ایمپلائی منٹ ویزا کے لیے کم از کم دو سال ہونا لازمی ہے۔“

”میں تو روزگار کے سلسلے میں وہاں جانا چاہتا ہوں۔“ نوبید باری نے کہا۔ ”لہذا آپ مجھے ایمپلائی منٹ ویزا پر ہی بھیجیں۔“

”ٹھیک ہے۔“ اس نے اثبات میں گردن ہلائی اور کہا۔ ”ایک بات ذہن میں رہے کہ ایمپلائی منٹ ویزا کا پروس خاصا طویل ہے۔ اس کے لیے آپ کو انتظار کرنا پڑے گا۔ ویزا تو زیادہ سے زیادہ دو ماہ میں لگ جاتا ہے جبکہ ایمپلائی منٹ ویزا کے لیے کم از کم آٹھ نو ماہ انتظار کرنا پڑتا ہے۔“

”میں انتظار کروں گا۔“ نوبید نے اضطرابی انداز میں کہا۔ ”مگر کام پکا ہونا چاہیے۔“

”میں بے کام ہی کرتا ہوں نوبید صاحب اسی لیے ناام لگتا ہے۔“ شیر افضل نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ”ورنہ اگر لوگوں کے پیسے کھا کر بھاگتا ہو تو کوئی بھی آسرا دیا جاسکتا ہے۔ اب آپ یہ بتا دیں کہ کس ملک میں جانا چاہتے ہیں؟“

”آپ کہاں کہاں بھجواتے ہیں؟“ نوبید نے پوچھا۔

”میرے پاس تو ہر ملک کا کام ہے۔ آپ جہاں کہیں گے، میں پہنچا دوں گا۔“ شیر افضل نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”آپ اپنی پسند بتائیں۔“

”یہ فیملی میں آپ پر چھوڑتا ہوں۔“ نوبید نے کہا۔

”بس کوئی ایسی جگہ ہو جہاں کام آسانی سے مل جائے اور تنخواہ اچھی ہو۔“

”آپ اس وقت کیا کام کر رہے ہیں۔“ شیر افضل نے پوچھا۔ ”اور ایک ماہ میں کتنا کما لیتے ہیں؟“

”محمود آباد کے مین بازار میں میری کپڑے کی دکان ہے۔“ نوبید نے بتایا۔ ”اور میں تقریباً پانچ سے سات ہزار روپے ماہانہ کما لیتا ہوں۔“

”ہوں.....“ شیر افضل نے سوچ میں ڈوبے ہوئے

جہانگیر بکس

450/-	انسان اور دیوتا
475/-	معظم علی
300/-	پاکستان سے دیوار تک
450/-	آخری چٹان
225/-	سوسال بعد
325/-	سفید جزیرہ
475/-	شاہین

نیم جہانگیر کے شاہکار تاریخی ناول

550/-	آخری معرکہ
550/-	اورنگزیب اور لٹ گئی
500/-	گمشدہ قافلے
300/-	واستان مجاہد
450/-	پروسی درخت
500/-	یوسف بن تاشفین

سبق آموز کتب سلسلہ



165/-	اقوال حضرت علی الرضی
165/-	اقوال آنحضرت کرام
195/-	حکایات گلستان سعدی
140/-	اقوال شیخ سعدی
180/-	حکایات رومی
170/-	دلچسپ و عجیب حقائق
199/-	حکایات بوستان سعدی
150/-	دلچسپ و حیرت انگیز باتیں
180/-	ایمان افروز سبق آموز چھ واقعات
165/-	بڑے لوگوں کے روشن واقعات



ادولفت

(جامعے تنویر)

ملفوظات حضرت مولانا محمد رفیع الرحمن صاحب دہلی

جہانگیر بک ڈپو

042-35757086 022-2780128
021-32765086 051-5539609 042-37220879

لجے میں کہا پھر سوال کیا۔ "مخت والا کام کر لیں گے؟"
"بالکل کروں گا۔" وہ جلدی سے بولا۔ "میں مخت سے نہیں گھبراتا۔"

"پھر آپ کے لیے آسٹریلیا سب سے زیادہ مناسب رہے گا۔" شیر افضل سمجھانے والے انداز میں بولا۔ "آسٹریلیا میں ڈیری فارم کا بہت زیادہ کام ہے جہاں ہر وقت لیبر کی ضرورت رہتی ہے۔"

"ڈیری فارم..... یعنی بیٹنیوں کا دودھ نکالنا۔؟"

نوید نے سوالیہ نظر سے اس کی طرف دیکھا۔
"میں پاکستان کے نہیں، آسٹریلیا کے ڈیری فارمر کی بات کر رہا ہوں۔" شیر افضل وضاحت کرتے ہوئے بولا۔

"وہاں کے ڈیری فارمر میں گائے بھینس کا دودھ نکلنے کے علاوہ کچھ، بھینس، چنیر اور ملائی وغیرہ کے پردس کے پلانٹ بھی لگے ہوتے ہیں اور مزے کی بات یہ ہے کہ وہاں گائے بھینس کا دودھ بھی یہاں کی طرح ہاتھ سے نہیں نکالا جاتا بلکہ اس کام کے لیے باقاعدہ مشینوں کا استعمال کیا جاتا ہے۔ ترقی یافتہ اور مہذب ممالک میں زیادہ محنت اور مشقت کا کام نہیں کرتی ہیں اور انسان ان مشینوں کو آپریٹ کرتے ہیں اور آپ کو ڈیری فارم کے جس بھی شعبے میں لگا دیا جائے گا پہلے اس کام کی آپ کو ٹریننگ دی جائے گی۔"

"پھر ٹھیک ہے۔ آپ مجھے آسٹریلیا بھی بھیجیں۔"

نوید باری اطمینان بھری سانس خارج کرتے ہوئے بولا۔
"میں تیار ہوں۔"

"آپ مجھے اپنے پاسپورٹ اور شناختی کارڈ کی فوٹو کا پی دے دیں۔" شیر افضل نے کہا۔ "میں آپ کا پروسس شروع کروا دیتا ہوں۔"

نوید باری پاسپورٹ اور شناختی کارڈ اپنے ساتھ لے کر آیا تھا اور ان کی فوٹو کا پی بھی کروا رہی تھی۔ شیر افضل کی مطلوبہ چیزیں اس کے حوالے کرتے ہوئے اس نے پوچھا۔

"آپ کو کچھ اندازہ ہے کہ آسٹریلیا میں مجھے ماہانہ کتنی تنخواہ مل جائے گی؟"

"آپ کے تصور سے بھی بہت زیادہ۔" شیر افضل نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے جواب دیا۔

نوید باری کا دل جھل کر رہ گیا۔ وہ اعظمی لہجے میں مستنصر ہوا۔ "پھر بھی..... کچھ بتائیں تو میں.....؟"

"میرے مختار انداز سے کے مطابق آسٹریلیا کے کسی ڈیری فارم میں آپ کو یہ آسانی پندرہ ڈالر فی گھنٹہ کی نوکری مل جائے گی۔" شیر افضل اسے تفصیلات سے آگاہ کرتے ہوئے بولا۔ "بتائیں، آپ کے اصول کیا ہیں۔"

"دیکھیں جناب اویز اوزت ہو یا اویز سیر ایتھاپا کی منٹ ویزا، میں دونوں صورتوں میں اس کام کے تین لاکھ

روپے لیتا ہوں۔“ شیر افضل نے ٹھہرے ہوئے انداز میں کہا۔ ”بس دونوں میں موڈ آف پے منٹ کا فرق ہے۔ وزٹ ویزا میں، میں ایک لاکھ روپے ایڈوائس لیتا ہوں اور باقی کے دو لاکھ ویزا لگتے پر.....“

”اور میرے والے کیس میں.....“ شیر افضل کی بات مکمل ہونے سے پہلے ہی نوید بول اٹھا۔ ”اس سلسلے میں آپ کا کیا اصول ہے؟“

”ایمپلائی منٹ ویزا کے لیے بھی ایک لاکھ روپے ایڈوائس لیتا ہوں۔ باقی کا پروسس بالکل مختلف ہے۔“ شیر افضل اپنے طریقہ کار کی وضاحت کرتے ہوئے بتانے لگا۔

”سب سے پہلے میں آسٹریلیا کے ایمپلائی منٹ ڈیپارٹمنٹ میں آپ کا کیس جمع کرواؤں گا جس کی رجسٹریشن فیس دو ہزار آسٹریلین ڈالر ہے۔ اس کے بعد ان لوگوں کے ساتھ میرا

خط کتابت کا سلسلہ شروع ہو جائے گا۔ آسٹریلیا کا ایمپلائی منٹ ڈیپارٹمنٹ آپ کے لیے کسی ڈیری فام میں جا ب نکال کر بھیجے گا کہ اس کے بعد اس ڈیری فام کی

طرف سے آپ کے لیے جا ب آفر لیٹر آجائے گا۔ اس جا ب آفر لیٹر کے ساتھ آسٹریلیا کے ورک پرمٹ ویزا کے حصول کے لیے وہاں کی ایگریجنٹ میں درخواست دی جائے گی۔ اس تمام تر پروسس میں چار سے چھ ماہ لگ جائیں گے۔ جب آسٹریلین ایگریجنٹ ڈیپارٹمنٹ آپ کے کیس سے مطمئن ہو جائے گا تو وہاں سے آپ کے میڈیکل چیک اپ کا لیٹر آجائے گا۔ اس دوران میں ہر مرحلے پر پیسے خرچ ہوں گے.....“ لکھاٹی توقف کر کے شیر افضل نے ایک گہری سانس خارج کی پھر نوید کی عقل سے ماورا پروسس کی

تفصیلات کو آگے بڑھاتے ہوئے بولا۔

”میڈیکل چیک اپ سب سے اہم اور نازک مرحلہ ہے۔ کسی اچھی شہرت والے اسپتال میں آپ کے مختلف ٹیسٹ کیے جائیں گے جن کی مدد سے یہ جانچا جاتا ہے کہ آپ میڈیکل ٹیسٹ میں ہیں اور آپ کے اندر خدائے ناس کوئی بڑی بیماری تو نہیں پھیل رہی.....“

”اور اگر میرے کسی ٹیسٹ میں کوئی بیماری نکل آئی تو.....؟“ نوید نے فکرمندی سے اس کی طرف دیکھا۔

”ایسا کچھ نہیں ہوگا لہذا آپ کو پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔“ شیر افضل نے بے پروائی سے کہا۔ ”اول تو آپ کے اندر کوئی ایسی بیماری ہے ہی نہیں جس سے دوسرے لوگوں کے لیے خطرہ ہو۔ وہ صرف یہ تسلی کرنا چاہتے ہیں کہ ان کے ملک میں طویل عرصہ گزارنے کے لیے آئے

والا شخص کسی ایسی وبائی یا متعدی بیماری میں مبتلا نہ ہو جس سے دوسرے لوگوں کے متاثر ہونے کا اندیشہ پیدا ہو جائے اور بہ فرض محال، خدا خواستہ اگر آپ کے اندر ایسی کسی بیماری کی نشاندہی ہو بھی گئی تو.....“ جیسے کوئی مکمل چھوڑ کر وہ تھوڑا سا آگے کھجک آیا پھر رازدارانہ انداز میں بولا۔

”میرا نام شیر افضل ہے۔ میں آپ کے کام نہیں کرتا۔ آپ مجھے میری مطلوبہ رقم دے رہے ہیں۔ آپ کے مفادات کا تحفظ کرنا میری ذمہ داری ہے۔ اگر آپ کے ٹیسٹ کی کسی رپورٹ میں کوئی گریز یا بھی گئی تو میں نوٹ خرچ کر کے سنبھال لوں گا۔ یہاں کے اسپتال سے آسٹریلین ایگریجنٹ ڈیپارٹمنٹ کو جو رپورٹ ارسال کی جائے گی اس کے مطابق آپ سولہ آسٹریلین منڈیکل فٹ ہوں گے لہذا آپ کو پریشان ہونے کی قطعاً کوئی ضرورت نہیں ہے۔“

نوید نے ایک طویل اور اطمینان بھری سانس خارج کی۔ شیر افضل نے جالا سے کہا۔ ”جس روز آپ کے میڈیکل چیک اپ کا لیٹر آئے گا اس دن آپ مجھے ایک لاکھ اور دیں گے اور آخری ایک لاکھ آپ اس وقت دیں گے جب آپ کو ایمپلائی منٹ ویزا جاری کروایا جائے گا۔“

”میڈیکل کے بعد ویزا ملنے میں کتنا وقت لگے گا؟“ نوید نے پوچھا۔

”ایک سے دو ماہ تک۔“ شیر افضل نے جواب دیا۔

”میڈیکل چیک اپ کی رپورٹ آسٹریلین ایگریجنٹ ڈیپارٹمنٹ میں جائے گی۔ اس رپورٹ سے مطمئن ہونے کے بعد متعلقہ ڈیپارٹمنٹ ”اوکے“ کا لیٹر جاری کر دے گا۔ اس لیٹر کے ساتھ آپ کا پاسپورٹ یہاں کراچی میں متعلقہ جگہ پر جمع کروایا جائے گا۔ یہاں سے آپ کا پاسپورٹ اسلام آباد آجائے گا اور ضروری کارروائی کے بعد آپ کو ویزا جاری کر دیا جائے گا۔ بس، اس کے بعد آپ کو جہاز پکڑ کر آسٹریلیا روانہ ہونا ہوگا۔“

شیر افضل نے نوید باری کو اس سلسلے میں مزید کچھ باتیں سمجھائیں۔ ان کا مقام پر اس نے دروغ گوئی سے بھی کام لیا تھا۔ نوید چونکہ اس نوعیت کے معاملات سے قطعی لاعلم تھا لہذا وہ شیر افضل کی بیان کردہ اسٹوری پر ایمان لے آیا اور اگلے روز اس نے اپنی زندگی کی جمع پونجی میں سے ایک لاکھ روپے نکال کر شیر افضل کے حوالے کر دیے۔ اب اس کی سیونگ میں چند ہزار ہی باقی بچے تھے۔ آپ خود اندازہ لگائیں، آج سے لگ بھگ تیس، ستائیس سال پہلے جو شخص چھ سات ہزار روپے ماہانہ کماتا ہوا اس نے سوا، ڈیڑھ لاکھ

روپے کتنی مشکل سے کتنے عرصے میں جمع کیے ہوں گے! شیر افضل نے ایک لاکھ روپے وصول کرتے وقت اپنا ہت بھرے لہجے میں کہا تھا۔ ”نوید صاحب! آپ کے پاس کم و بیش چھ ماہ ہیں۔ آپ ابھی سے دوسرے لاکھ کے بندوبست میں لگ جائیں۔ آپ کو پتا بھی نہیں چلے گا اور یہ چھ ماہ پر لگ کر اڑ جائیں گے۔“

”جی ٹھیک ہے۔ آپ فکر نہ کریں۔“ نوید نے..... بڑا اعتماد لہجے میں کہا۔ ”میں ادھر ادھر سے پکڑ کر انتظام کروں گا اور اگر اس میں کامیابی نہ ہوئی تو میں دکان میں موجود مال کو فروخت کر دوں گا۔ اس وقت کم از کم ڈیڑھ لاکھ کا پکڑا میری دکان میں موجود ہے۔ آپ بروکس شروع کر دیں۔ میں دوسرے اور تیسرے لاکھ کی ادائیگی سلسلے میں آپ کو پریشان نہیں کروں گا۔“

”یہ سودا آپ کے لیے مہنگا ثابت نہیں ہوگا نوید صاحب۔“ وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا۔ ”میں آپ سے جو کچھ لین لاکھ لے رہا ہوں اس میں آپ کی کئی نوکری کے علاوہ جہاز کا ٹکٹ بھی شامل ہے۔ آپ نے بس ایک بیگ تیار کرنا ہے۔ باقی سب میں سنبھال لوں گا۔ ان تین لاکھ کے علاوہ آپ کی جیب سے ایک پیسہ بھی خرچ نہیں ہوگا بلکہ جس روز میں آپ کو جہاز کا ٹکٹ دوں گا اسی دن ٹکٹ کے ساتھ پانچ سو آسٹریلین ڈالر بھی آپ کی خدمت میں پیش کر دوں گا تاکہ جب تک آپ کو تنخواہ ملتی، آپ اپنا خرچ چلا سکیں۔ ایک بات آپ کو بتا دوں کہ وہاں آپ کو ہفتہ وار تنخواہ ملے گی لہذا پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ یہ تین لاکھ تو آپ ایک سال کے اندر پورے کر لیں گے۔ اگر آپ آٹھ سو ڈالر بھی ماہانہ وہاں خرچ کریں تو پھر بھی لگ بھگ اکیس ہزار پاکستانی روپے یہاں اپنی منجلی کو بھیج سکتے ہیں۔ ایک بات اور.....“ اس نے ڈرامائی انداز میں توقف کیا پھر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے بولا۔

”میں نے آپ کی ماہانہ آمدنی کا جو ذکر کیا ہے وہ نارمل ڈیوٹی نام کا ہے۔ اگر آپ روزانہ چند گھنٹے اور ٹائم کریں گے تو ماہانہ پچاس ہزار روپے تک بھی کمائیں گے۔“

شیر افضل نے نوید باری کو جس بانس پر چڑھا دیا تھا وہاں سے سب اچھا اچھا سی دکھائی دیتا تھا۔ جب انسان کا دماغ اس بلندی پر ہو تو پھر اسے اپنے ملک کی سرزمین بہت حقیر نظر آنے لگتی ہے۔ نوید بھی اچھے بیٹھے، سوتے جاگتے آسٹریلیا ہی کے خواب دیکھ رہا تھا۔ اس دوران میں ہر دس پندرہ دن کے بعد شیر افضل اس سے ملاقات کرتا اور ہر

ملاقات پر اسے کوئی نہ کوئی کاغذ تھا دیتا۔ یہ وہ لیٹرز ہوتے تھے جو بہ قول شیر افضل کے، اس کے اور مختلف آسٹریلین دفاتر کے سچے مراسم نگاری کے نتیجے میں موصول ہوتے تھے۔ ان ڈاکویشنس کی رو سے نوید کا کیس بڑے طریقے سے سلیپے سے آگے بڑھ رہا تھا لہذا نوید مطمئن تھا۔

وقت بڑی تیزی سے آگے بڑھتا رہا اور میڈیکل چیک اپ کا مرحلہ آن پہنچا۔ نوید نے دوسرا لاکھ بھی شیر افضل کے حوالے کر دیا، تاہم اس رقم کے بارے میں اس نے اپنی بیوی کو کچھ نہیں بتایا تھا۔ صائمہ کی معلومات کے مطابق، شیر افضل ان کے ایک لاکھ روپے کھائے بیٹھا تھا اور اس نے مجھے بھی یہی بتایا تھا لیکن جب میری نوید سے براہ راست تفصیلی بات ہوئی تو دیگر اہم باتوں کے علاوہ اس نے مجھے یہ بھی بتایا تھا کہ وہ شیر افضل کے پاس دو لاکھ روپے پھنساے بیٹھا ہے۔ یہ بتانے کی ضرورت نہیں کہ صائمہ حسب وعدہ اپنے شوہر نوید باری کو میرے آفس تک لانے میں کامیاب ہوئی تھی۔

نوید باری کے ساتھ میری ملاقات اس کے لیے کافی سودمند رہی تھی۔ میں نے اسے ویزا ایجنٹ حضرات کی چال بازیوں اور مکاریوں کے بارے میں ایسی ایسی باتیں بتائیں کہ وہ یہ تسلیم کرنے پر مجبور ہو گیا کہ شیر افضل پچھلے دو سال سے مسلسل اسے الو بنا رہا تھا۔ جب میں نے نوید کا اعتماد حاصل کر لیا تو پھر اس نے کل کر مجھے بہت سی اہم باتیں بتائیں جن کی بنا پر میں نے اس کا کیس لینے کا فیصلہ کر لیا تھا۔

☆☆☆

نوید باری کی فراہم کردہ معلومات کے اندر بعض ایسے نکات موجود تھے کہ جن کے اوپر کھڑے ہو کر پیشہ ورانہ مہارت کو استعمال کرتے ہوئے میں بڑی خوب صورتی کے ساتھ شیر افضل کو اپنے گھرے میں لے کر بے بس کر سکتا تھا۔ میں نے اوپر آپ کو نوید باری کی اور شیر افضل کے بارے میں جتنا کچھ بتایا اس کے علاوہ بھی، بہت کچھ تھا جو آگے چل کر عدالتی کارروائی کے دوران میں مختلف مواقع پر آپ کے سامنے آئے گا۔

میں نے اگلے روز سلطان شاہ کو اپنے پاس بلایا۔ سلطان شاہ، نوید باری کا بھلے دار تھا اور چند روز پہلے وہ پہلی مرتبہ نوید کی بیوی صائمہ کے ہمراہ میرے پاس آیا تھا۔ مجھے یہ اندازہ قائم کرنے میں قطعاً کوئی دشواری محسوس نہیں ہوئی تھی کہ سلطان شاہ خدائی فوج دار قسم کا شخص تھا جو خلوص نیت

سپینس ڈائجسٹ

مارچ 2018ء

مارچ 2018ء

سپینس ڈائجسٹ

سے نوید باری کا بھلا چاہتا تھا۔
 رکی ملک ملک کے بعد میں نے اسے بتایا۔ ”شاہ
 جی! میں نے نوید باری کا کس پکڑ لیا ہے۔ میں تو عدالت
 کے اندر جو فائٹ کروں گا سو کروں گا مگر لیکن عدالت کے
 باہر مجھے آپ کی مدد کی ضرورت پیش آئے گی۔ کیا آپ اس
 سلسلے میں ذہنی طور پر تیار ہیں؟“
 ”مگر میں نوید باری کے کسی کام آسکوں تو مجھے خوشی
 ہوگی۔“ وہ گہری سنجیدگی سے بولا۔ ”آپ حکم کریں، آپ
 مجھ سے کیا چاہتے ہیں؟“
 ”صرف آپ کا خالص تعاون۔“ میں نے کہا۔
 ”لیکن اس سے پہلے کہ میں آپ کے ذمے کوئی کام لگاؤں،
 آپ مجھے بتائیں کہ بھاگ دوڑ کے لیے تھوڑا وقت نکال
 سکتے ہیں؟“
 ”نکال لوں گا جناب۔“ وہ سادگی سے بولا۔
 ”بتائیں، کہاں سے کہاں تک رہیں گانا؟“
 ”ارے نہیں یار۔۔۔۔۔ میں نے زیر لب مسکراتے
 ہوئے کہا۔ ”میں نے آپ کو کسی گھڑ دوڑ میں شرکت نہیں
 کرانا۔ میرے کہنے کا مطلب یہ تھا کہ آپ میری ہدایات پر
 عمل کرنے کے لیے دن میں کچھ وقت نکال سکتے ہیں؟“
 ”جی ضرور!“ وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے
 بولا۔ ”بتائیں، مجھے کیا کرنا ہوگا؟“
 ”میں نے پوچھا۔ ”آپ کی روزانہ کی مصروفیات کیا ہیں؟“
 ”میں پاکستان چوک میں واقع ایک چھوٹے سے
 پرنٹنگ پریس میں کام کرتا ہوں۔“ اس نے بتایا۔ ”میں
 پریس کے باہر کے کام دیکھتا ہوں اس لیے دن کا بیشتر حصہ
 شہر کی سڑکوں پر گزرتا ہوں۔“
 ”جب تو اور بھی اچھا ہے کہ میرے بتائے ہوئے کام
 سے آپ کی پیشہ ورانہ ذمہ داریوں میں کوئی خلل نہیں
 پڑے گا۔ آپ بہ آسانی اپنے فرائض کو نبھاتے ہوئے نوید
 باری کے بھی کام آ سکتے ہیں۔۔۔۔۔ میں نے لچائی توقع
 کر کے ایک گہری سانس خارج کی پھر اپنی بات مکمل کرتے
 ہوئے کہا۔
 ”آپ جانتے ہیں کہ وہ ریکورڈنگ ایجنٹ شیر افضل
 کوئی سیدھا سادہ نیک دل انسان نہیں ہے کہ ہم بڑے آرام
 سے اس کی جیب میں سے دو لاکھ روپے نکلوانے میں
 کامیاب ہو جائیں۔“
 ”دو لاکھ کیوں وکیل صاحب!“ سلطان شاہ نے
 چونک کر میری طرف دیکھا۔ ”نوید باری نے تو اس ویزا

ایجنٹ کو ایک لاکھ روپے دے دیے تھے۔ کیا ان دوسالوں کا ٹیکس
 لگا کر اس سے ذیل رقم وصول کرنا ہے؟“
 ”ذکوئی ٹیکس اور نہ کسی قسم کا کوئی جرمانہ یا ہرجانہ!“
 میں نے دو ٹوک انداز میں کہا۔ ”یہ اصل زر ہے اور میں شیر
 افضل سے یہی رقم نکلوانا ہے۔“
 ”آپ کے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ نوید باری نے
 آسٹریلیا جانے کے لیے اس ایجنٹ کو دو لاکھ روپے دے
 رکھے تھے؟“ وہ ابھن زدہ لہجے میں مستفسر ہوا۔
 ”ایسی ہی بات ہے شاہ جی۔“ میں نے بڑی رसान
 سے کہا۔ ”ایک لاکھ ایڈوائس، کام شروع کرنے سے پہلے
 اور ایک لاکھ ٹنگ جھگ چھ ماہ بعد۔ دو سال گزر جانے کے
 باوجود بھی نوید باری کا کام ہوا ہے اور نہ ہی اس کی دو لاکھ
 روپے کی رقم واپس لی ہے۔“
 ”اوہ خدا!۔۔۔۔۔!“ وہ آنسوؤں بھرے انداز میں
 گردن جھٹکتے ہوئے بولا۔ ”یہ ویزا ایجنٹ تو بہت عیار اور
 دھوکے باز شخص ہے۔“
 ”اکثر ریکورڈنگ ایجنٹس اسی قماش کے ہوتے
 ہیں۔“ میں نے زہر خنڈ انداز میں کہا۔ ”بہر حال، اب شیر
 افضل کے ساتھ قانونی چارہ جوئی کر کے اس سے نوید باری
 کے دو لاکھ نکلوانے ہیں اور اسی سلسلے میں مجھے آپ کے مکمل
 تعاون کی ضرورت ہے۔ آپ مجھے بتائیں، شیر افضل کے
 بارے میں آپ ذاتی طور پر کیا جانتے ہیں؟“
 ”کچھ بھی نہیں۔“ وہ صاف گوئی کا مظاہرہ کرتے
 ہوئے بولا۔ ”میں آج تک اس بندے سے نہیں ملا۔ بس
 اس کا ذکر ہی سنا ہے۔“
 ”لیکن اب آپ کو شیر افضل کے بارے میں بہت
 کچھ جاننے کی کوشش کرنا ہے اور وہ بھی جلد از جلد۔“ میں
 نے سلطان شاہ کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔
 ”مگر کیسے؟“ اس کی ابھن میں اضافہ ہو گیا۔
 ”طریقہ میں بتاؤں گا۔“ میں نے کہا۔ ”سب سے
 پہلے آپ نے شیر افضل کی رہائش اور اس کے بیوی بچوں کا
 سراغ لگنا ہے۔ نوید باری اس حوالے سے کچھ نہیں جانتا۔
 آج تک شیر افضل سے اس کی ملاقاتیں مختلف چائے خانوں
 میں ہوتی رہی ہیں۔ ایک دو بار وہ محمود آباد میں نوید کی دکان
 پر بھی ملنے آیا ہے، خاص طور پر شیر افضل نے دو لاکھ کی رقم
 نوید باری کی دکان پر آ کر کرن لی ہے۔ وہ نوید کی دکان، اس
 کے گھر کے بارے میں مکمل معلومات رکھتا ہے لیکن نوید کے
 ہاتھ میں کچھ نہیں ہے۔ اب آپ کو نوید کے ہاتھ مضبوط کرنا

ہیں یہ الفاظ دیگر، اس معاملے کو یہ خوبی نمٹانے کے لیے آپ
 نے میرے ساتھ تعاون کرنا ہے اور اسی کام کے لیے میں
 نے آپ کو اپنے پاس بلا یا ہے۔“
 ”آپ مجھے راستہ بتائیں وکیل صاحب۔“ وہ
 بڑے عزم سے بولا۔ ”میں آپ کی ہدایات پر عمل کر کے
 اس ٹاسک کو پورا کر دکھاؤں گا اللہ کے فضل سے۔“
 ”آخر کالونی میں نوید باری کا ایک دوست رہتا
 ہے۔“ میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”جو لاندھی
 کے کسی بینک میں جاب کرتا ہے۔ اسی شخص نے نوید کو شیر
 افضل سے ملوا تھا۔“
 ”آپ کہیں شاہ کی بات تو نہیں کر رہے۔۔۔۔۔؟“ وہ
 سرسراہتی ہوئی آواز میں مستفسر ہوا۔
 ”بالکل وہی۔“ میں نے تعدیقی انداز میں گردن
 ہلائی۔ ”مگر آپ شاہ پر تھوڑی محنت کریں تو ہمارا کام بن
 سکتا ہے۔“
 ”ٹھیک ہے وکیل صاحب! یہ میں کر لوں گا۔“ وہ
 پُر اعتماد لہجے میں بولا۔ ”اس کام کے لیے آپ مجھے دو دن
 دے دیں۔ پھر میں مکمل رپورٹ آپ کی خدمت میں پیش
 کرتا ہوں۔“
 ”دونیں، آپ چار دن لے لیں۔“ میں نے
 ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”اس دوران میں، میں اس
 معاملے کے دیگر قانونی پہلوؤں کو دیکھ لیتا ہوں۔ میں نے
 آپ کو ایک لاکھ دے دی ہے۔ باقی کام آپ کا ہے۔“
 ”انشاء اللہ! میں آپ کو مایوس نہیں کروں گا وکیل
 صاحب۔“ اس نے گہری سنجیدگی سے کہا۔
 میں نے مختلف ہدایات دے کر اسے رخصت کر دیا۔
 آئندہ دو روز میں سلطان شاہ نے میری مطلوبہ
 معلومات مجھے فراہم کر دیں جن کے مطابق، شیر افضل کو رگی
 کے علاقے میں رہتا تھا۔ اس کی ایک بیوی اور دو بچے تھے۔
 ایک بیٹی اور ایک بیٹا۔ بیٹی بڑی تھی اور اس کی شادی ہو چکی
 تھی۔ بیٹے کی عمر دو سال تھی اور ان کے نام علی الترتیب
 تازیہ اور فرحان تھے۔ شیر افضل کی بیوی شکیلہ ایک گھریلو
 عورت تھی اور اسے اپنے شوہر کی غیر تصالہی سرگرمیوں کی خبر
 نہیں تھی۔ عام لوگوں کی نظر میں اور بیوی کے علم کے مطابق
 وہ پراپرٹی کا کام کرتا تھا۔ اس کی باقاعدہ کوئی اسٹیٹ ایجنسی
 بھی نہیں تھی بلکہ وہ مختلف ایجنسیوں کے لیے کمیشن پر کام کرتا
 تھا۔ بہت ہی کم لوگوں کو یہ بات پتا تھی کہ شیر افضل نے
 پراپرٹی ایجنٹ والا نقاب لگا رکھا تھا اور اس نقاب کی ادھ

دینا پر آسٹریلیا بھجوا دو گے۔ آٹھ دس ماہ تو رہے ایک طرف، اب اس معاملے کو لگ بھگ دو سال ہو گئے ہیں، اس کے باوجود بھی میرا موکل اپنے ذہن میں آسٹریلیا کے کسی ذریعہ فارم کے خواب سمجھنے لگا۔ ابھی تک محمود آباد کے مین بازار میں کپڑے کی دکان چلا رہا ہے۔ دو سال گزر جانے کے باوجود بھی تم اپنا وعدہ پورا کرنے میں ناکام رہے ہو۔ نوید باری یعنی میرے موکل نے اب یہ معاملہ میرے سپرد کر دیا ہے۔ اسے آسٹریلیا یا کسی بھی ملک نہیں جانا۔ میں، نوید باری کے وکیل کی حیثیت سے اس نوٹس کے ذریعے تمہیں متنبہ کرتا ہوں کہ عرصہ سات یوم کے اندر میرے دفتر آ کر اس معاملے کو نمٹا دو اور معاملے کو نمٹانے کا مطلب یہ ہے کہ تمہیں میرے موکل کے دولاکھ روپے واپس کرنا ہیں۔ اگر تم نے اس نوٹس کا کوئی معقول جواب نہیں دیا اور اسے ایک کاغذ کا فضول سا ٹکڑا سمجھ کر نظر انداز کر دیا تو پھر یہ معاملہ کورٹ میں چلا جائے گا۔ اس کے بعد کیا ہوگا، اس کا تم اندازہ لگا سکتے ہو۔ یہ پہلا اور آخری نوٹس ہے۔ فیصلہ تمہارے ہاتھ میں ہے۔ یا تو میرے دفتر آ کر شرائط سے میرے موکل کے دولاکھ روپے واپس کرو یا پھر قانونی چارہ جوئی کے لیے تیار ہو جاؤ۔ اس نوٹس کی تریل کے چند روز بعد ایک شخص مجھ سے ملنے دفتر آیا اور ایک لفافہ میرے سامنے بچھتے ہوئے قدرے برہمی سے بولا۔ ”یہ آپ کا کارنامہ ہے؟“ مذکورہ لفافے پر نظر پڑتے ہی میں پہچان گیا تھا۔ یہ وہی رجسٹرڈ ڈاک والا لفافہ تھا جو میں نے دیرالینڈ شیر افضل کو بھیجا تھا، گویا شیر افضل اس وقت میرے سامنے موجود تھا۔ میں نے پتہ پورا انداز میں اسے بیٹھنے کے لیے کہا اور لفافے کو الٹ پلٹ کر دیکھنے کے بعد اضافہ کیا۔ ”گنا تو یہ میرے دفتر ہی کا ہے۔ کیوں؟ کیا ہوا؟“ میرے سوالات نے اسے سٹکا کر رکھ دیا۔ وہ بگڑے ہوئے لہجے میں بولا۔ ”مرزا امجد بیگ ایڈووکیٹ آپ ہی ہیں نا؟“ ”جی ہاں، میں ہی ہوں۔“ میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے جواب دیا اور پوچھا۔ ”آپ کون؟“ ”میرا نام شیر افضل ہے۔“ وہ رکھائی سے بولا۔ ”آپ نے کسی نوید باری کے حوالے سے مجھے یہ نوٹس بھیجا ہے جس میں دولاکھ روپے کی واپسی کا مطالبہ کیا گیا ہے۔“ ”تو اس میں ایسے خفا ہونے کی کیا ضرورت ہے۔“ میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ”آپ نے میرے موکل سے

جس کام کے لیے دولاکھ روپے لیے تھے وہ کام آپ نے کیا نہیں لہذا اصولی طور پر وہ رقم آپ نے میرے موکل کو واپس کرنا ہے اور یہ آپ.....“ لکائی توقف کر کے میں نے ایک گہری سانس لی پھر استخارہ کیا۔ ”میرے موکل کے لیے آپ.....“ کسی نوید باری کے الفاظ کیوں استعمال کر رہے ہیں۔ کیا میرا موکل آپ کے لیے اجنبی ہے؟“ ”وہ میرے لیے اجنبی نہیں ہے۔“ وہ جلدی سے سنہلنے ہوئے بولا۔ ”میں ابھی کل ہی اس سے ملا ہوں لیکن وہ میری کوئی بات سننے کو تیار نہیں۔ پتا نہیں، اسے کیا ہو گیا ہے۔“ ”اسے ہوش آ گیا ہے۔“ میں نے زہر خنجر لہجے میں کہا۔ ”اب آپ کو اس سے کوئی بھی بات نہیں کرنا۔ میں نوید باری کا وکیل ہوں۔ آپ کو جو بھی کہنا ہے، مجھ سے کہیں۔ یہاں بھی اور..... عدالت میں بھی!“ ”آپ مجھے عدالت کی دھمکی نہ دیں۔“ وہ برا سامہ بناتے ہوئے بولا۔ ”میں نے کوئی غلط کام نہیں کیا جو اس قسم کی باتوں سے ڈر جاؤں گا۔“ ”بس تو پھر ٹھیک ہے۔“ میں نے بات ختم کرنے والے انداز میں کہا۔ ”اگر آپ مناسب سمجھیں تو اس نوٹس کا کوئی تحریری جواب دے دیں۔ بہ صورت دیگر عدالت میں ملاقات ہوگی۔“ ”وکیل صاحب! میں یہاں آپ کو یہ سمجھانے آیا ہوں کہ میں نے نوید باری کے ساتھ کوئی دھوکا یا فراڈ نہیں کیا۔“ وہ اپنی صفائی پیش کرتے ہوئے بولا۔ ”میں نے آپ کے موکل سے جس کام کے لیے لیے ہیں اس کے لیے کوشش کر رہا ہوں۔ میرے پاس سارے ثبوت موجود ہیں۔ آپ میری بات کو سمجھنے کی کوشش کریں۔“ شیر افضل کی شخصیت متاثر کن تھی۔ وہ یہ ظاہر بڑے اعتماد کے ساتھ بات کر رہا تھا لیکن مجھے یہ اندازہ قائم کرنے میں قطعاً کوئی دشواری محسوس نہیں ہوئی کہ میرے بیٹھے ہوئے نوٹس نے اسے خاصا مضطرب کر دیا تھا۔ میں نے اس کے چہرے پر نگاہ جماتے ہوئے پوچھا۔ ”آپ کے خیال میں، میں کس کا وکیل ہوں؟“ ”ظاہر ہے، نوید باری کا۔“ اس نے جواب دیا۔ ”کیونکہ ا“ میں نے کہا۔ ”میں واقعی نوید باری کا وکیل ہوں اسی لیے میں اس کے مفادات کے تحفظ کے لیے چارہ جوئی کر رہا ہوں لہذا آپ کی بات میری سمجھ میں نہیں آسکتی۔ دولاکھ تو آپ کی ضرورت میں واپس کرنا ہوں گے۔“

”شاید آپ کو معلوم نہیں کہ اس سارے پروکس میں اچھے خاصے پیسے خرچ ہو چکے ہیں۔“ وہ ہوشیاری سے بولا۔ ”میرے پاس ایک ایک چیز کا ثبوت موجود ہے۔“ ”آپ یہ تمام تر ثبوت منجبال کر رکھیں۔ یہ کاغذ کے ٹکڑے ہو سکتے ہیں، عدالت میں آپ کے کسی کام آ جائیں۔“ میں نے حتی انداز میں کہا۔ ”میں تو صرف یہ جانتا ہوں کہ آپ نے میرے موکل سے جس مقصد کے لیے دولاکھ روپے لیے تھے وہ مقصد پورا نہیں ہو سکا۔“ ”یہ ٹھیک ہے کہ آسٹریلیا والے کام میں بعض رکاوٹیں کھڑی ہو گئی تھیں۔“ وہ بتانے لگا۔ ”اس لیے وہ چیئر کلور ہو گیا لیکن اب میں اسے یورپ بھیجنے کی کوشش کر رہا ہوں۔ ان شاء اللہ بہت جلد اس کا کام ہو جائے گا۔“ ”میرے موکل کو یورپ، آسٹریلیا، افریقا، امریکا کہیں نہیں جانا۔“ میں نے دونوں انداز میں کہا۔ ”اسے ایشیا ہی میں رہنا ہے یعنی اپنے ملک پاکستان میں..... کراچی میں..... اس لیے آپ اس کے دولاکھ روپے واپس کر دیں۔“ ”جناب! میں نے آپ کو بتایا ہے نا، میں نوید باری کو آسٹریلیا بھجوانے کے سلسلے میں اچھا خاصا خرچہ کر چکا ہوں۔“ وہ وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ”اب اگر وہ اسی سے کہیں نہیں جاتا تو میں اسے بیس بیس ہزار واپس کر سکتا ہوں۔“ اس کی مکارانہ بلکہ ظالمانہ پیشکش کو سن کر میرے ذہن میں ایک خیال آیا اور میں نے اسے اپنے جال میں پھانسنے کی غرض سے کہا۔ ”اس سلسلے میں، میں کوئی فیصلہ نہیں کر سکتا۔ میں آپ کی آفر کو نوید باری کے سامنے رکھوں گا۔ اگر وہ مان گیا تو پھر بھلا مجھے کیا اعتراض ہو سکتا ہے؟“ ”وہ آپ کا موکل ہے۔ آپ کی بات ضرور مان لے گا۔“ وہ خفیہ خیر انداز میں بولا۔ ”مجھے وہ آپ کا کلکائٹ ہو کر تھا۔“ میں نے ایک گہری چوٹ کی۔ ”اور بلا سوچے سمجھے وہ آپ کی ہر بات مان لیا کرتا تھا۔ آپ کو دولاکھ روپے دینا بھی اسی سلسلے کی کڑی ہے!“ ”چھوٹیں وکیل صاحب! گڑے مردے اکھاڑنے کا کیا فائدہ۔“ وہ بے تکلفی سے بولا۔ ”آپ بیس بیس ہزار میں ہمارا راضی نامہ کر دیں۔ میں آپ کو بھی خوش کر دوں گا۔“ ”میں سمجھا نہیں؟“ میں نے انہیں زندہ انداز میں اس کی طرف دیکھا۔ ”مطلب یہ کہ.....“ وہ جلدی سے وضاحت کرتے

ہوئے بولا۔ ”اگر آپ یہ سیٹل منٹ کروادیتے ہیں تو میں آپ کی خدمت شرمندہ بھی کر دوں گا۔ اگر نوید باری آپ کی فیس ادا کر سکتا ہے تو میں بھی کوئی ایسا گیا کرنا نہیں ہوں کہ آپ کو نظر انداز کر دوں آپ میرا اشارہ سمجھ رہے ہیں نا؟“ ”بڑی اچھی طرح سمجھ رہا ہوں۔“ میں نے اپنے انداز سے اظہار کیا کہ جیسے اس کی باتوں میں آ گیا ہوں۔ ”میں کل نوید باری سے بات کر کے دیکھتا ہوں۔“ ”آپ نے صرف یہ بات نہیں کرنا بلکہ یہ کام کرنا ہے۔“ وہ ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے بولا۔ ”مجھے امید ہے، وہ آپ کی تجویز کو رد نہیں کرے گا۔ آپ طریقے سلیقے سے اسے سمجھانے کی کوشش کریں گے تو یہ مسئلہ حل ہو جائے گا..... انشا اللہ!“ ہم لوگوں میں کچھ چیزیں اتنی پختہ ہو گئی ہیں کہ وہ ہماری عادت بن کر رہ گئی ہیں۔ آپ ایک لحاظ سے اسے فطرت ثانیہ بھی کہہ سکتے ہیں۔ ان شاء اللہ، ماشاء اللہ، ہم اللہ، الحمد للہ..... بہت اچھے الفاظ ہیں۔ ان الفاظ کے تقدس میں اور وقار کا تقاضا یہ ہے کہ انہیں ثبوت اور تعمیری مقامات پر استعمال کیا جائے لیکن عموماً دیکھنے میں یہی آتا ہے کہ ہم اچھے برے مقصد کی تفریق کے بغیر بے دھوک ان مقدس الفاظ کا استعمال کرتے ہیں۔ شیر افضل میرے موکل کے دو لاکھ بڑے کیے بیٹھا تھا اور میں بیس بیس ہزار میں اس معاملے کو سیٹل کرانے کے لیے اللہ کی رضا کا بھی ذکر کر رہا تھا..... ”اس مسئلہ کو حل کرنے کے لیے میں نوید باری کو آپ کی دی ہوئی آفر پر راضی کرنے کی ضرورت رکھوں گا۔“ میں نے شیر افضل کے اطمینان کی غرض سے کہہ دیا۔ ”لیکن ایک ضروری کام آپ کو بھی کرنا ہے اور..... اسی وقت کرنا ہے!“ ”کون سا ضروری کام وکیل صاحب؟“ وہ سوالیہ نظر سے مجھے دیکھنے لگا۔ میں نے اپنی میز پر پڑے ہوئے لفافے کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ”مجھے اس نوٹس کا جواب چاہیے۔“ ”اب اس کی کیا ضرورت ہے!“ وہ چونکے ہوئے لہجے میں متحضر ہوا۔ ”آپ تو ہمارا تصدیق کرانے جا رہے ہیں۔“ ”بے شک! میری خواہش اور کوشش تو یہی ہے کہ آپ دونوں کے درمیان راضی نامہ ہو جائے لیکن فائلوں کا پیٹ بھرتا بھی ضروری ہوتا ہے۔“ میں نے دوستانہ انداز میں کہا۔ ”میرے دفتر کی ریکارڈ کے لیے ہے کہ میں نے آپ کو ایک نوٹس بھیجا اور آپ نے اس کا جواب دے دیا۔“ ”ٹھیک ہے، آپ کہتے ہیں۔ تو میں آپ کی بات

”مان لیتا ہوں۔“ وہ رضامندی ظاہر کرتے ہوئے بولا۔
”مجھے آپ پر بھروسہ ہے لیکن کچھ میں نہیں آ رہا، جواب میں
کیا کہوں.....!“

”اگر مجھ پر بھروسہ کر رہے ہیں تو پھر بچ بولیں۔“
میں نے سمجھانے والے انداز میں کہا۔ ”سچائی میں بڑی
طاقت اور برکت ہوتی ہے۔“
”ہوں.....!“ وہ متذبذب نظر سے مجھے دیکھنے لگا۔
”کوئی پراہم ہے؟“ میں نے اپنا بیت بھرے لہجے

میں پوچھا۔
”نہیں.....!“ وہ جلدی سے نفی میں گردن ہلاتے
ہوئے بولا۔ ”میں سوچ رہا ہوں کہ اس نوٹس کا جواب کیسے
لکھوں گا۔ یہ نوٹس تو انگلش میں ہے۔ میں تو بھری بہت
انگلش پڑھ اور کچھ تو لیتا ہوں لیکن اس زبان میں باقاعدہ
تحریر نہیں کر سکتا۔“

”ادہ..... تو یہ مسئلہ ہے۔“ میں نے سرسری انداز
میں کہا۔ ”یہ تو معمولی سی بات ہے جناب۔ آپ کی آسانی
کے لیے یہ کام میں کر دیتا ہوں۔ آپ بس دستخط کر دینا۔“
”بہت شکریہ وکیل صاحب۔“ وہ مومینیت بھرے
لہجے میں بولا۔ ”آپ نے تو مسئلہ حل کر دیا۔“

”یہ ٹھیک ہے شیر افضل صاحب کہ میں نوید باری کا
وکیل ہوں۔“ میں نے سچے سچے ہونے لہجے میں کہا۔ ”لیکن
اگر آپ لوگوں کے معاملے کا اونٹ کسی کروٹ بیٹھنے جا رہا
ہے تو میں اس کا رخیر میں اتنا سحر تو ڈال ہی سکتا ہوں۔“

”بس تو پھر بم اللہ کریں۔“ وہ خوش دلی سے بولا۔
”اس کا رخیر کا اجر آپ کو اللہ دے گا اور آپ کا تختہ نامہ میں دوں گا۔“
میں نے شیر افضل کی جانب سے اپنے نوٹس کے
جواب کا ڈرافٹ تیار کر کے اس کے دستخط کروالے۔ دستخط
کرانے سے پہلے میں نے اس کے اطمینان کی خاطر مذکورہ
ڈرافٹ کا مضمون پڑھ کر اسے سنا دیا تھا جو سادہ الفاظ میں
کچھ اس طرح تھا۔

وکیل صاحب! آپ کی جانب سے نوٹس موصول
ہوا۔ یہ سچ ہے کہ دو سال پہلے میں نے آپ کے موکل نوید
باری سے دو لاکھ روپے وصول کیے تھے جس کے بدلے میں
عرصہ نوامہ کے اندر میں نے نوید باری کو ورک ویزا پر
آسٹریلیا بھجوانا تھا۔ میں تسلیم کرتا ہوں کہ مقررہ مدت میں،
میں اپنا وعدہ پورا کرنے میں کامیاب نہیں ہو سکا۔ اس
ناکامی... کا سبب جو بھی رہا ہو بہر حال، اب پچھلے کچھ عرصے
سے میں نوید باری کو یورپ کے کسی ملک بھجوانے کے لیے

کوشاں تھا لیکن اچانک اس نے اپنا ارادہ تبدیل کر دیا اور
آپ کے پاس جا پہنچا۔ میں بھی کوئی بد مزگی یا لڑائی بھگڑا
نہیں چاہتا۔ آسٹریلیا والے پروسس پر میرے اچھے خاصے
پیسے خرچ ہو گئے تھے۔ آپ اپنے موکل کو آفس میں
پلائیں۔ میں بھی آجاتا ہوں۔ میں اپنا نقصان کاٹ کر باقی
رقم نوید باری کے حوالے کر دوں گا۔ یہ تو اچھا ہے، ایک
وکیل کی موجودگی میں قانونی طریقے سے ہمارے لیکن دین
کا معاملہ نمٹ جائے گا۔

اس مضمون میں کوئی بھی ایسی بات نہیں تھی جس پر شیر
افضل چین بہ جیوں ہوتا۔ اس نے بے چون و چرا میرے تیار
کئے ہوئے ڈرافٹ پر دستخط کر دیے۔ میں نے ہنرمندی یہ
کی تھی کہ اس ڈرافٹ میں ان دو لاکھ روپوں کا تو واضح طور
پر ذکر کر دیا تھا جو اس نے میرے موکل نوید باری سے
وصول کیے تھے لیکن اس کے اخراجات والے امانت کا
کہیں تذکرہ نہیں کیا تھا۔ وہ میری چال میں آ گیا اور تسلی
بھرے انداز میں اس نے دستخط کر دیے تھے بلکہ یہ وقت
رخصت میرا حد درجہ شکر بھی ادا کر گیا تھا۔

میری کوشش تو یہ تھی کہ نوید باری کا کم سے کم نقصان
ہو اور عدالتی تکیڑوں میں پڑے بغیر ہی اس کا مسئلہ حل
ہو جائے لیکن قدرت کو کچھ اور ہی منظور تھا لہذا مجبوراً انصاف
کے حصول کے لیے میں عدالت کا دروازہ کھٹکھٹاتا پڑا۔

☆☆☆

آگے بڑھنے سے پہلے یہ بتانا چلوں کہ شیر افضل کی
میرے آفس میں آمد کے دو روز بعد میں نے ان دونوں
فریقین کو تھپنے کے لیے اپنے پاس بلا لیا تھا لیکن شیر افضل نے
معقول بات نہیں کی تھی۔ وہ خرچے کے نام پر دو لاکھ روپے
میں سے اتنی رقم کا فی چاہتا تھا کہ باقی نوید باری کے حصے
میں آنے والی رقم کو ”خیرات“ کا نام دیا جائے تو غلط نہیں
ہوگا لہذا ان کے سچے معاملہ بن نہیں پایا تھا۔

شیر افضل نے جب تک نوید باری کو آسٹریلیا والے
پروسس کے چکر میں الجھا رکھا تھا تو تھوڑے تھوڑے دنوں میں
وہ اسے اپنی کارروائی کی رپورٹ پیش کرتا رہتا تھا اور بعض
کاغذات کی فوٹو کاپی بھی وہ اسے تھماتا رہتا تھا۔ اس کے...
بقول یہ وہ کاغذات تھے جو آسٹریلیا کے مختلف محکموں سے
اس کی خط کتابت ہوتی رہتی تھی۔ نوید باری نے وہ تمام
کاغذات میرے حوالے کر دیے تھے۔ ان میں بعض بہت
ہی اہم چیزیں بھی تھیں۔

ابتدائی دو پیشیاں مختلف عدالتی کارروائیوں میں

آوازِ حق

مگر گھٹیں۔ جنوری کے وسط میں اس کیس کی باقاعدہ سماعت
کا آغاز ہوا۔ اس کیس میں شیر افضل کی حیثیت ایک ملزم
ایسی تھی جبکہ میں وکیل استیضاح کا کردار ادا کر رہا تھا اور مجھے
اپنے موکل نوید باری کو عدالت سے انصاف دلوانا تھا۔ شیر
افضل نے اپنے ڈیفنس کے لیے ایک وکیل بھی کر لیا تھا۔
شیر افضل کا حلفیہ بیان ریکارڈ ہو چکا تھا میں جرح
کے لیے ایک یوزر باکس کے نزدیک چلا گیا۔ میں نے ملزم کی
آنکھوں میں دیکھتے ہوئے سوالات کا آغاز کیا۔

”آپ کے نام کے دو حصے ہیں۔“ میں نے کہا۔
”شیر اور افضل.....“ اگر میں آپ کو کسی ایک نام سے پکارتا
چاہوں تو ان میں سے کون سا حصہ استعمال کروں؟“
وہ سادگی سے بولا۔ ”آپ کو جو بھی اچھا لگے وہ
استعمال کر لیں۔“

”اتھمے تو دونوں ہی ہیں۔“ میں نے بہ دستور اس کی
آنکھوں میں دیکھتے ہوئے دھڑے دھڑے جرح کے سلسلے
کو آگے بڑھایا۔ ”شیر جنگل کا بادشاہ کہلاتا ہے اور افضل کا
مطلب ہے فضیلت والا، اعلیٰ و ارفع۔ اس نسبت سے آپ کو
اعلیٰ اخلاقی اقدار کا مالک ایک نفس انسان ہونا چاہیے لیکن
مجھے نہایت ہی افسوس کے ساتھ یہ کہنا پڑ رہا ہے کہ آپ کا
کردار اس کے برعکس ہے۔ خیر.....“ میں نے لحاظی توقف
کر کے ایک گہری سانس لی پھر اضافہ کرتے ہوئے پوچھا۔
”شیر افضل صاحب! اس وقت آپ کی عمر کتنی ہوگی؟“

”لگ بھگ ستیئیس سال۔“ اس نے جواب دیا۔
میں نے سرسری انداز میں پوچھا۔ ”آپ کو کتنے بیٹے بھ
کی جنگ تیار ہوگی؟“

”اچھی طرح یاد ہے جناب۔“ وہ جلدی سے بولا۔
”اس وقت میں کم و بیش سترہ سال کا تھا۔“

میں نے اس کی رگڑائی ہتھکائی کا پروسس شروع
کرتے ہوئے بڑے دھیمے انداز میں کہا۔ ”ویری گڈ.....
اس کا مطلب ہے، آپ انٹری میں ہوں گے؟“

”نہیں جناب!“ وہ نفی میں گردن ہلاتے ہوئے
بولا۔ ”میں کان میں تعلیم حاصل نہیں کر سکا۔“
”میزک تو یقیناً آپ نے کر رکھا ہوگا؟“
”نہیں!“ اس نے ایک بار پھر سر کو کئی جنبش دی۔
”میں مڈل سے آگے نہیں بڑھ سکا۔“

”اس کے باوجود بھی آپ نے جس کام میں ہاتھ
پاؤں اور سر ڈال رکھا ہے وہاں تو سارے کا سارا کام ہی
انگلش کا ہے۔“ میں نے کہا۔ ”آپ بہت ہی باکمال انسان

ہیں کیونکہ یہ کام آپ خوش اسلوبی سے چلا رہے ہیں۔“
وہ میرے طنز کو سمجھ نہیں پایا اور عام سے لہجے میں
بولا۔ ”بس جی، اللہ چلا رہا ہے۔“

”آپ کا آفس کس جگہ پر ہے؟“ میں نے پوچھا۔
”میرا کوئی آفس نہیں ہے۔“ وہ جڑ بڑھوتے ہوئے بولا۔
”پھر کام کیسے چل رہا ہے؟“ میں نے قدرے سخت لہجے
میں استفسار کیا۔ ”آپ اپنے کلائس کو کیسے ڈیل کرتے ہیں؟“
”میں اپنے کلائس سے مختلف ہٹوں میں ملاقات
کرتا ہوں۔“ اس نے بتایا۔ ”ساری بات چیت وہیں پر
ہوتی ہے۔“

”ملک سے باہر جانے والے افراد کی آپ تک
رسائی کس طرح ہوتی ہے۔“ میں نے سوال کیا۔ ”کیا اس
سلسلے میں سچ کا کوئی آدمی آپ کی مارکیٹنگ کرتا ہے؟“
”نہیں!“ وہ قسطنی انداز میں بولا۔

میں نے سوالیہ نظر سے اس کی طرف دیکھا۔ ”پھر؟“
”دراصل، میں نے بہت سے لوگوں کو بیرون ملک
بھجوایا ہے۔“ وہ وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ”میری ایک
ساکھ بنی ہوئی ہے۔ ایک سے دو اور دو سے تین، اسی طرح
میرے کام کی شہرت آگے بڑھتی ہے اور مجھے کلائنٹس ملتے
رہتے ہیں۔“

”آپ کے کہنے کا مقصد یہ ہے کہ آپ نے جن
لوگوں کو بیرون ملک بھجوایا ہے وہی لوگ آپ کی پہلی
کرتے ہیں۔“ میں نے اسے اچھی طرح باندھتے ہوئے
کہا۔ ”وہ کسی نہ کسی کو آپ کے پاس بھیج دیتے ہیں۔ وہ لوگ
ملک سے باہر جانے کے خواہش مند افراد کو بتاتے ہیں کہ اگر
انہوں نے بھی دولت کماتا ہے تو وہ آپ سے رابطہ کریں۔
آپ اس شعبے میں بیرونی رکھتے ہیں۔“

”جی، بالکل ٹھیک کہا آپ نے۔“ وہ خوش ہوتے
ہوئے بولا۔ ”میرا کام ہی دراصل میرا تعارف ہے۔“

”ماشاء اللہ! اس سلسلے میں آپ کی تعارف کے محتاج
نہیں ہیں۔“ میں نے اسے کھجے پر چڑھاتے ہوئے کہا
پھر عدالت میں موجود اپنے موکل کی جانب اشارہ کرتے
ہوئے پوچھا۔ ”کیا آپ اس شخص کو جانتے ہیں؟“

”جی، بہت اچھی طرح جانتا ہوں۔“ وہ شکایتی نظر
سے نوید باری کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ ”اسی کی مہربانی
سے تو آج میں ملزموں والے کٹہرے میں کھڑا ہوں۔ کسی
نے سچ کہا ہے..... بھلائی کا کوئی زمانہ ہی نہیں رہا۔ جس پر
احسان کر دے وہی ڈکارتا ہے۔“

اقوال زریں

☆ کوئی بھی رشتہ بدن پر پڑتا ہوا لباس نہیں ہوتا کہ جسے اتار کر چھینک دیا جائے اور دوسرا بدل لیا جائے۔
☆ زندگی چاہتے ہو تو موت پر تین رکھو۔
☆ ناکامی کا مینیائی کا زینہ ہے کیونکہ ستارے اندھیرے میں چمکتے ہیں۔
☆ انہیں بھری ہوئی ہوں تو وہ ملے کا ڈھیر ہیں مگر جب باہم بڑ کر عمارت بن جائیں تو طاقت کا قلعہ جس میں تو میں پناہ لے سکتی ہیں۔
☆ بلند مقام ہمیشہ اپنا طرف بلند کرنے سے ملتا ہے۔ نہ کہ نعرے اور جھنڈے بلند کرنے سے۔

معلومات

☆ سب سے زیادہ اخبارات امریکا میں شائع ہوتے ہیں۔
☆ دنیا کا سب سے بڑا ہاکی اسٹیڈیم نیشنل اسٹیڈیم لاہور (پاکستان) ہے۔
☆ بدترین قحط 1959ء تا 1961ء کے دوران چین میں پڑا جس سے دو کروڑ پچانوے ہزار افراد قحطی اجل بن گئے۔

☆ جال "تیار کر رکھا تھا کہ وہ کسی بھی قیمت پر بچ نہیں سکتا تھا۔ میرے سنیے سوال نے شیر افضل کو حد درجہ ہراساں کر دیا تھا۔ اس نے امداد طلب نظر سے اپنے وکیل کی جانب دیکھا۔ وکیل صفائی حق فیس ادا کرتے ہوئے کراچی آواز میں گویا ہوا۔

☆ "مجھے سخت اعتراض ہے جناب عالی!" اس نے جج کی جانب دیکھتے ہوئے کہا۔ "وکیل استغاثہ غیر ضروری باتوں میں الجھا کر میرے موکل کو کنفیوژ کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ انہیں ایسے حربوں سے باز رہنے کی تلقین کی جائے۔" جج نے سوالیہ نظر سے مجھے دیکھا اور پوچھا۔ "آپ اس سلسلے میں کچھ کہنا چاہیں گے؟"

☆ "جناب عالی!" میں نے منہ مبارک گلا صاف کرتے ہوئے کہا۔ "میری باتیں تو غیر ضروری ہیں اور نہ ہی غیر منطقی۔ یہ انتہائی ضروری، منطقی اور اس کیس سے متعلقہ ہیں۔ اگر ڈیفنس کو نسلر مجھے میری جرح مکمل کرنے دیں تو میں معزز عدالت کے سامنے یہ ثابت کر دوں گا کہ میں نے جو کہا وہ سچ ہے اور جج کے سوا کچھ نہیں ہے۔"

☆ کرتے ہوئے تیر لہجے میں کہا۔ "تم نے پچھلے دو سال میں میرے موکل کو آسٹریلیا بھجوانے کے سلسلے میں آسٹریلیا کے ٹیلف ڈیپارٹمنٹس سے جو بھی خط کتابت کی ہے اس کی اور جنرل فائل تمہارے پاس ہے جبکہ تم نے ان پیجز کی جو لوگوں کا بیان میرے موکل کی کسلی کے لیے اسے فراہم کی ہیں وہ سب میری فائلوں میں موجود ہیں۔ کیا تمہیں اس میں کوئی شک ہے؟"

☆ "شک کی کوئی گنجائش نہیں۔" وہ تھوک نچتے ہوئے بولا۔ "یہ فوٹو کاپیاں میں نے ہی اپنے کلائنٹ کو دی تھیں۔" یہ تمام خط کتابت انگریزی زبان میں کی گئی ہے۔ میں نے کہا۔ "تھوڑی دیر پہلے تم نے معزز عدالت کے سامنے اس بات کا اعتراف کیا ہے کہ تمہاری تعلیم مڈل سے آگے نہیں بڑھ سکی۔ پھر تم انگریزی میں کس طرح امراسلنگاری کر لیتے ہو؟"

☆ "اس کام کے لیے میں اپنے بڑے کھٹے دوستوں کی مدد لیتا ہوں۔" وہ اپنی پوزیشن کلیئر کرتے ہوئے بولا۔ "جیسے کہ شاکر جیسے بڑے کھٹے دوست؟" میں نے ہنسنے لہجے میں استفسار کیا۔

☆ "ہاں..... کبھی کبھار شاکر بھی اس حوالے سے میری مدد کرتا ہے۔" اس نے گول مول جواب دیا۔

☆ "کبھی کبھار پرفوس کرتے ہوئے بتاؤ....." میں نے شاطر ریکورڈنگ ایجنٹ کے گرد گھیرا تنگ کرتے ہوئے کہا۔ "میری فائلوں کے اندر نوید باری کے کیس کے حوالے سے جتنے بھی کاغذات رکھے ہیں کیا ان کی تیاری میں بھی شاکر نے تمہاری مدد کی تھی؟"

☆ "جی مدد کی تھی۔" اس نے اثبات میں جواب دیا۔ "اس کا مطلب یہ ہوا کہ شاطر بہت ہی قابل بندہ ہے۔" میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے طنزیہ لہجے میں کہا۔ "اتنا قابل کہ آسٹریلیا کے بعض ڈیپارٹمنٹ اس سے مدد کی درخواست کرتے نظر آتے ہیں۔ ہیں نا؟"

☆ میرے اس سوال پر شیر افضل بہت زیادہ نروس ہو گیا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا جواب دے۔ میرا مقصد اسے ہراساں کرنا تھا اور میں اپنے اس مقصد میں کامیاب ہو چکا تھا۔ میرا دوسرا مقصد اسے جعل ساز ثابت کرنا تھا اور یہ مقصد آئندہ چند منٹ میں پورا ہونے والا تھا۔ تاثیر اور آخری مقصد اسے جھوٹا اور فراڈی ثابت کرنا تھا۔ مقصد آئندہ کسی پیشی پر لاڑی پورا ہو جاتا تھا۔ میں نے ہمارے شخص کو قابو کرنے کے لیے ایسا زبردست "جرح

☆ "آپ کی معلومات صد فیصد درست ہیں۔" وہ سر کو اٹھاتی جنبش دیتے ہوئے بولا۔ "شاکر کے نوید باری سے اچھے مراسم ہیں اور شاکر ہی نے نوید کو پہلی بار مجھ سے ملوایا تھا۔" اگر شاکر نے میرے موکل کو آپ سے ملوایا تھا تو شاکر کے اس عمل کو دوستانہ نہیں کہا جاسکتا۔ میں نے تلخ لہجے میں کہا۔ "یہ تو سراسر دشمنی ہے اور آپ کہہ رہے ہو، ان دونوں کے بیچ اچھے مراسم ہیں؟"

☆ "اب آپ جو بھی سمجھ لیں....." وہ بے پروائی سے بولا۔ "میں آپ کو روک تو نہیں سکتا۔"

☆ "میں جو سمجھ رہا ہوں اس کا تمہیں بھی یہ خوبی علم ہے۔" میں نے شیر افضل کے لیے اپنے لہجے میں موجود احترام کو خارج کرتے ہوئے کہا۔ "یہ بتائیں، آپ نے آج تک شاکر کے جاننے والے کتنے افراد کو بیرون ملک بھیجا ہے جو وہ آپ کی راکٹنگ کرتا پھر رہا ہے۔ کوئی بھی جواب دینے سے پہلے اس بات کو ذہن میں رکھنا کہ میں تمہاری بات کی تصدیق کے لیے ان افراد کے لواحقین کو عدالت میں بلا کر ان کی گواہی بھی دلاؤں گا!..."

☆ اس کے چہرے پر پہلی مرتبہ مجھے پریشانی نظر آئی۔ اس نے ایک لمحہ سوچا پھر فیصلہ کن لہجے میں بولا۔ "میں نے شاکر کے کسی عزیز یا دوست کو ملک سے باہر نہیں بھجوا یا۔" یہ جج اس نے مجھ سے اپنی جان چھڑانے کے لیے بولا لیکن میں اتنی آسانی سے اس کی جان کہاں چھوڑنے والا تھا۔ میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔ "اس کا مطلب یہ ہوا کہ شاکر تمہارا بزنس پارٹنر ہے؟" "ایسی کوئی بات نہیں۔" وہ بد کے ہوئے لہجے میں بولا۔ "میں اکیلے ہی یہ کام کرتا ہوں۔"

☆ "پھر شاکر کس خوشی میں تمہارے لیے مرے گھیرتا ہے۔" میں نے جیسے ہوئے لہجے میں پوچھا۔ "کیا اس خدمت کے لیے تم شاکر کو کوئی کمیشن وغیرہ دیتے ہو؟" "نہیں۔" اس نے ایک مرتبہ میری فیس گردن ہلائی۔ "شاکر کبھی کبھار دوستی میں کسی کلائنٹ کو فیر کر دیتا ہے۔"

☆ "گو یا شاکر سے تمہاری دوستی ہے؟" "کہہ سکتے ہیں!" اس نے گول مول جواب دیا۔ میں نے قدرے سخت لہجے میں کہا۔ "کہہ سکتے ہیں وغیرہ عدالت میں نہیں چلتا۔ دو ٹوک الفاظ میں جواب دو۔ شاکر تمہارا دوست ہے یا نہیں؟"

☆ "جی..... شاکر میرا دوست ہے۔" اس نے تسلیم کر لیا۔ میں نے میز پر رکھی اپنی فائلوں کی جانب اشارہ

☆ "غالبا آپ میرے موکل پر اپنے کسی احسان کا ذکر کر رہے ہیں....." میں نے تصدیق طلب نظر سے اس کی طرف دیکھا۔

☆ "آپ بالکل ٹھیک سمجھے وکیل صاحب۔" وہ شکوہ بھرے انداز میں بولا۔ "مجھے تو اس بات پر حیرت ہے کہ آپ جیسا تجربہ کار وکیل بھی اس احسان فراموش شخص کی باتوں میں آگیا اور مجھ پر مقدمہ دائر کر دیا!..."

☆ "میرے موکل پر آپ کے احسانات اور میری ناجسبی پر ہم بعد میں بات کریں گے۔" میں نے سرسری انداز میں کہا پھر پوچھا۔ "کیا آپ نے میرے موکل کے کسی دوست یا رشتے دار کو بیرون ملک بھجوا یا تھا؟"

☆ "نہیں۔" اس نے جواب دیا۔

☆ میں نے سوال کیا۔ "پھر میرے موکل کو آپ کے پاس کس نے بھیجا تھا؟"

☆ وہ متذبذب انداز میں وکیل صفائی کی طرف دیکھنے لگا۔ وکیل صفائی فوراً اپنے موکل کی مدد کو لپکا۔ وہ قدرے تیز آواز میں بولا۔

☆ "آپ کی کمیشن پورا نہ۔ یہ کوئی اصول نہیں کہ کوئی کسی کے توسط ہی سے میرے موکل تک پہنچے۔ بعض لوگ اپنی ضرورت کے تحت ڈائریکٹ رابطہ بھی کر سکتے ہیں۔ اصل بات یہ ہے کہ نوید باری بیرون ملک جا کر روزی کمانا چاہتا تھا اور وہ اس سلسلے میں میرے موکل سے ملتا تھا۔"

☆ "میرے فاضل دوست!" میں نے وکیل صفائی کے اعتراض کے جواب میں کہا۔ "میں نے جس اصول کے تحت ملزم سے سوال کیا تھا وہ خود ملزم ہی کا واضح کردہ ہے اور تھوڑی دیر پہلے ملزم نے معزز عدالت کے سامنے اپنا یہ اصول بیان کیا تھا اور آپ کی اطلاع کے لیے عرض ہے کہ میرا موکل ڈائریکٹ ملزم یعنی آپ کے موکل سے نہیں ملتا تھا۔"

☆ "پھر!..." وکیل صفائی کی حیرت میں ڈوبی ہوئی آواز ابھری۔ "ان کی ملاقات کس کے توسط سے ہوئی تھی؟" "شاکر کے توسط سے۔" میں نے وکیل مخالف کے سوال کا جواب دیا پھر ایکوڈ باکس کے اندر کھڑے شیر افضل سے استفسار کیا۔ "میں غلط تو نہیں کہہ رہا جناب؟"

☆ "آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں۔" وہ انکار نہ کر سکا۔ "کیا یہ درست ہے کہ شاکر نامی شخص آخر کار لوٹی کا رہائشی ہے۔" میں نے تصدیق طلب نظر سے شیر افضل کی طرف دیکھا۔ "اور یہ بندہ لائسنس میں واقع کسی بینک میں کام کرتا ہے؟"

جنگ نے اشیات میں گردن ہلاتے ہوئے مجھ سے کہا۔
 ”پلیز پرسنڈ!“
 ”میرے سوال کا جواب دو!“ میں دوبارہ شیر افضل کی جانب متوجہ ہو گیا۔
 وہ بولکھا ہٹ آئینہ انداز میں بولا۔ ”کون سا سوال؟“
 ”تمہارے دوست شاکر کی قابلیت کے بارے میں جو کچھ میں نے کہا اس حوالے سے تم کیا کہتے ہو؟“ میں نے پوچھا۔
 وہ جڑبڑھتے ہوئے بولا۔ ”میں مانتا ہوں کہ شاکر ایک قابل انسان ہے۔“
 ”اتنا قابل کہ آسٹریلیا کے مختلف اہم سرکاری اداروں میں اس کی بہت مانگ ہے؟“ میں نے زہریلے لہجے میں استفسار کیا۔
 وہ اپنی پیشانی پر نمودار ہونے والے پسینے کو ہاتھ کی پشت سے صاف کرتے ہوئے بولا۔ ”میں آپ کی بات کو سمجھ نہیں پایا۔ آپ بار بار آسٹریلیا کے اداروں کا ذکر کیوں کر رہے ہیں؟“
 ”وہ اس لیے کہ تم نے میرے کلکٹنٹ نوید باری کے آسٹریلین ورک ویزا کے لیے وہاں مختلف اداروں سے خط کتابت کی تھی جس کا ثبوت میری فائلوں کے اندر موجود ہے۔“ میں نے شیر افضل کو گھورتے ہوئے کہا۔ ”اور تم نے تھوڑی دیر پہلے اس امر کا اقرار کیا ہے کہ اس کام میں گاہے بہ گاہے شاکر نے تمہاری مدد کی تھی!“
 ”یہ شک ہے، شاکر نامی کسی شخص نے میرے موکل کی علمی معاونت کی ہوگی۔“ ویل صفائی نے شیر افضل کی حمایت کرتے ہوئے کہا۔ ”لیکن آپ شاکر کا آسٹریلیا کے مختلف اداروں سے جو تعلق جوڑنا چاہ رہے ہیں اس سے آپ کیا ثابت کرنا چاہتے ہیں؟“
 ”میں صرف یہ ثابت کرنا چاہتا ہوں میرے فاضل دوست۔“ میں نے ویل صفائی کی جانب دیکھتے ہوئے ڈرامائی انداز میں کہا۔ ”کہ آپ کا موکل ایک دھوکے باز شخص ہے۔ وہ میرے موکل کے دولاکھ روپے کھائے پیچھے اور اس فراڈ برٹس میں شاکر آپ کے موکل کا پارٹنر ہے۔“
 ”تو آپ معزز عدالت کو یہ بتانا چاہتے ہیں کہ شاکر اور شیر افضل مختلف آسٹریلین ڈیپارٹمنٹس کے ساتھ مل کر یہ مذموم کام کر رہے ہیں؟“ ویل صفائی نے استہزائیہ انداز میں کہا۔ ”ویری فنی۔۔۔۔۔!“
 ”یہ ویری فنی ہے یا جی ہاں، میں اسے ڈسکے کی چوٹ پر ثابت کر سکتا ہوں۔“ میں نے ایک ایک لفظ پر زور

دیتے ہوئے کہا۔ ”ہاتھ کلکٹن کو آری کیا ہے، پڑھے لکھے کو فاری کیا ہے!“
 میری بات پر تپنیں، ویل صفائی کی سمجھ میں آئی کہ نہیں، وہ بڑے جوش سے پوچھ بیٹھا۔ ”آپ یہ کس طرح ثابت کریں گے کہ میرا موکل اور اس کا دوست شاکر کسی آسٹریلین ڈیپارٹمنٹ کے ساتھ ملے ہوئے ہیں؟“
 ”حضور! میری کیا خیال کہ میں کچھ ثابت کروں۔۔۔۔۔“ میں نے ویل صفائی کے چنگی لی۔
 ”لیکن ابھی تو آپ نے ثابت کرنے کا دعویٰ کیا ہے؟“ وہ ابھن زدہ انداز میں بولا۔
 ”حضرت! آپ نے یہ تو سن رکھا ہوگا۔۔۔۔۔ دعویٰ جھوٹا، قبضہ سچا!“ میں نے سوالیہ نظر سے ویل مخالف کی جانب دیکھا۔
 ”جی سن رکھا ہے۔“ وہ گہری سنجیدگی سے بولا۔ ”تو اب آپ یہ فرما رہے ہیں کہ آپ نے جھوٹا دعویٰ کیا تھا؟“
 ”نہیں!“ میں نے قطعی انداز اختیار کرتے ہوئے کہا۔ ”میں تو یہ عرض کر رہا ہوں کہ اس وقت عدالت میں میرا دعویٰ اور آپ کے موکل کا قبضہ یعنی دونوں چیزیں موجود ہیں۔ میں اپنے دعوے کو آپ کے موکل کے قبضے کی مدد سے اس طرح ثابت کر دکھاؤں گا کہ میرا دعویٰ سچا اور آپ کے موکل کا قبضہ جھوٹا ہو جائے گا۔۔۔۔۔!“
 ویل استغاثہ نے بے بسی سے سر جھٹکا اور جج کی جانب دیکھتے ہوئے بولا۔ ”جناب عالی! میرے فاضل دوست اپنی مجھے دار باتوں سے عدالت کا قیمتی وقت برباد کر رہے ہیں۔ انہیں ایسی حرکتوں سے باز رہنے کی تاکید جائے۔“
 جج نے مجھ سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا۔ ”بگ صاحب! عدالت یہ جاننا چاہتی ہے کہ آپ نے جو معاہدہ پیش کیا ہے اس کا حل کیا ہے؟“
 ”یور آئز!“ میں نے روئے سخن جج کی سمت پھیرتے ہوئے نہایت ہی ذمہ داری کے ساتھ کہا تھا شروع کیا۔
 ”میرا شیر افضل معزز عدالت کے روبرو اس بات کا اقرار کر چکا ہے کہ آسٹریلیا کے مختلف اداروں سے خط کتابت کے سلسلے میں اس نے اپنے دوست شاکر سے مدد لی تھی کیونکہ ملزم خود نہ تو انگریزی کی ڈرافٹنگ کر سکتا ہے اور نہ ہی کسی ایسی ہی اس طرح کے کسی ادارے کی طرف سے بھیجے جانے والے کسی ڈاکوینٹ کو پوری طرح سمجھ سکتا ہے۔۔۔۔۔“ میں نے لمبائی توقف کر کے ایک گہری سانس لی پھر سلسلہ کلام کو جاری رکھتے ہوئے کہا۔

”جناب عالی! آسٹریلیا کی آفیشل لیٹکونٹ انگلش ہی ہے تاہم آسٹریلین انگلش، امریکن انگلش اور برطانوی انگلش سے قدرے مختلف ہے اور ہمارے ہاں پاکستان میں جو انگلش ڈرافٹنگ کی جاتی ہے اسے آپ امریکن اور برطانوی انگلش کا ملغوبہ کہہ سکتے ہیں اور ہماری مقامی انگلش، آسٹریلین انگلش کے مقابلے میں سب و لچے، گرامر اور الفاظ کے چناؤ، ان کی نشست و برخاست کے اعتبار سے کافی مختلف ہے۔ مطلب، اگر ایک ہی مضمون کو مقامی اور آسٹریلین انگلش میں ڈرافٹ کیا جائے تو اس میں انہیں میں نہیں بلکہ پندرہ میں کا فرق واضح طور پر دیکھا جاسکتا ہے۔ میرے کہنے کا مقصد یہ ہے کہ۔۔۔۔۔“
 میں نے ایک بار پھر مختصر سا توقف کر کے فاتحانہ انداز میں ویل صفائی کی جانب دیکھا پھر دوبارہ کرسی انصاف پر راجحان شخص سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا۔
 ”جناب عالی! میں معزز عدالت کے علم میں ٹھوس ثبوت کے ساتھ یہ حقیقت لانا چاہتا ہوں کہ ملزم شیر افضل ایک فراڈ اور جعل ساز شخص ہے اور دھوکا۔۔۔۔۔ دہی کے اس کاروبار میں شاکر بھی پوری طرح اس کے ساتھ شامل ہے۔“ پھر میں نے اپنی فائلوں میں سے وہ تمام کاغذات جو مختلف مواقع پر ویزا ایجنٹ شیر افضل نے میرے موکل کو بے وقوف بنانے کے لیے فراہم کیے تھے۔ وہ نکال کر جج کے سامنے رکھ دیے اور نہایت ہی پر اعتماد انداز میں کہا۔
 ”یہ ہر میری بات کا ٹھوس ثبوت۔ ان کاغذات میں پاکستان سے آسٹریلیا جانے والے اور آسٹریلیا سے پاکستان آنے والے تمام لیٹرز شامل ہیں۔ یہ ہر اسلئے نگاری آسٹریلیا کے مختلف ذمہ دار اداروں اور ملزم کے بیچ ہوئی تھی یہ الفاظ دیگر آسٹریلیا اور شاکر کے درمیان کیونکہ ملزم تو اس معیار کی انگلش لکھتا، پڑھتا اور سمجھتا جانتا ہی نہیں۔ یہ کارنامہ سراسر شاکر کے کھاتے میں لکھا جائے گا۔ ان ڈاکوینٹس کو دیکھ کر عدالت فوراً سے پیشتر اس نتیجے پر پہنچ جائے گی کہ پاکستان سے آسٹریلیا جانے والی کوئی ویزا ایجنٹ نہ ہو یا آسٹریلیا سے پاکستان آنے والا کوئی سرکاری آفیشل لیٹر۔۔۔۔۔“
 سب کچھ ایک ہی فرسے میں تیار کیا گیا ہے، یہ سب ایک ہی ٹیٹی، ایک ہی کاتب کی تحریر ہے۔ کہنے کا مقصد یہ ہے کہ ہر آسٹریلین لیٹر مقامی انگلش میں یعنی ایک دم پاکستانی انداز میں تحریر کیا گیا ہے اس بنا پر تھوڑی دیر پہلے میں نے عرض کیا تھا کہ ملزم کے دوست شاکر کی قابلیت کا شہرہ چارواگ پھیلا ہوا ہے، آسٹریلیا کے مختلف سرکاری ادارے انہی حضرت

سے اپنی تمام اہم ڈرافٹنگ کرواتے ہیں۔“
 میرے بات کرنے کے دوران میں جج نے ان تمام کاغذات کا جائزہ لیا تھا جو میں نے اپنی فائل میں سے نکال کر اس کی میز پر رکھے تھے۔ جج نے نگاہ اٹھا کر میری طرف دیکھا اور پھر سے ہوئے لہجے میں بولا۔
 ”بگ صاحب! آپ کا تجزیہ بالکل درست ہے۔ ان تمام لیٹرز کا ڈکٹیشن ایک جیسا ہے۔ لگتا ہے، ان سب کو ایک ہی سانسے میں تیار کیا گیا ہے۔“
 ”اور وہ سنا چاہے۔۔۔۔۔ شاکر!“ میں نے مضبوط لہجے میں کہا۔ ”جو اپنے کمال فن سے کراچی میں بیٹھ کر آسٹریلیا کے مختلف سرکاری اداروں کا ہاتھ بٹا رہا ہے۔ یہ ”عبرت“ ملزم شیر افضل کا دوست اور برٹس پارٹنر ہے۔ معزز عدالت سے میری استدعا ہے کہ اس سندھ جیٹی پر شاکر کو عدالت میں حاضر کرنے کا بندوبست کرایا جائے۔ میں اس ”نادر روزگار“ شخص کا دیدار کرنا چاہتا ہوں۔“
 اس کے ساتھ ہی عدالت کا وقت ختم ہو گیا۔
 جج نے ویل صفائی کو ہدایت کی کہ اگلی جیٹی پر وہ ملزم کے دوست شاکر کو عدالت میں پیش کرے۔ اس کے ساتھ ہی جج نے متعلقہ عدالتی عملے کے ذمے یہ کام لگایا کہ وہ کسی ماہر لسانیات کی مدد سے ان کاغذات کی جانچ پڑتال کرا لیں تاکہ اس بات کا حتمی ثبوت ہاتھ لگ جائے کہ ملزم نے اپنے دوست شاکر کے توسط سے جعلی دستاویزات تیار کروا کر میرے موکل نوید باری کو بے وقوف بنایا تھا اور اس کی سادگی و مصیبت سے فائدہ اٹھاتے ہوئے دولاکھ روپے ہتھیالے تھے۔ جج میرے اٹھائے ہوئے نکتے کو اچھی طرح سمجھ گیا تھا۔
 ہم عدالت سے باہر آئے تو نوید باری نے مجھ سے کہا۔ ”ویل صاحب! آپ نے تو کمال کر دیا۔“
 ”یہ تو ابتداء ہے نوید صاحب۔“ میں نے اس کے ساتھ براہ دم سے گزرتے ہوئے کہا۔ ”آگے آگے دیکھیے ہوتا ہے کیا!“
 ”شیر افضل تو آپ کے سامنے بیگنی بلی بنا کھڑا تھا۔“ وہ پر مسرت آواز میں بولا۔ ”اس سے تو بولہ بھی ٹھوس جارہا تھا۔ ویل صفائی بار بار اسے سہارا دے رہا تھا۔“
 ”انسان ویل اسی لیے تو کرتا ہے کہ وہ اسے سنبھالا دے۔“ میں نے معنی خیز انداز میں کہا۔ ”کیا میں نے آپ کو سہارا نہیں دے رکھا؟“
 ”بے شک دے رکھا ہے۔“ وہ بڑے توانا لہجے میں

بولاً۔ ”مجھے یقین ہو چلا ہے کہ آپ مجھے میرا حق دلا کر ہی رہیں گے۔“

”حق حاصل کرنے کے لیے آواز بلند کرنا پڑتی ہے نوید صاحب!“ میں نے پارکنگ لٹ کارچ کرتے ہوئے کہا۔ ”جو“ آواز حق“ کہلائی ہے۔ آپ نے میرے توسط سے اس عدالت کے پبلٹ فارم پر یہ آواز بلند کر دی ہے۔ آگے اللہ سب ٹھیک کر دے گا اور جہاں تک شیر افضل کے بیگی ملی بننے کا معاملہ ہے تو.....“ لحاقی توقف کر کے میں نے ایک آسودہ سانس خارج کی پھر اپنی بات کو مکمل کرتے ہوئے کہا۔

”ابھی تو آپ متاثر دیکھتے جا میں۔ بہت جلد وہ آپ کو ایک مرل چوہے کے روپ میں نظر آئے گا۔ شیر افضل جیسے فرائڈ لوگ صرف انہی افراد کو دبا سکتے ہیں جو ان کے غم سے واقف نہیں ہوتے۔ آپ جیسے معصوم اور سادہ لوح بیرون ملک جا کر زیادہ سے زیادہ کمانے کے لالچ میں اپنی زندگی بھر کی جمع پونجی ایسے لوگوں کے حوالے کر دی جاتی ہے۔“ مجھے اپنی حماقت پر سخت افسوس اور ندامت ہے وکیل صاحب۔“ وہ پشیمانی بھرے انداز میں بولا۔ ”آپ نے تو میری انجمنیں کھول دی ہیں۔“

”صرف افسوس، ندامت اور شرمندگی سے کچھ نہیں ہوتا نوید صاحب۔“ میں نے صاف گوئی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔ ”انسان کو اپنی غلطیوں سے سبق سیکھنا چاہیے۔ یہ اچھی بات ہے کہ ایک ہی تجربے نے آپ کی آنکھیں کھول دی ہیں۔“

”آپ نے شاکر کو بہت زیادہ اچھالا ہے۔“ وہ تشویش بھرے لہجے میں بولا۔

”ابھی تو میں نے شخص شاکر کا تعارف پیش کیا ہے نوید صاحب!“ میں نے پارکنگ لٹ کے نزدیک رکتے ہوئے کہا۔ ”آپ دیکھیے گا، اعلیٰ تہذیب پر مشتمل علماء اسے وٹس باکس میں کس طرح اچھا لیں ہوں۔ شاکر کو بھی اور شیر افضل کے وکیل کو بھی۔ میرے پاس شاکر اور شیر افضل کو دیر کرنے کا اتنا زیادہ سامان موجود ہے کہ مخالف پارٹی کے کسی بھی فرد کی سوچ وہاں تک نہیں پہنچ سکتی لیکن..... میں نے اس کے چہرے کی جانب انہی سے اشارہ کرتے ہوئے پوچھا۔

”آپ کا منہ کیوں لٹکا ہوا ہے۔ کوئی پریشانی ہے کیا؟“ میں شاکر کی وجہ سے ٹھوڑا الجھا ہوا ہوں۔“ وہ متذبذب انداز میں بولا۔

میں نے گہری سنجیدگی سے پوچھا۔ ”آپ کی انجمنیں

کی نوعیت کیا ہے؟“

”میری پریشانی کا سبب یہ ہے وکیل صاحب کہ شاکر سے آج تک میرے اچھے مراسم رہے ہیں۔“ وہ خائے لگے مہند انداز میں بولا۔ ”وہ کیا سوچے گا کہ میں اس کے خلاف کھڑا ہو گیا ہوں۔“

”تو جبراً ایک کام کرتے ہیں.....“ میں نے غصہ سے ہونے لہجے میں کہا اور خاموش نظر سے نوید باری کو نکتے لگا۔ وہ سر سرائی ہوئی آواز میں بولا۔ ”کون سا وکیل صاحب؟“ ”ہم اس کیس کو واپس لے لیتے ہیں۔“ میں نے اس کا رد عمل جاننے کے لیے کہا۔ ”آپ اپنے دولاکھ کو بھول جائیں۔ اس طرح آپ کے اور شاکر کے تعلقات کا بھرم قائم و دائم رہے گا۔ اللہ اللہ، خیر سلا.....!“

”میں اپنے پیسوں کو کیسے بھول سکتا ہوں۔ یہ تو میری زندگی بھر کی جمع پونجی ہے؟“ وہ بد کے ہوئے انداز میں بولا۔ ”تعلقات کی سلامتی کے لیے ایسی قربانیاں تو دینا پڑتی ہیں!“ میں نے سنجیدہ چیمبر چھاڑ کر عمل جاری رکھتے ہوئے کہا۔

”میرے مراسم شاکر سے ہیں، شیر افضل سے نہیں وکیل صاحب۔“ وہ گہری سنجیدگی سے بولا۔ ”اور میں نے دو لاکھ روپے شیر افضل کو دیے ہیں۔ میں اپنے پیسے نہیں چھوڑ سکتا۔ شیر افضل نے مجھے دھوکا دیا ہے۔“

”یہ آپ کی غلط فہمی ہے کہ آپ شاکر اور شیر افضل کو الگ الگ سمجھ رہے ہیں۔“ میں نے اس کے کانوں کے کیڑے جھاڑتے ہوئے کہا۔ ”یہ دونوں ایک ہی شخص کے بیٹے ہیں اور لوگوں کو بیرون ملک بھجوانے والے فرائڈ بزنس میں یہ ایک دوسرے کے پارٹنر ہیں۔ شاکر اور شیر افضل کا فرائڈ ہو گا تو آپ کی ڈوبی ہوئی رقم باز یاب ہو سکے گی۔ آپ شاکر سے اپنے مراسم کو بچانے کے لیے سلطان شاہ کا شکر یہ ادا کریں جس کے تعاون سے میں اس کیس کو سیدھا کرنے میں کامیاب ہوا ہوں اور.....“ میں چند سیکنڈ کے لیے جھما پھر اپنی بات کو پورا کرتے ہوئے مزید کہا۔

”..... اور آپ کو اپنی دانف کا بھی بے حد شکر گزار ہونا چاہیے جس نے شیر افضل کے خلاف آواز حق بلند کرنے کی شروعات کی۔ اگر اس روز صائمہ، سلطان شاہ کے ساتھ میرے دفتر نہ آتی اور مجھے صورت حال سے آگاہ کرنے کے بعد مجھ سے قانونی جارہ جوتی کی درخواست نہ کرتی تو آپ ابھی تک شیر افضل کے پکڑی میں جھپٹے ہوئے اور میں ممکن تھا، آپ اپنی دکان کا سامان مال فروخت کر کے تیسرا

آواز حق

میری افضل کے ہاتھ پر رکھ چکے ہوتے.....!“

”ٹھیک ہے وکیل صاحب!“ وہ ہتھیار چھینک کر لڑا ہوتے ہوئے بولا۔ ”اب میں کچھ نہیں بولوں گا۔ جو بچی کرنا چاہیں، میں آپ کے ساتھ ہوں۔“

”اسی میں آپ کی بھلائی اور آپ کی ڈوبی ہوئی دو لاکھ کی بازیابی کا امکان ہے۔“ میں نے کہا۔ ”روشن ان.....“

میری بات اس کی سمجھ میں آگئی۔ وہ میرا شکر یہ ادا کر کے رخصت ہو گیا۔ میں اپنی کار کی جانب بڑھ گیا۔

☆ ☆ ☆

میں اگلی تہذیب پر توقع تو یہی کر رہا تھا کہ شاکر حاضر نہیں کیونکہ میں نے گزشتہ تہذیب پر اپنے سوالات سے شیر افضل کو اس بری طرح اپنے جال میں پھنسا لیا تھا کہ اگر شاکر اسی کے لیے عدالت کے کمرے میں قدم رکھتا تو پھر اس بھت کا کوئی امکان نہیں تھا لیکن میرے اندازے کے برعکس وہ عدالت پہنچ گیا تھا۔ میں نے حیرت بھری نظر سے اس کی طرف دیکھا تاہم میری ٹوٹی ہوئی نگاہ نے اس کے لمبے پر کسی ایسے تاثر کو جاگ نہیں کیا جس سے پتا چلتا کہ وہ

بلان یا احساس باختہ ہے۔

شاکر کی عمر کچھ تیس سال ہوگی۔ وہ پتہ قیامت کو پلے پلے جسم کا بالک ایک مشکل پہلی کا شخص تھا۔ شاکر غامضی محنت مند موٹھیں رکھ چھوڑی تھیں بلکہ ان موٹھوں کے لیے ”پال رکھی تھیں“ کے الفاظ زیادہ موزوں اور مناسب تھے۔ ایک بات بلا مبالغہ کیوں کہ یہ کنگ سائز میں شاکر کے چہرے پر بھلی لگی تھیں۔

عدالت کی کارروائی کا آغاز ہوا تو میں جرح کے لیے باکس کے نزدیک چلا گیا پھر شاکر کے چہرے پر نگاہ ڈالی۔ شاکر کے ہونے لہجے میں کہا۔ ”آپ نے سچ بولنے کا حلف اٹھانے کے بعد اپنا بیان ریکارڈ کر لیا ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ آپ اخلاقی اور قانونی طور پر میرے سوال کا مکمل درست جواب دینے کے پابند ہیں۔ آپ میری

”اچھی طرح سمجھ رہا ہوں وکیل صاحب۔“ وہ بڑے

”سے بولا۔“ اور مجھے اپنی اخلاقی و قانونی حیثیت کا بھی

لی اندازہ ہے۔ آپ مجھ سے جو بھی پوچھیں گے میں اس

س کھرا اور سچا جواب دوں گا لیکن میری آپ سے ایک

مست ہے۔“

”کیسی درخواست؟“ میں نے سوالیہ نظر سے اس کی

طرف دیکھا۔

”میں بینک سے فرسٹ ہاف کی چھٹی لے کر آیا ہوں اور یہاں سے فارغ ہونے کے بعد مجھے سیدھا اپنی ڈیوٹی پر جانا ہے۔“ وہ منت بھرے لہجے میں بولا۔ ”سٹی کورٹ اور لائنڈی کے بیچ جتنی مسافت ہے اس کا آپ کو اچھی طرح علم ہے لہذا آپ کو مجھ سے جو کچھ پوچھنا ہے، جلدی پوچھ کر مجھے فارغ کر دیں تو آپ کی مہربانی ہوگی۔“

”ٹھیک ہے، عدالت آپ پر یہ مہربانی ضرور کرے گی۔“ میں نے فراخ دلی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا پھر میں براہ راست سوالات پر آ گیا اور پوچھا۔ ”شاکر صاحب! میری معلومات کے مطابق آپ کی رہائش اختر کالونی میں ہے اور اس کیس میں متاثرہ شخص یعنی میرے موکل نوید باری سے آپ کے درمیان مراسم ہیں اور آپ ہی نے نوید کو طرم شیر افضل سے ملوایا تھا؟“

”آپ کی ساری باتیں درست ہیں۔“ وہ ٹھوس لہجے میں بولا۔

”آپ طرم کو کب سے جانتے ہیں؟“ میں نے سوال کیا۔

اس نے جواب دیا۔ ”کم و بیش تین سال سے۔“

”تین سال.....!“ میں نے خود کلامی کے انداز میں کہا پھر صفائی کے گواہ سے پوچھا۔ ”یعنی جب آپ نے

طرم کو نوید باری سے ملوایا اس سے ایک سال پہلے آپ کی طرم سے شائستگی ہوئی تھی؟“

”جی ہاں!“ اس نے اثبات میں گردن ہلائی۔

”اس شائستگی کا سبب کیا تھا؟“ میں نے پوچھا۔

”جیسا کہ آپ کو پتا ہے، میں ایک بینک میں کام کرتا ہوں۔“ وہ وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ”شیر افضل

ہمارے بینک میں اکاؤنٹ کھلوانے آیا تھا۔“

”کیا آپ کا بینک فرائڈ ویزا انجمن کا ایسے ہی بغیر کسی ویری فیکیشن کے اکاؤنٹ کھول دیتا ہے؟“ میں نے

چپتے ہوئے لہجے میں استفسار کیا۔

”ایسی کوئی بات نہیں ہے وکیل صاحب.....“

”پھر کیسی بات ہے؟“ میں نے جارحانہ انداز میں

سوال کیا۔

”شیر افضل نے ہمیں بتایا تھا کہ وہ اسٹیٹ کی

خرید و فروخت کا کام کرتا ہے یعنی وہ ایک پراپرٹی ایجنٹ

ہے اور اس سلسلے میں اس نے بینک کو ضروری ثبوت بھی مہیا

کئے تھے۔“ وہ وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ”یہ تو مجھے بہت

بعد میں پتا چلا کہ شیر افضل ویزا وغیرہ کا کام بھی کرتا ہے۔

سچی بات

مارچ 2018ء

شمارے کی درجہ چھک

فقس شکن

سازش اور سود خوری کے دائرے سے نکل کے عالمی پس منظر میں بپا ہونے والے فتنوں کی ہوش کر بادستان..... **زویا اعجاز** کے قلم سے

انگاہے

دشمنوں کے ٹکڑے میں آہنی اعصاب کے مالک چیمپئن کا امتحان، محبت اور جنگ کی نصیب میں آگے بڑھتی **ظاہر جاوید مغل** کے بارگاہِ سلسلے کی ایک اور کڑی

آوارہ گرد

چلچلیاتی دھوپ میں ہر دم ایک نئی مصیبت سے برسرِ پیکار نوجوان کی سرگزشت..... **عبدالرب بھٹی** کی سلسلے دار کہانی

سورق کے انگ

زمین و جانکاد کے اسیر جوسر کے مستحق قرار پائے..... سرورق کے خونی رنگ میں ڈوبی کہانی رشتے ناتے انتہائی نازک ہوتے ہیں.....

نوٹے ہیں تو صرف کرجیاں رہ جاتی ہیں جو صرف زخمی کرتی ہیں..... سرورق کی نزاکت میں لپٹی کہانی

جینی نکتہ جینی

مارچ 2018ء

”یور آنا ہم شاکر کی گواہی کو چھ لحات کے لیے طرف رکھ کر بات کرتے ہیں۔“ میں نے نہایت ہی کمرے ہوئے لہجے میں کہنا شروع کیا۔ ”پچھلے پچی پر معزز لالت نے ملزم کی میرے موکل کو فراہم کی گئی مختلف تاویزات کی فوٹو کاپیوں کو کسی ماہر لسانیات کے پاس لے کر آپ“ کے لیے بھیجا تھا اور اس ٹیسٹ کی رپورٹ میرے موقف کی تصدیق کرتی ہے یعنی ملزم نے جن لفاظیات کو آسٹریلیا کے مختلف ڈیپارٹمنٹس سے آئے ہونے کا ظہر کیا، اس اہم اور چونکا دینے والی رپورٹ کے مطابق، وہ تمام کے تمام ڈیپارٹمنٹس یہاں پاکستان میں اسی شخص نے تیار کیے ہیں جو پاکستان میں بیٹھ کر آسٹریلیا کے تمام ڈیپارٹمنٹس سے خط کتابت کا ڈراما اسی طرح کر رہا تھا۔ اس نوعیت کی انگلش ڈرافٹنگ ملزم کے بس کا کام نہیں۔ ملزم اس مقصد کے لیے شاکر کی مدد لی یا کسی ایسے، وائی، ڈی کی..... اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ پتے کی بات یہ کہ ملزم نے جعل سازی کی ہے۔ جو کہ ایک سنگین نوعیت کا جرم ہے۔“ میں نے لگائی تو قف کے کر کے ایک گہری سانس بھر لی پھر اپنی بات کو مکمل کرتے ہوئے کہا۔

”اس امر میں کسی شک و شبہ کی گنجائش باقی نہیں رہی کہ ملزم نے فلاں امن فلاں کے توسط سے جعلی تاویزات تیار کر کے میرے سادہ دل اور معصوم موکل بھرون ملک بھیجنے کا جھانسا دے کر دو لاکھ روپے لے لیے ہیں۔ اس تنازع کو عدالت تک لانے کا مقصد بھی یہ ہے کہ میرے موکل کو انصاف فراہم کیا جائے۔ اسی انصاف کے حصول کے لیے میں نے اپنے دفتر میں بھی پیش کی تھی لیکن ملزم نے وہاں شرافت کا مظاہرہ نہیں کیا۔ لہذا یہ حالت مجبوری میرے موکل کو عدالت کے دروازے پر دستک دینا پڑی۔ اگر عدالت مجھے چھوٹ کی حاکمیت دے تو میں اس میں سے ملزم سے چند ایسے ٹیکنیکل لالچ کرنا چاہتا ہوں جس سے دودھ کا دودھ اور پانی کا لالچ ہو جائے گا۔ میرے یہ سوالات ملزم کی دھوکا دہی ثابت میں آخری ٹیل بھی ثابت ہوں گے۔“

”پریٹن گر انڈیا“ جج نے غصے سے لہجے میں کہا۔ میں اکیڈمی باکس کی جانب بڑھ گیا اور ملزم کے لیے کے تاثرات کا جائزہ لیتے ہوئے استفسار کیا۔ ”کیا ہرگز کرتے ہو کہ تم نے جعلی دستاویزات کی جھلکیاں دکھلا کر ملزم سے دھوکا دے رہے ہو؟“

”آج کل یور آنا۔“ وکیل صفائی نے آنا پر ہی

کہا۔ ”لیکن ابھی جو آپ نے بھری عدالت میں ملزم سے اعلانِ لالچ کیا ہے اگر بعد میں آپ کا یہ بیان غلط ثابت ہو تو آپ مصیبت میں پھنس جائیں گے۔“ میں نے معزز عدالت کے سامنے کسی قسم کی غلامی سے کام نہیں لیا۔ وہ بڑے اعتماد کے ساتھ بولا۔ ”اس لیے مجھے اپنے رب پر پورا بھروسہ ہے کہ مجھ پر کوئی آفت یا مصیبت نہیں آئے گی..... ان شاء اللہ!“ میں نے شاکر کو فارغ کر دیا۔ جب شاکر عدالت کے کمرے سے نکل گیا تو میں اکیڈمی باکس کے نزدیک آ گیا، پھر شیر افضل کو گھورتے ہوئے سوال کیا۔

”تمہارا بزنس پارنٹر تو تمہیں ہری جھنڈی دکھا گیا ہے۔ اب تم کیا کرو گے؟“

”آپ نے اس سے جس قسم کے سوالات کیے ہیں اس پر گواہ کا بدکہنا لازمی تھا۔“ شیر افضل نے فلسفیانہ انداز میں کہا۔ ”آپ نے میری ذات کے حوالے سے بہت زیادہ غلط بیانی سے کام لیا ہے۔“ بات کے اختتام پر وہ ناگواری سے مجھے دیکھنے لگا۔

”میں نے کیا غلط بیانی کی ہے؟“ میں نے الجھن زدہ نظر سے اس کی طرف دیکھا۔

”میں بتاتا ہوں۔“ وکیل صفائی نے اپنی موجودگی کا احساس دلاتے ہوئے کہا پھر جج کی جانب دیکھتے ہوئے ان الفاظ میں اضافہ کیا۔

”جناب عالی میرے موکل نے یہ ضرور تسلیم کیا ہے کہ شاکر نا ہی اس شخص سے اس کی دہائی ہے لیکن اس نے کسی بھی مرحلے پر یہ نہیں کہا کہ شاکر اس کا بزنس پارنٹر ہے یا یہ کہ وہ میرے موکل کے لیے مرے گھیرتا ہے یا میرا موکل شاکر کو کسی قسم کا کیشن دیتا ہے۔ میرے موکل نے یہ اقرار کیا ہے کہ انگلش میں عدم بھارت کے باعث وہ شاکر سے مدد لے لیا کرتا تھا تاہم اس نے ایسی کوئی بات نہیں کی کہ وہ شاکر کے تعاون سے جعلی دستاویزات تیار کرتا تھا۔ یہ تمام تر باتیں جو میرے فاضل دوست نے صفائی کے گواہ شاکر کو بتائی ہیں یا وکیل موصوف نے گواہ سے جس قسم کے سوالات کیے ہیں، وہ سب وکیل استغاثہ کے اپنے ذہن کی پیدوار ہے اور ان فضول باتوں کا حقیقت سے کوئی تعلق واسطہ نہیں۔“

وکیل صفائی اپنے موکل کے موقف کی وضاحت کر چکا تو جج نے میری طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ”بیگ صاحب! پورٹرن۔“

جیک کو چونکہ اس سے کوئی شکایت نہیں تھی اس لیے میں نے اس کے سائڈ بزنس پر کوئی توجہ نہیں دی۔

”اور جیسے ہی آپ کو پتا چلا کہ ملزم ویزا دلوانے کا منافع بخش سائڈ بزنس کرتا ہے تو آپ فوراً اس کے پارنٹرن بن گئے تاکہ خوب دولت کمائیں۔“ میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے پوچھا۔ ”یہی بات ہے نا؟“

”بالکل نہیں۔“ وہ پوری قطعیت سے گروں جھکتے ہوئے بولا۔ ”میں بھی کبھی شیر افضل کا پارنٹر نہیں رہا اور نہ ہی آئندہ میرا ایسا کوئی ارادہ ہے۔“

شاکر کے جواب نے مجھے سمیت حاضرین عدالت کو حیرت زدہ کر دیا تھا۔ جج بھی آنکھیں سکڑ کر صفائی کے گواہ کی طرف دیکھ رہا تھا۔ سب سے بری حالت وکیل صفائی اور ملزم شیر افضل کی تھی۔ ان کا تو یہ معاملہ تھا کہ کاٹو تو بدن میں خون نہیں شاکر ڈیپارٹمنٹس کا وٹس تھا لیکن اس کے جواب کی پان نے ڈیپارٹمنٹس ہی کے غبارے کی ساری ہوا نکال دی تھی۔ اس کا بیان ہمارے حق میں جاتا تھا یا نہیں البتہ ملزم کے خلاف ضرور جاتا تھا۔

”لیکن پچھلے پچی پر ملزم عدالت کے روبرو اس بات کا اقرار کر چکا ہے کہ آپ اس ’ویزا بزنس‘ میں اس کے پارنٹر ہیں۔ وہ تمام تر جعلی کاغذات آپ ہی کی مدد سے تیار کروا رہے۔“ میں نے شاکر کے چہرے کے تاثرات کا جائزہ لیتے ہوئے کہا پھر اسے ساری تفصیل سے آگاہ کر دیا۔

وہ حیرت اور الجھن کے طے جلتے تاثرات کے ساتھ میری طرف دیکھتا رہا۔ وہ جج میں کچھ نہیں بولا۔ پوری بات سننے کے بعد اس نے دو ٹوک انداز میں کہا۔ ”اگر شیر افضل نے ایسا کچھ کہا ہے تو سر اسر جھوٹ بولا ہے۔ میں اس کے کسی قول و فعل کا ذمہ دار نہیں ہوں۔ مجھے مر کر اپنی قبر میں جانا ہے۔ ہاں، میں تسلیم کرتا ہوں کہ میں نے ہی نوید باری کو شیر افضل سے ملوایا تھا۔ نوید کو ملک سے باہر جانے کا جنون پڑھا ہوا تھا اور میرے علم میں یہ بات تھی کہ شیر افضل اس قسم کے کام کرتا ہے۔ اگر شیر افضل نے نوید باری کے دولاکھ روپے ہتھیالے ہیں اور اس کا کام نہیں کیا تو اس میں میرا کوئی قصور نہیں۔ میں نے نوید پر رواج کر دیا تھا کہ میں نہیں ایک ایجنٹ سے ملو تو رہا ہوں لیکن پیسے کا لیکن دین تم اپنی ذمہ داری پر کرنا۔ نوید اس وقت عدالت کے کمرے میں موجود ہے۔ آپ اس سے میری بات کی تصدیق کر سکتے ہیں!“

”جیسی تصدیق کی ضرورت نہیں۔ عدالت کو ان معاملات کی خبر ہے۔“ میں نے رساں بھرے انداز میں

اعتراض جڑ دیا۔ ”میرے فاضل دوست“ جعلی دستاویزات“ اور ”تھیلے“ کے الفاظ استعمال کر کے میرے موکل کی اسلٹ کر رہے ہیں جبکہ میرے موکل نے واضح الفاظ میں عدالت کو یہ باور کر رکھا ہے کہ اس نے یہ دولا لکھ روپے نوید باری کو آسٹریلیا بھجوانے کی مد میں لیے تھے لیکن نوید کی بد قسمتی کہ کام ہو نہیں سکا۔“

”میں نے آپ کی بات محل سے سن لی میرے فاضل دوست۔“ میں نے وکیل صفائی کی جانب انگلی اٹھاتے ہوئے کہا۔ ”اب اگر آپ کی اجازت ہو تو میں آپ کے موکل سے وہ شخصیکل سوالات کر لوں جس کی اجازت معزز عدالت آپ کے سامنے مجھے دے چکی ہے؟“

میرا انداز ایسا سنگا دینے والا تھا کہ وکیل صفائی بیچ و تاب کھا کر رہ گیا۔ بڑی بددلی سے اس نے کہا۔ ”جی ضرور۔“

میں نے اس کے زخموں پر نمک پاشی کرتے ہوئے کہا۔ ”یہ میرا آپ سے وعدہ ہے کہ یہ نوٹ آپ کے میں نے آپ کے موکل کی جو اسلٹ کی ہے، اپنی بات کے اختتام پر میں آپ کے موکل کی عزت افزائی کر کے یہ قرض مع سود اتار دوں گا۔“

وہ معاندانہ نظر سے مجھے گھور کر رہ گیا۔ ”تم نے میرے موکل سے جس کام کے لیے دولا لکھ روپے بطور سے تحفے وہ باوجود جہاڑی لاکھ کوشش کے بھی ہو نہیں سکا۔“ میں نے اکیڈم ڈاکس میں کھڑے ملزم شیر افضل کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ ”کیا اخلاقیات اس امر کا تقاضا نہیں کریں کہ اپنی ناکامی... کا اعتراف کرتے ہوئے بے حد معذرت کے ساتھ تم یہ دولا لکھ روپے میرے موکل کو واپس کر دو؟“

”اجی مقصد کے لیے آپ نے اپنے آفس میں ایک میننگ رکھی تھی۔“ وہ اپنی عرق آلود پیشانی کو ہاتھ کی پشت سے صاف کرتے ہوئے بولا۔ ”میں آپ کے موکل کو کچھ رقم دینا چاہتا تھا لیکن آپ جانتے ہیں کہ اس بندے نے میری بات نہیں مانی لہذا ہمارے بیچ تفریق نہیں ہو سکا تھا۔“

”ہاں، میں یہ بات جانتا ہوں اور مجھے وہ سب بھی معلوم ہے جس کی بنا پر تم دونوں کے درمیان سیٹل منٹ نہیں ہو سکا تھا۔“ میں نے تیز نظر سے شیر افضل کو گھورا پھر اضافہ کرتے ہوئے کہا۔ ”تم میرے موکل کو بیس ہزار روپے پر ٹخا کر اس کے ایک لاکھ اسی ہزار روپے ہضم کرنا چاہتے تھے جبکہ میرے موکل کا موقف اور میری تجویز یہ تھی کہ تم بیس ہزار روپے رکھ کر باقی کے ایک لاکھ اسی ہزار روپے

میرے موکل کو واپس کر دو مگر تم اس کے لیے راضی نہیں ہوئے تھے۔“

”میں گھانے کے اس سودے کے لیے کیوں نہ راضی ہو جاتا؟“ وہ برا سامنے بناتے ہوئے بولا۔

”تمہارا اس میں کیا نقصان ہو رہا تھا؟“ میں نے پوچھا۔ ”آپ کو کچھ اندازہ نہیں کہ اس کیس پر میرا کتنا خرچ ہو چکا ہے۔“ اس نے کہا۔ ”ورک ویز اکا پر دوس کوئی بیچوں کاکیل نہیں؟“

”تم ٹھیک کہتے ہو۔ یہ واقعی بیچوں کاکیل نہیں بلکہ یہ تم جیسے گھاگ اور شاطر کاکیل ہی ہے۔“ میں نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ ”اور جہاں تک آسٹریلیا کے ایسپلائی منٹ ویزا کے پروکس کی بات ہے تو میں اچھی طرح جانتا ہوں کہ بچنے دو سال میں اس کام پر تم نے کتنا خرچ کیا ہوگا۔ میں تو بیس ہزار دلوں کو تمہیں مالامال کرنا چاہتا تھا مگر میری بات جہاڑی سمجھ میں نہیں آئی۔“

وہ بڑے جوش سے بولا۔ ”اگر آپ اس کام سے اتنی ہی زیادہ واقفیت رکھتے ہیں تو بتائیں، میں نے کتنے پیسے خرچ کیے ہوں گے؟“

اس کا انداز بیچ کرنے والا تھا۔ میں نے اسے ”ویل کم“ کہتے ہوئے سسٹی خیز لہجے میں بتایا۔ ”زیادہ سے زیادہ ایک ہزار روپے بلکہ پاکستان رائج الوقت!“

وہ اس طرح اچھلا جیسے کسی نے اسے گیارہ ہزار دولت کا کرنٹ لگا کر جھٹکا دیا ہو۔ اس کے ساتھ اس نے سرسراہٹ ہوئی آواز میں کہا۔

”آسٹریلیا کے ایسپلائی منٹ ڈیپارٹمنٹ میں صرف رجسٹریشن فیس ہی دو ہزار آسٹریلین ڈالرز ہے جو پاکستان کی کرنسی کے مطابق لگ بھگ اکیس ہزار روپے بنتے ہیں۔ یہ تو صرف ایک معمولی سا خرچہ ہے۔ اس کے علاوہ دس جگہ پر کچھ نہ کچھ دینا پڑتا ہے۔“

”تم ایک زبردست کرلو تو میں آگے بات کرتا ہوں!“ میں نے مختصر انداز میں کہا۔

”کیا مطلب ہے آپ کا؟“ اس کی آنکھوں میں الجھن تیرنے لگی۔ ”آسٹریلین ورک ویزا کے لیے وہاں کے ایسپلائی منٹ ڈیپارٹمنٹ کی رجسٹریشن فیس دو ہزار نہیں بلکہ دس ڈالرز ہے لہذا پاکستانی کرنسی میں یہ رقم اکیس ہزار روپے نہیں، دو ہزار ایک سو روپے بنتی ہے۔“ میں نے کہا۔ ”اب تو ایک زبردست کرلو کہنے کا مطلب تمہاری سمجھ میں آ گیا ہوگا؟“

وہ میرے بیان کردہ کتنے پر توجہ دے بغیر بولا۔ ”اور یہ جو آپ نے میرے تمام تر اخراجات کا مائونٹ منٹ ایک ہزار روپے بتایا ہے، کیا یہ کوئی مذاق ہے؟“

”کیا ہمارے بیچ میں بھی مذاق کا کوئی تعلق یا رشتہ رہا ہے؟“ اس کے سوال کا جواب دینے کے بجائے الٹا میں نے اس سے پوچھا۔

”نہیں!“ بے ساختہ اس نے نفی میں گردن ہلا دی۔ ”بس..... تو سمجھ لیں کہ میں نے آپ سے کوئی مذاق نہیں کیا بلکہ ایک حقیقت بیان کی ہے۔“ میں نے سمجھ انداز میں کہا۔ ”اور اس ایک ہزار کی رقم میں ایسا کوئی بھی خرچ شامل نہیں جس کا بلا واسطہ یا بلا واسطہ میرے موکل کے آسٹریلیا جانے سے کوئی تعلق ہو۔“

وکیل صفائی کافی دیر سے ضبط کے داس کو دبوچے کھڑا تھا۔ میرے تازہ ترین انکشاف پر اس کے مہر کا پیٹنا ٹھنک اٹھا، استغناء یہ مگر خاصی تیز آواز میں اس نے براہ راست مجھ سے استفسار کیا۔

”بھریہ ایک ہزار روپے کس چیز کا شاخسانہ ہے؟“ ”آپ نے بہت ہی موزوں لفظ استعمال کیا ہے میرے فاضل دوست..... شاخسانہ“ میں نے وکیل صفائی کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ ”یہ نہ تو کوئی افسانہ ہے اور نہ ہی آشیانہ بلکہ یہ سراسر شاخسانہ ہے ان اخراجات کا جو پچھلے دو سال میں آپ کے موکل اور اس کیس کے ملزم نے میرے موکل اور اس کیس کے مظلوم پر کیے ہیں اور ان اخراجات کی تفصیل سمجھ اس طرح ہے.....“ میں نے ڈرامائی انداز میں توقف کر کے حاضرین عدالت پر ایک طائرانہ نگاہ ڈالی پھر پھرے ہوئے لہجے میں اپنی بات کی تکمیل کر دی۔

”کسی انکشاف جاننے والے شخص سے ڈراڈنگ کرانے کا معاوضہ، کسی ٹائپسٹ اینڈ فیکٹس اپر پر کاغذات نامہ اور مختلف چائے خانوں میں میرے موکل کی خاطر تواضع پر اٹھنے والی رقم..... آپ کے موکل نے پچھلے دو سال سے اس کے سوا اور کیا ہی کیا ہے میرے فاضل دوست؟“

”تو..... آپ معزز عدالت کو یہ بتانے کی کوشش کر رہے ہیں کہ گزشتہ دو برس میں میرے موکل نے آپ کے موکل کو آسٹریلیا بھجوانے کے سلسلے میں کچھ نہیں کیا؟“ ”بالکل ٹھیک کہا..... آئی ٹی امٹ ا!“ میں نے ایک الٹ لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔

”کیا آپ اپنے اس دعوے کو سچا ثابت کر سکتے ہیں؟“ وکیل صفائی نے طنزیہ لہجے میں استفسار کیا۔

”ہنڈریڈ اینڈ ون پرسنٹ ا!“ میں نے پورے تین سے کہا۔

”کریں ثابت.....“ وہ شدلائے والے انداز میں بولا۔ ”دراپتا تو ملے کہ آپ نے پچھلے دو تین ماہ میں کون سا ٹکنگ ریٹ ناجائز جمع کر لیا ہے.....!“

قبل اس کے کہ میں اپنی جرح کے سلسلے کو مزید آگے بڑھاتا، عدالت کا مقررہ وقت ختم ہو گیا۔

بیچ نے پندرہ روز بعد کی تاریخ دے کر عدالت پر خاست کرنے کا اعلان کر دیا۔ ”وی کورٹ از ایڈ جرنل ا!“ آئندہ بیٹھی سے پہلے میں نے اپنے موکل نوید باری کو دفتر بلایا اور اس کے ذمے ایک اہم کام لگانے کے بعد پوچھا۔

”کیا آپ یہ کام کر سکتے ہیں؟“ ”آپ بے فکر ہو جائیں وکیل صاحب۔“ وہ بڑے اعتماد کے ساتھ بولا۔ ”میں اس سلسلے میں آپ کو مایوس نہیں کروں گا۔“

”آپ نے اگلی بیٹھی کی تاریخ نوٹ کر لی ہے نا؟“ میں نے سوالیہ نظر سے اس کی طرف دیکھا۔

”جی بالکل نوٹ کر لی ہے۔“ وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ”اور ڈیٹنیشن بھی کر لی ہے۔“

”میں نے جو کام آپ کے سپرد کیا ہے اسے آئندہ بیٹھی سے ایک دو روز پہلے کرنا ہے۔“ میں نے کہا۔ ”یہ بہت ضروری ہے۔“

”ہو جائے گا۔“ وہ مضبوط لہجے میں بولا۔

میں نے چند ہدایات دینے کے بعد نوید باری کو رخصت کر دیا۔

☆☆☆

منظر اسی عدالت کا تھا اور اکیڈم ڈاکس میں ویزا ایجنٹ شیر افضل کھڑا تھا۔ دوسرے اہم افراد بھی کمرائے عدالت میں موجود تھے۔ پچھلی بیٹھی پر میری بات مکمل نہیں ہو سکی تھی، عدالت کی کارروائی کا آغاز ہوا تو میں نے روئے سخن بیچ کی جانب کرتے ہوئے کہا۔

”جناب عالی! گزشتہ بیٹھی پر وقت کی کمی کے باعث میری بات ادھوری رہ گئی تھی۔ میں جرح کے سلسلے کو وہیں سے شروع کروں گا جہاں سے رابطہ منقطع ہوا تھا۔ میرے فاضل دوست نے باوجود میرے کدھوں پر لا در رکھا ہے۔ میں آج کی کارروائی میں یہ یوہجہ ملزم کی مدد سے اپنے کدھوں سے اتار بیچینگوں گا اس طرح میرے فاضل دوست کا مطالبہ بھی پورا ہو جائے گا اور میرے موکل کے

لیے انصاف کا حصول بھی آخری اور ترقی مرحلے میں داخل ہو جائے گا۔" لچائی توقف کر کے میں نے وکیل صفائی کی جانب دیکھا اور شرارت بھرے لہجے میں پوچھا۔
 "میرے فاضل دوست! آپ کو کوئی اعتراض تو نہیں؟"
 وکیل صفائی نے نفی میں گردن ہلانے پر اکتفا کیا۔
 میں ملزم شیر افضل کی جانب متوجہ ہو گیا اور اس سے پوچھا۔ "کیا تم اس بات سے انکار کرتے ہو کہ تم نے میرے موکل سے دولا کھروپے لے رکھے ہیں؟"
 "نہیں، میں انکار نہیں کر سکتا۔" وہ گہری سنجیدگی سے بولا۔ "اور یہ بات میں نے آپ کے نوٹس کے جواب میں بھی لکھی تھی، مطلب یہ کہ میں نے نوید باری سے دولا کھ روپے لینے کا اقرار کیا تھا۔"
 "مذکورہ جوابی نوٹس میں تو تم نے اپنی ناکامی کا اعتراف کرتے ہوئے یہ بھی کہا تھا کہ..... مقررہ مدت میں، میں اپنا وعدہ پورا نہیں کر سکا..... تو اس صورت میں مجھیں میرے موکل کے دولا کھ روپے واپس نہیں کر دینا چاہئیں؟"
 "آپ جس نوٹس کے جواب کی بات کر رہے ہیں، وہ وہ میں نے نہیں، آپ نے ڈرافٹ کیا تھا۔" وہ قدرے خشکی بھرے انداز میں بولا۔
 "وہ اس لیے کہ تم انکس لکھنا پڑھنا نہیں جانتے۔" میں نے وضاحت کرتے ہوئے کہا۔ "میں نے اس جوابی نوٹس کا مضمون پڑھ کر تمہیں سنایا اور سمجھایا تھا۔ مطمئن ہونے کے بعد ہی تم نے اس پر دستخط کیے تھے۔ مذکورہ لیٹر اس وقت بھی میری ایک فائل میں موجود ہے۔ اگر تم میری بات کو جھٹلاؤ گے تو میں بطور ثبوت اسے عدالت میں پیش کر دوں گا۔"
 "م..... میں آپ کی بات کو جھٹلا نہیں رہا۔" وہ تھوک نکتے ہوئے بولا۔ "میں تو آپ کو یہ بتانے کی کوشش کر رہا ہوں کہ آسٹریلیا والے مشن میں ناکامی کے بعد میں نوید باری کو یورپ کے کسی ملک بھجوانے کی کوشش کر رہا تھا کہ یہ اللہ کا بندہ اس معاملے کو عدالت میں لے آیا ہے۔"
 "وہ اس لیے کہ اس اللہ کے بندے کی آنکھوں پر تم نے اپنی چالاک کی جو پٹی باندھ کر اس سے دولا کھ روپے بٹور لیے تھے، وہ پٹی ایک محل گئی اور میرے موکل کو سب کچھ واضح نظر آنے لگا۔" میں نے زہریلے لہجے میں کہا پھر پوچھا۔ "کیا آسٹریلیا کے محاذ پر تمہیں ہمیشہ منہ کی کھانا پڑتی ہے یا "مشن آسٹریلیا" میں بھی فتح بھی نصیب ہوئی ہے؟"
 "یہ پہلا کیس ہے جس میں گزربڑ ہوئی۔" وہ اپنی

صفائی پیش کرتے ہوئے بولا۔ "ورنہ نوید باری سے پہلے ان کبھی نہیں ہوا۔"
 شیر افضل غیر محسوس انداز میں دھیرے دھیرے، میرے بچھائے ہوئے جال میں پھنستا چلا جا رہا تھا۔ میں نے سنجیدہ لہجہ اختیار کرتے ہوئے اس سے پوچھا۔
 "یعنی تم یہ بتانے کی کوشش کر رہے ہو کہ نوید باری سے پہلے تم کافی لوگوں کو آسٹریلیا کے ویزا دلوا چکے ہو؟"
 "جی بالکل۔" وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ "میرا یہی مطلب تھا۔"
 "میرے موکل سے پہلے تم نے کتنے افراد کو آسٹریلیا بھجوا دیا ہے؟" میں نے جرح کے سلسلے میں تیزی لاتے ہوئے کہا۔
 "بہت سے لوگوں کو....." اس نے گول بول جواب دیا۔
 میں نے جیسے ہوئے لہجے میں استفسار کیا۔ "اسی نوعیت کے جعلی ڈاکومنٹس پر تم نے لوگوں کو آسٹریلیا بھجوانے جو میرے موکل کے کس میں فائلوں کا پیٹ بھر رہے ہیں؟"
 "آپ کی نظر میں یہ ڈاکومنٹس جعلی ہوں گے۔" وہ برا سامنا نہاتے ہوئے بولا۔ "لیکن میں اپنے کام سے مطمئن ہوں۔"
 "تمہارے اطمینان سے بات نہیں بنے گی، یہاں پر معزز عدالت کو مطمئن کرنے کا مسئلہ ہے اور عدالت کے اطمینان کے لیے محسوس ثبوت چاہیے ہوتے ہیں۔" میں نے کڑے تیروں سے شیر افضل کو گھورا۔ "اگر تم نے لا تعداد افراد کو آسٹریلیا بھجایا ہے تو معزز عدالت کو صرف پانچ خوش نصیب افراد کے نام بتاؤ جو تمہارے توسط سے آسٹریلیا چائے ہیں۔ فرضی نام گناتے ہوئے ایک بات ذہن میں رکھنا کہ میں چور کو اس کے گھر تک پہنچا کر آتا ہوں۔ تم جن افراد کے نام دو گے، میں ان کے لواحقین کو گواہی کے لیے عدالت بھی بلواسکتا ہوں!"
 شیر افضل، شیر تھا اور نہ افضل۔ اس کی شخصیت اور لہجے دار باتوں کا سارا جاوہ خارجی حیثیت کا حامل تھا۔ اندر سے چونکہ وہ بالکل خالی تھا پتہ چڑھ میری دھمکی کے دباؤ میں آ گیا اور گھبراہٹ ہوئی آواز میں بولا۔
 "اس وقت مجھے کسی کا نام یاد نہیں آ رہا....."
 "تم جس دھندے سے لگے ہوئے ہو وہ سراسر غیر قانونی ہے۔" میں نے تازہ چھکارا آغاز کرتے ہوئے کہا۔ "اسے ٹیکنیکل زبان میں جیوین ٹریفکنگ HUMAN TRAFFICKING یعنی انسانوں

اسے گناہ کہا جاتا ہے جس کی بڑی کڑی سزا ہے!"
 "میں تمام کام ڈاکومنٹس پر کرتا ہوں۔" وہ خود کو بھالنے کی کوشش کرتے ہوئے بولا۔ "میرا کام غیر قانونی نہیں ہے۔"
 "ٹھیک ہے، اب ہم تمہارے ڈاکومنٹس کی صحت کا صحت مارٹم کرتے ہیں۔" میں نے حد درجہ کڑوے لہجے میں کہا۔ "اس کے ساتھ ہی آسٹریلیا کے قوانین اور وہاں کے درویشوں کی بھی بات ہوگی۔ تم تیار ہو؟"
 آخری جملہ میں نے براہ راست اس کی آنکھوں میں ڈھکیچھتے ہوئے ادا کیا تھا۔ اس کے چہرے پر ایک رنگ سا گر کر گر گیا۔ اس کی آنکھوں میں موجود تاثرات سے جھلکتا تھا کہ وہ کسی بھی وقت اکیزوڈیاکس میں سے نکل کر کمرائے عدالت کے دروازے کی سمت دوڑ لگا دے گا۔ گویا لوہا گرم ہو چکا تھا۔ اب مجھے دو چار کاری چوٹیں لگانا تھیں۔
 "جی..... میں تیار ہوں۔" وہ تھوک نکل کر تحفہ سی آواز میں بولا۔
 "کیا تم جانتے ہو، پاکستان میں بھی اور سیز ایپلائیڈ عدالت ڈیپارٹمنٹ موجود ہے۔" میں نے کہا۔ "جو بیرون ملک جا کر کام کرنے کے خواہش مند پاکستانی افراد کے لیے ان کی تعلیمی اور فنی قابلیت کے مطابق پوری دنیا میں جاب سرچ کرتا ہے اور انہیں ورک ویزا کی سہولیات مہیا کرتا ہے؟"
 "جی..... میں جانتا ہوں۔" وہ جان چھڑانے والے انداز میں بولا۔
 "بھی تمہارا اس ڈیپارٹمنٹ میں جانے کا اتفاق ہوا ہے؟" میں نے پوچھا۔
 "نہیں۔" اس نے نفی میں گردن ہلائی۔ "میں نے کبھی اس کی ضرورت محسوس نہیں کی۔"
 "تم نے ضرورت اس لیے محسوس نہیں کی کیونکہ تم تو ہمارا راست آسٹریلیا ورک ویزا ڈیپارٹمنٹ کے ساتھ ملے ہو؟" میں نے سوالیہ نظر سے اس کی طرف دیکھا۔
 وہ کچھ نہیں بولا۔ میں نے پوچھا۔
 "آئی ایل او کے بارے میں کیا جانتے ہو؟"
 "یہ کیا ہوتا ہے؟" وہ ابھن آ میز حیرت سے مجھے دیکھنے لگا۔
 "آئی ایل او کا مطلب ہے..... انٹرنیشنل لیبر آرگنائزیشن۔" میں نے وضاحت کرتے ہوئے کہا۔ "بھی اس ادارے کا نام سننا ہے؟"
 "نہیں۔" اس نے مختصر جواب دیا۔

"میں نے بتا دیا ہے اور وہ بھی بغیر فیس وصول کیے....." میں نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ "اب اسے یاد رکھنا۔ تمہارے بہت کام آئے گا کیونکہ اس فیس سے منٹے کے بعد تم نے کوئی شرفانہ کام کر کے رزق حلال تو کماتا نہیں ہے۔ آ جا کر تمہارے پاس یہی ایک کام ہے..... مرٹے گھیرنا اور مال بنانا..... اگر دوبارہ کہیں شخص گئے تو میری فراہم کردہ معلومات تمہارے کام آئیں گی۔" لچائی توقف کر کے میں نے ایک گہری سانس لی پھر جرح کے سلسلے کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔
 "آئی ایل او دنیا بھر کے ممالک کے ورک ویزا ڈیپارٹمنٹس کو کنٹرول کرتا ہے۔ اس کے بنائے ہوئے قواعد و ضوابط ہر ملک کے متعلقہ ڈیپارٹمنٹ کو ماننا پڑتے ہیں۔ آئی ایل او نے ایک "لیبر ایگری منٹ" نامی ڈاکومنٹ تیار کر رکھا ہے جو دنیا کے دیگر ممالک کی طرح آسٹریلیا ورک ویزا ایورو کے پاس بھی موجود ہے۔ جب بھی آسٹریلیا ورک ویزا ڈیپارٹمنٹ ملازمت کے خواہش مند کسی شخص کے ساتھ خط کتابت شروع کرتا ہے تو پہلے ہی مرحلے پر فارم کے ساتھ اس لیبر ایگری منٹ کی ایک کاپی بھی متعلقہ شخص کو بھیجی جاتی ہے۔ تم نے میرے موکل کے کیس کے سلسلے میں جو کاغذات کا پلینڈو جمع کیا ہے اس میں مجھے مذکورہ "لیبر ایگری منٹ" کی کاپی کہیں نظر نہیں آئی۔ اس غیر حاضری کی وضاحت کرو گے؟"
 "ان لوگوں نے جو کچھ بھیجا وہ میرے پاس موجود ہے۔" وہ بے بسی سے بولا۔ "اگر وہ لیبر ایگری منٹ کی کاپی بھیجنا بھول گئے ہیں تو اس میں میرا کیا قصور ہے!"
 "تمہارا کوئی قصور نہیں!" میں نے زہر میں بچھے ہوئے الفاظ میں کہا۔ "یہ آسٹریلیا ورک ویزا ایورو کی بھول ہے۔ انہوں نے آئی ایل او کے تیار کردہ "لیبر ایگری منٹ" کی کاپی تمہیں نہیں بھیجی۔ اس غلطی پر تو ممکن ہے آئی ایل او آسٹریلیا ورک ویزا ڈیپارٹمنٹ کو معاف کر دے لیکن آسٹریلیا ورک ویزا ڈیپارٹمنٹ کی ایک سنگین غلطی کو کبھی درگزر نہیں کر سکتی۔ ورک ویزا ڈیپارٹمنٹ کا یہ قصور گردن زدنی ہے۔"
 "کون سا قصور؟" بے ساختہ اس کے منہ سے نکلا۔
 "یہی جو..... وہ..... آپ کے ساتھ..... پاکستانی اسٹائل کی..... انکس میں خط کتابت کر رہے ہیں۔" میں نے ٹھہر ٹھہر کر اس کی طبیعت صاف کرتے ہوئے کہا۔ "عدالت کے حکم پر تمہارے فراہم کردہ کاغذات کا جوسانی ٹیسٹ ہوا

ہے اس کا نتیجہ اسر تہارے خلاف جاتا ہے۔
”پپ پانی.....“ وہ اپنے خشک ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے بولا۔ ”میں شدید پیاس محسوس کر رہا ہوں۔“
مجھے یہ اندازہ قائم کرنے میں کوئی دقت محسوس نہیں ہوئی کہ شیر افضل اندر سے بری طرح ٹوٹ چکا تھا۔ ان لمحات میں وہ ”نہ پائے رفق، نہ جائے ماندن“ ایسی کیفیت سے دو چار دکھائی دیتا تھا۔ میں نے اپنی جرح کو اخلاقی مرحلے میں داخل کرتے ہوئے پچکارنے والے انداز میں مزمل سے کہا۔

”تمہارے خشک حلق کو تر کرنے کا بندوبست کیا جائے گا لیکن پانی سے نہیں بلکہ دودھ سے اور وہ بھی آسٹریلیاں ریڈ کاؤ (سرخ گائے) کے دودھ سے۔“
وہ خوفزدہ نظر سے مجھے دیکھتا رہا۔

میں نے جارحانہ انداز میں استفسار کیا۔ ”تم نے میرے موکل کو آسٹریلیا کے کسی ڈیری فارم میں ملازمت دلوانے کی بات کی تھی نا؟“
”جی.....“ وہ کھٹک زدہ لہجے میں بولا۔

”تمہارے فراہم کردہ کاغذات میں آسٹریلیا کے کسی ڈیری فارم کا نام دیکھنے کو نہیں ملتا۔“ میں نے سخت لہجے میں کہا۔ ”آسٹریلیا میں کم و بیش چھ ہزار چار سو ڈیری فارم ہیں جن میں لگ بھگ تینتالیس ہزار ملازمین کام کر رہے ہیں۔ کیا تم معزز عدالت کو بتاؤ گے کہ میرے موکل کو تم کس ڈیری فارم میں جاب دلوا رہے تھے؟“
”اس وقت مجھے کچھ بھی یاد نہیں آ رہا.....“ وہ عجیب سے لہجے میں بولا۔

”جیل جا کر تو تمہاری یادداشت واپس آ ہی جائے گی لیکن میں یہاں بھی تمہیں یاد دلانے کی کوشش کرتا ہوں۔“ میں نے گرتی ہوئی دیوار کو ایک اور دھکا دیتے ہوئے کہا۔ ”آسٹریلیا کے چھ بڑے حصوں میں ڈیری فارم قائم ہیں۔ تم میرے موکل کو جس ڈیری فارم میں ملازمت دلوا رہے تھے اس علاقے کا نام بتا دو؟“
شیر افضل کے پاس میرے اس سوال کا کوئی جواب نہیں تھا۔ اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے میں نے کہا۔ ”تمہیں اس لیے کچھ بھی یاد نہیں آ رہا کیونکہ تمہارا سارا خیال جھوٹ اور دھوکا دی پر مبنی ہے۔ درحقیقت تم آسٹریلیا کے بارے میں کچھ نہیں جانتے۔ میں نے تھوڑی دیر پہلے آسٹریلیا کے ان چھ علاقوں کا ذکر کیا ہے۔ وکٹوریہ، ساؤتھ آسٹریلیا، نیو ساؤتھ ویلز، کوئینزلینڈ، تسمانیا اور ولیمسٹون

آسٹریلیا۔ اب تم سے آخری سوال.....“ میں نے ڈرامائی انداز میں بات اسوری چھوڑ کر فاتحانہ انداز میں وکیل صفا کی طرف دیکھا پھر مزمل شیر افضل سے استفسار کیا۔ ”آسٹریلیا کے دارالحکومت کا نام کیا ہے؟“
”سڈنی!“ وہ بڑے اعتماد سے بولا۔

میں نے کہا۔ ”اگر تم ایمانداری سے کام کر رہے ہو تو میرے اس سوال کا بالکل درست جواب دیجئے۔“ وہ اپنے جواب کی غیر محسوس دیوار کو پلستر کرتے ہوئے بولا۔ ”پرچھ.....!“

”تم ایک دھوکے باز..... ہی نہیں بلکہ ایک نالائق ایجنٹ بھی ہو۔“ میں نے کہا۔
”سیلیورن!“ وہ سرخ روئی کی کوشش میں مصروف رہا۔
”بالکل غلط!“ میں نے ناپسندیدہ نظر سے اسے گھورا۔
وہ زنج ہوتے ہوئے شکست خوردہ لہجے میں بولا۔

”پھر آپ ہی بتادیں!“
میں نے بتایا۔ ”کینیبرا۔“

”اوہ.....“ وہ مکاری سے بولا۔ ”میں یہ بتانے ہی والا تھا۔“
”یہ بتانے کا موقع تو جاتا رہا۔“ میں نے معنی خیز انداز میں کہا۔ ”اب تم وہ بتا دو.....!“

”وہ کیا؟“ وہ حیرت بھرے لہجے میں متغیر ہوا۔
”کہ..... تم میرے موکل کے دو لاکھ کب واپس کر رہے ہو؟“ میں نے پھر سے ہونے لہجے میں پوچھا۔
”آپ کو اندازہ نہیں ہے کہ اس پر دس.....“ وہ اپنی بات پوری نہ کر سکا۔

”عدالت کو یہ خوبی اندازہ ہو چکا ہے کہ تم دھوکا دہی کے اس مذموم کاروبار کو کس طرح جھوٹ اور جعل سازی کی مدد سے چلا رہے ہو۔“ جج نے ناگوار نظر سے مزمل کی جانب دیکھتے ہوئے کہا۔ ”عدالتی کارروائی میں متعدد مقامات پر تمہاری غلط بیانیوں کا راز فاش ہو چکا ہے۔ اگر باقی کی زندگی جیل کی سنگلاخ دیواروں کے پیچھے گزارنے کا ارادہ نہیں رکھتے تو یہ ڈراما بازی بند کرو اور بیگ صاحب کے سوال کا سیدھا جواب دو۔“

جج کے ریمارکس نے کھلے عام یہ بتا دیا تھا کہ عدالت نے میرے موکل کے حق میں فیصلہ صادر کر دیا ہے۔ جج کی بات نے شیر افضل کی رہی سہی ہمت کی لٹیا بھی ڈبو دی۔ وہ ایک صدیوں کا بیمار نظر آنے لگا۔ وہ جج کو مخاطب کرتے ہوئے مہلتیاند انداز میں بولا۔

”سرا میری مالی پوزیشن ایسی نہیں ہے کہ میں ایک مہلت دو لاکھ روپے ادا کر سکوں۔“
شیر افضل کے جواب نے یہ تو ثابت کر دیا کہ اس نے دو لاکھ روپے واپس کرنے کا ارادہ کر لیا ہے، مگر یاد وہ اپنے ہم کار قرار کر چکا تھا۔ جج نے پھر سے ہونے لہجے میں کہا۔ ”تم نے جس طرح دو قسطوں میں نوید باری سے دو لاکھ روپے وصول کیے تھے، اسی طرح دو قسطوں میں عرصہ سات یوم کے اندر یہ رقم اس کے حق دار کو واپس کر دو۔“
”سرا مجھے بڑے افسوس کے ساتھ یہ کہنا پڑ رہا ہے کہ میں اس وقت بہت مجبور اور لاچار ہوں۔“ شیر افضل روٹی صورت بنا کر بولا۔ ”میں پچھلے کچھ عرصے سے مالی بحران کا شکار ہوں۔ اگر عدالت اس رقم کی واپسی کے لیے پانچ ہزار روپے ماہانہ کی قسط باندھ دے تو میں بے حد شکر گزار رہوں گا۔“

”ہرگز نہیں!“ میں نے شیر افضل کی جانب دیکھتے ہوئے قطعی لہجے میں کہا۔ ”دو لاکھ کی یہ رقم تم ایک مہلت ہی ادا کرو گے اور وہ بھی ایک دو روز میں۔ اداکاری کر کے تم عدالت کی ہمدردی حاصل نہیں کر سکتے۔ یہ تو شکر کر دو کہ تم سے اصل زری واپس لیا جا رہا ہے ورنہ اگر اس کے اندر تمام تر اس کیس کے عدالتی اخراجات کو بھی شامل کر لیا جائے اور لگے ہاتھوں اس رقم پر دو سال کا دارک اپ بھی ایڈ کر دیا جائے تو تحقیر تین لاکھ تک جا پہنچے گا۔ میں جانتا ہوں کہ تم آج کا سورج غروب ہونے سے پہلے بے آسانی میرے موکل کو دو لاکھ روپے ادا کر سکتے کی پوزیشن میں ہو۔“

”بیگ صاحب!“ جج نے چونک کر میری جانب دیکھا اور پوچھا۔ ”آپ کس طرح اتنے وثوق کے ساتھ یہ بات کہہ رہے ہیں؟“

”جناب عالی! میرے پاس اپنی بات کو سچا ثابت کرنے کا ٹھوس ثبوت موجود ہے۔“ میں نے گھبرانداز میں کہا۔

”کیا آپ وہ محسوس ثبوت عدالت کے علم میں لائیں گے؟“ جج نے پھر سے ہونے لہجے میں استفسار کیا۔

”جی ضرور.....“ یہ کہتے ہوئے میں نے اپنی فائل میں سے ایک کاغذ نکال کر جج کی جانب بڑھاتے ہوئے کہا۔ ”یہ راہدہ ٹھوس ثبوت۔“

”اوہ.....!“ جج نے مذکورہ کاغذ پر نگاہ ڈالتے ہوئے کہا۔ ”یہ تو بیگ اسٹیٹ منٹ ہے جس کا کلوزنگ سٹینٹس چار لاکھ تیرہ ہزار چھ سو چوبیس روپے ہے۔“

میں نے نوید باری سے کہہ کر شاگرد کے تعاون سے مزمل شیر افضل کی بینک اسٹیٹ منٹ نکلائی تھی۔ اس زمانے میں آج کی طرح کمپیوٹرائزڈ بینک اسٹیٹ منٹ نہیں ہوا کرتی تھی۔ اس وقت اسٹیٹ منٹ میں بہت سا کام ہونڈ میڈ بھی ہوا کرتا تھا۔

”میں نے اپنے ذرائع سے یہ بینک اسٹیٹ منٹ نکلائی ہے۔“ میں نے جج کی جانب دیکھتے ہوئے کہا۔ ”معزز عدالت! اپنے ذرائع استعمال کر کے متعلقہ بینک سے اس اسٹیٹ منٹ کی ویری فیکیشن کروا سکتی ہے۔ اس دستاویز میں ظاہر ہونے والا سٹینٹس ایک روز پہلے کا ہے یعنی مزمل کی فائل پوزیشن ایسی ہے کہ آئندہ دو مہینے کے اندر اگر یہ چاہے تو میرے موکل کو یکمشت پے منٹ کر سکتا ہے۔“

جج نے مزمل کی طرف دیکھتے ہوئے استفسار کیا۔ ”پے منٹ کی ادائیگی کے لیے دو دن کی مہلت کافی ہے؟“
جج اگر حکم دیتا کہ ابھی اور اسی وقت نوید باری کو فائل پے منٹ کر دو تو بھی شیر افضل کے پاس انکار کی گنجائش نہیں بچی تھی۔ جج کے سوال کے جواب میں مزمل نے مرلی کی آواز میں کہا۔

”جی..... خشک ہے.....“

☆☆☆

نوید باری کی خوشی کا کوئی ٹھکانا نہیں تھا۔ اس کی ڈوبی ہوئی دو لاکھ کی رقم قانونی چارہ جوئی کے مجرانی اثرات سے باز باہ ہو گئی تھی۔ میں نے اپنی جرح کی رسیوں کی مدد سے شیر افضل کو کمرائے عدالت میں اس طرح باندھ دیا تھا کہ وہ اٹ نہیں سکتا تھا، اس کے پاس کوئی بھی راہ فرار اور کوئی بھی جائے پناہ نہیں بچی تھی۔ اگر وہ افس میری بات مان لیتا تو یقیناً فائدے میں رہتا۔ میں اسے عدالت کے باہر اپنے آفس میں بیٹھ کر روپے دلوا رہا تھا۔ وہ اگر ایک لاکھ اسی ہزار روپے میرے موکل کو واپس کرنے کے لیے راضی ہو جاتا تو یہ معاملہ اسی روز میرے آفس ہی میں منٹ جاتا لیکن شیر افضل کو توقع نہیں تھی کہ میں اسے عدالت میں اس بری طرح بے بس دلا جا کر کے رکھ دوں گا۔

انسان کی تو قہات بعض اوقات اس کا کھڑا کر کے رکھ دیتی ہیں اور اگر انسان برائی کی راہ پر گامزن ہو تو پھر قدرت کے فیصلے اس کا ستیاناس نہیں بلکہ سواستیاناس مار دیتے ہیں۔ شیر افضل کے ساتھ بھی کچھ ایسا ہی ہوا تھا۔

بہ ظاہر یہ کیس بہ خیر و خوبی اپنے منطقی انجام کو پہنچ گیا



خلش

نعان اسحاق

غلط فیصلے ہمیشہ غلط نتائج کو جنم دیتے ہیں... اور یہ غلطی بغیر کسی تفریق کیے کسی سے بھی ہو سکتی ہے جیسے کہ اس کی ماں... جو اس کی سبیلی بھی تھی، جانے کیوں اپنے دل پر لگے ہوئے زخم کی ٹیس کو جان نہ سکی اور نہ ہی اپنی بیٹی کے دل میں چھپی خلش کو سمجھ سکی کیونکہ... وہ غلطی پر تھی اور یہی بات وقت نے بھی سچ ثابت کر دی۔

زندگی کے بھائے درو کو جینے والی ایک حسرت کی دلورز کھا

”صغیر ہرگز غیر ذمے دار نہیں۔ یہ تو اس کی بیوی کی طبیعت خراب تھی۔ اسے اسپتال لے جانا تھا اس لیے چھٹی کر لی اور تم سکتے اور چکر کا ٹوٹی... بیٹہ جاؤ۔ تھک جاؤ گی چندا۔“ رقیہ ساتھ کرسی پر بیٹھی تھیں اور اب محبت سے بیٹی کو بھی ساتھ دانی کرسی پر بیٹھنے کا کہہ رہی تھیں۔

”ہونہ... مجھے نہیں پتا۔ میرا آج کا پروگرام تو خراب ہو گیا۔ ادھر کالج میں میری سہیلیاں انتظار کر رہی ہوں گی۔“ وہ ہنوز منہ بھلائے کھڑی تھی۔

گھر کی خوبصورتی دیدنی تھی۔ ایک نظر جو پڑتی تو مزہ دوسری بار دیکھنے کا دل کرتا۔ سیاہ آہنی گیٹ، سفید روغن سے نہائی دیواریں اور دیواروں سے جھانکی پڑے ٹکڑے عمارت جس کے لان میں عائنہ سے چٹائی سے ادھر ادھر پکڑے کاٹ رہی تھی۔ مٹھیاں جیسے منہ بھلائے وہ دنیا بھر سے ناراض لگتی۔

”امی! آپ ایسے غیر ذمے دار ملازم رکھتی کیوں ہیں۔“ وہ بیزار سے لہجے میں ماں سے کہہ رہی تھی۔

سے دور، بہت دور ہو جانا چاہیے اور بھر میں نے ایسا ہی کیا۔ اس روز عدالت میں میری وہ گواہی اس تبدیلی کی شروعات تھی۔ وہ دن اور آج کا دن، میں نہ بھی شیر افضل سے ملا اور نہ ہی اس سے کوئی واسطہ رکھا۔ وہ اپنے کسی کام سے چپک میں آتا بھی تھا تو میں اس کے لیے انجینی بن جاتا تھا۔ پھر کوشش کر کے میں نے اپنا تادل دوسری برانچ میں کروا لیا۔ میں شیر افضل سے دور تو ہو گیا تھا لیکن میرے اندر سکون کا فقدان تھا۔ کچھ سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ میں اطمینان قلب کے لیے کیا کروں۔ پھر کل بیٹھے بھائے میرے ذہن میں آیا مجھے اپنا پیراڈکس سے شیر کرنا چاہیے۔ مجھے آپ سے زیادہ معقول شخص اور کوئی دکھائی نہیں دیا تو آپ کے پاس آ گیا۔“

”آپ نے بہت اچھا کیا۔“ اس کی بات مکمل ہوئی تو میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”اندر کا غبار دھوئے سے سن ہکا ہو جاتا ہے۔ اب آپ کیسا محسوس کر رہے ہیں؟“ ”بہت پرسکون اور مطمئن۔“ اس نے جواب دیا۔ ”گڈ...“ میں نے حوصلہ بڑھانے والے انداز میں کہا۔ ”مبارک ہو، آپ کا مسئلہ ہو گیا۔“ ”مسئلہ تو حل ہو گیا...“ وہ قدرے الجھن زدہ لہجے میں بولا۔ ”لیکن ایک سوال کا جواب نہیں مل رہا...“ ”کون سا سوال؟“ میں پوچھنے پر تیار نہ رہ سکا۔ ”وہ آواز کیا چیز تھی؟“ وہ میری آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بولا۔ ”جس نے سیکنڈ کے ہزارویں حصے میں میری دنیا بدل ڈالی؟“

”آپ اس آواز کی حقیقت جاننا چاہتے ہیں؟“ میں نے گہری سنجیدگی سے پوچھا۔ ”ضرور... اسی لیے تو آپ کے پاس حاضر ہوا ہوں۔“ وہ عقیدت بھرے لہجے میں بولا۔ ”وہ آواز حق تھی۔“ میں نے پرسوج انداز میں کہا۔ ”جب حق کسی انسان کو بدلنا چاہتا ہے تو وہ اس کے اندر اسی طور کو نبھاتا ہے، پھر وہ بندہ حق شناس ہو جاتا ہے۔“ ”اب میرا مسئلہ مکمل طور پر حل ہو گیا ہے۔“ وہ ایک گہری سانس خارج کرتے ہوئے بولا۔ ”حق آپ کا بھلا کرے...!“

میں نے شاکر کی بات کے جواب میں کچھ نہیں کہا۔ اس نے مجھے سلام کیا اور جیتی خاموشی سے وہ آیا تھا ویسے ہی چپ چاپ رخصت ہو گیا۔

(تحریر: حسام بٹ)

تھا۔ نوید باری کو اس کی رقم واپس مل گئی تھی اور اس نے کبھی بھی ملک سے باہر جا کر روزی کمانے سے توبہ کر لی تھی۔ میں بھی مطمئن ہو کر اپنے روزمرہ کے پیشہ وزانہ کاموں میں مصروف ہو گیا تھا لیکن لگ بھگ آٹھ ماہ کے بعد ایک ایسا واقعہ پیش آیا جس نے اس کیس کو فائل ٹیچ لگا دیا۔ ایک شام میں حسب معمول اپنے آفس میں موجود تھا کہ شاکر مجھ سے ملے آ گیا۔ وہی شاکر جس کے نوید باری کے ساتھ بہت اچھے تعلقات تھے اور جو لائڈگی کے کسی چیک میں کام کرتا تھا اور اسی شاکر کی گواہی نے شیر افضل اور وکیل صفائی کے منہ پر طمانچہ درسید کر دیا تھا۔

”دیکھ سلیک کے بعد وہ گہری سنجیدگی سے بولا۔“ ”وکیل صاحب! میں آپ کے پاس اپنے ایک ذاتی کام سے آیا ہوں۔“ ”جی فرمائیں، میں آپ کی کیا خدمت کر سکتا ہوں؟“ میں نے اس کی طرف متوجہ ہوتے ہوئے کہا۔ ”کافی دنوں سے میرے دل و دماغ پر ایک بوجھ ہے۔“ وہ قدرے آگے کو جھکتے ہوئے بولا۔ ”آپ اسے میرے ضمیر کی خلش بھی کہہ سکتے ہیں۔“ ”میں ہمتن کوش ہوں۔“ میں نے اس کے چہرے پر نگاہ جماتے ہوئے کہا۔ ”آپ جو بھی کہنا چاہتے ہیں، بے دھڑک کہہ ڈالیں۔“

”اس روز عدالت میں، میں نے غلط بیانی سے کام لیا تھا۔“ وہ انکشاف انگیز لہجے میں بولا۔ ”میں نے اس سے کوئی سوال نہیں کیا۔ خاموشی نظر سے اس کے بولنے کا انتظار کرنے لگا۔

”وہ اپنی بات کو آگے بڑھاتے ہوئے بولا۔“ ”حقیقت یہ ہے کہ میں کافی عرصے تک شیر افضل کے ساتھ کام کرتا رہا تھا۔ میں یہی سمجھ رہا تھا کہ وہ دیا اندازی سے کام کر رہا ہے لہذا مختلف نوعیت کی ڈرافٹنگ میں، میں اس کی مدد کر دیا کرتا تھا جس کے عوض وہ مجھے کچھ رقم بھی دے دیا کرتا تھا لیکن نوید باری کے کیس نے شیر افضل کے جھوٹ کی نقلی کھول کر اس کی دھوکا دہی کو میری نگاہ میں آشکار کر دیا۔ جب شیر افضل کا گھناؤنا کردار میرے سامنے کھلا تو اسی لمحے میرے اندر ایک آواز ابھری...“ ”حقاتی توقف کر کے اس نے ایک بھر جھری لی پھر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے بولا۔

”اس آواز میں بڑی توانائی، بڑی تحریک تھی۔ کوئی میرے اندر بول رہا تھا اور مجھے تلقین کر رہا تھا کہ مجھے فوراً سے چیختر دلی، دماغی، جسمانی اور روحانی طور پر شیر افضل

در اصل آج اس کے کالج میں میوزیکل شوقا۔ ملک کا سب سے بڑا گلوکار گانے کے لیے آرہا تھا اور اسے کالج چھوڑنے کی ذمہ داری ڈرائیور مندر کی تھی۔ ارادہ تو تیر صاحب کا تھا کہ وہ بیٹی کو کالج ڈراپ کر دیں گے مگر فیملی میں کلائنٹ کی غیر متوقع آمد کی وجہ سے انہیں جلدی لگانا پڑا اور یوں عاشر جیسے گھر میں قید ہو کر رہ گئی۔ کالج جانے کا کوئی وسیلہ بنا نظر نہ آتا تھا۔

”میں خود گاڑی ڈرائیور کے چلی جاتی ہوں۔“ اسے یکدم خیال آیا۔

”نہیں..... رقیہ نے قطعی طور پر منع کیا۔“

”کیا طے ہوا تھا کہ کالج سے فراغت سے پہلے تم ڈرائیور نہیں کرو گی اور تمہیں ڈرائیور کرنا آتا بھی کہاں ہے۔ پھر کہیں گاڑی لگوا دو گی۔“

”ادو امی اب ایسی بڑی ڈرائیور بھی نہیں ہوں۔ کچھ نہیں ہوتا۔ اب کیا ضرورت کے تحت بھی ڈرائیور نہ کروں۔ میرا کالج جانا بے حد ضروری ہے۔ آپ جانتی ہیں میرا پسینہ یہ سکر آ رہا ہے۔“ وہ ماں کو تال کر کے کی کوکھش کر رہی تھی۔

گھر رقیہ کا سرنفی میں بٹھا رہا۔

تمہی ملازم کی بیرونی میں ایک لڑکا لان کی طرف آتا دکھائی دیا۔

بالکا، جیٹا، چہرے پر جوانی کے دھنک رنگ لیے، بال سلیپ سے بٹائے۔

”السلام علیکم خالہ!“ رقیہ کے سامنے اس نے سر جھکا دیا۔

”اوہ نہیں۔“ بانٹیک پر تو میری ساری لک خراب ہو جائے گی۔ تم پلیز کچھ تکلیف اٹھا لو۔ مجھے گاڑی میں ڈراپ کر دو۔ واپسی پر اپنی بانٹیک لے لیتا تو پھر چلیں؟“ اس نے چابی یاسر کی طرف بڑھادی۔ یاسر نے مسکرا کر چابی تھام لی اور اٹھ کھڑا ہوا۔

”خالہ اب امی نے پیسے بھجوائے ہیں؟“ اس نے شرٹ کی سامنے والی جیب سے پیسے نکال کر رقیہ کی طرف بڑھائے۔

”ادو یہ خدیجہ بھی حد کرتی ہے۔ یہ معمولی سی تو رقم تھی۔ اب اس کی واپسی کی کیا تکلیف تھی۔ اب تم سے نلانی تو ناراض ہو گی۔ بہنوں میں اتنے چھوٹے موٹے حساب کیا اچھے لگتے ہیں۔“ خدیجہ سے کہتے ہوئے انہوں نے رقم تھام لی۔

”چلو عاشر کو چھوڑ آؤ۔ واپسی پر کب شپ لگاتے ہیں۔“ رقیہ نے کہا تو یاسر اور عاشر روانہ ہو گئے۔

”تم آج معمول سے زیادہ بیڈم لگ رہے ہو۔“ جب گاڑی میں گیٹ پار کر رہی تھی تب عاشر نے کہا تھا۔

”تقریباً آج معمول سے زیادہ بیڈم لگ رہا ہے۔“ عاشر نے کہا تھا۔

”تقریباً آج معمول سے زیادہ بیڈم لگ رہا ہے۔“ عاشر نے کہا تھا۔

”تقریباً آج معمول سے زیادہ بیڈم لگ رہا ہے۔“ عاشر نے کہا تھا۔

”تقریباً آج معمول سے زیادہ بیڈم لگ رہا ہے۔“ عاشر نے کہا تھا۔

”تمہارا کزن تو کافی بیڈم ہے۔“

”آخر کون کس کا ہے۔“

”صرف کزن ہی ہے یا پھر کوئی اور رشتہ بھی ہے؟“

”اور رشتہ مطلب؟ کیا کوئی اور رشتہ بھی ہو سکتا ہے؟“ عاشر نے بھڑک کر پوچھا۔

”ہاں بھئی۔ دوست، منگیتیر یا پھر.....“ سہیلی نے لمبے بھر کو شوخ وقفہ لیا۔

”یا پھر پریمی!“

عاشر کا دل لمحے بھر کو دھڑکنا بھول گیا۔ اس نے پلٹ کر یاسر کی طرف دیکھا جو سامنے آنچ پر گاتے گلوکار کو انہماک سے سن رہا تھا۔ یاسر کس قدر بیڈم ہے۔ جیسے دیو مالائی داستان کا یونانی پوتا۔ اس کا پہلے دھیان کیوں نہ گیا۔

”کیا تم نے شوا انجوائے کیا؟“ واپسی پر عاشر پوچھ رہی تھی۔

”ہاں، بہت خوبصورت شوقا۔“

عاشر جیسے سے اسے دیکھنے لگی۔

”اگر تم نے آئندہ یہ سوال پوچھا تو میں تم سے خفا ہو جاؤں گی۔“ اس کی نگاہ میں ہمارے پر جم گئیں۔ جتنا جو آسمان کی وسعتوں کو چھوتا تھا۔ جو قیام پاکستان کی نشانی تھا۔

”اسی پارک میں کبھی مسلمان اکٹھے ہوئے تھے اور انہوں نے ایک عزم کیا تھا۔ خود سے ایک وعدہ کیا تھا کہ وہ اپنی بھانجے کے لیے ایک الگ ملک حاصل کریں گے۔“

”آج ہم بھی اسی جگہ وعدہ کرتے ہیں کہ کبھی ایک دوسرے کو نہ چھوڑیں گے۔ میرے ساتھ الفاظ دہراؤ۔“

”میں وعدہ کرتی ہوں۔“ عاشر کہتی۔

”میں بھی وعدہ کرتا ہوں۔“ یاسر دہراتا۔

”میں تم سے زندگی کی آخری سانس تک محبت کروں گی۔“

”میں بھی تم سے زندگی کی آخری سانس تک محبت کروں گا۔“

”ہر دکھ سکھ اکٹھے ہائوں گی۔“

کی کوئی قید نہیں۔ میں اپنا ہونٹ کھولوں گا۔ میرے ہونٹ کے چپے طول و عرض میں ہوں گے۔“

”اللہ کرے ایسا ہی ہو۔“ والد صاحب دل ہی دل میں کہتے اور پوچھتے۔ ”مگر بیٹا! ہونٹ کھولنے کے لیے بہت سارے پیسے چاہئیں۔ تیرے باپ کی کریانے کی دکان سے اتنا پیسہ کہاں لکھے گا۔“

”ابو! اللہ مسبب الاسباب ہے۔“ وہ مسکرا کر کہتا۔ اللہ اس کی قسمت کھولے گا۔ اس کا نصیب چمکے گا، اسے پختہ یقین تھا۔

بسم اللہ ذکر کے والد صاحب نے کمپنی سے آئے پیسے بیٹے کے ہاتھ پر رکھے اور اس نے ایک ڈھابا کھول لیا مگر اس کا ارادہ آہستہ آہستہ اس کام کو بڑھانے کا تھا۔ منزل دوسری گمان شاء اللہ ایک دن آئے گا کہ اس کا ہونٹ شہر کی مرکزی شاہراہ کے کنارے ہوگا اور شہر بھر میں مشہور ہوگا۔ ابھی تو لگے بندھے گا کہ تھے۔ سلسلہ چل رہا تھا مگر آمدنی کم تھی لیکن اس خود پر یقین تھا اور اچھے مستقبل کی بے انتہا امیدیں۔

اور دوسری طرف..... دوسری طرف عائشہ ایم بی بی ایس کر رہی تھی۔ میرٹ نہ بنا۔ والد صاحب کے پاس اتنے پیسے تھے کہ انہوں نے بیٹی کی خواہش کو مقدم جانا اور آج وہ سال سوم کی طالبہ تھی۔ دو بڑے بھائی تھے۔ بڑا کاروبار کے سلسلے میں یورپ سیٹل تھا۔ دوسرا انجینئر تھا۔ صوبائی دارالحکومت کے بجائے اسے مرکزی دارالحکومت میں انجینی جاب ملی، چنانچہ وہ بھی گھر سے دور رہتا۔

یاسر اور عائشہ جو خالہ زاد تھے اور ایک دوسرے سے محبت کرنے لگے تھے۔ یہ کہاں جانتے تھے کہ تمام خواب تعبیر کو نہیں پہنچتے۔

کل عائشہ کی سالگرہ تھی اور وہ ان لوگوں میں سے ہرگز نہیں جس جو اپنی سالگرہ بھول جاتے ہیں اپنی سالگرہ کا دن اسے ہمیشہ یاد رہتا۔ وہ رات گیارہ بجے سوئی تو اسے یاد تھا کہ جب وہ اٹھے گی تو پانچ سال کی ہوگی۔

ابھی آنکھوں میں بچی نیند کی کاس کا دروازہ بجایا گیا۔ وہ اٹھ بیٹھی۔ اس وقت اس کے دروازے پر کون دستک دے سکا ہے؟ وہ اٹھی اور دروازہ کھولا۔

سر ٹوٹی بجائے، ہاتھ میں غبارے لیے یاسر کھڑا تھا۔ ”سالگرہ مبارک ہو۔“ یاسر اسے پورے بارہ بجے دس کرنے آیا تھا۔

”تھیک یو سوچ یاسر! آئی ریلی.....“ تو یو کے

الفاظ منہ میں ہی رہ گئے۔ پیچھے رقیہ دونوں ہاتھ سینے پر جمائے کھڑی تھیں۔

”اچھا جلدی لاؤ نج میں آؤ اور کیک کاٹو۔ تمہیں بروقت دس کرنے کے پکڑ میں خالہ کی نیند میں غلغل ڈالا۔“

رقیہ کا چہرہ بے تاثر تھا اور یوں ان دونوں نے جو اپنے تعلقات و احساسات اب تک گھروالوں سے مخفی رکھے تھے، اب مخفی نہ رہے۔

عائشہ نیچے آئی اور کیک کاٹا۔ یاسر ہی تالیاں بجاتا رہا۔ رقیہ ساری کارروائی دیکھتی رہیں۔ عائشہ نے کیک کاٹ کر کھلانے کے لیے ماں کے منہ کی طرف بڑھایا۔

”مجھے بھی کھلاؤ۔“ یاسر کہہ رہا تھا۔ یوں تو وہ پہلے بھی ایک ہی پلیٹ میں کھاتے رہے تھے مگر یوں ماں کے سامنے اسے بے تحاشا شرم آئی۔

”ای کیسا سوچتی ہوں گی۔“

اور یاسر بھی تو یہی جانتا تھا کہ وہ سوچیں اس لیے اس نے رات کے اس پہر آنے کی پروا نہ کی۔

عائشہ نے کیک یاسر کی طرف بڑھایا۔ اس نے مسکراتے ہوئے اس کا ہاتھ تھاما اور کیک کھا لیا۔ وہ کچھ دیر کھڑا باتیں کرتا رہا۔

”خالہ! معذرت کہ آپ کو تنگ کیا مگر میں عیشو کو کچھ انوکھے انداز میں دس کرنا چاہتا تھا۔“

”عیشو.....“ تو تک نیم بھی رکھا جا چکا ہے۔ وہ کہاں سوئی رہی تھیں۔

یاسر اودامی کلمات کہتا چلا گیا۔ رقیہ صوفے پر خاموش بیٹھی رہیں۔

”یہ سلسلہ کب سے چل رہا ہے؟“ آخر کار انہوں نے پوچھ لیا۔

عائشہ کا دل زوروں سے دھڑکنا شروع ہو گیا۔ یاسر کا طریقہ غلط تھا۔ انہیں پہلے والدین کو بتادینا چاہیے تھا پھر یوں دس کرتا تو اور بات تھی۔

”چند ماہ سے.....“ اس کی آواز مدہم تھی۔

”تھیک.....“ رقیہ دھیمے سے سر ہلانے لگیں جیسے کچھ سوچ رہی ہوں۔ چند لمحوں میں یوں گزر گئے۔

”تھیک ہے بیٹا تم سو جاؤ، صبح بات کرتے ہیں۔“ اس تمام وقت میں رقیہ کے ہونٹ ہلکی بار مسکرائے مگر عائشہ کو یہ مسکراہٹ پراسرانی تھی۔

رقیہ اس کا گال چھینچاتی ہوئی چلی گئیں اور وہ اپنے کمرے کی طرف چلی آئی۔

”ای کا بھانجا ہے۔“ انہیں کیا اعتراض ہوگا۔ اچھا خوب صورت لڑکا ہے۔ تھوڑا غریب ہے مگر کوشش تو کر رہا ہے۔ وہ وقت بھی آجائے گا جب شہر کی مرکزی شاہراہ کے کنارے اس کا ہونٹ ہوگا۔“ وہ خود سے باتیں کرتی ہوئی۔

اس بات سے بے خبر کہ کل ماں سے ہونے والی باتیں کیسے اس کی کا پاپٹا دیں گی۔

☆☆☆

”تم جانتی ہونا تمہاری ماں یونیورسٹی سے گریجویٹ ہے۔“ ناشتے کی میز پر دونوں ماں بیٹی آئے سامنے بیٹھی تھیں۔ تو قیر آفس چلے گئے تھے۔ یوں تو اس نے بھی کالج جانا تھا مگر رقیہ نے روک لیا۔

”ای امیری سہیلیوں نے پارٹی ارنج کی ہوگی۔“

”میری باتیں زیادہ ضروری ہیں۔ اگر پھر بھی ضروری سمجھو تو یوں کالج چلی جانا۔“

”جی.....“ اس نے یک لفظی جواب دیا۔

”ہمارے زمانے میں تعلیم عام نہ تھی اور میں خاندان کی واحد لڑکی تھی جو پڑھنے کے لیے یونیورسٹی گئی تھی۔“ رقیہ بتا رہی تھیں۔ ”شروع میں تو سب نے میرے پڑھنے کو برا جانا مگر تعلیم اپنی افادیت منوالیتی ہے۔ میں نے بھی سب کو گرویدہ کر لیا۔“ وہ لمبے بھر کو کہیں۔

”یہ تو وہ باتیں ہیں جو تم پہلے سے جانتی ہو مگر اب تمہیں ایک اور بات بتانی ہوں جو میرے علاوہ کوئی نہیں جانتا۔ یونیورسٹی میں، میں نے بھی محبت کی تھی۔“ عائشہ حیرت سے ماں کو دیکھنے لگی۔

”شاید میرا کلاس فیلو تھا۔ ہم دونوں ایک دوسرے کو پسند کرنے لگے اور پسند محبت میں بدل گئی اور ہم نے تمام زندگی ایک ساتھ نبھانے کے عہد کیے اور پھر.....“ وہ لمبے بھر کو خاموش ہو گئیں۔

”پھر دگرگی مل ہوئی، راولپنڈی ختم ہوئے اور تمہارے ابو کا میرے لیے رشتہ آیا۔ تمہاری دادی نے مجھے کسی تقریب میں دیکھا اور اپنے بیٹے کے لیے پسند کر لیا۔ وہ ایک انڈسٹریلسٹ کی بیٹی تھیں اور تو قیر ایک انڈسٹریلسٹ کا بیٹا۔ بہت امیر کیرئیر تھی۔ ان کا رشتہ ہماری لوئر ملڈ کلاس تھی میں آنا کسی نعمت سے کم نہ تھا۔ سب خوش تھے۔ مجھے جو پہلے ہی خوش قسمت سمجھا جاتا تھا اب تو جیسے خوش قسمت ترین سمجھا جانے لگا۔ ہاں میں خوش قسمت ترین تھی.....“ وہ رک گئیں اور گہری نظروں سے بیٹی کو دیکھتی رہیں۔ عائشہ خاموشی سے انہیں دیکھتی رہی۔

”شاید بہت غریب تھا۔ رہنے کے لیے گھر بھی نہ تھا۔ چہ بہن بھائی تھے۔ کرائے کے گھر میں رہتے تھے۔ میں نے خوب سوچا۔ تمہارے کام لیا اور تمہارے ابو کے لیے ماں کہہ دی۔ شروع میں اپنا آپ چھوٹا لگا۔ بے وفا ہونا چھوٹی بات نہیں تھی مگر کرائے کے گھر میں زندگی گزارنا آسان نہیں ہوتا اور آج سوچتی ہوں تو خود کو مطمئن پاتی ہوں۔ اگر میں تو قیر کے لیے ماں نہ ہوتی اور شاید کا ہاتھ تھامتی تو شاید میرے کانوں کے جھمکنوں میں میرے نہ دک رہے ہوتے۔ اور شاید تم بھی ڈاکٹر نہ بن رہی ہوتیں۔“ رقیہ کا ایک ہاتھ اپنے کان کے تھمکے پر تھا۔ وہ اسے اپنی کہانی سنا رہی تھیں۔ ہوا سا کتنی مگر عائشہ کو اپنا وجود آندگی کی زد میں محسوس ہو رہا تھا۔

”یاسر اچھا لڑکا ہے۔ میرا بھانجا ہے۔ اس نسبت سے مجھے عزیز بھی ہے مگر اتنا عزیز نہیں کہ میں اپنی بیٹی اس سے بیاہ دوں۔ وہ گلی کے کٹر پڑھا لے میں بریائی پیچھے والا میری بیٹی کو اور میرے نواسوں کو کیا مستقبل دے گا۔“ رقیہ کے الفاظ تلخ تھے اور کمر بھی۔

عائشہ خاموش بیٹھی رہی۔ کتنے ہی لمبے خاموش گزر گئے اور جب کہا تو اتنا ہی کہا۔

”کیا زندگی میں پیسا ہی سب کچھ ہوتا ہے؟“

”نہیں پیسا ہی سب کچھ نہیں ہوتا۔“ رقیہ مسکراتے ہوئے بیٹی کو جواب دے رہی تھیں۔ ”مگر چند محبت بھی سب کچھ نہیں ہوتی۔ محبت کے بغیر گزارہ آسان ہے، پیسوں کے بغیر گزارہ مشکل۔ اور اپنے لیے آسانیاں ڈھونڈنی چاہئیں۔ محبت کا کیا ہے۔ صرف ایک دفعہ نہیں ہوتی۔ اگر صرف ایک دفعہ ہوتی تو میں اور تمہارے ابو اتنی خوب صورت زندگی کیسے گزارتے۔“

عائشہ چپ چاپ ماں کو دیکھنے لگی۔ اسے اندازہ بھی نہ ہوا کہ اس کی آنکھیں جھپک رہی ہیں۔

”جس موڑ پر تم کھڑی ہو، وہاں سے واپس لوٹ آؤ۔ تمہارے مقدر میں پھولوں کے راستے ہیں۔ کانٹوں کا سفر اپنے کے لیے منتخب مت کرو۔“ اب وہ بیٹی کے ہاتھ پر ہاتھ رکھے اس کا ہاتھ سہارا رہی تھیں۔

”اب کالج جانا ہو تو صفر سے کہہ دو، وہ چھوڑ آئے گا۔ تمہاری دوستوں نے پارٹی ارنج کی ہوگی۔“ رقیہ اس کا گال چھینچاتی ہوئی اٹھ گئیں اور وہ وہیں ناشتے کی میز پر بیٹھی رہ گئی۔

کالج جانا، برتھ ڈے پارٹی..... کچھ بھی یاد نہ رہا۔ یاد

سکریٹری نے اپنے پاس کے کمرے میں داخل ہو کر کہا۔ ”جناب ایک خاتون آپ سے ملاقات کرنے آئی ہیں۔“

”کیا وہ خوبصورت ہے؟“ پاس نے اشتیاق سے پوچھا۔

”جی ہاں۔“ سکریٹری نے جواب دیا۔ ”انتہائی خوبصورت اور دلکش۔“

”اچھا! اسے اندر بھیج دو۔“ پاس نے کہا اور جلدی جلدی اپنے بال ستارے لگا۔

جب وہ عورت ملاقات کر کے چلی گئی تو پاس نے اپنے سکریٹری کو طلب کیا۔ ”تم جتنی ہو۔“ پاس نے غصے سے کہا۔ ”اس بد صورت عورت میں تمہیں حسن کیسے نظر آیا؟“

”میں معذرت خواہ ہوں سر!“ سکریٹری نے لجاجت سے کہا۔ ”اس نے نام نہیں بتایا تھا، میں سمجھا شاید وہ آپ کی بیوی ہے۔“

”وہ میری بیوی ہی تھی۔ اب جاؤ دفع ہو جاؤ۔“ پاس دہاڑا۔

مرسلہ: حسین ریاض..... سرگودھا

نری سے پوچھ رہا تھا۔

”میرے سر میں درد ہے۔“ وہ روئے جاتی اور سلمان اسے اچھنبے سے دیکھنے جاتا۔

☆☆☆

آسمان پر بادلوں کے کٹڑے آنکھیلیاں کرتے پھرتے تھے۔ پیچھے زمین کا موسم خوشگوار تھا اور شاید وہ اراضی زمین کا کٹڑا نہیں تھی۔ خوش رنگ اور خوش گلو۔ عانت نے کھوم کر ہر طرف کا جائزہ لیا۔ یہ ایک باغ تھا۔ پھولوں بھرے پودے۔ پھولوں سے لدے درخت۔ ہوا کے جھونکے اور معطر فضا۔ کیا یہ جنت تھی؟

جنت نہیں تو جنت کیسی ضرور تھی۔

اس کے دل میں خواہش پیدا ہوئی کہ وہ کسی درخت سے کچھ توڑ کر کھائے اور یہی خواہش لیے وہ اپنے لیے پھل منتخب کرنے لگی۔

پہلے درخت پر سرخ اسٹرابیریز سی تھیں۔ وہ اتنی سرخ تھیں کہ سرخ رنگ پسندیدہ ٹھہرے۔ درخت کے نیچے کھڑے ہو کر اس نے سانس اندر اتاری۔ قبل اس کے کہ وہ ہاتھ بڑھا کر اسٹرابیری توڑتی، دل میں خیال آیا کہ کچھ اور کھایا جائے۔ چنانچہ وہ اسٹرابیری کھانے کی خواہش پر قابو پاتے

دیوار کا سہارا لے کر کھڑی ہو گئی اور بے تحاشہ رونے لگی۔

”بس کر دو اب۔“ میرے خواب و خیال پر جب تم قابض ہو۔ اب بس کر دو۔ میرے خواب و خیال میری ملکیت ٹھہراؤ۔ مزید ان میں مست آؤ۔“ روئے ہوئے وہ خود سے نہیں یا سہرے کہہ رہی تھی۔

☆☆☆

آج کی محفل خاص تھی اور اس خاص میں وہ دونوں مہمان خصوصی تھے۔ رات بھینکی بھینکی تھی۔ سیاہ رات میں سیاہ لباس میں ملیوں حسن کی ملکہ سی اور اس کا شوہر، جیون بھر کا ساتھی حسن کا دیوتا۔

کنڈھے سے کندھا ملائے وہ اسٹج کے بالکل سامنے بیٹھے تھے۔ اسٹج پر مشہور گلوکارہ اپنی آواز کا فن چکا رہی تھی۔

عانت نے نظریں دوڑا کر چاروں طرف دیکھا۔ یہ محفل خاص اس کے لیے سچائی گئی تھی اور کیا رنگ تھے اس محفل کے۔ پھولوں کی آرائش سے لے کر نشست گاہوں تک۔ طعام کے انتظام سے موسیقی کے سروں تک۔ سب کچھ بے مثال تھا۔

اور اس کا سراپا، سیاہ لباس، بالوں میں انکے خوش رنگ پھول اور ہاتھ کے بریلیٹ میں دکھائی دینا۔ سب کچھ مکمل۔ گلوکارہ نے گانا ختم کیا۔ تالیاں بھینیں۔ سلمان کے دوستوں نے شور مچا دیا کہ اب وہ گائے۔ سلمان فن موسیقی کا دلدادہ تھا۔ صرف سننا ہی نہیں گانا بھی اس کا مشغلہ تھا۔ اس لیے تو اکثر گانا گاتا رہتا۔

دوستوں نے فرمائش کی تو وہ مسکراتا ہوا اسٹج پر آ گیا۔

”میں یہ گانا اپنی محبوب اپنی شریک حیات کے نام کرتا ہوں۔ جو میری زندگی میں بہار لے کر آئی۔ جس نے میری زندگی مکمل کی۔“ تالیاں گونج اٹھیں اور سب عانت کی قسمت پر رشک کرنے لگے۔

مگر عانت کے گلے میں آنسوؤں کا گولا اٹھا اور حلق میں اٹک گیا اور اسے پتا بھی نہ چلا کہ وہ چھوٹ چھوٹ کر رونے لگی۔

گنگنا تھا ہوا سلمان خاموش ہو گیا۔ محفل لمحے بھر کو رک گئی۔ سب اس کی طرف متوجہ ہو گئے۔

محفل کی سب سے معزز عورت یوں اچانک اس طرح چھوٹ چھوٹ کر رونے لگی تھی۔ کیا ہوا تھا آخر؟ سلمان تیزی سے اس کے پاس آیا۔ وہ صوفے پر بیٹھی تھی۔ سلمان اس کے قدموں میں بیٹھ گیا۔

”سویت ہارٹ! کیا ہوا؟ سب ٹھیک تو ہے؟“ وہ

اور پھر جتنی زندگی شروع ہوئی وہ اور سلمان۔ اس کی خوبصورتی کے بارے میں اگر کوئی دورائے نہ تھی تو یہی معاملہ سلمان کا تھا۔

وہ دیو مالائی داستان کا یونانی دیوتا جیسا ہوتا۔ بالکل یاسر جیسا اور وہ سکتے میں آ جاتی کہ وہ ہر وقت سلمان کا یاسر کے ساتھ موازنہ کیوں کرتی رہتی ہے۔

اس دن کا آغاز معمول کی طرح ہوا۔ جب اس کی آنکھ کھلی تو واش روم سے شادری کی آواز آرہی تھی۔

”یہ یاسر کون ہے؟“ غصے سے اس کے کہ وہ واش روم چلتی۔

”یہ یاسر کون ہے؟“ غصے سے اس کے کہ وہ واش روم چلتی۔

سلمان نے پوچھ لیا۔ اس کا دل اچھل کر حلق میں اٹک گیا۔

یاسر.....

”یاسر چھوٹا سا لڑکا ہے۔ ہمارے گھر کا سودا سلف لانا ہے۔“

”کیا صبح اٹھانے کی ذمہ داری اسی کی ہے۔“ پہلے بھی ایک رات میں سے نوٹ کیا اور کل رات بھی ٹم بار بار اس کا نام لے رہی تھیں۔

”جی، جی۔ صبح مجھے اٹھانا ہے۔“ وہ من من بھر کے قدم اٹھاتی واش روم میں چلی آئی۔

واش روم کا ٹائل کھولا۔ سامنے آئینے میں عکس دیکھا۔ وہاں وہ نہ تھی، یاسر تھا اور اس سے کہہ رہا تھا۔

”یوں مت کرو عانت۔ میں تم سے پیار کرتا ہوں۔“

”میں شرمندہ ہوں۔“ وہ یاسر سے کہہ رہی تھی۔

”پارک میں مینار کے پاس تم نے مجھ سے وعدہ کیا تھا۔ کبھی میرا ہاتھ نہ چھوڑو گی۔“ وہ اسے تمام سلسلے میرے نام کرو گی۔

”وہ اسے یاد دلانا چاہ رہا تھا۔“

”میں وعدے کے لیے معذرت چاہتی ہوں۔“

وعدہ خلافی اور معذرت۔ یاسر بے یقینی سے اسے نکتا رہا۔ کیا صرف اتنی سی بات تھی کہ وعدہ خلافی اور معذرت کے الفاظ تلاقی کر دیں۔

”کیوں، آخر کیوں؟“ وہ مردو تھا مگر اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

”مستقبل..... میں اچھا مستقبل چاہتی ہوں۔“

”میں تمہیں اچھا مستقبل دوں گا۔ آسائشوں بھری زندگی دوں گا۔“

”نہیں..... لفظوں کے کل رہائش کے قابل نہیں ہوتے۔“ آئینے میں عکس دیکھ لایا۔ اب اس کا اپنا عکس تھا اور اس کا چہرہ آنسوؤں سے تر تھا۔

اس نے غل پورا کھول دیا۔ پانی پوری رفتار سے بہنے لگا۔ وہ

رہا تو بس یہ کہ پھولوں بھرے راستے مقدر میں ہوں تو اپنے لیے کانٹوں کا سفر منتخب نہیں کرنا چاہیے۔

☆☆☆

سلمان اس کا کلاس فیلو تھا۔ شہر کی مرکزی شاہراہ پر اس کے والد کا بہت بڑا اور بہت مشہور اسپتال تھا۔ لوگ دور دراز کے شہروں سے وہاں علاج کے لیے آتے۔

ایک دن سلمان نے اس سے کہا۔ ”میرے والدین آپ کے گھر آنا چاہتے ہیں۔“

”کیوں؟“

”آپ کے والدین سے میرے لیے آپ کو مانگتے۔“ وہ مسکراتے ہوئے کہہ رہا تھا۔ ”آپ کو اعتراض تو نہیں؟“ وہ پوچھ رہا تھا۔

”نہیں، مجھے اعتراض ہے۔“ اسے کہنا چاہیے تھا اور شاید وہ کہنا چاہتی تھی مگر کہہ نہ پائی۔

اور سلمان کے ابو کا اسی شاہراہ پر تو اسپتال ہے جہاں یاسر اپنا ہسپتال کھولنا چاہتا تھا۔

سلمان کا رشتہ آیا۔ چھ بیٹیوں کے اندر رشتہ طے بھی ہو گیا۔

فائل ایئر کے امتحانات کے بعد ابھی رزلٹ نہیں آیا تھا۔ ابھی اپنے ناموں کے ساتھ ڈاکٹر لگانے میں وقت تھا کہ وہ دونوں شادی کے حسین بدھن میں بندھ گئے۔

شادی پر اس نے سرخ فرائڈ پہنی۔ سلمان کے سیاہ کوٹ سے چھائی ٹائی کا رنگ بھی سرخ تھا اور کاج میں انکے پھول کا بھی۔

سرخ فوہیا ہوتا جوڑے نے ایجاب قبول کے مراحل طے کیے اور عانت دعاؤں کے سائے میں پھولوں سے بنی لمبی سی گاڑی میں بیٹھ کر ایک عظیم الشان گھر سے دوسرے اس سے بھی زیادہ عظیم الشان گھر میں چلی آئی۔

اور یاسر کی گلی کے کٹڑے پر کھڑا اپنے ڈھابے پر بریانی بیچتا رہا۔ آنکھوں میں آئے آنسو صاف کرتا رہا۔

سچ کہتے ہیں کہ انسان کو اپنی اوقات دیکھ کر کام کرنا چاہیے۔ یہاں تک کہ محبت کرنے سے پہلے بھی دیکھ لے کہ اس کی جیب اس محبت کی قفل ہے کہ نہیں۔

میں وعدہ کرتی ہوں۔

تم سے زندگی کی آخری سانس تک محبت کروں گی۔

ہر دھک کھانے بانٹوں گی۔

کبھی تمہارا ہاتھ نہ چھوڑوں گی۔

☆☆☆

ہوئے آگے بڑھی۔

اگلے درخت پر آڑو سجے تھے مگر کچھ سوچ کر اور آگے بڑھ گئی۔

اگلے درخت پر سرخ انار تھے اور اس سے اگلے درخت پر پیلے آم۔ دونوں پھل اپنی خوبوں میں بے مثال تھے مگر اس نے وہ بھی تو ذکر نہ کھائے۔

اگلا درخت عام درختوں جیسا ہی تھا مگر اس پر لگے پھل عجیب تھے۔ اس نے پہلے ایسا درخت نہیں دیکھا تھا۔ اس درخت پر کمری ٹوٹ گئے تھے۔ سرخ، نیلے اور

برے۔ وہ حیران ہوئی۔ کیا درختوں پر بھی پیسے لگتے ہیں؟

اور وہ لوہی جو اسٹریمری، آڑو، انار اور آم کھانے کے لیے نہ رکھی، پیسے دیکھ کر اس کا دل دھکنے لگا اور اس نے

درخت سے پیسے توڑ لیے۔ اتنے سارے پیسے کہ سنبھالنا مشکل ہو گیا۔ وہ زمین پر گرے اور وہ انہیں اٹھائی۔ جب

وہ زمین پر گرے ہوئے ٹوٹ اٹھائی تو پیسے سے ہاتھ میں "جوہر ٹوٹ" گر جاتے۔ کتنی ہی دیر تک یہ سلسلہ چلتا رہا۔

بات نہیں تک محدود ہوئی تو بھی خیر تھا مگر یہ کیا..... اب، ہلکی ٹوٹ کھارہی تھی۔

سبز ٹوٹ منہ میں ڈالا، اسے چبا یا اور گل گئی۔ نیلا ٹوٹ منہ میں ڈالا اور اب وہ اسے چارہ ہی تھی۔

کیا ان ٹوٹوں کا ڈاکٹر اسٹریمری، آڑو، انار اور آم سے بہتر تھا؟

اور پھر جب اچانک عاتش کی آنکھ کھلی تو اس نے خود کو شمع اندھیرے کمرے میں لیٹے پایا۔

زیر پاؤں کا بلب کمرے کے باؤل کو خوبناک بنا رہا تھا۔ اس کا شوہر اس کے پہلو میں اس کی طرف رخ کیے لیٹا تھا اور وہ سیدھی لیٹی اندھیرے میں چھت کو کھنکھاتی تھی۔

یہ کیسا خواب تھا؟ اور اس نے چل کھانے کے بجائے کمری ٹوٹ کھانے کو کیوں ترجیح دی؟ دماغ کچھ سوچنے سمجھنے کی صلاحیت سے مفقود ہوا جاتا اور آن کی آن میں آنکھوں میں جھل آنسو چپکنے لگے۔

کیا ہو چکا تھا، کیا ہو رہا تھا، اور کیا ہونے والا تھا۔ وہ مسلمان کے قریب ہوئی اور اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا۔

مسلمان اس کا شوہر تھا۔ اس کا انتخاب۔ وہ بہت اچھا اور خیال رکھنے والا تھا۔ پھر کیوں وہ بے چین و بے گل تھی اور یہ کیسے خواب و خیال اس کو ڈرتے رہتے تھے۔

ایک عہد وفا تو اس نے نہ بچایا تھا۔ کیا وہ زندگی کا

سب سے اہم فیصلہ کرتے ہوئے تھوڑی سی غرض نہ دکھانے لگی تھی۔ آنکھیں بند کر کے اس نے سونے کی کوشش کی مگر یاسر کا سر اچھا پڑا آنکھوں کے سامنے آ گیا۔

وہ اٹھ بیٹھی اور رونے لگی۔ مسلمان کی آنکھ کھل گئی۔ اس نے بیوی کو پیٹتے ہوئے اور روتے ہوئے پایا۔ "کیا ہوا عاتش؟" وہ پریشان ہونے لگا۔

"میرے پیٹ میں درد ہو رہا ہے۔" وہ روتے ہوئے کہہ رہی تھی۔

اور مسلمان عاتش کو کھنکھانے لگا۔ اگر پیٹ میں درد تھا تو اس کے دونوں ہاتھ سینے پر دل والی جگہ پر کیوں تھے تھے؟

☆☆☆

ناشتے کی میز پر اب صرف وہ میاں بیوی بیٹھے تھے۔ والد صاحب اسپتال روانہ ہو چکے تھے۔ والدہ صاحبہ اپنے

کمرے کی طرف۔ یوں تو وہ دونوں اب ہاؤس چاب کر رہے تھے اور انہیں بھی اسپتال کی طرف روانہ ہونا چاہیے تھا مگر کہہ

سن کر مسلمان نے اپنی اور عاتش کی چھٹی منظور کر لی تھی۔ "کمرے میں چلیں۔" اس نے چائے کے دو کپ

تھامے اور اٹھ کھڑا ہوا۔ عاتش نے بھی اس کی تقلید کی۔ کمرے میں آکر عاتش بیڈ پر بیٹھ گئی۔ مسلمان کرسی کھینچ

کر اس کے سامنے بیٹھا گھونٹ گھونٹ چائے پیتے لگا۔ "تم مجھے فرسٹ ایئر سے اچھی لگتے تھے۔ تم تھی ہی

اتنی اچھی....." مسلمان کی نگاہیں اس کے چہرے پر جمی تھیں۔ "ہر انسان خوشگوار زندگی چاہتا ہے۔ تمہیں دیکھتا تو

احساس ہوتا کہ ہاں تم ہی وہ عورت ہو جس کے ساتھ میں ساری زندگی گزار سکتا ہوں۔ اسی لیے تو تمہارے ہاں رشتہ

بجایا۔" چائے ختم ہو گئی۔ مسلمان نے کپ ایک طرف رکھ دیا۔ عاتش چپ چاپ سر جھکا کر بیٹھ رہی تھی۔

"جب زندگی ایک ساتھ گزارنی ہے تو دکھ دکھ بانٹنے چاہئیں۔" مسلمان نے اس کا ہاتھ تھام لیا اور زنی سے دبانے

لگا۔ "کیا تم میری بات سے اتفاق کرتی ہو؟" عاتش کو اثبات میں سر ہلانے میں بھی دقت ہوئی۔

"میں بھی ڈاکٹر ہوں اور تم بھی..... جب میں نے جان لیا کہ تمہارے سر میں درد ہوتا ہے، نہ پیٹ میں تو اب

چھپانے کا کوئی فائدہ نہیں۔"

عاتش نے سر اٹھا کر مسلمان کو دیکھا مگر کراسے دیکھتی رہی۔ "تو وہ دکھ جو تمہیں ادھ موا کیے دیتا ہے مجھ سے

بانٹ لو۔ میں اچھا غمگسار ساتھی ہوں۔ تمہارے زخموں پر مرہم رکھوں گا۔" وہ ہاتھ دبا تے ہوئے نرمی سے کہہ رہا

تھا۔ "اور اگر ایسی بات ہے جو شوہر سے نہ کہی جاسکے تو دوست سے کہہ لو۔ میں تمہارا چھا دوست بھی ہوں۔"

عاتش کی نگاہیں مسلمان کے چہرے سے نہ ہٹتی تھیں۔ جانے وہ کیا تلاش کر رہی تھی اور پھر ان آنکھوں میں آنسو

بھرنے لگے اور وہ ایک بار پھر پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔ اس کا شوہر کتنا اچھا تھا۔ ہر دکھ پاٹنے کے لیے تیار اور

وہ خود..... شاید وہ مسلمان کے قابل بھی نہ تھی۔ "مجھ سے غلط فیصلہ ہو گیا....." روتے ہوئے وہ

بتانے لگی۔ مسلمان نرم تاثرات لیے اسے دیکھتا رہا۔ "میں اس سے محبت کرتی تھی۔ وہ مجھ سے محبت کرتا

تھا۔ اہی کہتی تھیں محبت کے بغیر گزارہ ہو جاتا ہے۔ بیویوں کے بغیر گزارہ نہیں ہوتا۔ اس لیے میں نے تمہارے لیے

ہاں کہہ دی مگر اب....." وہ روتی رہی اور بتاتی رہی۔ "میرا محبت کے بغیر گزارہ نہیں ہوتا۔ یہ دولت و

آسائشیں اس کا فہم البدل نہیں۔ میں تم میں اسے ڈھونڈتی ہوں۔ مجھے وہ ہر دقت یاد آتا ہے۔" ہاتھ پر گرفت ڈھیلی

ہوئی اور مسلمان نے اس کا ہاتھ چھوڑ دیا۔ اگلے پل اس کے دل میں آیا کہ عاتش کو چپنا سے

پکڑے اور کھینچا ہوا کمرے سے باہر دھکیل دے اور کل اس کے کہ وہ ایسا ہی کرتا اس نے خود پر قابو پایا۔ وہ برا آدمی نہیں

تھا۔ برا خیال آتا برے ہونے کی نشانی نہیں۔ برے ہونے کی نشانی یہ ہے کہ آپ اس خیال پر عمل بھی کر گزریں۔

وہ اٹھا اور عاتش کے پہلو میں جا بیٹھا اور اس کا سر اپنے کندھے سے لگا لیا۔

"محبت میں بڑی طاقت ہوتی ہے۔ وہ انسان کو کہیں کا نہیں چھوڑتی۔" وہ عاتش کا سر تھپک رہا تھا۔ عاتش بلک

بلک کر رو رہی تھی۔ "مگر محبت سے بھی ایک طاقت ور چیز اور ہے۔ اور وہ ہے نکاح۔ وہ بندھن جس میں تم اور میں بندے ہیں۔" وہ

آہستہ آہستہ کہہ رہا تھا۔ "اسے بھولنے کی کوشش کرو اور مجھے یاد رکھنے کا طریقہ ڈھونڈو۔ اب کچھ بھی نہیں لوٹا یا جاسکتا کہ تمہارا

نکاح مجھ سے ہو چکا ہے۔ محبت پس پشت چلی گئی ہے۔" "میں اسے بھولنے کی کوشش کرتی ہوں مگر....." وہ

روتی رہی اور کہتی رہی۔ "کوشش جاری رکھو۔" مسلمان اس کا سر تھپک رہا تھا، عاتش روئے جاری تھی۔

"میں تمہارے ہر دکھ کا ازالہ کروں گا۔" وہ کہہ رہا تھا۔ ☆☆☆

خوبصورت باتیں

☆ انسان کی نرمی کو اس کی کمزوری نہ سمجھو کیونکہ پانی سے نرم کوئی چیز نہیں لیکن اس کی طاقت بھی چٹانوں کو زبردہ زبردہ کر دیتی ہے۔

☆ ماں، باپ، استاد اور سکالوں کی اہمیت اپنی جگہ مگر سبق دہی یا درہتا ہے جو دقت اور لوگ سکھاتے ہیں۔

☆ تعلیم کی کی کو تربیت اچھی طرح ڈھانپ لیتی ہے لیکن تربیت کی کی کو تعلیم بھی پورا نہیں کر سکتی۔

☆ کسی کی پہچان علم سے نہیں بلکہ ادب سے ہوتی ہے کیونکہ علم تو انہیں کے پاس بھی تھا لیکن وہ ادب سے محروم تھا۔

☆ اپنی عمر اور پیسے پر کبھی اعتبار نہ کرنا کیونکہ جو چیز مکتبی میں آجائے وہ لازماً قیمتی ہونے والی ہے۔

مرسلہ: عبدالجبار رومی انصاری قصور

بڑے لوگوں کی بڑی باتیں

☆ قول بے عمل اور علم بے اخلاص ناقابل قبول ہے۔

☆ جو عالم زاہد نہ ہو، وہ اپنے زمانے والوں پر عذاب ہے۔

☆ مصیبتوں کو چھپاؤ کہ اس سے قرب حاصل ہوتا ہے۔

☆ زیادہ ہنسومت..... کہی غفلت کا اثر ہے اور اس سے دل مردہ ہو جاتا ہے۔

☆ اللہ تعالیٰ کی رحمت سے ناامید نہ ہو۔ خوف اور امید کے درمیان زندگی گزارو۔

☆ مومن جس قدر بڑھا ہوتا ہے، اس کا ایمان اتنا طاقت ور ہوتا ہے۔

☆ وہ شخص کتنا بد نصیب ہے جس کے دل میں جانداروں کے لیے رحم نہیں ہے۔

☆ وہ رزق جس کی فراخی پر شکر نہ ہو اور معاش کی تنگی جس پر صبر نہ ہو، فتنہ بن جاتی ہے۔

مرسلہ: ریاض بیٹ، حسن ابدال

ہوا کیں چل رہی تھیں۔ اندر آتش دان کے پاس زوہلی اور نانی ایک ہی شال اوڑھے بیٹھی ہاتھ سینک رہی تھیں۔ کالج کی پڑھائی سے فارغ ہونے کے بعد چھٹیاں گزارنے وہ نانی کے پاس چلی آئی تھی۔ نانی کی باتیں اسے ہمیشہ اچھی لگتیں اور آج نانی نے اسے اپنی زندگی کی کہانی سنائی تو وہ ششدر رہ گئی۔

”یوں تو اپنے بچوں کو اپنی جوانی کی کج ادائیگوں کے بارے میں نہیں بتانا چاہیے مگر میں نے اس لیے بتایا کہ تم اس قصے سے کچھ سیکھ پاؤ۔“ عائشہ کی آواز میں لرزش تھی۔ اس عمر میں رعشے کا مرض اس کے چہرے اور ہاتھوں کے ساتھ ساتھ آواز میں بھی لرزش لے آیا تھا۔

”تمہارے ماما بہت عظیم انسان تھے۔ انہوں نے ہمیشہ میرا خیال رکھا۔ جب انہیں میں نے اپنی محبت کے بارے میں بتایا تو کوئی عام مرد ہوتا تو اسی وقت مجھے گھر سے نکال دیتا مگر تمہارے ماما نے مجھے سنبھالا۔ میرے ٹوٹے ہوئے وجود کو سمیٹا اور یہ انہی کی محبت تو تھی کہ مجھے ان سے محبت ہونے میں وقت نہ لگا۔ اور ہم نے بہت خوبصورت زندگی گزاری۔“ عائشہ رک گئی اور زوہلی نانی کا جھریوں بھرا چہرہ دیکھتی رہی۔

”اور وہ صاحب.....“ زوہلی نے سوال کیا۔ عائشہ نے ایک طویل سانس بھری۔

”اللہ نے یاسر کو بخت لگا دیا۔ اس کا مرکزی شاہراہ پر ہمارے اسپتال سے چند کلومیٹر کے فاصلے پر شہر کا سب سے مشہور ہوٹل ہے۔ اب یہاں آئی ہو تو کزنز کے ساتھ وہاں سے کھانا کھا آتا۔ پورا شہر اس ریسٹورنٹ کے کھانوں کا گردیدہ ہے۔“ عائشہ اتنا کہہ کر خاموش ہو گئی اور زوہلی نانی کے مزید بولنے کا انتظار کرنے لگی۔

”زندگی اچھی گزر گئی مگر دل میں ایک خلش رہ گئی کہ میں محبت نہ کرتی اور اگر محبت کی تو بے وفائی نہ کرتی۔ جو انسان کے نصیب میں ہو وہ مل کر رہتا ہے۔ آج یاسر کا بھی تو شہر کا سب سے مشہور ہوٹل ہے۔ خاندان کی ایک تقریب میں اس کی بیوی سے ملاقات ہوئی تھی۔ اس کے گلے کے لاکٹ میں ہیرا و تک رہا تھا۔ زندگی کے فیصلے کرتے ہوئے محض ظاہری اسباب نہیں دیکھنے چاہئیں۔ دل کی بات بھی سن لینی چاہیے۔“ اور کاش بزرگوں کی سماعت کے ساتھ ساتھ نگاہ میں بھی گہرائی اور جوہر شناسی کی بصیرت ہو تو بچوں کو اتنی اذیتوں سے نگزرتا پڑے۔“

وہ خوب سخی سنواری تھی مگر اتنی تیار ہونے کے بعد بھی وہ جڑی اجڑی لگ رہی تھی۔

یاسر کاؤنٹر پر دیکھنے کے سامنے کھڑا تھا۔ وہ اس کے مقابل آن کھڑی ہوئی۔

”یاسر! میں تمہارے بغیر نہیں رہ سکتی۔“ عائشہ کی آنکھوں میں آنسو تھے۔

یاسر ہاتھ میں بیچ لیے اسے دیکھتا رہا۔ ڈھابے میں کام کرنے والا بیڑا اور گاہک چہ میگوئیاں اور اشارے کرنے لگے۔

”اگر میں طلاق لے لوں تو کیا تم مجھ سے شادی کر لو گے؟“ یہ عائشہ کا سوال تھا۔

ہوا رک گئی۔ سورج بجھ گیا۔ اندھیرا چھانے لگا مگر یاسر ہوش میں آیا اور خود کو جواسوں میں لاتے ہوئے بولا۔

”یہ زندگی ہے کوئی کیل تماشائیں۔ تم طلاق یافتہ ہو جاؤ یا پھر بیوہ۔ میں تم سے بھی شادی نہیں کروں گا۔ چلی جاؤ یہاں سے۔ بھرے بازار میں تماشا مت لگاؤ۔“

”میں نہیں جاؤں گی۔“ وہ وہیں زمین پر بیٹھ گئی۔ یاسر نے مڑ کر ایک نظر گاہکوں کو دیکھا۔ اب تو لوگ دکان کے باہر رک کر یہ منظر دیکھنے لگے تھے۔

”میرے ساتھ آؤ۔“ یاسر نے اس سے گاڑی کی چابی لی۔ اپنے اسٹش سے دکان سنبھالنے کا کہا اور اسے لے کر چل پڑا گاڑی عائشہ کے سیکے کے دروازے پر روکی اور اسے لیے اندر چلا آیا۔ رقیہ اپنے بالوں کے لیے کوئی بیوٹی ٹپ استعمال کر رہی تھیں۔ عائشہ کو یاسر کے ساتھ آتے دیکھ کر کبک رک رہ گئیں۔

”اپنی شادی شدہ بیٹی کو سنبھالیں۔ میری دکان پر آگئی تھی۔ لوگوں کو بغیر ٹکٹ کے فلم دکھا دی۔“ وہ زیادہ دیر نہ رکھا۔ عائشہ روٹی کر لاتی رہ گئی مگر وہ چلا گیا۔

یہ نہیں تھا کہ اسے عائشہ سے محبت نہ تھی۔ اس کا دل بھی دھکنے لگا تھا اور کی بات تو اس نے بھی سوچا۔ ہاں تمام لے عائشہ کا ہاتھ مگر یہ زندگی تھی اور وہ یاسر تھا۔ جب وہ اس کے پیچھے ہاتھ دھو کر پڑ گیا تھا اور اسے ہراساں کیا کرتا تھا۔ وہ..... کوئی بہت پرانی بات تھی کہ وہ بھول چکا ہوتا۔

اس رات وہ خدیجہ سے کہہ رہا تھا۔

”امی! کوئی مناسب سی لڑکی دیکھ کر میری شادی کر دیں۔ مزید تاخیر مت کریں۔“

☆☆☆

سردیوں کا موسم تھا۔ ٹھنڈا اور خشک۔ ماہر سرد

مارچ 2018ء

150

سپینس ڈائجسٹ



امانت

شاہ زین رضوان

معاشرہ چاہے مشرقی ہو یا مغربی... ماں کے احساسات و جذبات اور ممتا کی چاشنی قدرت نے یکساں رکھی ہے۔ وہ بھی ایک ایسی ماں تھی جس کی گود حالات نہ بھرنے کے باوجود خالی رکھی... مقدر کے چکر اسے ہی کہتے ہیں کہ جستجو اپنے مطلوبہ ہدف تک لا کر بھی اسے نظروں سے اوجھل کر دیتی ہے... لیکن اس کا شک جب یقین میں ڈھلا تو وہ بھی مجسم حقیقت بن کر اس کے پاس آگئی۔

محبت کے رشتوں میں گندمی ممتا کی تڑپ اور لگن کی روداد

اس سے پہلے مجھے زندگی میں صرف ایک مرتبہ سوال کرنا پڑا تھا اور اس مرتبہ بھی صورت حال کچھ زیادہ مختلف نظر نہیں آ رہی تھی۔ میں ایک امید و نیم کی کیفیت میں اس کے جواب کا انتظار کر رہی تھی..... بالآخر چند لمحوں کی خاموشی کے بعد اس نے سکوت توڑا۔

”کیتریں؟“ وہ ٹھنڈی سانس لیتے ہوئے بولا۔

”یہاں آنے سے پہلے تم کتنی جگہ کوشش کر چکی ہو؟“

”دو جگہ۔“ میں نے جواب دیا۔

مارچ 2018ء

151

سپینس ڈائجسٹ

اس نے اپنے سامنے پڑا ہوا پرت آؤٹ اٹھا یا اور بولا۔ ”تمہاری لیاقت یقیناً اب ٹوٹ ہے۔ بلکہ تمہاری تعلیم اس ملازمت کے لحاظ سے زیادہ ہے تم نے اپنے آپ کو بہت سنبھال کر رکھا ہے اور دیکھتے ہیں بہت اچھی لگی ہو لیکن اس کے باوجود تمہیں ناکامی ہوئی۔“

میں نے تائید میں سر ہلادیا، گوکہ وہ غلط کہہ رہا تھا۔ میں نے آؤٹی اوٹ کے بیچے ایک پرانا پلاؤز پہن رکھا تھا جس کی آستینیں کثرت استعمال سے گھس گئی تھیں۔ میری پتلون بھی ٹھٹھکی پر سے پھٹ گئی تھی اور جوتوں کی بھی لمبو بیش بھی حالت تھی۔

”میں تمہاری مدد کرنا چاہتا ہوں۔“ وہ بولا۔
”پھر کیا مسئلہ ہے؟“ میں نے یہ جینٹل ہونے بولے کہا۔

”یہ میرا خاندانی کاروبار ہے اور میں اپنے کام سے بے مقامی آبادی پر انحصار کرتا ہوں، اگر میرے بڑوں کو معلوم ہو گیا کہ تم یہ کام کرتی ہو تو میرے لیے مصیبت ہو جائے گی۔“

میں نے اس سے انکاری ہوئی اور اس کی طرف منہ کر کے بولے۔ ”میرا بڑا بڑا وقت کا شہر ہے۔ میں نے یہ سنا ہے کہ یہ شہر بہت ہی ترقی یافتہ ہے۔“
”تم کوئی خاص شہر بتاؤ۔“ میں نے کہا۔
”وہ شہر کونسا ہے؟“

”میں نے اپنا ہاتھ دھو کر دیکھا۔“ میں نے کہا۔
”تم یہاں کیوں آئیں گی؟“
”میں نے یہاں آنا چاہا تھا۔“ میں نے کہا۔
”تم یہاں کیوں آئیں گی؟“

”میں نے یہاں آنا چاہا تھا۔“ میں نے کہا۔
”تم یہاں کیوں آئیں گی؟“

”میں نے یہاں آنا چاہا تھا۔“ میں نے کہا۔
”تم یہاں کیوں آئیں گی؟“

”میں نے یہاں آنا چاہا تھا۔“ میں نے کہا۔
”تم یہاں کیوں آئیں گی؟“

ہاتھ میں خریداری کا تھیلہ تھا۔ مجھے اس کی شکل کچھ جانی پہچانی لگی لیکن کچھ یاد نہ آیا کہ وہ کون تھی۔ اس لیے میرا بدحواس ہونا فطری تھا۔

وہ میرے پاس آ کر رک گئی اور بولی۔ ”تمہارے ہاتھ خون سے رنگے ہوئے ہیں۔“

اس سے پہلے کہ میں کوئی جواب دیتی، اس نے اپنا تھیلہ پاؤں کے پاس گرادیا۔ اس میں رکھی ہوئی چیزیں سڑک پر بکھر گئیں۔ درہا چلتے لوگ یہ سوچ کر رک گئے کہ شاید اسے مدد کی ضرورت ہو لیکن اس نے ان لوگوں پر کوئی توجہ نہیں دی۔ اس نے میری چھائی پر انگلی مارتے ہوئے کہا۔ ”جہاں سے آئی ہو، وہیں چلی جاؤ۔ یہاں تمہارے لیے کوئی جگہ نہیں ہے۔“

مارے شرمندگی کے بری زبان ننگ ہوئی اور میں صرف اتنا ہی کہہ سکی۔ ”بھلا افسوس۔“

اس نے مجھے گھور کر دیکھا اور میں تیز تیز قدموں سے آگے بڑھی۔ گھر پہنچ کر بیٹھے یاد آیا کہ وہ عورت جوڑی ہاتھ لگی جو میرے گھر مقامی کا کام کرتی تھی۔ وہ غنٹے میں تین مرتبہ آتی تھی۔ اس نے تین یا دو سال تک میرے گھر کا کام کیا تھا۔ میں اس کے سادہ انداز پر وہ پہچان لیتی تھی کیونکہ جہاں تک بیٹھے یاد پڑتا ہے، اس کے پاس مجھ سے نفرت کر کے کسی کوئی وجہ نہیں تھی لیکن جب کہ کل نے کہا۔ ”کوئی نہیں، پتا نہ کیا ہو جائے جب لوگوں کو تمہارے بارے میں پتا چلے گا۔“ میں یہ سوچتے پر مجبور ہوئی کہ شاید میں مقامی آبادی سے تھوڑے مدلل کے لیے تیار نہ تھی جو بھی پرسکون اور باوقار ہو کر رہتی تھی۔

میں نے لباس تبدیل کیا اور پتھر پر لیٹ کر آنکھیں بند کر دیں اور جلد ہی مجھے نیند آنے لگی لیکن اچانک ہی جھل منزل سے شور کی آوازیں آئے۔ ننگے پاؤں کے عورتوں کی نسبت زیادہ شدید تھیں۔ نیچے رہنے والا وہی آواز میں گانے سنا کرتا تھا۔ میں نے اس کی شکایت بھی کی لیکن مجھے بتایا گیا کہ اس سلسلے میں وہ کچھ نہیں کر سکتے۔

آوازیں مسلسل آ رہی تھیں۔ میں نے اپنے کان بند کر لیے۔ مجھے یہ کہا گیا تھا کہ نیچے رہنے والے شخص سے الجھنے کی کوشش نہ کروں کیونکہ وہ ذہنی دباؤ کا شکار ہے۔ بہر حال اسے خطر کان نہیں سمجھا جاتا۔ اس سے غیر ضروری طور پر ذہنی مول لینا عقل مندی نہ ہوگی۔

مجھے یہاں رہتے ہوئے گیارہ دن ہو گئے تھے لیکن ابھی تک اس کی شکل نہیں دیکھی تھی۔ وہ رات کے

اندھیرے میں اپنی کار میں بیٹھ کر نہیں جاتا اور سورج نکلنے سے پہلے واپس آ جاتا، اس کی گولہ باری ہمیشہ دوپہر ایک بجے کے قریب شروع ہوتی۔ لگتا تھا کہ کوئی چیز چھت سے گر رہی ہے۔

میں نے اپنے لیے لٹچ تیار کیا جو دو اسٹیل ہوئے انڈوں، ایک توس اور ایک سیب پر مشتمل تھا اور ہستر کے کنارے رکھے ہوئے الامر کلاک کو آن کر دیا۔ ضرورت کی ہر چیز اس جگہ موجود تھی۔ ایک ہی کمرے میں بیڈ روم، لیونگ روم اور کچن تھا۔ اس سے متصل ایک ہاتھ روم تھا جس میں ایک چھوٹی سی الماری تھی تاہم یہ جگہ گرم صاف اور محفوظ تھی۔

کھانے کے دوران آوازیں آتا بند ہو گئیں۔ لٹچ سے میرا پتھر بگرا اور اب مجھے شام تک کچھ کھانے کی ضرورت نہیں تھی۔ میں نے ایک بار پھر گھڑی دیکھی گوکہ میں اچھی طرح جانتی تھی کہ مجھے کس وقت روانہ ہونا ہے۔ اس کے باوجود میں نے ایک بار پھر وقت کا حساب لگانا شروع کر دیا۔ پانچ منٹ تیار ہونے کے لیے اور پچیس منٹ پیدل چل کر منزل تک پہنچنے کے لیے۔

جیسے ہی میں نے کھانا ختم کیا، آوازیں آنا پھر شروع ہو گئیں۔ یوں لگا جیسے میرے پیروں کے نیچے ہی کچھ ہو رہا ہے۔ نیچے رہنے والا زور زور سے کوئی چیز چھت میں مار رہا تھا۔ اس نے سات یا آٹھ مرتبہ ایسا کیا اور میں مجبور ہو کر کمرے سے باہر نکل آئی۔ اس کے باوجود مجھے ایک لمحے کے لیے اس کا دروازہ کھلکانے میں ہچکچاہٹ محسوس ہوئی۔ دس فٹ کے فاصلے پر ایک اور دروازہ کھلا۔ ایک پورٹری عورت اندر سے جھانک رہی تھی۔ میں نے اس کے پاس جا کر پوچھا کہ سامنے والے گھر میں کون رہتا ہے اور یہ آوازیں کیسی ہیں۔ اس نے کوئی جواب دیے بغیر دروازہ بند کر دیا۔

مجبوراً مجھے سامنے کا دروازہ کھلکانا پڑا لیکن کوئی جواب نہیں آیا۔ دوسری بار میں نے زور سے دستک دی۔ ایک آدمی باہر آیا۔ اس نے ایک ٹریک سوٹ پہن رکھا تھا جس پر کسی کلب کا مونو گرام بنا ہوا تھا۔ وہ مجھے ایک ایسا جرائم پیشہ شخص لگا جو اپنے آپ کو قانون سے بالاتر سمجھتا ہو۔

”یہ خرابی تم لگا رہے ہو؟“
اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔ اس کے ہونٹ بند تھے۔
میں نے دوبارہ کہا۔ ”تم میرے فرش پر تھوڑے برسارہے ہو۔“

”تم میرے دروازے پر دستک دے رہی تھیں؟“
”کیونکہ تم میرے فرش پر خرابی لگا رہے تھے۔“
”تمہیں غلطی ہوئی ہے۔“ اس نے جھرے پر بد نما مسکراہٹ لاتے ہوئے کہا۔ ”میں تو باس پر پکڑا لپیٹ کر چھت صاف کر رہا تھا۔“

مجھے دیر ہو رہی تھی۔ اس لیے اس سے الجھنا مناسب نہ سمجھا اور اسکول کے لیے روانہ ہو گئی۔ سرد ہوا کے تھپڑے میرے چہرے پر لگ رہے تھے۔ میں نے پرانی جینز اور پنڈلیوں تک لمبا اور کوٹ پہن رکھا تھا۔ یہ کوٹ میں نے ایک بڑے شاٹنگ مال سے خریدا تھا۔ میں اس زمانے میں مانچسٹر سے خریداری کیا کرتی تھی۔ یہ کوٹ اسی زمانے کی یادگار تھا لیکن اب میرے پاس کچھ نہیں تھا سوائے میری بیٹی الازہ کے۔ وہ بھی مجھ سے دور ہو گئی تھی اور میں اس کی واپسی کا دعویٰ نہیں کر سکتی تھی۔

اس کی پیدائش قبل از وقت ہو گئی تھی۔ وہ دس ہفتے اسپتال میں رہی۔ اس کے پچھوڑے کام نہیں کر رہے تھے۔ لگتا تھا جیسے قحطی کے چھوٹے پر ہوں۔ جو میں اور میں نے اسپتال کے قریب ایک کالج کرائے پر لیا تاکہ ہم اس کے پاس رہ سکیں۔ وہ تین ماہ کی ہو گئی لیکن اس کا وزن چھ پونڈ سے بھی کم تھا۔ جب لوگ اس کی عمر پوچھتے تو میں جھوٹ بولتی کہ یہ نوزائیدہ بچی ہے کیونکہ میں لوگوں کے سوالات سن سن کر نگاہ اچکی تھی۔ بس میرا دل چاہتا کہ اسے سینے سے لگائے رکھوں۔

میرے پاس اس کی آخری تصویر اس وقت کی ہے جب وہ چار سال کی تھی۔ یہ تصویر ساحل سمندر پر لی گئی تھی۔ یہ دس سال پہلے کی بات ہے۔ اٹھارہ مہینوں میں تین خاندانوں نے اس کی پرورش کی پھر ایک جوڑے نے اسے گود لے لیا۔ میرے والدین کا انتقال ہو گیا تھا اور بھائی نے میری بیٹی کو اپنے پاس رکھنے سے صاف انکار کر دیا تھا۔ اس جوڑے نے بچی کو گود لینے کے لیے جوش رکھیں وہ میں نے قبول کر لیں۔ یہ کوئی مشکل فیصلہ نہیں تھا کیونکہ شائد اطفال میں اسے گھر کا ماحول نہیں مل سکتا تھا۔ ویسے بھی میں جیل کی دیواروں کے پیچھے قید تھی۔ اس لیے اس سے دور رہنا میرے لیے مشکل نہیں تھا لیکن رہائی کے بعد یہ میرے لیے ایک پہچان بن گیا۔

میں اپنے آپ کو سمجھاتی رہی کہ اسے صرف ایک نظر دیکھنا چاہتی ہوں تاکہ مجھے معلوم ہو جائے کہ وہ کس حال میں ہے پھر میں یہاں سے کہیں اور جا سکتی ہوں۔ گزشتہ چار

سال سے مجھے اس کی کوئی خبر نہیں ملی تھی۔ اس سے پہلے مجھے لیٹرکس اسکیم کے تحت سال میں ایک مرتبہ اس کا خط مل جاتا تھا۔ یہ اسکیم جیل میں قید ماؤں، ان کے بچوں اور انہیں گود لینے والوں کی مدد کے لیے شروع کی گئی تھی لیکن پھر بعض وجوہات کی بنا پر یہ اسکیم ختم کر دی گئی۔ ایک خیال یہ بھی تھا کہ اگر یہ بچے اپنے باقی سے جڑے رہے تو ان کے مستقبل پر منفی اثرات مرتب ہوں گے۔

یہ غلط سوئٹھ سروسز کے ذریعے آتے تھے۔ مجھے یہ بھی معلوم ہوا کہ ڈسٹریبیوٹر کے ذریعے اس کے بارے میں لکھتے ہوئے پریشانی کا سامنا تھا۔ اس کے باوجود میں الزبتھ کو خط لکھتی رہی۔ میں نے اس سے معذرت کرنے کے بجائے وضاحت کرنے کی کوشش کی۔ اسے بتایا کہ میں اس سے بہت محبت کرتی ہوں لیکن میرے پاس اس کے علاوہ کوئی راستہ نہیں تھا اور یہ کہ میں ہر روز اسے یاد کرتی ہوں اور کبھی نہیں بھول سکتی۔ بعد میں مجھے معلوم ہوا کہ ڈسٹریبیوٹر میرے خط... الزبتھ تک نہیں پہنچائے اور نہ ہی میرے بارے میں اس کو داس کی کوئی تصویر بھیج دی۔ اسکول کے قریب پہنچ کر میں نے ارد گرد کا بخور جائزہ لیا کہ کہیں کوئی مجھے دیکھ تو نہیں رہا۔ میں نے سڑک کے پار ایک ایسی جگہ کا انتخاب کیا کہ کسی کو میری موجودگی پر شک نہ ہو، زیادہ تر والدین کاروں میں آ رہے تھے البتہ صرف ایک عورت سیاہ رنگ کے کتے کے ساتھ پیول آتی ہوئی دکھائی دی۔ پھر وہاں ایک ڈبل ڈیکر بس آ کر رکی لیکن الزبتھ اس میں سوار نہیں ہوئی۔ ممکن ہے کہ وہ اسکول میں ہو یا کوئی ٹھکانا یا یا نیٹ بال کھیلنے کے لیے رک گئی ہو۔

بچے اسکول کے مرکزی دروازے سے باہر آ رہے تھے اور فوراً ہی وہ علاقہ نیوی بلڈو یٹ فارم سے بھر گیا۔ تین لڑکیاں میری طرف آتی دکھائی دیں۔ ان کے بال سیاہ اور وزن غیر معمولی طور پر زیادہ تھا۔ میں نے انہیں غور سے دیکھا لیکن ان میں الزبتھ نظر نہیں آئی۔ اس کے بعد میں مزید پانچ منٹ وہاں کھڑی انتظار کرتی رہی لیکن الزبتھ کا کہیں پتا نہیں تھا۔ مایوس ہو کر میں گھر کی طرف چل دی۔ میں سڑک پار کرنے ہی والی تھی کہ ایک سلیٹ رنگ کی کار میرے پاس آ کر رکی۔ اس میں سے ایک عورت اتری اور مجھے اپنا کارڈ دکھاتے ہوئے پوچھا۔ ”کیٹھرین روڈز؟“ میں نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

”ڈی سی جون آرنلڈ۔ کیا میں تمہیں گھر تک

چھوڑ دوں؟“

”نہیں شکریہ۔ میں پیول چلی جاؤں گی۔“

”پیول جاؤ کیٹھرین۔“ وہ سکرٹے ہوئے بولی۔

اس نے کچھ اس انداز سے کہا کہ میں انکار نہ کر سکی اور اس کے برابر والی نشست پر بیٹھ گئی اور اس نے کار کا رخ میرے گھر کی جانب موڑ دیا۔ میں نے اس سے یہ بھی نہیں پوچھا کہ اسے میرے گھر کا پتا کیسے معلوم ہوا یا یہ کہ وہ مجھ سے کیا چاہتی ہے۔ میں نے زندگی میں یہی سیکھا تھا کہ بلا ضرورت نہیں بولنا چاہیے۔ راستے میں یونہی میں نے گردن نکھا کر دائیں جانب دیکھا تو اس کی شکل جانی پہچانی معلوم ہوئی۔ میں نے محسوس کیا کہ میں اسے جانتی ہوں! ایک بار میں نے اسے الزبتھ کے اسکول میں دیکھا تھا وہ بچوں کو آگ سے بچنے کی احتیاط کے بارے میں بتا رہی تھی۔

جب ہم ونڈر میٹر کے علاقے میں پہنچے تو وہ اپنی گاڑی لائبریری سے متصل کار پارکنگ میں لے گئی اور بولی۔ ”میں تمہیں دروازے کے سامنے نہیں اتاروں گی۔ میں نہیں چاہتی کہ لوگ تمہیں میرے ساتھ دیکھ کر باتیں بنائیں۔“

میری سمجھ میں نہیں آیا کہ اس نے ایسا کیوں کہا لیکن یہ سوچنے کے لیے میرے پاس وقت نہیں تھا۔ میں نے پوچھا۔ ”اب میں جا سکتی ہوں؟“

”ہاں۔“ اس نے کہا۔

میں نے جھک کر اپنا پلاسٹک بیگ اٹھا یا اور دروازہ کھولنے ہی والی تھی کہ وہ بولی۔

”تمہیں معلوم ہے کہ تم اسکول نہیں جا سکتیں؟“

میں اس کا منہ دیکھنے لگی۔ ”تم مجھ سے وعدہ کرو کہ دوبارہ وہاں نہیں جاؤ گی۔“ اس کا لہجہ نرم لیکن پیغام واضح تھا۔ ”تم جانتی ہو کہ بچی کو گود لینے وقت یہ شرط بھی عائد کر دی گئی تھی۔“

میں دوبارہ اپنی جگہ پر بیٹھ گئی اور بولی۔ ”میں کوئی مشکل کھڑی کرنا نہیں چاہتی۔ صرف یہ جانتا چاہ رہی تھی کہ وہ خیریت سے ہے۔“

”ہاں وہ بالکل ٹھیک ہے۔“

میں نے پوچھا۔ ”تم اسے جانتی ہو؟“

”بہت زیادہ تو نہیں لیکن مجھے معلوم ہے کہ وہ کون ہے۔“

”وہ کیسی ہے؟“

”اس کے ساتھ کچھ مسائل تھے لیکن اب وہ ٹھیک ہے۔“

”کیسے مسائل؟“ میں پوچھنے لگی۔

اس نے کندھے اچکا دیے۔ یہ گویا اشارہ تھا کہ اسے اس سے زیادہ بتانے کا اختیار نہیں۔

”کیا وہ اس سے پیار کرتے ہیں؟“ میں نے پوچھا۔

”کم از کم تم اتنا تو بتا سکتی ہو۔“

”ہاں اسے بہت محبت ملتی ہے۔“

”شکریہ۔“ میں نے آہستہ سے کہا۔ ”مجھے بتانے کا

شکریہ۔“

”تم یہ سمجھ لو کہ اگلی بار میں متعلقہ لوگوں کو رپورٹ کرنے پر مجبور ہو جاؤں گی اگر تم نے الزبتھ سے رابطہ کرنے کی کوشش کی۔“

میں نے منہ ہاتھ سے ڈھکے ہوئے کہا۔ ”اس کا مطلب ہے

کہ آج کی ملاقات ریکارڈ نہیں ہوگی؟“

”نہیں لیکن تمہیں وہاں دیکھ لیا گیا ہے۔“

”وہ کون ہے؟“

”ایک عورت نے تمہیں وہاں انتظار کرتے دیکھا۔ وہ

تمہیں پہچان گئی اور سوچنے لگی کہ تم وہاں کیوں کھڑی ہوئی

تھیں۔ اس نے مجھ سے کہا کہ تم سے پوچھوں، اس سے پہلے کہ

کوئی اور تمہاری شکایت کر دے حالانکہ یہ میرا کام نہیں ہے۔“

”میں جانتی ہوں۔“ یہ کہہ کر میں گاڑی سے اتر گئی۔

اگلے روز مجھے ایک جگہ انٹرویو کے لیے جانا تھا۔ یہ

ایک قلمی تنظیم تھی اور اسے ایک خیریت کرنے والی تھا۔ وہ

ان لوگوں کو اچھا اور کام دینا چاہتا تھا جو پسندیدہ ملازم

نہیں سمجھے جاتے۔ اگر میں یہ ملازمت حاصل کرنے میں

کامیاب ہو جاتی تو مجھے ایک نوجوان لڑکے اور ایک عورت

کے ساتھ کام کرنا پڑتا۔ لڑکا نشیات کا عادی تھا اور وہ عورت

دور متبہ چوری کے الزام میں جیل جا چکی تھی۔

میں ان لوگوں کے ساتھ کام کرنے کے بارے میں

خوفزدہ تھی۔ نہ جانے وہ کیسے لوگ ہوں گے۔ جیل میں میرا

واسطہ جن عورتوں سے پڑا وہ بہت ہمدرد، حوصلہ بڑھانے

والی اور دوسروں کے دکھ درد بانٹنے والی تھیں۔ کہتے ہیں کہ

جیل کی پہلی رات بہت بری ہوتی ہے لیکن میں سمجھتی ہوں کہ

جیل جانے کا خوف اس سے کہیں زیادہ برا ہوتا ہے۔ جب

مجھے سزا سنائی گئی تو میں نے بہت سکون محسوس کیا۔ مقدمہ ختم

ہو چکا تھا اور رہائی کا کوئی امکان نہیں تھا۔ میں نے اس سزا کو

اپنی تقدیر کا فیصلہ سمجھ کر قبول کر لیا۔ اس روز میں نے الزبتھ

کے ساتھ ایک ٹھکانہ گزارا اور سے سینے سے چمک کر خوب پیار

کر لیتی رہی۔ پھر وہ چلی گئی۔ سے ہوتا تھا۔ میں جانتی تھی

کہ یہی ہوتا ہے۔

میں اپنی بیٹی، اپنے گھر، اپنی آزادی اور اپنے مستقبل کے امکانات سے محروم ہو گئی۔ مجھے بارہ سال کے لیے جیل بھیج دیا گیا لیکن دس سال بعد مجھے جیل پر رہائی مل گئی۔ اگر میرے اختیار میں ہوتا تو میں اسے دوبارہ کوئی مار دیتی اور ایک بار پھر جیل چلی جاتی کیونکہ سزا یافتہ کے لقب کے ساتھ چنانچہ گوارا نہیں تھا۔

توقع کے برعکس میری ملازمت بہتر ثابت ہوئی۔ انہوں نے مجھے ایک دردی فراہم کی جس میں گرم چیکٹ، جوتے، ادنیٰ ہیٹ، ٹوٹی اور دو جوڑی دستانے شامل تھے۔ ٹیکس اور آشورس کی قسط کٹ جانے کے بعد مجھے ہفتے کے ایک سو ستر پونڈ مل جاتے تھے۔ میں نے پہلی تنخواہ میں موبائل سمیت ضرورت کی کئی چیزیں خرید لیں۔ میں سوچ رہی تھی کہ اب مجھے کسی بہتر جگہ رہائش اختیار کر لینی چاہیے۔

ایک دن جب میں کام سے واپس آئی تو میں نے اس بوڑھی عورت کو دروازے پر کھڑے دیکھا۔ مجھے دیکھ کر وہ اندر جانے لگی۔ میں نے اسے پکارا لیکن وہ نہیں رکی البتہ دوسری بار آواز دینے پر رک گئی۔ میں تیزی سے چلتی ہوئی اس کے پاس گئی اور آہستہ سے کہا۔

”مجھے ڈرنے کی ضرورت نہیں۔“

”میں کسی سے نہیں ڈرتی۔“ اس نے جواب دیا۔

”پھر کیوں مجھ سے بھاگ رہی ہیں؟“

”میں اپنے کام سے کام رہکتی ہوں۔“

”یہی بات تمہارا پڑوسی بھی کہتا ہے۔ کیا تم دونوں

ایک ہی طرح سوچتے ہو؟“

اس نے مجھے گھور کر دیکھا اور بولی۔ ”میں کل یہاں

سے جا رہی ہوں۔ مجھے ایک بہتر جگہ مل گئی ہے۔“

”یہ خوشی کی بات ہے۔“ میں نے کہا۔

”جانے سے پہلے ایک مشورہ دینا چاہتی ہوں۔ اس

کے دروازے پر کبھی دستک مت دینا۔ وہ مہمانوں کا آنا

پسند نہیں کرتا۔“

”مشورے کا شکریہ۔“ میں نے جیسے ہوئے کہا اور

اوپر چلی گئی۔

میں صبح سواست بجے گھر سے نکلتی ہوں کیونکہ

ساڑھے سات بجے اٹھن مجھے پوسٹ آفس کے پاس سے

اپنی گاڑی میں بیٹھنا ہے۔ اس روز جب میں نیچے آئی تو

میں نے دیکھ کہ اس کے فلیٹ کا دروازہ پوری طرح بند نہیں

تھا۔ اس وقت میرے کانوں میں بوڑھی عورت کے الفاظ گونجنے لگے۔ ”وہ مہمانوں کا آ پائند نہیں کرتا۔“

مجھے تجسس ہوا کہ اندر جھانک کر دیکھنا چاہیے۔ میں نے دروازے کو ہلکے سے دھکا دیا تو وہ کھلتا چلا گیا۔ اس کا فلیٹ میرے مقابلے میں بڑا تھا۔ کمرے کے وسط میں ایک کھانے کی میز رکھی ہوئی تھی اور وہ دونوں بازوؤں پر سر رکھے سو رہا تھا۔ فضا میں الکوحل کی بو محسوس ہو رہی تھی۔ میں نے دیکھا کہ شراب کی ایک خالی بوتل اس کی کہنی کے نیچے دلی ہوئی ہے۔ اس کے سامنے کار کی چابیاں اور پچاس پونڈ کے نوٹوں کی دس گڈیاں رکھی ہوئی تھیں۔ میں دیے قدموں اس میز تک گئی۔ میری نظریں اس رقم پر جمی ہوئی تھیں۔

دس منٹ بعد میں ایلن کے ساتھ اس کے ٹرک میں بیٹھی کافی کی رہی تھی۔ ایلن اسٹیزنگ ویل پر انگلیاں مار رہا تھا۔ جب بھی ساندرو کو آنے میں دیر ہوتی، وہ اسی طرح کی حرکتوں سے اپنے جذبات پر قابو پانے کی کوشش کرتا۔ میں نے اس کا دھیان بنانے کے لیے کہا۔ ”کیا میں جاب شیٹ دیکھ سکتی ہوں؟“

وہ نیچے کی جانب جھکا اور اپنی سیٹ کے نیچے سے ایک رول کیا ہوا پرنٹ آؤٹ نکال کر مجھے پکڑا دیا۔ جب میں وہ کاغذ دیکھ رہی تھی، وہ مجھے کن انکھیوں سے دیکھتے ہوئے بولا۔ ”آج ہم سینٹ میری چرچ کی گھاس کاٹیں گے۔ اس کے بعد ٹروٹ بیک برج کی سڑک پر صفائی کریں گے۔“

ٹروٹ بیک برج کا نام سننے ہی میں چونک گئی۔ الزبتھ کا اسکول وہیں واقع تھا۔

”اس کا مطلب ہے کہ آج زیادہ کام نہیں ہے۔“ میں نے اپنی اندرونی کیفیت پر قابو پانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ میں نے جاب شیٹ ایلن کو واپس کی اور کافی کا تھرماں سفری تحفے میں رکھنے سے پہلے اس کا اچھی طرح جائزہ لیا۔ بظاہر میں اپنی ٹوپی تلاش کر رہی تھی لیکن میرا ہاتھ کسی اور چیز کو ٹوٹ رہا تھا۔

”آج پھر تمہیں دیر ہوگی۔“ ایلن نے ساندرو کو دیکھ کر دروازہ کھولتے ہوئے کہا۔

وہ اس کے سونے کو نظر انداز کرتے ہوئے بولی۔

”تم تھارہ منٹ دیر سے آئی ہو۔“ ایلن نے پھر کہا۔

”اور تمہیں یہ گرس نہ ہو رہا ہے۔“ ساندرو نے گاڑی

میں بیٹھے ہوئے کہا۔ ”کتنی اذرا مجھے اخبار تو دینا۔“

میں نے بھی ایلن یا ساندرو سے الزبتھ کے بارے میں بات نہیں کی تھی۔ اس لیے انہیں یہ معلوم نہیں تھا کہ میری ایک بیٹی بھی ہے۔ وہ اس علاقے میں رہتے تھے۔ انہیں یہ تو معلوم ہوگا کہ میں نے اپنے شوہر جولیئن پر گولی چلائی تھی لیکن وہ اس وقت اتنے چھوٹے تھے کہ انہیں کس کی دیگر تفصیلات کا علم نہیں ہوگا۔

ایلن نے اس سڑک پر ٹرک کھڑا کر دیا جو اسکول کی طرف جاری تھی۔ میں سڑک کے کنارے کے ساتھ ساتھ صفائی کر رہی تھی۔ ابھی تیسرا ایک بھرا تھا کہ میں نے کھنٹی کی آواز سنی۔ یہ چلنے کا اشارہ تھا لیکن ایلن ڈرنگ لینے پیڑوں پر پھپھکیا ہوا تھا۔ میں اپنا سامان سینٹ لگی۔ نیچے میرے پاس سے گزر رہے تھے۔ میری نظر ایک موٹی لڑکی پر پڑی جو سڑک کے دوسری جانب چل رہی تھی۔ میں اس وقت خوفزدہ ہوئی جب ایک لڑکا اس کے عقب میں آیا اور اس نے آدھا سبب کا ٹکڑا اس کے سر پر دے مارا۔ میں نے دیکھا کہ اس لڑکی کے گال سرخ ہو گئے اور اس نے اپنی رفتار تیز کر دی۔

”ہائے الزبتھ۔“ لڑکا چلا یا اور میں اپنی جگہ پر جم گئی۔

لڑکی نے اس کی طرف پلٹ کر نہیں دیکھا۔ اس نے سڑک پار کی اور بالکل میرے سامنے آ گئی۔

ساندرو نے میری طرف دیکھا اور آہستہ سے بولی۔

”یہ وہی ہے۔“

”کون؟“

”تمہاری بیٹی۔“ اس نے کہا۔ گویا وہ اس کے بارے میں جانتی تھی۔

لڑکی ٹھوڑا سا آگے بڑھ کر بس کا دروازہ کھلنے کا انتظار کرنے لگی۔ یہ جاننے کے بعد کہ یہی میری بیٹی الزبتھ ہے، مجھے اپنے آپ پر قابو نہ رہا۔ میں اس کی جانب دو قدم بڑھی۔ اس نے مجھے مڑ کر دیکھا تو مجھے لگے جیسے وہ نہیں جانتی کہ میں اس کے قریب آؤں، گوکہ وہ مجھے نہیں جانتی تھی لیکن اس کے چہرے کے تاثرات سے یہی ظاہر ہو رہا تھا پھر مجھے اس روڑ کی بات یاد آ گئی۔ ایسا نہ ہو کہ کوئی مجھے یہاں دیکھ لے اور معاملہ مزید خراب ہو جائے۔ میرے بڑھتے ہوئے قدم رک گئے اور میں واپس ٹرک پر آ گئی۔ گھر واپس آتے ہوئے راستے میں ساندرو نے مجھ سے کوئی بات نہیں کی۔

ایکسے ہاؤس کے باہر فٹ پاتھ کے ساتھ ایک قہقہہ لگتی ہوئی کی دین کھڑی ہوئی تھی۔ میں نے ساندرو

ایلن کو خدا حافظ کہا۔ ایلن عجبی شیشے میں کچھ دیکھ رہا تھا۔ ساندرو آہستہ سے بولی۔ ”میرا خیال تھا کہ تم اس سے بات کرو گی۔“

”تمہارا خیال غلط تھا۔“ میں نے کہا۔

میں عمارت میں داخل ہوئی۔ دو آدمی نیا دروازہ لگا رہے تھے۔ میں نے پوچھا۔ ”کیا ہوا؟“

ان میں سے ایک بولا۔ ”کسی نے دروازے کے ساتھ دروازہ زما کی ہے۔ اس سے صرف تانے کو نہیں بلکہ چوٹ کو بھی نقصان پہنچا ہے۔ اب نیا دروازہ لگانا پڑ رہا ہے۔“

”یہ کس کی حرکت ہے؟“

اس نے کندھے اچکاتے ہوئے کہا۔ ”پتا نہیں لیکن کبھی منزل پر رہنے والا کتا شور مچا رہا ہے۔“

میں بیڑھیاں چڑھ کر اوپر جانے لگی تو کسی کے چلانے کی آواز سنی کہ مجھے تشویش ہوئی۔ میرا بڑی دھوکا کھ رہا تھا کہ اس کی رقم غائب ہے۔ جو غلط نہیں تھا۔ عمارت کا نقشہ کچھ اس طرح بنا ہوا تھا کہ مجھے اوپر جانے کے لیے اس کے دروازے کے آگے سے گزرنا پڑتا۔ کمرے کے باہر کڑی جانب دیکھا۔ اس کے فلیٹ کا دروازہ بھی زبردستی کھولا گیا تھا اور اوپر کا قبضہ غائب ہونے کی وجہ سے وہ تیس درہے کے نیچے پڑ چھوٹ رہا تھا۔ میں تیزی سے بیڑھیاں چڑھتی ہوئی پڑ آئی۔ قہقہہ کا دروازہ بند کر کے اندر سے کنڈی لگائی۔

میں سینئر بعد ہی مجھے بیڑھیوں پر کسی کے قدموں کی آہٹ سنائی دی پھر دروازے پر دستک ہوئی لیکن میں خاموش کھڑی رہی۔

”میں جانتا ہوں کہ تم اندر موجود ہو۔“ اس نے نرم لہجے میں کہا۔ ”مجھے تم سے بات کرنی ہے۔“

میں نے آہستگی سے کیبنٹ کا دروازہ کھول کر ایک مری نکالی جو چپل اور بیڑیاں کھانے کے کام آتی تھی پھر دروازہ کھول دیا۔ اس نے ہیلو کہنے کی جی ذمیت گوارا نہیں کی۔

”تم جتنے کہتے بچے جاتی ہو؟“

”سو سات۔“

”آج بھی اسی وقت گئی تھیں؟“

”ہاں۔“

”کیا تم نے کسی کو میرے دروازے کے قریب دیکھا تھا؟“

”نہیں۔“

اس نے ایک لمحہ توقف کیا پھر واپس جانے کے لیے

مڑنے لگا۔ میں نے کہا۔ ”کیا میں کچھ پوچھ سکتی ہوں؟“

”اس کا انحصار سوال کی نوعیت پر ہے۔“ اس نے جواب دیا۔

”آج میں نے یہاں بہت گڑبڑ دیکھی۔ صرف عمارت ہی نہیں بلکہ تمہارے دروازے کو بھی نقصان پہنچا ہے۔ ان حالات میں کیا یہاں رہنا محفوظ ہے؟“

”میں نہیں سمجھتا کہ کوئی تمہیں پریشان کرے گا۔“ یہ کہہ کر وہ چلا گیا۔

اس رات میں ٹھیک طرح نہ سو سکی۔ ذرا سے کھٹکے پر آنکھ کھل جاتی۔ میں نے رات کو ہی اپنے سفری بیگ میں ضرورت کی سب چیزیں رکھ لی تھیں۔ البتہ تو تھ بڑش، تھ پیسٹ اور بستر کے سرہانے رکھی ہوئی تصویر رہنے دی جس سے ظاہر ہو کہ میرا واپس آنے کا ارادہ ہے کیونکہ آج نہیں تو کل میرے فلیٹ کی تلاشی ہوئی تھی۔

میں نے ایلن کو ایک پیغام کے ذریعے اپنی بیماری سے مطلع کیا اور بتایا کہ جب کام پر واپس آتا ہوا تو اسے اطلاع کروں گی۔

”چپ آئی تو وہ لائنری کے پاس کھڑا ہوا تھا۔ مجھے دیکھ کر بولا۔“ آج جلدی اٹھنا پڑ گیا۔ مجھے کپڑے دھونے تھے۔“

میں نے کوئی جواب نہیں دیا اور آگے بڑھ گئی۔ وہ بولا۔ ”میں سوئے جا رہا ہوں۔ تم سے شام کو ملاقات ہوگی۔“

مجھے ڈر تھا کہ کہیں وہ اپنے کمرے کی کھڑکی سے نہ دیکھ رہا ہو۔ اس لیے گیٹ ہاؤس کی دیوار کے ساتھ ساتھ چلنے لگی اور ایک لمبا چمکات کر اس جگہ آئی جہاں اس کی کار کھڑی ہوئی تھی۔ میں نے بیگ سے اس کی چابیاں نکالیں اور کار میں سوار ہوئی۔ دس منٹ بعد میں نے بڑی احتیاط سے اپنی گاڑی ایک مینی بس اور کار کے درمیان کھڑی کی۔ وہ جگہ الزبتھ کے اسکول سے صرف سو گز کے فاصلے پر تھی، اب مجھے اس کا انتظار کرنا تھا۔

”الزبتھ، تم الزبتھ ہی ہوتی؟“

”ہاں۔“ اس نے حیران ہوتے ہوئے کہا۔

”کیا میں تم سے بات کر سکتی ہوں؟“

”کس سلسلے میں؟“

”کیا یہ بہتر نہ ہوگا کہ تم کار میں بیٹھ جاؤ؟“ میں نے تجویز پیش کی۔

اس نے لمبے بھر کے لیے سوچا پھر بولی۔ ”تم کون ہو؟“

میں نے فوری طور پر اسے بتانا مناسب نہیں سمجھا کہ اس کی ماں ہوں۔ ”میں یہ سترین روڈز ہوں۔“
اس نے ایسا کوئی تاثر نہیں دیا کہ میرا نام سن کر وہ کیا محسوس کر رہی ہے۔ اسے بالکل اندازہ نہیں تھا کہ کیتھرین روڈز کون ہے۔
”تم جانتی ہو کہ میں کون ہوں؟“ میں نے اسے آزمانے کے لیے پوچھا۔ ”کیا تم نے اس سے پہلے میرا نام سنا ہے؟“

اس نے سر ہلایا لیکن اس کا چہرہ اب بھی جذبات سے عاری تھا پھر اس نے رون شروع کر دیا۔ ”تم آگئیں؟“
”ہاں۔“ میں نے اس کا ہاتھ پکڑتے ہوئے کہا۔
میں نے کار موڑ دے کی طرف بڑھادی۔ میں نے کسی منزل کا تعین نہیں کیا تھا لیکن الزبتھ نے کہا کہ میں کار چلائی رہوں۔ دراصل مجھے امید نہیں تھی کہ وہ کار میں بیٹھے گی بلکہ میرا خیال تھا کہ وہ میرا نام سنتے ہی چل دے گی لیکن اس نے ایسا نہیں کیا بلکہ بولی کہ میں اسے اسکول سے دور لے جاؤں۔

”اگر میں وہ نہ ہوں جو میں نے بتایا ہے تو؟“
”اور کون مجھ سے بات کرنا چاہے گا؟“ اس نے کہا۔
”اس کے علاوہ تم میرا نام بھی جانتی ہو۔“
”مجھے خوشی ہے کہ اس نے تمہارا نام نہیں بدلا۔ میرا مطلب تمہاری موجودہ ماں ہے۔“
”وہ بدلنا چاہ رہی تھی۔“ اس نے جواب دیا۔ ”وہ میرا نام جاریا رکھنا چاہتی تھی لیکن ڈیڈی نے منع کر دیا۔ ان کا خیال تھا کہ اس سے نہیں دکھ ہوگا۔“

”تم کس نام کو ترجیح دو گی؟“
”مجھے اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔“
”تمہاری مامی اور ڈیڈی کیسے ہیں؟“
”ڈیڈی ہی نہیں چھوڑ کر چلے گئے تھے جب میں آٹھ برس کی تھی۔“
”مجھے یہ بات معلوم نہیں تھی۔“ میں حیران ہوتے ہوئے بولی۔ ”کیا تم اس سے لٹی رہتی ہو؟“
”وہ ٹی میں سر ہلاتے ہوئے بولی۔ ”مما یہ نہیں چاہتی۔ ڈیڈی ان کی کسی دوست کے ساتھ چلے گئے تھے جس کا ماما کو بہت افسوس تھا۔ اسی لیے انہوں نے مجھے ڈیڈی سے ملنے سے منع کر دیا۔“
”وہ کہاں رہتے ہیں؟“
”مجھے معلوم نہیں۔“

”وہ تم سے رابطے میں نہیں ہے؟“
”نہیں۔“

مجھے یہ سن کر غصہ آ گیا۔ میں صرف اس وجہ سے اسے کسی کو گود دینے پر تیار ہوئی تھی کہ الزبتھ کو ایک فیملی مل جائے گی لیکن اسے باپ سے دور رکھنا معاہدے کا حصہ نہیں تھا۔ میں نے اس سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا۔ ”تمہیں میرے خط ملتے تھے؟“

”نہیں۔“
”تم سوچتی ہو... گی کہ میں نے بھی تمہیں چھوڑ دیا۔“
”ہاں۔“
آگے چل کر مجھے ایک کافی ہاؤس کا پورے نظر آیا۔ میں نے عمارت کے سامنے گاڑی کھڑی کی اور بولی۔ ”میں کافی پینا چاہتی ہوں۔ تمہیں کچھ چاہیے۔“
”نہیں۔“ وہ اپنی جگہ بیٹھی رہی۔
”کیا تم اندر نہیں آؤ گی؟“
”میں نہیں انتظار کروں گی۔“

میں لیڈ یز روم میں مٹی اور سبک پر کھڑے ہو کر مرنے دھونے لگی۔ میں نے آئینے میں اپنا گس دیکھا۔ ”یہ تم کیا کر رہی ہو کیتھرین؟ تمہیں احساس ہے کہ تم نے اسے کتنا برا کر لیا ہے؟“
”مگر اسے نکلتے وقت میرا خیال تھا کہ اگر میں اس سے بات کرنے میں کامیاب ہوئی تو یہی کافی ہوگا۔ میں صرف یہ جانتی تھی کہ وہ محفوظ اور خوش رہے پھر میں یہ جگہ چھوڑ دوں گی جب تک وہ اٹھارہ برس کی نہیں ہو جاتی۔ میں کسی دوسری جگہ رہ کر بھی اس سے قانون کے مطابق سوشل سروس کے ذریعے رابطہ کر سکتی تھی۔ مجھے یہ امید نہیں تھی کہ وہ میرے ساتھ آنے پر تیار ہو جائے گی۔“

میں نے کاؤنٹر پر جا کر کافی، چاکلیٹ اور سوپ لیا اور کار کی طرف چل دی۔ میں نے ٹرے اپنے اوپر اس کے درمیان رکھی تو وہ بولی۔ ”میرے باپ کے بارے میں بتاؤ جو میرا حقیقی باپ تھا۔ میں نے سنا ہے کہ تم نے اسے قتل کر دیا تھا۔“

”وہ غیر ارادی قتل تھا۔“ میں نے کہا۔
”کسی کو شاکت گن سے مار دینا غیر ارادی قتل نہیں ہو سکتا اور نہ ہی اسے حادثاتی کہا جاسکتا ہے۔“
”یہ کوئی ایسی بات نہیں جس پر میں فخر کر سکوں۔“
”پھر تم نے اسے قتل کیوں کیا؟“
”اس لیے کہ اس کے ہاتھ بہت چلنے لگے تھے۔“

”شراب پی کر تو وہ بالکل آہستہ سے باہر ہو جاتا تھا۔“
”بس یہی ایک وجہ تھی؟“

”یہ کوئی معمولی بات نہیں تھی بلکہ اس کا رویہ دن بہ دن خراب ہوتا جا رہا تھا۔ اس کا کاروبار بہت اچھا چل رہا تھا۔ وہ مقامی کونسل کا چیئرمین بھی منتخب ہو گیا تھا لیکن بارہ سال قبل اسے کاروبار میں نقصان ہونا شروع ہو گیا۔ وہ یہ ناکامی برداشت نہ کر سکا اور اس نے بے تحاشا شراب پینی شروع کر دی۔ وہ اپنا غصہ مجھ پر اتارتا تھا۔ اس نے مجھے مارنا شروع کر دیا اور جب میں اسے شراب پینے سے روکتی تو وہ اور زیادہ تشدد برقرار آتا۔ کبھی کبھی میں سوچتی کہ اس سے بٹھا دی کر کے غلطی کی کیونکہ لوگوں نے مجھے پہلے ہی اس کے بارے میں بتا دیا تھا پھر میں نے وہی کیا جو بہت سی عورتیں ان حالات میں کرتی ہیں۔ میں نے لوگوں سے چھپانا شروع کر دیا۔ ان پر یہی ظاہر کرتی کہ ایسی کوئی بات نہیں ہے کیونکہ میں اپنی غلطی کا اعتراف نہیں کرنا چاہتی تھی۔“

”وہ ہمیشہ گھر میں شاکت گن رکھتا تھا۔“ میں نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔ ”ایک دن وہ نشے میں دھت گھر آیا اور اپنی لینڈ روور لے جا کر باغ میں تمہارے ڈیڈی کی ہاؤس سے ٹکرا دی۔ شکر ہے کہ تم اس کے اندر نہیں بلکہ قریب ہی موجود تھیں۔ تم نے جلدی شروع کیا تو اس نے تمہیں مارا جب میں اس پر چلائی تو اس نے اپنی گن نکال لی۔ اس وقت تک میں تمہیں اپنی گود میں لے چکی تھی اور وہ ہم دونوں کو لٹانے پر لیے ہوئے تھا۔ میں نے گھٹنوں کے بل جھک کر اس سے التجائی کہ میں گولی نہ مارے لیکن اس نے کوئی اثر نہیں ہوا اور اس نے ٹریگر دبا دیا لیکن گولی نہیں چلی۔ اس لمحے میں نے محسوس کیا کہ اگر اس وقت وہ ہمیں نہ مار سکا تو بعد میں ضرور ایسا کرے گا۔“

”وہ کار میں سے فالو کارٹوں لینے گیا تو میں نے اس کی جیکٹ سے دو کارتوں نکال کر گن کو ڈکرتی۔ نشے میں ہونے کی وجہ سے اسے ان کا خیال نہیں آیا۔ وہ جیسے ہی واپس آیا میں نے اسے گولی مار دی۔“

”میں نے اخبار میں پڑھا تھا کہ تم نے اس پر گن تانی تھی۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ تم اسے گولی مارنا چاہتی تھیں۔“
”ہاں مجھے اپنے دفاع میں گولی چلانی پڑی۔“
”لیکن حقیقت میں ایسا نہیں ہوا تھا؟“

”نہیں جیسا کہ میں نے کہا وہ یا میں، میرے وکیل نے ذاتی دفاع کا تکیہ اٹھایا لیکن مسئلہ یہ تھا کہ میں اسے مرتے ہوئے دیکھتی رہی اور میں نے ایبونیس کو نہیں بلایا

جب تک مجھے اس کے مرنے کا یقین نہیں ہو گیا۔ اسی لیے مجھے بارہ سال کی سزا ہوئی۔“

”میری ماما کہتی ہے کہ تم باگل ہو گئی تھیں۔ تم نے غصے میں آ کر اسے گولی مار دی اور مجھے تنہا چھوڑ دیا کیونکہ تم ذاتی طور پر اس قابل نہیں تھیں کہ ایک ماں کی ذمہ داری سنبھال سکو۔“
”اب تمہیں حقیقت معلوم ہو گئی۔“ میں نے کہا۔
”اب یہ تم پر ہے کہ اس پر یقین کرو یا نہیں۔ میرے پاس اس کے سوا کوئی راستہ نہیں تھا۔“

الزبتھ سسکرائی اور کچھ کہنے ہی والی تھی کہ اس کی توجہ کسی اور جانب ہو گئی۔ میں نے اس کی آنکھوں میں بے چینی دیکھی۔ ”کیا تم کسی مشکل میں ہو؟“ اس نے آہستہ سے کہا۔
”تھوڑی بہت۔“ میں نے جواب دیا۔ ”تمہیں اپنے ساتھ لاکر میں نے بیرونی شراکتہ کی خلاف ورزی کی ہے۔“
”اوہ۔“ وہ پریشان ہوتے ہوئے بولی۔
”اور یہ کار بھی چوری کی ہے اور شاید اس وجہ سے مجھے دوبارہ جیل جانا پڑے۔“ وہ اپنا ہونٹ کاٹنے ہوئے بولی۔

”بے خبر سے کے لیے؟“
”نہیں۔ شاید دو مہینے کے لیے۔“
میں نے مرکز دیکھا۔ تین پولیس والے میری طرف بڑھ رہے تھے۔ ”جہاں تم جا رہی ہو۔“ وہ جلدی سے بولی۔
”کیا میں تمہیں خط لکھ سکتی ہوں یا ملنے آ سکتی ہوں؟“
”ضرور۔ مجھے خوشی ہوگی۔“

اس نے میرے دونوں ہاتھ تھام لیے۔ پولیس والے اب چند گز کے فاصلے پر رہ گئے تھے۔ الزبتھ میرے گالوں کا بوسہ لیتے ہوئے بولی۔ ”تم نے میرے لیے جو کیا۔ اس پر میں تمہاری شکر گزار ہوں۔“
”یہ میری خوش نصیبی ہے۔“

”کیتھرین روڈز۔“ ایک پولیس آفیسر نے کہا۔
میں نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ”میں آ رہی ہوں۔“

”اپنا بیگ مت بھول جانا۔“ میں نے اسے بیگ پکڑاتے ہوئے کہا تو وہ کچھ حیران ہوئی۔
”اس کی تہ میں کچھ ہے۔“ میں نے سرگوشی میں کہا۔
”اس میں کچھ رقم ہے بلکہ کافی زیادہ۔ میرے واپس آنے تک اسے حفاظت سے رکھنا۔“

اب مجھے کوئی فکر نہیں تھی۔ میں نے چوری کی رقم امانت کے طور پر محفوظ ہاتھوں میں منتقل کر دی تھی۔

✽ مہتاب اور لیس..... راو پینڈی
اس ایک پل میں یہاں ایک عمر بیت گئی
بڑی نگہ کرم ہے کہ سڑکی ایام
✽ کمال انور..... کراچی
غارت گری کے بعد بھی روشن تھیں بستیاں
ہارے ہوئے تھے لوگ مگر حوصلے میں تھے
آندھی ہوا کے لئے گئی جس کو ابھی ابھی
منزل کے سب نشاں آبی راستے میں تھے
✽ صلاح الدین..... ٹنڈوالہار
میرے ہونٹوں پہ نہیں تیرے لئے
یہ تو ہیں عرشِ محبت کے صلے

✽ راجہ قیصر..... چنڈ واہل خانہ
سارے شہر کو جھونک رہا تھا
وقت کا ہاتھ بٹا ہوا تھا
جاگتی گلیاں، اونٹنیوں میں زردانہ پاتا چھڑا
جس نے سے ہم ڈرتے تھے، اس نے آخر وار

✽ ہادیہ ایمان، ماہا ایمان..... غور، نہ پاس
سپردہ کسے اسے چاندنی کے ہاتھوں میں
میں اپنے گھر کے اندھیروں میں اوت آؤں گی
✽ راؤد اشفاق..... حمر شاہ قیم
مٹوں پہلو میں پالا اور ہم کچھ بھی نہیں
تم نے دیکھا اک نظر اور دل تمہارا ہو گیا
✽ ماہین فاطمہ..... حمر شاہ قیم
میرے پختہ ارادے خود مری تقدیر بدلیں گے
میری قسمت نہیں محتاج ہاتھوں کی لکیروں کی
✽ ماہین باہر، فضل عباس..... گلستانہ روڈ کھاریاں
بہت سے لوگ دل کو اس طرح محفوظ رکھتے ہیں
کوئی بارش ہو یہ کاغذ ذرا بھی تم نہیں ہوتا
چھڑتے وقت کوئی بدگمانی دل میں ابھی جاتی ہے
اسے بھی غم نہیں ہوتا، مجھے بھی غم نہیں ہوتا



✽ ملا گاجہ جرم..... حمر شاہ قیم
برس رفتا ہے حرم، ہوس میں دوسرا حسن
گدائے عشق سے، کاسے میں اک نظر بھی نہیں
✽ اشفاق شاہین..... لاہور
صبا نے پھر دو زنداں پہ آکے دیکھ
سحر قریب ہے، دل سے کہو نہ ہیرائے
✽ عبدالجبار روٹی انصاری..... قصور
سکتے ہیں سب چراغ تھے، تارے تھے دم بخود
میں اس کے اختیار میں، وہ میرے بس میں تھی
اب کے بھی ہے جی ہوئی آنکھوں کے سائے
خوابوں کی ایک دھند جو پچھلے برس میں تھی
✽ محمد صفر معاویہ..... ضلع خانیوال
مرہم نہ بن سکے گی بھی معذرت تیری
دل توڑنے سے پہلے تجھے سوچنا تو تھا

✽ باہر عباس..... گلستانہ روڈ کھاریاں
میں اداسیاں نہ جاسکوں بھی جسم و جاں کے فرار پہ
دوہڑے میں مری آنکھوں میں مجھے اکی سخت سزا دے
✽ محمد علی..... حیدر آباد
روح بدلنے میں اُسے دہری کیا گنتی ہے
جس کسی کو بھی زمانے کی ہوا گنتی ہے
لوٹ آتے ہیں سرشام پرندے گھر کو
اور پرچائیں بھی دیوار سے جاگتی ہے
✽ جہانزیب احمد..... لاڑکانہ
صد شکر، تو نے خواب سے چونکا دیا مجھے
صد شکر، ہو رہا ہے بڑا انقعات کم
تخلیق فن کردوں گا بعنوان ارتقاء
جس ہاتھ میں قلم ہے اسی ہاتھ کی قسم
✽ رمضان پاشا..... گلشن اقبال، کراچی
آپ کہتے ہیں تو تسلیم کیے لیتے ہیں
وردہ حالات سنبھل جائیں گے ممکن تو نہیں
✽ طلحہ اکمال..... کراچی
نمی میں ڈوب کے ٹھنڈی ہوائیں آتی تو ہیں
برس بھی جائیں گی آخر، گھٹائیں چھائی تو ہیں
اب اس کے بعد مجھے فکر کیا کہ ہوگا کیا
وہ آنکھیں آج برے غم پہ ڈھائی تو ہیں
✽ شرمین عباسی..... فیصل آباد
کل کوکل پرکھوں جب کل آئے گا دیکھا جائے گا
آج کی رات بہت بھاری ہے آج کی رات نہیں رہ جاؤ
کب تک یوں پردے پردے میں حسن محبت کو چھلاتا
موت کا دن بھی حشر کا دن ہے، چھپنے والا سامنے آؤ
✽ محمد رشید سیال..... روہڑی
تیرا کیا جائے گا میرا ہو کے اے جان ادا
چند لکھوں کے لیے ہم کو خوشی مل جائے گی
✽ عصمت علی..... سرگودھا
رہنا اور مان جانا چاہتوں کا حسن ہے
کیسے دل تیرے جڑنے پر میڑنا چھوڑ دے
✽ جبران احمد ملک..... گلشن اقبال، کراچی
دیکھو تو کتنے چین سے اس کس دیکھو مطلقاً
پہلے ہیں ارض پاک کو آدھا کیسے ہوئے

✽ الیس سجاد..... ضلع اوکاڑہ
بزم سے اٹھ جائیں جب ہم گریباں چاک لوگ
کس کے گھر جائیں گی شہر عشق کی رسوائیاں
✽ نور العین..... اسلام آباد
ہم اپنی قوتِ تخلیق کو آکسانے آئے ہیں
منیر ارتقاء میں بجلیاں دوڑانے آئے ہیں
جو گردش میں رہیں گے اور بھی خالی نہیں ہوں گے
ہم ایسے جام بزمِ دہر میں چمکانے آئے ہیں
✽ فیصل خان..... بہاولپور
کس کی تحویل میں تھے کس کے حوالے ہوئے لوگ
چشمِ گریہ میں رہے دل سے نکالے ہوئے لوگ
کب سے راہوں میں بڑی گرد بنے بیٹھے ہیں
تجھ سے ملنے کے لیے وقت کو ٹالے ہوئے لوگ
✽ مدحت..... کراچی
دنیا بھی تو ہاتال سے باہر کا سفر ہے
منزل بھی رستوں کے حوالے نہیں کرتا
جس آگ سے روشن ہوا احساس کا آگن
اس آگ کو آنکھوں کے حوالے نہیں کرتا
✽ راحیلہ شفیق..... سندھی ہوئی، نیو کراچی
ہمارے عالمِ فرقت میں تنہائی نہیں ہوتی
تصور کی ملاقاتوں میں رسوائی نہیں ہوتی
✽ زرین خان آفریدی..... حیدر آباد
چدائی صرف فاسلوں کا ہی تو نام نہیں
کچھ لوگ تو صدیوں سے ہاتھ قلمے چھائیے ہوتے ہیں
✽ اوشا راہی..... ملٹی سندھ
لذتِ وصل سے بھی بڑھ کے مزہ آئے گا
اپنی تنہائی سے دل اپنا لگا کر دیکھو
✽ تبسم بانو..... سیالکوٹ
رات آئی ہے بلاؤں سے رہائی دے گی
اب نہ دیوار نہ زنجیر دکھائی دے گی
سچ دھندکا سا جو ہے اس کو قیمت جانو
دیکھنا پھر کوئی صورت نہ بھائی دے گی
✽ چلی ہیر..... سیالکوٹ
دل کے احساس سے ملتا ہے محبت کو دوام.....
پیار کے بول، تو ہر شخص لیے پھرتا ہے



حبس زدہ

منظبر سلیم ہاشمی

زندگی جب زنداں کا منظر نامہ بن جائے تو سانس لینے میں گھٹن کا احساس انسان کی ہمت ختم کر دیتا ہے... وہ بھی ایک ایسے ہی ماحول میں زندہ رہنے پر مجبور تھی جہاں اس کی جان کا دشمن کوئی غیر نہیں بلکہ اس کا اپنا سگیا باپ تھا... ایسے میں جو گھر اس کی پناہ گاہ تھا وہی اس کی مقل گاہ بن گیا۔

ایک پتھر دل باپ کی شقیقی التلی..... ایک لرزہ خیز واردات

ایڈ کو اپنے پاس زولو کی بیٹی کو بوشن سے واپس لانے کا کام ملا تھا۔ وہ نہ صرف اپنے کام کا مایوس تھا بلکہ بوشن کے دے میں بھی تفصیل سے آگاہ تھا۔ ویسے بھی تمام کارندوں ان وہ سب سے زیادہ قابل اعتماد تھا۔ پائرس نے تمام تفصیلات دو بار سے زیادہ دہرائیں، حالانکہ... ایڈ کو یہ سب پہلی مرتبہ ہی ذہن نشین ہو گیا تھا۔ اس نے پائرس کی لاف و زراف میں دھل دینے کی بالکل کوشش نہ کی اور اپنی بیڑی چھوٹی چھوٹی چکیاں لیتا رہا۔

✽ زوہیب احمد ملک..... گلستان جوہر، کراچی
شدت درد میں ہونٹوں پہ دعا کا ہوتا
ثابت اس سے بھی تو ہوتا ہے خدا کا ہوتا
✽ عامر علی..... شاہ فیصل کالونی، کراچی
وعدہ تو ہے شب کا، مگر اب دن نہ گئے گا
حیراں ہوں کہ یہ آج کی شب جانے کب آئے
✽ کہکشاں..... پشاور
کل مجھ پر الزام تھا سارا، آج تو فتنے رنگ تہرا
کل تم مجھ سے شرمائے تھے، آج آئینے سے شرماء
✽ فاطمہ کنول..... منڈی بہاؤ الدین
بہت قریب نہ آؤ، کہ دور سے بھی ہم
وہ آج آئی کہ مرجھا گئے دلوں کے چمن
✽ عذرا وقار..... خانیوال
اے ستارہ نشیں! چمن بیا
مانگتے ہیں ثبوت وحدت ہم
✽ نعمان راجیل..... لاہور
مدت کے بعد اذن تقسیم ملا ہمیں
وہ بھی کچھ ایسا طبع کہ آنسو نکل پڑے
✽ فیض احمد..... میانوالی
کچھ درگزر کا کھیل، کچھ ایثار کا کمال
دور نہ وہ کون ہے جو کسی سے نباہ لے
✽ جمعہ خان..... پشاور
تم اتنی دور سے چل کر میرے قریب آئے
تو اب قریب ہی بیٹھو، جھکن مجھے دے دو
✽ فرید احمد..... فیصل آباد
اک نہیں فضا کے دل میں بھی
یا تیر نکل گیا کماں سے
✽ جاوید اختر رانا..... پاکپتن شریف
تیرے بجز میں وہیں ملنا تھا تیرے قریب میں انھیں ملتی ہیں
مجھے کھوٹا ایک قیامت تھا تیرا ملنا اور غدا ہوا

✽ سعدیہ خورشید..... ملتان
سب سے مشکل ہے اذیت یہ گوارا کرنا
دل سے اترے ہوئے لوگوں میں گزرا کرنا
✽ محمد عمیر..... کراچی
شام کی دھند میں آتا ہے بہت یاد ہمیں
اس کا چہرہ تھا کتنی شب میں ستارے جیسا
✽ جنید احمد ملک..... گلستان جوہر، کراچی
کوئی بھی لمحہ کبھی لوٹ کر نہیں آیا
وہ شخص ایسا مگیا پھر نظر نہیں آیا
✽ مہر النساء..... ساہیوال
کمرے میں میرے غم کے سوا اور کچھ نہیں
کھڑکی سے جھانکتی ہے کسے بار بار دھند
✽ ذیشان انصاری..... جہلم
اٹھ کر چلا گیا کوئی وقفے کے درمیاں
پردہ اٹھا تو سارا تماشا بدل گیا
✽ احمد علی..... رحیم یار خان
جودل کے سمندر سے ابھرتا ہے یقیں ہے
جو ذہن کے ساحل سے گزرتا ہے گل ہے
✽ بشارت علی..... چنیوٹ
درد کا احساس مجھ کو درد سے پہلے بھی ہے
چوٹ وہ سہلا رہا ہوں جو ابھی کھائی نہیں
✽ زاہد علی..... کوئٹہ
پت جھڑ میں ڈالیوں پہ جو گزری گزرمی
چیلی ہوئی زمین کی جھولی تو بھر گئی
✽ ناہید یوسف..... اسلام آباد
ڈھونڈتا ہوا ہمیں بھی تو ستارہ کوئی
گھر سے نکلیں تو نکل آئے گا رستہ کوئی
✽ حسان احمد..... لاہور
مجھے نہیں ہے ابھی فرصت کرم نہ سہی
تکھے نہیں ہیں مرے ہاتھ بھی دعا کرتے

محفلِ شاعرانہ

کوین
اپریل
2018

”امید تو نہیں ہے کہ کوئی گزربز ہوگی..... لیکن اگر ہوگی جائے تو تم پولیس والوں سے واقفیت رکھتے ہو..... امید ہے کہ سب بہ آسانی سنبھال لو گے۔ وہاں کے کئی کوچے تمہارے جانے پہچانے ہیں..... فرار کے وقت تم کسی اندر کی گلی میں بھی بچھنے سے رہے..... مجھے پوری توقع ہے کہ تم اسے کھن کے بال کی طرح نکال کر لے آؤ گے.....“

ایڈ نے کوئی جواب نہ دیا۔ بیڑ کا ایک اور گھونٹ بھرتے ہوئے اس نے سوچا کہ زولو کا حکم کون ٹال سکتا ہے؟ اگر اسے اس کام کے لیے منتخب کر لیا گیا تھا تو وہ انکا تو کہہ نہیں سکتا تھا۔ پائرس کی موجودگی البتہ اس کے لیے ذہنی اذیت کا سبب بن رہی تھی۔ وہ یہ سمجھنے سے قاصر تھا کہ زولو کو آخر ایک جج کا آدمی لانے کی کیا ضرورت تھی؟ وہ یہ سب کام اسے براہ راست بھی تو بتا سکتا تھا۔

البتہ اسے زولو پر اعتماد تھا، اس وجہ سے وہ پائرس کی باتیں اچھی طرح ذہن نشین کرتا جا رہا تھا۔

”کیا تم کل نکل سکتے ہو؟“

”ہاں۔۔۔ اس نے ایک لفظی جواب پر اکتفا کیا اور وہاں سے روانہ ہو گیا۔

اگلے دن وہ اپنی گاڑی میں پوری تیاری کے ساتھ بوشن کی جانب رواں دواں تھا۔ ساتھ والی نشست پر اس کا بیگ پڑا تھا جس میں ضرورت کے مطابق کپڑے تھے۔ اپنی نائن ایم ایم کی اسمتھ ایڈ ویسن گن اس نے ڈیش بورڈ کے خفیہ خانے میں دو فاصل میگزینز کے ساتھ چھپا رکھی تھی۔ وہ سمجھتا تھا کہ وہ اپنی منزل تک پہنچنے میں اسے چار گھنٹے کا وقت درکار تھا۔

ابھی سپاہوں کی آمد کا موسم شروع نہیں ہوا تھا، ٹریفک کا دباؤ کم ہونے کے باوجود اس نے اپنی شیورلے کی رفتار ستر سے زیادہ نہیں ہونے دی تھی۔ میسا جیوس کی پہاڑیوں سے گزرتے ہوئے اس نے اپنے موبائل فون سے ایک پرانا نمبر ملایا۔

”کون بول رہا ہے؟“ چند لمحوں کی خاموشی کے بعد فون اٹھانے والے نے پوچھا تو اس کا لہجہ مشرق وسطیٰ کے رہائشی ہونے کا غماز تھا۔

”کرٹ..... میں ایڈ..... مصروف تو نہیں ہوں؟“

”او غدا! تم..... تم کہاں سے بول رہے ہو؟“

”سٹریٹ بریج کے آس پاس ہوں.....“ وہ سڑک کنارے لگے سامن بورڈ کو پڑھتے ہوئے بولا۔

”یہ تو کمال ہی ہو گیا۔ کیا تم میرے پاس روکے؟ میں

نے آج ایک دعوت کا اہتمام کیا ہوا ہے۔ سب پرانے لوگ جمع ہوں گے۔ تمہاری آمد تو پارٹی کو چار چاند لگا دے گی..... تم آ رہے ہو نا؟“ کرٹ بولتے بولتے بے یقینی۔۔۔ پوچھ بیٹھا۔

”کوشش کروں گا.....“ ایڈ کے لہجے میں ہچکچاہٹ تھی۔

”رات تو میرے گھر پر ہی گزار دو گے نا؟“

”ہاں..... لیکن ساری رات نہیں..... مجھے پارٹی ادھوری چھوڑ کر ایک خاص کام کے لیے جانا پڑے گا.....“

شاید پھر شب بھری کے لیے کسی ہوٹل کو ڈھکنا پڑے گا.....“

”پائرس ہوٹل کیسا رہے گا؟ تمہاری بلنگ کرا دوں وہاں پر؟“

”اوہ نہیں..... تمہارا شکریہ کرٹ لیکن میں چاہوں گا کہ اس بار میں اپنا انتظام خود کروں..... ہاں البتہ بروکلین کے پاس کسی ہوٹل کا چتا جتا دو تو مجھے انتخاب کرنے میں آسانی ہوگی۔“

”فیڈن ہوٹل بہترین رہے گا..... لیکن مجھ سے مل کر جانا.....“ یہ کہہ کر وہ ایڈ کو ہٹا سمجھانے لگا لیکن اس نے بات کاٹ دی۔

”مجھے یاد ہے ایڈر میں تمہارا..... اتنا صبر نہیں ہوا کہ میں سب بھول جاؤں.....“

”تم بس شام کو جلدی آ جانا، اگر تمہارا کام اس میں حائل نہ ہو تو..... غروب آفتاب کے بعد سے ہی پارٹی شروع ہو جائے گی..... اور بہت دیر تک چلے گی..... تم جلدی آ جا گے تو ہمیں باتیں کرنے کا وقت مل جائے گا..... بہت وقت بیت گیا ایڈر میرے بچے..... بہت وقت.....“

”میں پہنچ جاؤں گا.....“ اس سے پہلے کہ کرٹ مزید جذباتی ہوتا ایڈ نے ہائی بھرے میں ہی عافیت چھٹی۔

زولو نے اپنی بیٹی کا نام ہی ایسا رکھا تھا جو کہ آئینل مجھے مار والی کیفیت پیدا کرتا تھا۔ ایلیزا نام سن کر ہی ایڈ کو دھول مٹی اور سیرک اپ میں تھڑی حسینہ یاد آ جاتی تھی۔ بچپن سے اب تک وہ ایلیزا سے کئی بار مل چکا تھا..... حتیٰ کہ اس کو اسکول پہنچانے اور واپس لانے کے فرائض بھی انجام دیا کرتا تھا۔

”مشکل ہی ہے کہ اس کو یہ بات یاد ہو.....“ اس نے سوچا۔

وہ کم سنی سے ہی ایک بدخیز لڑکی شکاری جاتی تھی۔ چھوٹی چھوٹی باتوں پر غرے کرتا اور غلیظ گالیاں بکتا اس کی فطرت ثانیہ بن چکی تھی۔

اب وہ بیس برس کی ہو چکی تھی اور اتنی نادان تھی کہ

یو یارک سے بوشن بھاگ کر آنے کی بے وقوفی کا اندازہ بھی نہیں کر سکتی تھی۔ شاید وہ اپنے باپ کے صبر کا امتحان لیتا چاہتی تھی..... دیکھنا چاہتی تھی کہ کہاں تک..... اسے اپنے مقاصد کے حصول کے لیے موم کر سکتی ہے۔ اس کی گستاخیاں بروقت چلی جا رہی تھیں..... ایڈ کو خدشہ تھا کہ کہیں کسی روز..... زولو اپنی بیٹی کے قتل کا حکم ہی نہ دے دے اور ایڈ میں سرتابی کی مجال تک نہ رہی۔

کرٹ نے تنہائی میں آتے ہی ایڈ نے اپنی جینٹل اتار کر الماری میں لٹکا دی۔ تقریبی بکل والے ہولسٹر میں مقید اپنے پھل کو نکال کر ایسے ہاتھ میں جھلایا جیسے وزن کر رہا ہو۔ میگزین کی چودہ گولیوں کے ساتھ ایک گولی جیبر میں بھی موجود تھی۔ میڈکن کے ساتھ اس نے دو اضافی میگزین احتیاط کے ساتھ ہی بیڈ کے ساتھ والی دروازے میں رکھ دیے۔ نیم گرم پانی سے غسل لے کر وہ قارغ ہو چکا تھا، سو دروازے پر ہونے والی دستک کا جواب اس نے محض ایک لمبے لمبے ملبوس دیا، ویدر گرما کر کھانا لایا تھا جس کو اس نے شان بے نیازی سے بیس ڈالر کی ٹپ دے دی۔

”شکریہ مسٹر فائبر.....“ ویدر شکرا تہ اعزاز میں جھک گیا۔

”ارے..... خیر ہے.....“ ایڈ نے مسکراتے ہوئے اسے رخصت کیا۔

کھانا کھانے کے دوران وہ ہائی وے سے گزرتے ٹریفک کو بھی بکتا رہا۔ اس کے دل میں آیا کہ کاش وہ دوسری جانب والا کرا لیتا تو مل کھاتے دو یا پڑو بے سورج کا نظارہ دیکھ کر پرانی یادیں تازہ کر سکتا تھا۔

کھانے اور پھر سستانے کے کچھ دیر بعد ہی اس کی شیدی ایک بار پھر سیاہ کوٹار والی سڑک پر رواں دواں تھی۔

اندھیرا تیزی سے پھیل چکا تھا اور اس نے بھی میڈکن کو اپنی میٹ کے نیچے محفوظ کر دیا تھا۔ کیمرہ ہمیشہ کی طرح بڑھوم اور یادگار تھا۔ اپنی شیدی کو ڈیوس اسکوائر کے پاس پارک کر کے وہ پیدل ہی دوسرے بلاک میں موجود کرٹ کے گھر کی جانب چل پڑا۔

تین منزلہ مکان کی پُر شکوہ عمارت پوری شان سے ایستادہ تھی۔ پارٹی کی وجہ سے روشنیوں کی خصوصی حادث کی گئی تھی۔ ایڈ نے گھوم کر چاروں طرف سے جائزہ لیا اور بارغ کی آرائش کے لیے کی گئی کرٹ کی کوششوں کو سراہے بنا نہ وہ

کا۔ گھر کی عقیقی میں سن ٹھہر کر وہ نظارہ کرنے لگا۔ پہلی منزل کی کھڑکی سے اس نے دو اجنبی عورتوں کو باتوں میں محو دیکھا۔ تھوڑی دیر بعد اس کی متلاشی نظریں اپنے میزبان کو

ڈھونڈنے میں بھی کامیاب ہو گئیں۔ پچھلے تین سال کے مقابلے میں وہ کافی بھاری ہو گیا تھا۔ حسب سابق اس کی بھوری ناک پر بھی نظری کیٹنگ اب گری کے تپ گری کا اثر دے رہی تھی۔ وہ کسی سے ہاتھ ہلا کر بات کر رہا تھا اور آنکھیں شروپ کے نشے سے خود نظر آ رہی تھیں۔

دوسری کھڑکی سے آنے والی آواز پر وہ متوجہ ہوا تو کھلکھلا

اٹھا۔ اپنے جہازی ساز کے بچے اٹھائے ایک روٹ وائیکر اسل

کا کتا..... ایڈ کو بھی دیکھ رہا تھا۔ اس کی فراہم اتنی زیادہ تھی کہ وہ شیشے کی ادٹ سے بھی سناٹی دے رہی تھی۔ کرٹ نے چونک کر اپنے کتے کو دیکھا اور اس کی فراہم پر ہلکا دیکھنے کی کوشش کی لیکن ایڈ کی ادھوری جھلک میں کوئی بھی نشین کرنے میں کامیاب نہ ہو سکا۔ دونوں ہی کھڑکی سے ہٹ گئے اور تھوڑی ہی دیر بعد ان کا سایہ عقیقی دروازے پر نمودار ہو گیا۔

”میں چھوڑوں گا نہیں تم کو..... آوارہ لڑکو..... یہ کتوں سے ہوشیار رہنے کا بورڈ میں نے خواہواہ نہیں لگا رکھا.....

بروزر حملہ کرو.....“ کرٹ نے چلاتے ہوئے کہا اور اپنے کتے ’بروزر‘ کی زنجیر چھوڑ دی۔

بروزر ایڈ کی جانب تیزی سے بڑھا جو کہ ابھی تک ساکت کھڑا تھا۔ جیسے جیسے وہ ایڈ کے قریب آ رہا تھا ویسے ویسے ہی اس کی فراہم خوش آئینہ ازلیں تبدیل ہو رہی تھی۔ ایڈ نے بھی بڑبڑ انداز میں بروزر کو گلے لگایا اور اس کے بالوں میں ہاتھ پھیرتے ہوئے دو چار بوسے دے ڈالے۔ کرٹ جو پہلے ہی لہجے کا شکار تھا بروزر کے اس انداز پر خوش ہو گیا اور ایڈ کو چند باتیں سنا دیں۔

”میری خوش نصیبی..... میں تمہیں دیکھ پایا.....“ اس کی آواز فرط جذبات سے کانپ رہی تھی۔ ”یہ میرے کتے کو چار کتا چھوڑ دو اور ذرا روشنی میں آؤ شیطان لڑکے..... تمہیں اچھی طرح دیکھنے زمانے بیت گئے.....“ کرٹ کے انداز میں حقیقی محبت جھلک رہی تھی جو بی زمانہ خال خال ہی لوگوں کو میسر آتی تھی۔

”اور اس رکھوالی کے کتے کو تو اس کے کام سے ہی ہٹا دینا چاہیے..... کھانا تپا ہے غیر متعلقہ لوگوں کے آنے پر حملہ کرنے کے بجائے پیار جتانے لگتا ہے۔“

ایڈ کا اس بات پر قہقہہ گونج گیا۔

”ہاں ہاں..... پس لو..... ویسے چاہے تم اسے میرے پاس چھوڑ گئے تھے لیکن یہ ہمیشہ سے تمہارا ہی رہا ہے..... دیکھا کیسے پل بھر میں تمہیں پہچان لیا.....“ کرٹ ناراضی آمیز لہجے میں ایک بار پھر محبت جتاتے ہوئے بولا اور ایڈ کو

گلے لگایا۔

”یہ بالکل اصلی ہے۔ میرے بارسلونا والے دوست کا تعلق ہے۔ وہ بھی تمہاری طرح خوش لباسی کے خط میں مبتلا ہے۔“ طویل عرصے بعد ملاقات کے تعلقات سے گزرنے کے بعد کرٹ اسے اپنے اسٹری روم میں لے آیا تھا اور گلاس پکڑا چکا تھا۔

”تم جس سلسلے میں آئے ہو۔ کیا آج رات ہی وہ کام سرانجام دیتا ہے؟“ اس نے ایڈ سے پوچھا۔

”ایک اور گلاس کے بعد تو بالکل بھی نہیں۔“ ایڈ نے نفی میں سر ہلایا۔ ”کوشش کروں گا کہ کل تک کام، انجام بخیر ہو جائے۔“

”پھر واپس ہو یا کر؟“

”ارادہ تو آوارگی واپسی کا ہے۔“

”جب میرے ساتھ تھو ضرور کرنا۔ ہم ساحل پر جا سگے۔ اور وہاں تمہارے پسندیدہ گائے کے گوشت کے پسندے ضرور کھا سگے۔“

”اف۔ کیا دور یا دودلا دیا؟ میں تو بھول بھال ہی گیا ہوں کہ ان کا ذائقہ کیا ہوتا تھا۔ یقیناً چلیں گے۔“

”ہاں اور اصلی والے پہ چلیں گے۔ ان کی شہرت دیکھ کر یہاں بہت سے فٹ بال اپنی دکانیں سجا کر بیٹھ گئے ہیں۔ لیکن اصلی والے تو کمال کے ذائقہ دار ہوتے ہیں۔ گوشت کے اندر تک سمندری نمک کی لذت کو محسوس کیا جاسکتا ہے۔“

مزید مہمانوں کی آمد و رفت جاری تھی۔ اسٹری روم کے دروازے کے باہر سے آنے والی ان کی آوازیں ایڈ بخوبی سن سکتا تھا۔ بروز رکان بیہوشی اس کے قدموں میں اودھ رہا تھا۔

”تمہارے شے شاگرد کیسے ہیں؟“

کمرے میں چھائی خاموشی کو ختم کرنے کا اس سے کوئی بہتر طریقہ نہ ملا تو اس نے یہی سوال وار دیا۔

”بے وقوف۔۔۔ کم عقل۔۔۔ پتا نہیں کہاں سے منہ اٹھا کر آ جاتے ہیں۔ تمہارے زمانے کے مقابلے میں تو یہ پھرے کا ڈھیر گتے ہیں ایڈ روڈ۔۔۔ اساتذہ فونز کے اتنے شوقین ہیں کہ میں ان کو بارگ والے جیسے ہی روکے رکھتا ہوں۔۔۔

ہمیشہ خدشہ ہی لگا رہتا ہے کہ اگر ان کو آواز چھوڑ دیا تو کسی ٹرک کے نیچے نہ آجائیں۔“ کرٹ نے بھڑاس نکالنا شروع کر دی تھی۔

”پھر بھی۔۔۔ کوئی تو قاتل ہوگا۔۔۔؟“

”تم ہمیشہ میری آنکھوں کے تارے رہے ہو۔۔۔ تم جانتے ہو کہ میرے پسندیدہ طالب علم تھے۔ میرا چمکا تارا۔۔۔ میری امید۔۔۔ تمہیں غلطی کی بہت اعلیٰ پہچان تھی لیکن ساتھ میں تمہیں حقیقی دنیا کے چلن سے جو آگاہی تھی وہ صدیوں میں ہی کسی کو نصیب ہوتی ہے۔ میرے بچے ایڈ روڈ، تمہارے زمانے میں انجینیئریت والوں کی کیس تھی۔

سب ہی جوان لوگ انقلاب لانے کے خواہش مند تھے۔ ایک پرامن انقلاب۔ یہ بس تمہاری عقل ہی تھی کہ تم نے خوابوں میں رہنے کے بجائے ساست کو عملی طور پر اپنی زندگی میں شامل کر لیا۔“ کرٹ کی آنکھیں مشروب کے نشے سے سرخ ہو رہی تھیں اور وہ کتاب زندگی کی پرانی یادوں کے باب تیزی سے پلٹتا جا رہا تھا۔

دوسرے دور کے آغاز پر کرٹ نے اس کے ہاتھ میں جو تھمایا تھا۔ ایڈ ابھی تک اسی گلاس سے مختصر چمکیاں لے رہا تھا۔

”آہ۔ یہ دنیا کسی ظالم درندے کے مانند ہے جو اپنے خونخوار بیٹوں میں انسان کو بیکڑ لیتی ہے۔ محبت اور خلوص والے جذبات کو لمبا میٹ کر کے ہی اسے چین آتا ہے۔ ہم کسی مقصد کے تحت اس دنیا میں وجود پذیر ہوتے ہیں۔“

کرٹ غالباً بیکٹے لگا تھا لیکن عین موقع پر سنبھل گیا۔

”تم۔۔۔ میرے بچے تم۔۔۔ ہمیشہ سے ہی یہ بات سمجھتے تھے۔ انیس سال کی عمر میں ہی تم اس بات سے واقف تھے کہ یہ کائناتوں کا بستر ہے۔“

”تم نے دنیا کو بدلنے کی کوشش کیوں نہیں کی؟“ کرٹ نے اپنا گلاس ایک طرف رکھتے ہوئے پوچھا۔ ”حالانکہ تم تو جانتے بھی تھے کہ اس دنیا کو کیسے بدلا جاسکتا ہے۔“

”کس نے کہا میں نے کوشش نہیں کی؟“ ایڈ کے چہرے پر ایک زہریلی مسکراہٹ تھی۔

”پھر تم کامیاب کیوں نہیں ہوئے؟ کیا بیساکمانے کی چاہ اتنی بڑی تھی کہ دنیا میں اس لانے کا خواب اس کے سامنے ماند پڑ گیا؟ یا پھر تم نے اپنی کوئی دنیاوی تلاش کی؟“

”نہیں پروفیسر۔۔۔ ایسا کچھ نہیں۔ میں بس یہ اچھی طرح جانتا ہوں کہ اس دنیا کا نظام کیسے چلتا ہے؟“ ایڈ نے پرسوج بے جس میں جواب دیا۔

پروفیسر کرٹ کی باتوں نے اس کے دل و دماغ میں بھونچال سا پیدا کر دیا تھا۔ اتنے دنوں کے بے گلی کی وجہ سے سمجھ آئی تھی۔ اس ظالم دنیا میں نازل زندگی کی طرف

واپسی کا ارادہ جواب تک دماغ کے بند درپچوں میں قید تھا وہ سب کچھ تو ذکر باہر آ گیا تھا۔

کرٹ کے دماغ پر غبار طاری ہو گیا تھا۔ لیونگ روم میں جاری پارٹی میں شامل ہونے کے بعد وہ ضرورت سے زیادہ چمک رہا تھا۔ مہمان اپنی سستیوں میں مگن تھے۔ ایک جانب چند جوڑے تیز موسیقی پر رقص میں مصروف تھے۔ کرٹ نے جب ایڈ کو لوگوں سے متعارف کرانا شروع کیا تو اس نے اجازت لینے میں ہی عافیت سمجھی۔ کرٹ بھی اس کے پیچھے پیچھے آیا۔

”یہ دیکھو۔ یہ ایڈ روڈ۔۔۔ پیراؤکٹا تارا۔ یہ میری آخری امید تھا۔ اب یہ پارک میں کسی سائے کا اندر چتا ہے۔ دیکھو میری اس ناکامی کو۔ اس نے سیاسی پارٹی میں شمولیت اختیار کر لی۔“

ایڈ اسی راستے سے واپس ہوا جہاں سے وہ داخل ہوا تھا۔ کھلی ہوا میں گہرے سانس لیتے ہوئے وہ اپنی کاری جانب چل پڑا۔ پروفیسر کرٹ کے الفاظ اس کے ذہن پر کسی بھتوڑے کی طرح برسر رہے تھے۔

☆☆☆

ایڈ اپنے ہوٹل میں صبح چھ بجے تک سو جا رہا۔ بھرپور نیند کے بعد اس نے کرس ہیمز کی فون کو بغور دیکھا جو پائرس نے اسے روانہ ہونے سے قبل دی تھی۔ وہ غصے ہوئے مضبوط دھن کا مالک تھا جس پر جا بجا ٹیٹو گدے ہوئے تھے۔ یہ وہ شخص تھا جس کی پناہ میں آکر لیزا اخام خیالی کا شکار ہو گئی تھی کہ وہ اب محفوظ ہو گئی ہے۔

ہیمز خود کو ساؤتھ بوسٹن کے ایک گینگ سے متعلق بتاتا تھا، حقیقت میں وہ سڑک چھاپ موالی سے زیادہ کی حیثیت نہیں رکھتا تھا۔ وہ بڑے جرائم پیشہ لوگوں کی گاڑیاں ڈرائیو کرتا یا کبھی کبھار بوڑھوں، بچوں سے مار پیٹ کر کے اپنی بد معاشی کا بھرم قائم رکھتا تھا۔

”تم نے شاید۔۔۔ کافی عرصے سے اسے نہ دیکھا ہو۔۔۔ اور اس لوفر کے ارد گرد جانے کتنی آوارہ عورتیں منزل لا رہی ہوں گی، اس لیے یہ بھی لیتے جاؤ۔“ پائرس نے لیزا کی ایک تازہ فونو گراف دیتے ہوئے کہا تھا۔

بلیک ایڈ وائٹ ہونے کے باوجود ایڈ کو وہ اس میں کافی دلچسپی محسوس ہوئی۔ ہوا کے چھوٹوں سے لہراتے بالوں کے ساتھ وہ ایک جانب دیکھ رہی تھی جیسے کسی کی بات کو بہت غور سے سن رہی ہو۔

برولین کی ایک گلی کا ایڈ ریس بھی اس کو لکھ کر دیا گیا تھا

جس پر یہ پیغام درج تھا۔۔۔

”لو! کاہر یعنی رات، رات گئے تک شہر میں موج مستی کرتا ہے۔ لیکن واپس اپنے اگلے کے مکان پر ہی لوٹتا ہے۔“

روٹ تان پر اپنی شیوی دوڑاتے ہوئے ایڈ اپنی منزل کے قریب پہنچ گیا۔ برولین کی گلیوں میں داخلے کے بعد اس نے گاڑی کی رفتار بڑی دھم کر دی تھی۔ کتنی پتھروں سے کتنی عمارتیں اس وقت سناں دیرانوں کا منظر پیش کر رہی تھیں۔

اپنے مطلوبہ مکان والی گلی میں گاڑی پارک کر کے وہ پیدل ہی اس کی جانب چل پڑا۔ سو سال پہلے کے کسی اصلیل کی آرائش کر کے مکان کی صورت حاصل کرنے والی وہ عمارت اپنے ارد گرد سے بڑا مختلف تاثر پیش کر رہی تھی۔

سامنے کا حصہ اگرچہ چھوٹا تھا لیکن نیم دائرے کی شکل والے ڈرائیوے میں دو گاڑیاں ٹھہرانے کی گنجائش موجود تھی۔ ایک سرخی بڑک کی نمبر پلیٹ دیکھ کر ایڈ کو یاد آیا کہ یہ لیزا کی ملکیت ہے۔ شاید اس کے باپ نے ایک سال قبل ساگرہ کے تحفے میں اسے دیا تھا۔ دوسری کار کو کوئی یورپی اسپورٹس کپڑی کی تھی۔ جو کہ ساتھ والے لان کی گھاس کو روندتے ہوئے پارک کی گئی تھی۔

ایڈ نے مطلوبہ دروازے پر پہنچ کر ایک گہری سانس لی اور تیزی سے دسک دے ڈالی۔ تقریباً فوراً ہی ایک چینی۔۔۔۔۔ شکل والے شخص نے دروازہ کھولا اور اس کی جھری میں سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

”کون۔۔۔“ الفاظ ابھی اس کے منہ میں ہی تھے کہ ایڈ کی زوردار نگر سے دروازہ اس کے منہ پر لگا اور وہ کچھ بولنے کی حسرت لیے بری طرح کراہ اٹھا۔

ایڈ کی خود کا دشمن کی طرح متحرک تھا۔ اس نے پھرتی کے ساتھ دروازہ کھولا اور اندر داخل ہو گیا۔ اس دوران اس نے نہایت تیزی کے ساتھ ہولٹرس سے گن نکال کر اپنے ہاتھ میں لے لی تھی۔ خوش قسمتی سے مضبوط لکڑی کا دروازہ اس شخص کے سین منہ پر لگا تھا جس کو پکڑ کر وہ ہرا ہوا جا رہا تھا۔

اندرو داخل ہو کر ایڈ نے سب سے پہلا کام دروازہ بند کرنے کا کیا اور اس کے بعد اس چینی نقوش والے شخص پر اپنی گن تان لی۔ شدید جھٹ کے باوجود بھی وہ ابھی تک اپنے حواسوں میں تھا۔ اس لیے تو گتے شخص کے پاس بھی ایک عدد پستول موجود تھا لیکن فی الحال وہ اپنے چہرے کے بارے میں زیادہ فکر مند تھا، اس کی آنکھیں حیرت سے کھلی پڑ رہی تھیں جبکہ ہاتھوں سے اپنے منہ کو سہارا تھا۔ وہ گہرے سانس لے

رہا تھا لیکن ابھی بولنے کی کوشش نہیں کی تھی۔

ایڈ نے اپنی گن سے اشارہ کیا اور وہ سمجھنے کے انداز میں تابعداری کا مظاہرہ کرتے ہوئے ٹھنوں کے بل بیٹھ گیا۔ اب بھی اس کے منہ سے خون رُس رہا تھا۔

ایڈ فوراً ہی اس کے پیچھے پہنچا اور پوری قوت سے گھما کر ایک لات اس کی نپٹی پر رسید کر دی۔ اور وہ چوٹ کھا کر اپنے بھاری وجود کے ساتھ زمین بوس ہو گیا۔ ایڈ نے اس کی لمبی بے ہوشی کا اندازہ لگانے کے ساتھ ہی اس کا ریو اور نکال لیا، ایک جھٹکے سے اس کا جیبر کھول کر چھ کی چھ گولیاں فرش پر پھینکیں اور ریو اور کو ساتھ پڑے ایک آرائشی پودے والے گھلے میں ڈال دیا۔

مکان ایک سیدھی لائن میں بنا ہوا تھا جس میں ایک کے بعد ایک کمرہ قطاری صورت میں موجود تھا۔ ایڈ نے تیزی سے لیونگ روم، طعام گاہ اور باورچی خانے کو پار کیا۔ دروازے کھلے ہونے کے باعث اسے رک کر دیکھنے کی ضرورت نہ تھی۔ اگلا دروازہ منقل تھا اور دیگر کے مقابلے میں مختصر بھی تھا۔ ایڈ نے دھکا مارنے سے قبل گن کو مضبوطی سے اپنے دوسرے ہاتھ میں منقل کیا اور دوڑ کر ایک زوردار ٹکڑا کر دی۔

ایڈ اور چوبی دروازہ بیک وقت کمرے کے فرش پر آکر گرے تھے۔

کمرے میں تاریکی چھائی ہوئی تھی لیکن ٹوٹے ہوئے دروازے سے آنے والی روشنی ایڈ کے لیے کافی تھی۔ ایک سایہ سار تیزی سے اس کی جانب آیا لیکن اس نے قابل دید پھرتی سے اپنے بدن کو تیش دی اور ایک جانب ہو گیا۔ اس نے آنے والے کو تیش سے پکڑا اور تیزی سے اس کے جسم کو دائیں جانب دھکیلتا ہوا ریماری میں لے آیا۔

ہیمینڈ نے گالیاں دینے کی کوشش کی لیکن بازو مروڑنے پر وہ چلا کر رہی رہ گیا۔ روشنی میں ایڈ نے جائزہ لیا تو اس کی بلند قاتلی اور ڈیل ڈول سے متاثر ہوئے بنانا نہ رہ سکا قدم طرز کے بنوائے گئے نیو پوری طرح سے عیاں تھے کیونکہ ہیمینڈ کے بدن پر اس وقت صرف ایک زیر جامہ تھا۔ ایڈ نے دھکا دے کر اسے ٹائلوں والے خوبصورت فرش پر گر دیا۔

بائرس نے آمد سے قبل اس کو زولو کی ہدایات اچھی طرح ذہن نشین کرادی تھیں۔ اور ایڈ کو پتہ چلنے کے دوران کبھی کبھی وہ ساری باتیں اُتر رہیں۔

”اس کی پیمیشی لگا دینا۔ اور اگر ضروری سمجھو تو بے شک جان سے مار دینا۔ لیکن اس کی مار لگانا از حد ضروری ہے۔ کوشش کرنا کہ یہ مار ایڈز کے سامنے لگاؤ۔ اس احمق کو

بھی پتا چلنا چاہیے کہ وہ کس گدھے کے ساتھ بھاگی ہے جو مار پڑنے پر بری طرح رینگنے لگا ہے۔“

ایڈ نے گن اس پر تانتے ہوئے ایڈز کو اندر سے کمرے میں آواز دی۔ وہ بستر کی چادر میں لپٹی فوراً باہر نکل آئی۔ کسی بگڑی ہوئی شہزادی کے بجائے وہ اس وقت شدید خوفزدہ لڑکی لگ رہی تھی۔ ایڈ نے ہیمینڈ کو کھڑا ہونے کا اشارہ کیا۔ وہ ایڈ سے قدم کوئی دو تین انچ اوپر ہی تھا اور وزن میں کوئی پچاس پونڈ زیادہ۔

ایڈ نے گن سے میگزین باہر کھینچ لیا، جیبر میں موجود اکلوتی گولی بھی ماہرانا انداز سے باہر نکالی اور گن سمیت سب کچھ کچن کاؤنٹر پر رکھ دیا۔ اب وہ ہمتا ہیمینڈ کے سامنے کھڑا چیخ کر رہا تھا۔

”آ جاؤ۔“

”ماں۔“ ہیمینڈ ایک غلیظ گالی دیتے ہوئے اس کی جانب تیزی سے بڑھا۔

اس کی رفتار طوفانی تھی اور اس وقت وہ کسی انسان سے نکل کر اتا تو شاید اس کی جان جانے کا سبب بن سکتا تھا۔ ایڈ نے سانس روک لی۔

اس نے ہیمینڈ کو اپنے قریب آنے کا موقع دیا اور اسے اپنے سر پر ہاتھ مارنے تک رکھا رہا۔ جیسے ہی اس کا ہاتھ بلند ہوا ایڈ پھرتی سے ایک جانب ہوا اور اس کے لیے اپنی دائیں ٹانگ پر گھومتے ہوئے ایک لیفٹ رائٹ ہارس ٹک ہیمینڈ کی پسلیوں میں جڑ دی۔ اسٹیل کے نعلے کی ضرب خوفناک تھی اور ایسی آواز آئی جیسے برف کے ٹکڑے کو توڑ دیا گیا ہو۔

ایڈ اچھل کر ایک جانب ہو گیا۔ وہ چاہتا تھا کہ ہیمینڈ محسوس کرے کہ اس کے ساتھ کیا ہو چکا ہے۔ ہیمینڈ نے سنبھلنے کی کوشش کی لیکن فوراً ہی گھٹنے کے بل ڈھے سا گیا۔ وہ ایڈ کو حیران نظروں سے دیکھ رہا تھا جیسے جھٹکے کی کوشش کر رہا ہو کہ وہ اتنے کم وقت میں اتنا زیادہ خطرناک کیسے ہو گیا؟ تکلیف کی شدت سے اس کے چہرے کا زاویہ پر لہر تبدیل ہو رہا تھا۔

”کھڑے ہو لو۔“ ذرا اپنی جوانی کا جوش ادھر بھی تو دکھاؤ۔“ ایڈ ابھی تک اپنی جگہ پر دیر سے دیر سے اچھل رہا تھا۔ ایڈز اسے سب نہ سمجھ سکی۔ وہ دیکھ چکی تھی کہ ہیمینڈ بری طرح زخمی ہو چکا ہے۔

”بے غیرت انسان۔“ وہ ایڈ سے مخاطب ہوئی۔ ”اسے چھوڑ دو۔“ جلتی ہوں میں تمہارے ساتھ۔ کیا یہ کافی نہیں ہوگا؟“

ہیمینڈ کے حواس کسی قدر قابو میں آچکے تھے۔ اپنے

دائیں پہلو کو دباتے ہوئے وہ ایک بار پھر ایڈ کی جانب بڑھا۔ ایڈ نے اس بار دووں کے درمیان فاصلہ کم کیا۔ ہیمینڈ نے فوراً اپنا چہرہ بچانے کے لیے ہاتھ اوپر کیے۔ لیکن یہی ایڈ کی چال تھی۔ اس نے فوراً اس کے مضروب پہلو پر ہاتھ رکھ دیا اور تیزی سے دبانے لگا۔

ہیمینڈ کی ٹانگ کھٹک کھٹک جھینٹا نکل گئیں۔ اس نے ایڈ کا گلا پکڑنے کی کوشش کی لیکن بے تحاشا دردی کیفیت نے اس کی ساری کوششوں پر پانی پھیر دیا۔

ایڈ نے ابھی تک دباؤ ڈالا ہوا تھا۔ اس نے اچانک بازو پکڑ کر مروڑ دیا اور ٹوٹی چلی کو ایک جھٹکا دے دیا۔ دردی شدت سے ہیمینڈ کا چہرہ سرخ سے جامنی ہو گیا تھا اور آنکھیں اٹل کر باہر آ گئیں۔ ایڈز نے اس کی یہ حالت دیکھ کر اندر کی جانب دوڑنا شروع کر دیا۔

درویدہ لگا ہوں سے ایڈ نے دیکھ لیا تھا کہ وہ تیزی سے کمرے کی اندرونی جانب لپٹی تھی چنانچہ اس نے ہیمینڈ سے ٹھنکے کا فیصلہ کر لیا۔ اس نے ایک طوفانی مکا اس کی آنکھ پر جڑ دیا۔ بے ہوش ہو کر ہیمینڈ کی بوری کی طرح فرش پر ڈھیر ہو گیا۔

ایڈ تیزی سے کمرے میں داخل ہو گیا۔ ایڈز اس وقت ایک چھوٹے کلب پر کھڑے ہوئے گولیاں ڈالنے کی کوشش کر رہی تھی۔ گالیاں بکتے ہوئے اس کے ہاتھ بھی بری طرح سے کانپ رہے تھے۔ ایڈ نے اس کے ہاتھ تھامے اور مروڑ کر آرام سے گن چھین لی۔ وہ کرائی اور اس کے کندھے ڈھلک گئے جیسے شکست خوردہ ہوئی ہو۔

یہ ایڈ کو بے وقوف بنانے کی کوشش تھی جس میں وہ کامیاب رہی۔ ایڈ کا چہرہ اس کی پینچ میں تھا، اس لیے جیسے ہی وہ ڈھیلا پڑا اس نے فوراً اپنے لیے ناخنوں سے آدھیر ڈالا۔ خراشیں اُٹتی گہری تھیں کہ ان سے خون رسنے لگا لیکن وہ ابھی تک چلتا ہے ہوئے اس کا منہ بچنے کی کوشش میں لگی تھی۔ ساتھ ساتھ وہ ہڈیانی انداز میں قہقہے بھی لگ رہی تھی۔ ایڈ کی برداشت سے باہر ہو گیا تو اس نے ایک مکا اس کے چہرے پر بھی جڑ دیا وہ لڑھکتی ہوئی الماری کے سامنے قائلین پر گر گئی۔

ایڈ چند لمحوں تک اس کے سینے کے نشیب و فراز پر نگاہ جھانک رہا تھا۔

جب اطمینان ہو گیا کہ وہ اس بار کوئی کرنٹیں کر رہی تو وہ تیزی سے بھاگا اور ہیمینڈ کو کھاتے ہوئے خواب گاہ کا جائزہ لینے لگا۔ جس اور دیگر نشانات موجود تھیں لیکن ہیر و مین کی عدم موجودگی پر اس نے ایک اطمینان بھرا سانس لیا۔ زولو کو شک

تھا کہ وہ ہیر و مین کا نشر کرنے لگی ہے۔ اس کی باتیں زوردار پتی تھیں لیکن انکشاف کے دعووں سے صاف تھیں۔

ایڈ نے احتیاط سے ایڈز کو اپنی گود میں لیا اور اچھی طرح اس کی کپٹی کو دیکھا۔ اس کے سوسے ہوئے چہرے پر ہاتھ رکھا۔ چوٹ کے نشان کے ساتھ ایک ہلکا سا ٹک بھی ابھرا آیا تھا۔ وہ زخمی ہے اسے ہوش میں لانے کی کوشش کرنے لگا۔

”اچھا۔۔۔ نہیں۔ کیا؟“ وہ بے ربط سا بولنے لگی۔

”آرام سے۔۔۔ آرام سے۔۔۔ جاگتی رہو۔۔۔ جھیک ہے؟ زیادہ دیر بے ہوش رہیں تو طبیعت خراب ہو جائے گی۔ بہتر ہوگا کہ اب تم اٹھ جاؤ اور میرے ساتھ رہو۔۔۔ ہمیں برف کی ضرورت ہے۔ کیا تم کھڑی ہو سکتی ہو؟“ ایڈ نے پچکارنے کے انداز میں حکم دیا۔

وہ اسے سہارا دے کر کچن تک لے آیا۔ ایڈز اسے قدم ابھی تک لرز رہے تھے لیکن ایڈ کو اطمینان تھا کہ وہ اس کی توقع سے زیادہ تیزی سے خود کو سنبھال رہی تھی۔

ہیمینڈ ابھی تک اسی حالت میں زمین چاٹ رہا تھا جس میں ایڈ اسے چھوڑ کر گیا تھا۔ ایڈ نے پلاسٹک کی ایک پٹیلی میں برف ڈال لی۔

”اپنی چیزیں ٹائف سمیٹ لو۔۔۔ تمہیں ابھی گھر بھی جانا ہے۔“

ایڈ نے اسے موقع دیا کہ وہ اپنی ضروری چیزیں سمیٹ لے۔ اس دوران اس نے مکان کا جائزہ لیتا شروع کر دیا۔ یہ مکان ہیمینڈ کے اٹکل فرار ڈول کی ملکیت تھا۔ چونکہ علاقے کا مشہور غنڈا تھا۔ فرار کی بہن، کرس ہیمینڈ کی ماں تھی۔ اسی وجہ سے وہ کبھی کار، نیو والی باڈی اور اس گھر کا مالک بن چکا تھا۔

مکان کی زیر بنیاس نہایت عمدہ انداز میں کی گئی تھی۔ لگتا ہی نہیں تھا کہ اس میں ہیمینڈ جیسا کوئی غنڈا، موالی بھی رہتا ہوگا۔ انیسویں صدی کی خوبصورت تصاویر سے ایک ایک دیوار مزین تھی۔ شطرنج کی بساط کی طرح سفید و سیاہ ٹائلیں فرش کی خوبصورتی کو بڑھاتی تھیں۔ جبکہ گولوں میں سجے آرائشی پودوں کا سبزہ آنکھوں کو ایک خوشگوار تزاوٹ بخشتا تھا۔ بڑی بڑی کھڑکیاں باہر کے خوبصورت مناظر کو قابل دید بنا رہی تھیں۔ ایسا لگتا تھا اس مکان کی تزئین و آرائش کے لیے کسی پیشہ ور کی خدمات حاصل کی گئی تھیں۔

ایڈز ایک چست چٹون اور سیاہ رنگ کی بڑی شرٹ پہن کر باہر لپکی۔ چہرے کی مطابقت سے بڑے دھوپ کے

جس نے چہرے کا ذمہ بڑی حد تک چھادیا تھا۔ اس کے ہاتھ میں ایک بڑے سائز کا لیڈر بیگ تھا جس میں چند جوڑے کپڑے بے آسانی آسکتے تھے۔

”بس..... کیا یہ سب تمہاری ضرورت کے لیے کافی ہوگا؟“

”میرے پاس بس یہی کچھ ہی ہے.....“ اس نے سسکتے ہوئے کہا اور بیسڈ کی جانب دیکھنے لگی جو کابھی کبھی آواز میں گراہ رہا تھا۔

”جینگ کہاں ہے؟“ اس نے چونک کر پوچھا۔

قطار در قطار کمروں والی راہداری سے گزرتے ہوئے اسے اچانک خیال آیا تھا لیکن ایڈ نے اسے جواب دینے کی ضرورت محسوس نہ کی۔ ایڈز کا سانس اوپر کا اوپر اور نیچے کا نیچے رہ گیا، جب اس نے جینگ کو دروازے کے پاس اوندھا لے کر دیکھا۔

”کیا تم نے اسے قتل کر دیا؟“

”نہیں.....“

ایڈز کی آنکھوں میں بے چینی تھی لیکن وہ اس کے پیچھے مکان سے نکل کر چپکے سے جاتی ڈرائیو سے نکل بیٹھ گئی۔

”میرے ٹرک کا کیا ہوگا؟“

”مجھے یقین ہے کہ زلو تو تمہیں ایک نیا لے دے گا..... یا پھر کسی کو بیچ دے گا کہ یہاں سے آکر لے جائے.....“

”لعنت ہو..... میں خود ڈرائیو کروں گی..... اور تمہارے پیچھے پیچھے آ جاؤں گی۔“ اس کا پرانا اکھڑ مزاج واپس آ رہا تھا۔

”بھول جاؤ.....“

”نہیں..... ایسا مت کرو..... میں تمہیں شاید جانتی ہوں..... نام کیا تھا تمہارا؟“

”ایڈ.....“

”ایڈ..... سچ..... دیکھو ایڈ..... ڈیڑی اکثر تمہارا ذکر کرتے رہتے ہیں۔ تم ان کے نزدیک بہترین ہو..... ہر چیز میں..... پلیز مجھے اپنے پیچھے آنے دو..... میں اب کہاں جاسکتی ہوں؟ اس تماشے کے بعد اگر میں یہاں واپس لوٹی تو بیسڈ کے گھر والے میری جان لے لیں گے..... سچے؟ میں تمہارے پیچھے آؤں گی..... اس طرح میری گاڑی کم از کم ایک ایسے مکان کے سامنے سے نہیں ملے گی جہاں تم ایک آدمی کو قتل کر چکے اور دوسرے کو مرنے کی حد تک مار کے بے ہوش چھوڑ آئے ہو.....“

”میرا نہیں خیال وہ آدمی مر چکا ہے.....“

”مجھے تو وہ کوئی مردہ ہی لگ رہا تھا..... ایڈ.....“

ایڈ نے ارد گرد دیکھا اور پھر پلٹ کر ایڈز کو دیکھا۔ وہ آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات کر رہی تھی..... وہ حنا تر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ ”تم اپنے باپ کو جانتی ہو.....“

”ہاں..... بڑے اچھے طریقے سے جانتی ہوں.....“

”وہ تم سے پہلے ہی مارا ہے.....“

”ہاں..... یہی جانتی ہوں.....“

”تم نے ایک ایسی حرکت مزید کی تو وہ مجھے تمہیں مارنے کا بھی حکم دے سکتا ہے.....“

”تم نے پہلے ہی مجھے مارا ہے.....“

”مارنا مطلب جان سے مارنا..... سمجھیں؟“

”ہاں..... سمجھ گئی.....“

”تم نے مجھ سے جان چھڑا کر بھاگنے کی کوشش کی تو میں تمہیں قتل کروں گا..... سمجھ گئی؟“

”ہاں سمجھ گئی ایڈ.....“

”اچھی طرح؟“

”ہاں.....“ وہ اس کے قریب آگئی لیکن ایڈ نے اپنی جگہ سے جنبش تک نہ کی۔

”مجھے ذرا برابر بھی فرقی نہیں پڑے گا..... تم یہ بات جانتی ہو؟“ ایڈ نے اس پر ہاتھ پٹکی سے کہا تھا۔

”جیسے تمہارا دل کرنے ویسے کرو.....“ وہ اس کے کندھے سے لگ کر بھونکنے لگی۔

”میرے پیچھے پیچھے آنا.....“ ایڈ نے علیحدہ ہوتے ہوئے کہا اور اپنی کار کی جانب بڑھ گیا۔

☆☆☆

ایڈز کے شاور لینے کے دوران ایڈ کی پائرس سے طویل بحث ہوئی..... کم از کم اسے تو وہ بہت طویل لگی۔ ایڈ چاہتا تھا کہ ایڈز کی باز پائی کے بعد اب کوئی بھی اسے آکر وہاں سے لے جائے۔ وہ مانی کا اختتام ہفتا ہفتی مرضی سے اپنی پسند کے لوگوں کے ساتھ گزارنا چاہتا تھا..... کچھ ذاتی معاملات نمٹانا چاہتا تھا۔

واپسی کی خواہش سر پر چڑھنے لگی تھی۔

میں ایکس سالہ ایک لڑکی کو وہ اپنے ساتھ ہر جگہ گھٹنے کے حق میں بالکل بھی نہیں تھا۔

”یہاں تو اس وقت کوئی اور بھی دستیاب نہیں ہے.....“

پائرس نے فوری طور پر انکار کر دیا۔

نوبہر کا آغاز ہو چکا تھا اور یوٹیل انکشن سر پر آن پہنچے تھے۔

”دراصل.....“ پائرس ہچکچایا..... ”میں تمہاری بھی یہاں پر اشد ضرورت ہے..... تمہیں کتنا وقت لگ جائے گا یہ

اپنا.....“ ذاتی کام، ختم کرنے میں.....؟“

”شاید پورا دو ایک ایڈ لگ جائے..... لیکن اگر اتنی ہی میری ضرورت ہے تو میں کل سہ پہر واپسی کے لیے روانہ ہو سکتا ہوں.....“

فون پر خاموشی سی چھا گئی..... ایسا محسوس ہوا جیسے کوئی ریسیور پر ہاتھ رکھ کر آواز کو دبائے کی کوشش کر رہا ہو۔ ایڈ کو شدید الجھن ہوئے لگی تھی کہ اسی وقت پائرس لائن پر واپس آ گیا۔

”ہاں..... زلو صاحب اپنی بیٹی کے حوالے سے بہت پریشان ہیں..... وہ اس کو فوراً اپنی آنکھوں کے سامنے دیکھنا چاہتے ہیں..... ایڈ..... تمہارا یہ “ذاتی کام” واقعی کوئی اہم نوعیت کا ہونا چاہیے.....“

”میں ابھی اس کو بس پر بٹھا کر واپس بھیج سکتا ہوں۔ اگر اتنی ہی سہ جینی ہے تو..... وہ چار گھنٹے میں تم تک پہنچ جائے گی..... پھر تم اس کو بس اسٹاپ سے یک کر سکتے ہو.....“

”ایڈ..... پلیز..... تم تو سمجھ دار ہو۔ مگر وہ راستے میں کسی بھی اسٹاپ پر اتار کر دو؟ اور اگر وہ یہاں نہیں پہنچتی تو تم کس منہ سے زلو کا سامنا کرو گے؟ اگر تمہیں واقعی کوئی بہت ضروری کام ہے تو اس کو فٹا اور لڑکی کو لے کر فوراً واپسی کی راہ لو..... اسے تمہارے ساتھ ہی واپس آنا ہے ہر حال میں.....“

”اور اس کا ٹرک؟“

ایک بار پھر لائن پر خاموشی چھا گئی.....

”مسٹر زلو چاہتے ہیں کہ جیسے تم مناسب سمجھو بے بی اس ٹرک سے نجات حاصل کر لو..... چاہے اپنے کسی آدمی کی مدد سے واپس لے آؤ یا وہیں کی کوئی دو..... اس کام کی بھی تمہیں علیحدہ سے قیمت مل جائے گی..... لیکن لڑکی کو ہر حال میں اتار تک یہاں بیٹھ جانا چاہیے..... پائرس نے یہ کہہ کر لائن کاٹ دی۔

ایڈ نے غصے میں اپنا فون ایک جانب پھینک دیا..... ”قیمت مل جائے گی.....“ پائرس کے الفاظ نے اس کی روح تک کو سلگا دیا تھا..... ایک وقت تھا جب زلو خود ایڈ کو حکم جاری کیا کرتا تھا۔ اب اس کے جیسے اس کے ساتھ زر خرید غلاموں والا سلوک کر رہے تھے۔ غصے میں آکر اس نے اپنی شرٹ اتار کر ایک جانب پھینک دی اور تیزی سے پیش اب لگانے کے بعد اس نے اپنے غصے کی آگ کو کسی قدر سرد ہوتا محسوس کیا۔

وہ سخت کسرت کے بعد تیزی سے سانس لے رہا تھا جب ایڈز صرف ایک تو لے میں اپنی کھل خانے سے باہر نکلی۔

سنگھار میز کے آئینے پر لگی اپنی تصویر دیکھ کر وہ چونک سی گئی۔ ایڈ نے خود کو ذہنی طور پر اس حوالے سے کبھی بھی قسم کے سوال کے لیے تیار کر لیا لیکن وہ کچھ بھی نہ بولی۔ تصویر واپس لگاتے ہوئے وہ پرسوج انداز میں اس پر اپنی خردلی انگلیاں پھیرتی رہی پھر تیزی سے ایڈ کے پاس آگئی۔

اب وہ انگلیاں ایڈ کے سینے پر پھیر رہی تھی مگر اس کی جانب دیکھنے سے گریز کر رہی تھی پھر اس کا ہاتھ اس کے پیٹ تک پہنچ گیا لیکن ایڈ نے پیچھے ہٹنے کی بالکل کوشش نہ کی۔

”ایک بوڑھے آدمی کے حساب سے تو بہت سخت ہے تمہارا جسم.....“

”اتنا بھی بوڑھا نہیں ہوں.....“

”ہمم..... تو ہم کب روانہ ہوں گے؟“

”مجھے کچھ کام ہے..... مجھے آج کسی سے ملنا ہے..... کچھ دوسرے کاموں کو کل پورا کرتا ہے..... اس کے بعد ہم واپس جاسکتے ہیں.....“

”مجھے یہ زخموں کے نشان اچھے لگ رہے ہیں.....“ وہ سرگوشی میں بولی اور اس کے سینے پر یوں کی بارش کر دی۔ وہ چند لمحوں کا کھڑا رہا پھر حرکت میں آیا تو وہ دونوں بستر پر تھکے..... اور جذبات کے سیل رواں میں دونوں ڈوبنے ابھرنے لگے۔

شاور لینے ہوئے ایڈ نے دروازہ بند کرنے کی زحمت نہ کی..... وہ ابھی تک خشک میں تھا کہ ایڈز اسے غل دے کر کہیں رو پھرنے نہ ہو جائے۔ وہ باہر آیا تو ایڈز اس کی ہی ایک شرٹ پہنے اپنے حسن کی جلوہ نمائی میں مصروف عمل تھی..... وہ بستر پر لیٹا تو وہ اس کے گرد پٹ سی گئی۔

”میں اپنے باپ کے ساتھ نہیں رہ سکتی.....“

”یہ میرا مسئلہ تو نہیں ہے.....“

”میں پھر بھاگ جاؤں گی..... اور اس وقت تک بھاگتی رہوں گی جب تک میرا باپ میرے پیچھے آنا بند نہیں کر دیتا..... یا تم آکر میری جان نہیں لے لیتے..... تب تو یہ تمہارا مسئلہ ہوگا نا؟“

ایڈ نے اس کی آنکھوں میں جھانکا جہاں روشنیوں کا راج تھا۔

”تم گھر چھوڑ کر بھاگو یا نہ بھاگو..... وہ شاید جلد ہی تمہیں مروا دے گا.....“ وہ اس کے چہرے کو اپنے ہاتھوں میں لپیٹے ہوئے بولا۔

وہ بنا آواز کے رونے لگی۔

”میں جانتی ہوں.....“ اس نے سسکی بھری۔

”ایڈ۔۔۔۔۔؟“

”ہاں بولو۔۔۔۔۔“

”کیا اس نے میری ماں کو بھی قتل کروا دیا تھا؟“

”ہاں۔۔۔۔۔“

وہ یہ بات جانتی تھی پر کبھی کسی دوسرے کے منہ سے نہیں سنی تھی وہ بڑبڑ کر رہ گئی اور کھڑکی کی جانب دیکھنے لگی۔

”کیا تم میری ماں کو جانتے تھے؟“

”ہاں۔۔۔۔۔“

”کیسی گلی تھی وہ؟“

”بہت اچھی طرح تو نہیں جانتا۔۔۔۔۔ میں خود اس وقت اپنے لڑکپن میں تھا۔۔۔۔۔ تم سے بھی چھوٹا۔۔۔۔۔ میں بروکلین میں ہوتا تھا لیکن ہم دونوں میں اکثر جاتے تھے۔ میں اکثر اوقات ویٹر ہوتا تھا اور میز پر رکھنے شروع میں ہی نہ آنے دینا میری ذیولٹی ہوتی تھی۔ وہاں زولو بھی آیا کرتا تھا۔ تمہاری ماں اس کے مقابلے میں بلند قامت تھی۔ اونچا بولنے والی۔۔۔۔۔ بخدا بہت خوبصورت تھی۔۔۔۔۔ ہر طرح پر۔۔۔۔۔“

”تم نے میرے باپ کے پاس کیسے کام شروع کیا؟ اور بروکلین کیوں چھوڑ دیا؟“

”میرے ایک اکل وہاں ہوتے تھے۔۔۔۔۔ انہوں نے خرچہ دیا کہ میں کالج جاسکوں۔ چار سال وہاں گزارے۔۔۔۔۔ پھر چند سال فوج میں۔۔۔۔۔ جب واپس آیا تو سب کچھ زولو چلا رہا تھا۔۔۔۔۔ اس نے مجھے کام کی پیشکش کی جو میں نے قبول کر لی۔۔۔۔۔“

”کیا تم اسے پسند کرتے ہو؟“

”ہم۔۔۔۔۔ ہم دوست ہیں۔۔۔۔۔ یہ کہتے ہوئے ایڈ نے نظریں چرا لیں۔ دونوں بڑی دیر تک ہم آغوش رہے اور ایک دوسرے کے بدن سے گرمی چراتے رہے۔

☆☆☆

ایڈ اور کرٹ کی ملاقات ساحل پر ہوئی جہاں انہوں نے بیف سینڈویچ کھائے۔ ایڈ بھول چکا تھا کہ وہ کتنے لڑکے تھے اور وہ کتنے شوق سے کھایا کرتا تھا۔ بروز ساحل پر آنے والے پتھریوں کو اڑاتا رہا اور وہاں سے فراغت ہتی تو ایڈ کے گرد اٹھیلیاں شروع کر دیتا۔ ایک جانب ایڈ ابھی غسل آفتابی سے لطف اندوز ہو رہی تھی۔

”تمہارے ذہن پر کوئی بوجھ ہے۔۔۔۔۔ عام دنوں کی نسبت، پہلے سے کہیں زیادہ بوجھ۔۔۔۔۔“ پروفیسر کرٹ نے سوال کیا۔

”بس کام کا ہی بوجھ ہے اور کیا؟“

”نہیں۔۔۔۔۔ کچھ اور ہی مسئلہ ہے۔۔۔۔۔ نہ بتانا چاہو تو اور بات ہے۔۔۔۔۔“

”مجھے افسوس ہے۔۔۔۔۔“

”اپنا افسوس اپنے پاس رکھو۔۔۔۔۔ کرٹ سیاہ پڑتے ہوئے بولا۔ ”کیا تمہیں معلوم بھی ہے کہ تم کتابدل کئے ہو؟“

”ویسا ہی تو ہوں۔۔۔۔۔“

”کاش ایسا ہوتا۔۔۔۔۔ اب تو تم اس روشنی کا سایہ معلوم پڑتے ہو جو کبھی ان گلیوں کو روشن کرنے کے لیے تمہاری صورت میں نکلا کرتی تھی۔ اب تو تمہیں دیکھ کر میں خود ڈر جاتا ہوں۔۔۔۔۔ بسا اوقات ایسا لگتا ہے کہ تم کسی کوئل بھی کر سکتے ہو۔۔۔۔۔“ کرٹ اپنی بات پر خود ہی ہنس پڑا۔

”جو کام تمہیں خود تمہارے قابل نہ چھوڑے اس کو کرنے کا کیا فائدہ؟ چھوڑ دو یہ سب کچھ ایڈ ورڈ۔۔۔۔۔ کچھ نہیں رکھا اس سیاست میں۔۔۔۔۔ تو جوان لوگوں کو تو یہ پھوڑے رکھ دینی ہے۔۔۔۔۔“ وہ ہمیشہ کی طرح اس کا پورا نام لے کر مخاطب تھا۔

”میں جانتا ہوں۔۔۔۔۔ اور شاید تمہارے کہنے سے قبل ہی اس بارے میں سوچ رہا تھا۔۔۔۔۔“

”آہ۔۔۔۔۔ یعنی کہ تم اپنی اس زندگی سے واقعی ناخوش ہو۔۔۔۔۔ میرے بچے جب بھی واپسی ہو گئی تم مجھے کھلی ہانہوں کے ساتھ خود کو خوش آمدید کہتے پاتے آگے۔۔۔۔۔“

”ہاں میں واقعی ان خطوط پر سوچ رہا ہوں۔۔۔۔۔ اور اپنی کچھ دسے داریاں پوری کرتے ہی میری واپسی کا سفر شروع ہو جائے گا۔۔۔۔۔“

”یہ تو بہت اچھی بات ہے۔۔۔۔۔ میری دعا میں تمہارے ساتھ ہیں۔۔۔۔۔ واپسی کا راستہ بھی سہل نہیں ہوتا۔۔۔۔۔ تو ذرا سنبھل کر میرے بچے۔۔۔۔۔ ویسے تم واپس آ کر میرے ساتھ کیمبرج میں پڑھانے کا کام بھی کر سکتے ہو۔۔۔۔۔“

”تمہارا بہت شکریہ کرٹ۔۔۔۔۔ ہر بات کے لیے خاص طور پر میری سوچ کو ایک راہ پر ڈالنے کے لیے۔۔۔۔۔“ وہ سر ہنسی ہوتے سمندر کی وسعت میں نگاہوں کو کم کرتے ہوئے بولا۔

”اوہ میرے بچے۔۔۔۔۔ یہی تو میرا کام ہے کہ کسی بھٹکے ہوئے کو راہ دکھا دوں۔۔۔۔۔“ کرٹ ہنسا تا کہ احوال کی تنقید کی کچھ کم ہو سکے۔ ایڈ کا شانہ جھٹکتے ہوئے وہ خود بھی ریت اور سمندر کی اٹھیلیاں دیکھنے میں مگن ہو گیا تھا۔

☆☆☆

”تمہاری عمر بے کتنی آخر؟“

”اتنا لیس سال۔۔۔۔۔“

”اوہ۔۔۔۔۔“

”میں جانتا ہوں تم نے زیادہ کا اندازہ لگایا ہوگا۔۔۔۔۔ صحیح کہہ رہا ہوں نا۔۔۔۔۔؟“

”تقریباً ساٹھ۔۔۔۔۔“

وہ اس بات پر قہقہہ لگ کر ہنس پڑا۔ وہ بھی ساتھ میں ہنسنے لگی۔

وہ اس کو اپنے ساتھ ہی ہر جگہ لے کر گھوم رہا تھا۔ پرانے ہب میں اسے پہلی ملا تو دونوں نے مل کر بیڑی اور ایک دوسرے کو اپنے گھسے سٹائے۔ وہ بھی ایڈ کو دیکھ کر بے حد حیران تھا لیکن محض آدھے گھنٹے میں وہ ایسے باتیں کر رہے تھے جیسے پچھلے دس سال سے اکٹھے ہی وقت گزار رہے ہوں۔ ایڈ خاموشی سے ایک کونے میں بیٹھ کر اپنا سینڈویچ کھا رہی تھی۔ وہ اتنے میں ہی بے حد خوش تھی۔

ایڈ کچھ پرانے دوستوں کو تلاش کرنے میں ناکام رہا۔ کیٹی اوہارا۔۔۔۔۔ فلاڈیلفیا میں موسیقی کی استاد بن چکی تھی اور سویلیون۔۔۔۔۔ لاس اینجلس میں اپنی لاء فیرم کھول چکا تھا۔ ایڈ حیران تھی کہ وہ بڑا بوجھ آدھی دو گھنٹے تک ایڈ سے باتیں کرنے کے باوجود مزید پرنسپر تھا لیکن ایڈ نے معذرت کی اور اس کے پاس سے اٹھ گیا۔ وہ اب بھی اس کا بازو پکڑ کر روکنے کی کوشش کر رہا تھا۔ ایسا لگتا جیسے ایڈ کوئی مہمان خصوصی ہو۔۔۔۔۔ جو بھی اس سے ملتا اس کے پاس سے ہٹا گوارا نہ کرتا۔ جب سویلیون کے بڑے مکان سے وہ ایڈ کے ساتھ باہر نکلا تو بالکی کی کینڈی اس کے چہرے پر چھائی ہوئی تھی۔

”انکل تو بڑی زوردار پارٹی کرتے ہیں۔۔۔۔۔ لگتا ہے تمہاری ان کے ساتھ بڑی گہری دوستی ہے۔“

”ہاں۔۔۔۔۔ بڑا اچھا وقت ساتھ گزارا ہے، ہم نے۔۔۔۔۔“

لیکن یہ میرے دوست کے والد تھے۔۔۔۔۔“

”ہاں لگ رہا تھا۔ لیکن پھر بھی تم نے ان کے ساتھ کافی وقت گزار لیا۔“

”چلو اب واپسی کا وقت آ گیا۔۔۔۔۔ اگر ہم زیادہ دیر ایسے سڑکوں پر گھومتے رہے تو میڈیٹریاں کے چیلوں کی نظر میں آ جائیں گے۔ وہ یقیناً تمہاری تلاش میں نکل چکے ہوں گے۔“

”ہم یہاں کرنے۔۔۔۔۔ کیا آئے تھے؟ کیا صرف تمہارے کالج کے پرانے دوستوں سے ملاقات کرنے؟“

”ہاں۔۔۔۔۔ کیا تم نے بھی کالج جانے کے بارے میں سوچا؟“

”نہیں۔۔۔۔۔ ہاں۔۔۔۔۔ لیکن ڈیڈی۔۔۔۔۔ میرا مطلب زولو کہتا ہے کہ بیڑی بکواس ہے۔“

”ہاں ہے تو صحیح لیکن اس کا مطلب یہ ہرگز نہیں کہ تمہیں کالج میں اچھے لوگ نہیں ملتے۔“ وہ اپنی شیوی میں بیٹھتے ہوئے بولا۔

”ہم۔۔۔۔۔“ وہ سر ہلاتے ہوئے اس کے برابر والی سیٹ پر بیٹھ گئی۔

”کیا تم واقعی جانا چاہتی ہو؟“

”ہاں۔۔۔۔۔“

”کوئی چیز کی ضرورت تو نہیں؟“

”نہیں۔۔۔۔۔ بس اب چلو۔۔۔۔۔“ وہ ادا اس لہجے میں یوٹی تو ایڈ نے گاڑی آگے بڑھا دی۔

”ان دونوں نے ستر میل کا فاصلہ ایک گھنٹے میں ہی طے کر لیا تھا اور اب جنوب کی جانب سفر کر رہے تھے۔ پائرس کا فون آیا تو ایڈ کے ماتھے پر تھوڑی سی غمو دار ہو گئیں۔ اس نے خاموشی سے اس کی ہدایات سنیں اور ہوں ہاں میں ہی جواب دیتا رہا۔ ناخوشیوں کے درخت تیزی سے پیچھے گزرتے جا رہے تھے۔

”کیا کام ہو جائے گا؟“ پائرس نے پوچھا۔

”ہاں۔۔۔۔۔ ایڈ نے مختصر جواب دے کر فون بند کر دیا تھا۔

ایڈ اس کے کپکپاتے ہاتھوں کو دیکھ رہی تھی۔

”ہم جلد ہی کسی سسٹن سڑک پر مڑ جائیں گے نا؟“

اس کے انداز میں زمانے بھر کا درد بسا ہوا تھا۔

ایڈ کو ایسا لگتا جیسے کسی نے پتھر اس کے سینے میں گھونپ دیا ہو۔۔۔۔۔ اپنی تو جگہ گاڑی چلانے پر مرکوز کرتے ہوئے وہ آہستہ آہستہ اس تکلیف سے آزاد ہوا۔

چھدرے درختوں کے بعد اب جنگل گھٹا ہوا تھا۔۔۔۔۔

”ہاں بس تھوڑی دیر میں۔۔۔۔۔“ اس نے اپنے لہجے کو

سپاٹ رکھنے کی کوشش کی لیکن لڑش پر قابو پانا آسان نہ تھا۔ وہ

جواب نہیں دینا چاہتا تھا لیکن اس کے بنا کوئی چارہ بھی نہیں تھا۔

زولو نے بیٹی کی نادانیوں کو مستقل ختم کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ ایڈ کی سکسٹیاں بلند ہوتی جا رہی تھیں۔ اپنے ہاتھوں کی کپکپاہٹ پر قابو پانا آسان نہیں تھا۔ دل کڑا کر کے اس نے گاڑی کے خفیہ خانے کو کھولا۔ گن پر اپنی گرفت مضبوط کرتے ہوئے اس کے ذہن میں بس کرٹ کے الفاظ چکر رہے تھے۔

”واپسی کے سفر میں آخری کام کبھی بھی سہل نہیں ہوتے۔۔۔۔۔“

وقت بادشاہ اور کائنات کی برشے اس کی رعایا ہے لیکن ... اس کی نہ کوئی شکل اور نہ ہی وجود ہے۔ اس کے باوجود یہی وقت روپ بدل بدل کر سامنے آن کھڑا ہوتا ہے۔ جس کی گردش انسان کی زندگی میں بہت اہم کردار ادا کرتی ہے۔ یہ ایک ہی پل میں کسی کو بادشاہت سے نوازتا ہے اور کسی کو زمین کی خاک چاٹنے پر مجبور کر دیتا ہے۔ کبھی دن اور رات میں ڈھل کر عمر رواں کا نام پاتا ہے اور موسم کی طرح گزر جاتا ہے۔ کبھی مہربان اور مخلص دوست بن جاتا ہے اور کبھی سفاک دشمن کا کردار ادا کرتا ہے۔ کبھی محبت بن کر ہونٹوں پر پشیمانی بکھیرتا ہے اور کبھی درد کی صورت آنسو بن کر دلوں میں گھٹاؤ ڈال دیتا ہے۔ چونکہ یہ کسی کا غلام نہیں اسی لیے کسی کی پروا بھی نہیں کرتا لیکن ... اتنا سنگدل ہے جو اس کی پروا نہیں کرتا اسے ایسی مار مارتا ہے کہ پیٹے کو دو ہونڈ پانی تک نہیں ملتا اور اتنا بے ایمان بھی ہے کہ جس پر اپنی مرضی سے مہربان ہو جائے اس کے لڑکھڑائے قدموں سے بھی قدم ملا کر عروج عطا کرتا ہے مگر شرارت سے پلٹ کر ان کی طرف بھی دیکھتا ہے جنہیں وہ بیچ دھنور میں تنہا چھوڑ آتا ہے۔ وہ بھی ایک ایسے ہی مہربان نہ ہے کہ اسے سیر تھا ... جسے یہ تک خبر نہ تھی کہ وہ کون ہے اور کس خاندان سے وابستہ ہے۔ جس کی اپنی کوئی شناخت نہ تھی اس کے باوجود اس کی داستان حیات میں چاہے والوں کی کمی نہ تھی۔ دو مختلف معاشروں اور تہذیبوں کا حسین امتزاج ... ایک ایسا سلسلہ جو برسوں یاد رہے گا۔

قسط نمبر: 12

وقت

حسام

موت کے کنویں میں بھی وقت جس کا ہم رکاب

تھا۔ ایک ایسے پر عزم بازی گر کی بازی گری

..... سستی خیز واقعات پر مشتمل ایک

در با طویل داستان



اس کا نام اسد علی رکھا گیا جسے "علی" کے نام سے جانا جاتا تھا۔ علی اپنے والدین کے بارے میں کچھ نہیں جانتا تھا۔ جب اس نے ہوش سنبھالا تو خود کو علی سلطان کی کھدایت میں پایا۔ علی سلطان نکلیس (امریکا) کا ایک معتبر کاروباری شخص تھا۔ ایک حادثے نے علی سلطان کو مکمل چیز تک محدود کر دیا تھا۔ اس کی اپنی بیوی اور بیٹا علی بن علی سلطان سے ملے تھے۔ وقت رخصت رہا اپنی انگوٹھی پہننے لگا۔ کو اپنے ساتھ لے گئی تھی۔ علی سلطان نے اپنی اور علی کی کچھ دیکھ کے لیے ایک کل وقتی ملازمہ مقرر ہوئی تھی اور انہیں سے جوانی تک علی کی تعلیم و تربیت کے تمام تر اخراجات اٹھائے تھے۔ وہ علی کے ساتھ اپنی اولاد یا میراث کو کرنا تھا جو اسے اٹھل بٹھل تھا۔ اپنے والدین کے حوالے سے علی کے ذہن میں بیکڑوں سوالات اس کے ساتھ ہی چل رہے تھے۔ اس نے جب بھی اپنے محسن و مرئی اٹھل سے کچھ پوچھنے کی کوشش کی تو اس پر بدراضی نے نہایت ہی خوب صورتی سے یہ کہہ کر اسے ٹال دیا تھا۔ "میرے بچے انتظار کرو۔ وقت آنے پر تمہیں سب بتا دوں گا۔" یہ علی علی کے تجسس کو ہوا دیتی تھی لہذا اچھے کے طور پر اس کا ذہن بے سمت سوچوں کے چالے میں الجھ کر رہ جاتا تھا مگر اس انتظار پر کیفیت میں بھی اس نے زندگی کے سبزی روئی میں کوئی رکاوٹ نہیں آنے دی تھی۔ کانچ میں قدم رکھتے ہی اس نے نکلیس کے علاقے "ہٹکلن" میں واقع "سرکلی اسے" نامی ایک اسٹور پر جڑوئی ملازمت کر لی تھی۔ بیس سال کی عمر میں جب علی نے ساٹھ لاکھ نو سو پچھتر ڈگری حاصل کر لی تو نئے ہنگامے اس کے تعاقب میں لگ گئے۔ ایک روز دو مسکینوں کے ذریعے علی کی نیت سے "سرکلی اسے" میں مس آئے۔ تمام بیس لاکھ کے بعد وہ دیکھتے علی کے ساتھ موجود بیکڑوں کی نظر کو کھٹکے۔ پولیس نے علی کی بنیاد پر علی کو بھی شامل تحقیقات کر لیا۔ علی کا دامن صاف تھا۔ پولیس کے سوالات کے جواب میں اس نے انہیں مطمئن کر دیا۔ بعد ازاں ان دونوں مسکینوں کو دیکھتے کوئی شخص (امریکی ذوق) سے گرفتار کر لیا گیا۔ علی کا چانچ لیک جینسن (نیکلیس) میں تھا جب علی سلطان کی رہائش بے غمی (نیکلیس) میں تھی۔ علی ایک بونٹی میں رہتا تھا اور ایک جینسن کے کٹر ریسٹوٹس میں اس کا آنا جانا لگتا تھا۔ "وئی لاؤنچ" نامی ایک ریسٹورنٹ میں اس کا زیادہ دل لگتا تھا کیونکہ وہاں ایک ہسپاوی دھڑلہ شاد رو اپنے فن کا مظاہرہ کرتی تھی۔ اس دل میں ہمیں جس نے علی کے دربار پر دیکھ تو اس کی زندگی میں بہار تر آئی۔ ایک رات وئی لاؤنچ میں جب لیو نارڈو نامی ایک مسکین خنڈے اور اس کے حواریوں نے شاد رو سے بدتمیزی کی کوشش کی تو علی چل چل کر نکل پڑا۔ اس مارا ماری کو ایک امیر و کبیرا جینسن لیلی ڈیٹھلیا نے بڑی دلچسپی سے دیکھا اور اپنا ڈزیننگ کارڈ علی کو ہاتھ کر دیا کہ وہاں سے رخصت ہو گئی۔ "مجھے بہادر لوگ بہت پسند ہیں۔ زندگی میں جب بھی میری ضرورت محسوس کر دو رابطہ کر لیا۔" اس واقعے کے بعد لیو نارڈو نے علی کی دشمنی کا قاعدہ آغا ہو گیا تھا۔ آئے والے دنوں میں علی اور لیو نارڈو کے خنڈوں میں لگاتار جگہ بگڑنے لگا۔ لیو نارڈو نے اپنی جرئت کا بدلہ لینے کے لیے شاد رو کو گرت کر نے لگا۔ وئی لاؤنچ کا منہ بھول گیا۔ وئی لاؤنچ کا خود شاد رو اپنے کی بنا پر علی نے شاد رو کی ریسٹورنٹ والی جانب چھڑا کر اسے اٹھل سلطان کی خدمت کے لیے گھر میں رکھ دیا تھا۔ ایک روز جب شاد رو اپنے ریسٹورنٹ سے گھر کی خریدنے کی ضرورت تھی تو لیو نارڈو نے اسے انکار کر لیا۔ علی نے شاد رو کی تلاش میں بہت ہار دی اور شاد رو کو صحت مند کر لیا۔ ایک بار لیو نارڈو کا ایک ترقی پزیر سامی چیلو اس کے ہتھے چڑھ گیا۔ دونوں کے بیچ خوش محسوس ہوا مگر چیلو، شاد رو اور لیو نارڈو کے حوالے سے زبان کھولنے کو تیار نہیں ہوئی۔ علی نے پیش کے عالم میں مار مار کر چیلو کو مار دیا۔ چیلو نے شاد رو کی قتل کی خبر سنی۔ جینسن اور اس کے قریب وجہ اور میں گروش کر رہی تھی۔ پولیس قاتل کی تلاش میں تھی۔ ایک جینسن میں مزید یہ تمام خطرات کا ثابت ہو سکا تھا لہذا علی نے اٹھل سلطان کو مصورت حال سے آگاہ کیا اور اپنی سرخ ہڈی اسے سپرد کر دی۔ جینسن سے پولیس بچ گیا۔ سرخ ہڈی ہڈی اسے سپرد کر دی۔ جینسن سے پولیس قاتل کے قرار ہونے کی خبر نے علی کے ہوش اڑا دیے۔ اس سنگین صورت حال میں علی نے ڈیٹھلیا سے مدد لینے کا فیصلہ کیا۔ رابطہ ہونے پر ڈیٹھلیا نے علی کی کھانسنے کے بعد کہا کہ اگر وہ بہتر کھینچے تک باہر کی دنیائے کت کر اس کے ساتھ بیٹھے میں رہے تو وہ اسے تمام مسائل سے نجات دلا دے گی۔ راضی ہونے پر ان بہتر کھنڈوں میں ہر بل علی پر چڑھتوں کا ایک نیا دور ہوتا رہا۔ ڈیٹھلیا بہت ادنیٰ بچ کی مالک ایک پراسرار لیلیٰ تھی۔ اس نے اپنا اثر سوشل استعمال کر کے علی کو چیلو مڈرکس سے اس طرح نکال لیا جیسے کھن سے بال۔ علاوہ ازیں ڈیٹھلیا نے نفوس نبوت کی مدد سے علی کو بتایا کہ لیو نارڈو، شاد رو کو انوار کے کیو کے شہر ہوتا ہے کیا ہے جہاں وہ شاد رو کو سمیت فروشی کے جنم میں جو بیٹھے کا ارادہ رکھتا ہے۔ ڈیٹھلیا نے علی کو یقین دلایا کہ اگر وہ بہتر کھن سے پورے ہونے کے بعد اس کی ایک خواہش پوری کرے تو وہ شاد رو کو صحیح سلامت واپس لے آئے گی۔ شاد رو کے حصول کی خاطر علی ڈیٹھلیا کی بات ماننے کے لیے تیار ہو گیا۔ یہ سیشن بالو والے اس بیٹھے میں ڈیٹھلیا کی سنگت میں گزرنے والے وہ عظیم ہوش کا بہتر کھن ہے بڑے رنگین، رنگین، روانہ پروردار و ناظر نقین تھے۔ ڈیٹھلیا کی شخصیت کسی سنے سے کم نہ تھی۔ اس پر مستزاد، ڈیٹھلیا نے اپنے ہی اسکا دو پراسرار شخصیات رہی آؤنگ بارورخ لاؤنچ اور ایما علی باس علی کی ملاقات بھی کرادی۔ تب علی پر یہ انکشاف ہوا کہ تمام افراد یہودیوں کی ایک سیکٹر اور بہت طاقتور روسا کی "سرکلی اسے" سے تعلق رکھتے تھے جو لوگوں کی قسمت کا فیصلہ کرنے میں آراو تھے۔ یہ لوگ خود کو دینی خدا سمجھتے تھے۔ اٹھل علی کے عمر ایک ایسے جوان کی تلاش تھی جس کی ماں مسلمان اور باپ یہودی تھا۔ انہیں شک تھا کہ علی وہی جوان ہے جس کے والدین اسے علی سلطان کے حوالے کر کے کہیں رو پیش ہو گئے تھے۔ ڈیٹھلیا کی ترغیبی علی کی ان کی شرا پر صا کرتے ہوئے "اسکلی اینڈ بوز" کی رکنیت حاصل کرنے پر آمادگی ظاہر کر دی۔ لیکن علی نے ڈیٹھلیا کی خواہش کو ٹھکرا دیا اور ڈیٹھلیا سے بے غمی اپنے اٹھل سے پاس آ گیا۔ یہاں حالات کی ایک نئی گروت اس کی راہ دکھ رہی تھی۔ اٹھل نے نہایت ہی مختصر مگر جامع الفاظ میں علی کو اس کی زندگی کے دو پرند اور سر بہ راز سے آگاہ کر دیا۔ علی سلطان کے مطابق، انیس سال پہلے، ایک برس کی عمر میں لیو نارڈو (امریکا) سے لیو نارڈو (امریکا) مرزا عامر بیگ کے پاس پہنچا یا گیا تھا۔ مرزا عامر بیگ علی سلطان کا دوست تھا۔ اس نے علی کو علی سلطان کے والد کے بارے میں بتا دیا۔ علی سلطان نے اس کی حیثیت سے انہیں برس تک علی کی پرورش کی تھی۔ اس پلیٹ میں ہونے والے تمام تر اخراجات کراچی میں تیم ایک نیک خاتون برداشت کر رہی تھیں مگر پچھلے چند ماہ سے یہ رقم آنا بند ہو گئی تھی جس سے مرزا عامر نے

یہی نتیجہ نکال دیا کہ وہ خاتون کی معیت میں گرفتار ہو گئی ہے چنانچہ یہ فیصلہ کیا گیا کہ علی کوئی انکوار کراچی روانہ ہو جانا چاہیے۔ علی سلطان اور مرزا عامر بیگ مذکورہ خاتون کے بارے میں زیادہ معلومات نہیں رکھتے تھے۔ ان کا اندازہ تھا کہ اس خاتون کا علی کے ساتھ کوئی خونی رشتہ ہے۔ مرزا عامر بیگ نے علی کو چند ایسے اشارے دیے جن کی مدد سے علی کراچی میں اس خاتون کو تلاش کر سکتا تھا۔ اس صورت حال میں علی کا دل علی الاطلاق یہ لہر ہٹا کر وہ عورت اس کی ماں ہے۔ علی نے حتی الامکان سرعت سے تیار کی اور پوچشوں سے کراچی آ گیا۔ پاکستان کی سرزمین پر قدم رکھتے ہی تھے، باموں نے اس کا استقبال کیا۔ وہ انٹرپورٹ سے ایک عیسائی چیکر کو اپنے بونٹی کی جانب روانہ ہوا تو علی نے ڈرا میر نے اسے ویرانے میں جا کر لوٹنے کی کوشش کی مگر علی نے اسے ناکام بنا دیا۔ علی کی دوستی تنظیم کی تو جوان سے ہوئی۔ تنظیم نے اپنے تعلقات استعمال کرتے ہوئے علی کی والدہ کا پتہ لگا لیا اور انہیں گھر لے آیا۔ علی کی ملاقات اپنی ماں سے ہوئی۔ علی کو اپنی ماں کے حالات جان کر بہت دکھ ہوا اور وہ دشمنوں سے انتقام لینے کے بارے میں سوچنے لگا۔ علی ماں کے بیٹھے پر رہنے لگا وہیں اسے اطلاع ملی کہ اٹھل علی سلطان کا دل کے دورے کے سبب انتقال ہو گیا ہے۔ علی نے ماں کو امریکا کے ساتھ لے جانے کے لیے وٹ و ڈٹ دیا۔ وٹ و ڈٹ کے لیے کوشش شروع کر دی۔ علی کو ایک رات خواب میں ڈیٹھلیا نظر آئی۔ اس نے علی کو بونٹی دی کہ وہ نہیں چلا جائے اس سے بچتا نہیں چھڑا سکتا۔ کچھ ماہ بعد افراد نے حملہ کر کے علی کی والدہ کو قتل کر دیا۔ علی نے جیہ کر لیا کہ وہ ماں کے قاتلوں کو کھنڈر وارک پہنچائے گا۔ علی نے تمام حقیقت بتا کر کوئی بتادی۔ وہ علی کی اچھی دوست اور مرزا بن گئی تھی، علی کو اس کی رانگ لٹاؤ کے پتے پر ایک لافظ غلاش میں ایک پیغام تھا جسے پڑھ کر اس کا دماغ بھگ سے اڑ گیا۔

اب آپ مزید واقعات ملاحظہ فرمائیے

خط کی تحریر کے آغاز میں میری ماں کو ایک غلیظ گالی دی گئی تھی۔ اس کے بعد مجھ سے مخاطب ہو کر نہایت ہی عاسیانہ زبان میں بہت کچھ کہا گیا تھا۔ تحریر کے ایک ایک لفظ سے تیز اب چلتا تھا۔

"تمہارا باپ میرا مجرم تھا۔ اس کہنے نے مجھے دس کروڑ روپے کا نقصان پہنچا دیا تھا۔ آج سے بائیس سال پہلے دس کروڑ بہت بڑی رقم ہوتی تھی۔ میں نے اپنے مجرم کو کتے کی موت مار دی پھر تمہاری ماں کو میں نے گندی نالی کا کیڑا بننے پر مجبور کر دیا۔ یہ بوڑھی بلی تو سوچو سے کھا کر عمرہ کرنے چلی تھی۔ میں نے اس کی زندگی کا چراغ بھی گل کر دیا۔ تمہاری ماں کو فنا کے گھاٹ اتارنا میرے لیے بھی بھی مشکل نہیں تھا لیکن مجھے تمہاری واپسی کا انتظار تھا۔ میں نہیں جانتا تھا، اس غیبت عورت نے تمہیں کہاں بھیج دیا تھا۔ اب پتا چلا ہے کہ تم جہدہ میں جیسے بیٹھے تھے۔ اچھا ہوا، تم آ گئے۔ اس خنڈ کو پڑھنے کے بعد میری تلاش میں نکلو گے لیکن مجھے تمہیں نہیں بچ سکے۔ مجھ تک رسائی حاصل کرنے کے لیے تم کا پتہ جاؤ گے، باپ جاؤ گے اور تمہاری زبان باہر نکل آئے گی۔ میں تمہیں ماروں گا نہیں، تڑپاؤں گا، دوڑاؤں گا، سسکاؤں گا اور تمہارے ہاتھ پاؤں تو ڈرکرا پاؤں بنا دوں گا پھر تم کسی فٹ پاتھ پر بیٹھے پھیک مانتے دکھائی دو گے۔ تب میرا انتقام پورا ہو جائے گا۔"

میں یہ وقت تمام اس تحریر کو ایک باپ ہی پڑھ سکا۔ ایک ایسے وقت پر جبکہ میں اپنی ماں کے گم کی میل میں اپنے دیرینہ دشمن کو نظر انداز کر کے واپس امریکا جانے کا ارادہ کر چکا تھا، اس بدخصلت دشمن نے بڑے کٹھن الفاظ میں

مجھے لگا رہا تھا۔ اس وقت میرے دماغ میں بارودی دھماکے ہو رہے تھے۔

میں ایک کرسی پر بیٹھ گیا پھر آنکھیں بند کر کے جسم کو ڈھلا چھوڑ دیا۔ اس کے بعد میں گہری اور ہموار سانس لینے لگا۔ سانس کا انسان کی سوچ کے ساتھ بڑا گہرا تعلق ہے۔ انسانی دماغ کو بنیادی طور پر دو چیزوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ اول آکسیجن، دوم گلوکوز اور یہ دونوں خون کے ذریعے دماغ تک پہنچتی ہیں۔ میں بھی طویل اور گہری سانسوں کے ذریعے اپنے دماغ کی تواضع کرنے لگا۔ دھیرے دھیرے میری حالت میں بہتری نمودار ہونے لگی۔ مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میری سوچ کا جہاز اتر پانٹ سے باہر نکل آیا ہو۔ چند لمحے پہلے میری کھوپڑی کے اندر اٹھنے والا آتش فشاں رفتہ رفتہ سرد ہونے لگا تھا۔

چنگیز خان کا نام میرے لیے اجنبی نہیں تھا۔ ماں نے عظیم کے ہاتھ میرے لیے نئے کور والی جوارڈی ایجوکاتی تھی اس میں چنگیز خان کا تفصیلی ذکر موجود تھا۔ یہ شخص میرے باپ کی موت اور میری ماں کی بربادی کا ذمہ دار تھا اور اس تحریر کے توسط سے چنگیز خان نے میری ماں کو قتل کروانے کا اعتراف بھی کر لیا تھا اور مجھے عبرتناک انجام تک پہنچانے کی دھمکی بھی دی تھی۔ میں تو ماں کی فرمائش پر چنگیز خان کو ذہن سے نکال چکا تھا لیکن یہ بذات نفس کھل کر سامنے آ گیا تھا تو اب ماں کی خواہش سے صرف نگاہ کرتے ہوئے اس ختم شیطان سے دو، دو ہاتھ کرنا اور اسے جنم دہاں کرنا ضروری ہو گیا تھا۔

نبلی دھڑکی میں رقم ماں کی داستان کے مطابق، میری

پیدائش سے پہلے میرے والدین کراچی میں رہتے تھے۔ میرے والد کا اپنا بزنس تھا۔ وہ ملائی زیورات کی میکانک کا کام کرتے تھے۔ ان کا چھوٹا سا کارخانہ صدر کے علاقے میں تھا۔ چنگیز خان بنیادی طور پر ایک ستار تھا لیکن اس بیٹے کی آڑ میں وہ بہت سے مذموم وعدے بھی جاری رکھے ہوئے تھا جن میں سونے کی اسٹنگ، منیات کی تزیین، بلیک مارکیٹنگ اور اسی نوعیت کے دوسرے کام بھی شامل تھے۔ نیلی ڈائری سے حاصل ہونے والی معلومات کے مطابق چنگیز خان کی رہائش ناتھ ناظم آباد میں تھی۔

کسی معاملے پر والد صاحب کی چنگیز خان سے چٹاقلش ہوئی تھی۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ یہ تنازع بڑھتا رہا اور چنگیز خان نے بڑے واضح الفاظ میں والد صاحب سے کہا کہ اسے پتا چلا ہے، والد صاحب اس کے دشمنوں سے مل گئے ہیں۔ چنگیز خان جس قماش کا شخص تھا اس کے پیش نظر اس کی دوستی قراء سے بھی اور نہ ہی دشمنی ایک افراد سے۔ ایک بے بنیاد شک کی بنا پر وہ خوا خواہ والد صاحب کا دشمن بن گیا تھا۔ اس نے بعض جرائم پیشہ افراد کے ذریعے والد صاحب کو خطرناک نتائج کی دھمکیاں بھی دی تھیں لیکن والد صاحب نے اس کی بکواس کی پروا نہیں کی اور اپنی ڈگری پر گامزن رہے۔

جیسا کہ میں نے بتایا، چنگیز خان سونے کی اسٹنگ میں بھی ملوث تھا۔ اس سلسلے میں اسے ایک طاقتور سیاسی شخصیت کی پشت پناہی بھی حاصل تھی۔ مارکیٹ میں یہ خبر بھی گرم تھی کہ مذکورہ سیاسی شخص سونے کی اسٹنگ میں چنگیز خان کا بزنس پارٹنر بھی ہے۔ حالات میں اس وقت ایک سنگین موڑ آیا جب ہانگ کانگ کی بندرگاہ پر چنگیز خان کی سونے کی ایک بھاری کمپ بکڑی گئی۔ اس سونے کی قیمت لگ بھگ دس کروڑ روپے بنتی تھی۔ اسمگل شدہ سونے کی یہ کمپ ضبط کر لی گئی۔ چنگیز خان کو بھاری مالی نقصان اٹھانا پڑا۔

والد صاحب کا اس معاملے میں کوئی ہاتھ نہیں تھا لیکن چنگیز خان نے سارا الزام انہی کے سر پر ڈال دیا تھا۔ اس کا دعویٰ یہ تھا کہ والد صاحب اس کے دشمنوں کے آلہ کار بن گئے تھے اور ان کی بخیر پر چنگیز خان کا مال ہانگ کانگ میں بکڑا گیا تھا۔ اس آتش گیر خط میں چنگیز خان نے اپنے اسی دس کروڑ کے نقصان کا ذکر کیا تھا اور اس کی تحریر کے ذریعے اس نے میرے والدین سے لگ کا اقبال بھی کر لیا تھا۔

میں نے ”جی تحریر“ کے الفاظ اس لیے استعمال کیے ہیں کہ اس پر کچھ بطور ثبوت کہیں پیش نہیں کیا جاسکتا

تھا۔ اس مضمون سے کہیں یہ ظاہر نہیں ہوتا تھا کہ یہ ساری باتیں چنگیز خان ہی نے لکھی ہیں۔ علاوہ انہیں کوریئرسوں کا وہ لفافہ بھی ایک دم بگس تھا۔ مطلب یہ کہ مذکورہ لیٹر باقاعدہ کسی کوریئرسروس سے مجھ تک نہیں پہنچا تھا۔ ایک معروف کوریئرسروس کا پرنٹڈ مخصوص لفافہ ضرور اس مقصد کے لیے استعمال کیا گیا تھا لیکن اس انویلیپ پر نوٹورینک آئی ڈی کا کوئی اسٹیکر چسپاں کیا گیا تھا اور نہ ہی پینٹ کا باقاعدہ کوئی اندراج تھا۔ یہی معلوم ہوتا تھا کہ اس کوریئرسروس کا کسی طرح لفافہ حاصل کر کے اسے میرے نام اور ایڈریس پر دستی ڈیلیور کروایا گیا تھا۔ لفافے کے پیچھے چنگیز خان کا نام اور ایڈریس لکھا ہوا تھا جس کے بارے میں میرا اندازہ یہی تھا کہ وہ فرضی ایڈریس ہوگا۔ میں نے لفافہ الٹ پلٹ کراچی طرح چیک کر لیا۔ اس پر ایسی کوئی چیز موجود نہیں تھی جس کی بنا پر یا جس کی مدد سے میں مذکورہ کوریئرسروس کی ہیلپ لائن پر کال کر کے اس پینٹ کے حوالے سے کسی قسم کی معلومات حاصل کر سکتا۔

ان لمحات میں میرا ذہن بہت جیزی سے کام کر رہا تھا۔ میں خط کے ان مندرجات پر غور کرنے لگا جو میرا میری ذات سے متعلق تھے۔ خط پیچھے والا میرے اصل نام اسماعیل سے واقف تھا۔ اسے ماں کے جھنگ کا پوسٹل ایڈریس معلوم تھا۔ وہ یہ جانتا تھا کہ میں جدہ سے آیا ہوں اور سلمیٰ حیدر کا بیٹا ہوں۔ ان تین پوائنٹس کو ذہن میں رکھ کر میں خط لکھنے والے کو اپنے ارد گرد کے لوگوں میں ٹریس کرنے کی کوشش کرنے لگا۔

عظیم اور اس کی فیملی کو معلوم تھا کہ سلمیٰ اور حیدر علی کا بیٹا اسماعیل ہوں مگر میں جدہ نہیں، بلکہ امریکا سے آیا ہوں۔ وہ لوگ نٹو چنگیز خان کے بارے میں کچھ جانتے تھے اور نہ ہی ماں کے جھنگ کے پوسٹل ایڈریس سے واقف تھے۔ دس کروڑ روپے والے سونے کی کہانی کا میں نے بھی ان سے ذکر نہیں کیا تھا۔ ان لوگوں پر شک کرنا خارج از امکان تھا۔

دوسرا نمبر بیٹا کا تھا۔ میری زبانی بیٹا کو میری حقیقت تو معلوم ہو چکی تھی اور وہ ماں کے جھنگ کے پوسٹل ایڈریس سے بھی بہ خوبی آگاہ تھی لیکن وہ ناظم آباد کے کسی رہائشی چنگیز خان سے ہرگز ہرگز واقف نہیں تھی اور نہ ہی وہ ہانگ کانگ میں بکڑے جانے والے چنگیز خان کے دس کروڑ مالیت کے سونے کے بارے میں کچھ جانتی تھی۔ جب باخشی میں یہ واقعہ پیش آیا، اس وقت بیٹا بیٹھ دوسال کی ایک بچی

کی بچی تھی اور جرمنی کے شہر فریکفرٹ میں ہوا کرتی تھی۔ اس تناظر میں بیٹا کا نام شک زدہ افراد کی موجودہ فہرست سے نکل جاتا تھا۔

اب باری تھی نادر شاہ کی۔ نادر شاہ میرے اصل نام سے بھی واقف تھا اور اسے یہ بھی علم تھا کہ میں سلمیٰ حیدر کا بیٹا ہوں اور جدہ سے آیا ہوں۔ نادر شاہ چونکہ ماں کے جھنگ کی فروخت میں پوری طرح موجود تھا بلکہ یہ کام اسی کے ہاتھ سے ہو رہا تھا لہذا اس کے پوسٹل ایڈریس اس سے چھپا ہوا نہیں تھا۔ علاوہ انہیں وہ ایک طویل عرصے سے ماں کے ساتھ جڑا ہوا تھا چنانچہ وہ ماں کے دشمن چنگیز خان کو بھی اچھی طرح جانتا تھا۔ اس امر کے بھی روشن امکانات تھے کہ وہ دس کروڑ کے سونے والی اسٹوری سے بھی لاعلم نہیں ہوگا۔

میری نقیشتی سوچ نادر شاہ کے نام پر آ کر رک گئی۔ یہ شخص ڈے ون سے میری سمجھ میں نہیں آیا تھا۔ عظیم نے بھی اس پر اپنے شک کا اظہار کیا تھا۔ ماں کے تمام تر مالی معاملات کلی طور پر نادر شاہ کے ہاتھ میں تھے۔ صبح معنوں میں ماں کا بھینٹری تھا۔ میرے ذہن نے کچھ کر کہا۔ یا تو یہ شخص ماں کا قاتل ہے اور یہ لیڈر اسی نے میرے نام ڈیلیور کر لیا ہے تاکہ میں گھبراہٹ میں فوراً پاکستان سے چلا جاؤں اور یہ ماں کے مال پر عیاشی کے لیے آزاد ہو جائے۔ یا پھر یہ چنگیز خان کے ساتھ ملا ہوا ہے اور جدہ سے میری آمد کی اطلاع اسی نے چنگیز خان تک پہنچائی ہے۔ اس صورت میں خط والی تحریر چنگیز خان کی طرف سے ہو جاتی تھی۔ اس بات سے کوئی فرق نہیں پڑتا تھا کہ وہ کوریئرسروس سے مجھ تک پہنچی تھی یا کوریئرسروس کی آڑ میں مجھ تک دتی پہنچائی گئی تھی۔

نادر شاہ کوڑ پ کرنے کے لیے یک جہت تھے، میرے ذہن میں ایک آئیڈیا آ گیا۔ تخلیق کی زبان میں اسے ”آدم“ کہا جاتا ہے۔ ایک فوری فیصلے پر پہنچنے کے بعد میں ثابت ہو گیا تھا۔ اگلے ہی لمحے میں اپنے آئیڈیا کو عملی جامہ پہنانے میں مصروف ہو گیا۔

میں نے اسی نائپ کا ایک سادہ کاغذ لیا جیسے کاغذ پر میرے لیے وہ زہریلا خط لکھا گیا تھا پھر مذکورہ وینڈرائنگ کی کم دیش کاپی کرتے ہوئے میں نے لکھنا شروع کیا۔

”میں تمہاری ماں کی عظمت کو سلام پیش کرتا ہوں۔ تمہارا باپ حیدر علی میرا بہت اچھا دوست تھا۔ اس نیک دل انسان کے مجھ پر بہت احسانات ہیں۔ میں اپنے دوست کی موت کو اب تک نہیں بھول پایا ہوں اور اب تو کسی شقی

وقت

القلب ورنہ دے تمہاری عظیم ماں کی بھی جان لے لی۔ دوپائیزہ گورت چند روز بعد عمرے کی سعادت حاصل کرنے والی تھی لیکن شاید اللہ کو یہ منظور نہ تھا۔ بیٹا! میں تمہارے دکھ درد میں برابر کا شریک ہوں۔ تم جب تک پاکستان میں ہو، میں تمہاری ہر نوعیت کی مدد کے لیے تیار ہوں۔ تمہارے کسی بھی چھوٹے بڑے کام آ کر مجھے یہ حد خوش ہوگی۔ کوئی بھی ضرورت ہو، کسی تکلف سے کام نہیں لیتا۔ تمہارا اکل، چنگیز خان۔“

میں نے اصل کاغذ کو اپنے پاس محفوظ کر لیا اور اپنے ہاتھ سے لکھے ہوئے اس خط کو کوریئر والے لفافے کے اندر رکھا اور اپنے سیل فون پر نادر شاہ کے نمبر پر کال کرنے لگا۔ دوسری گھنٹی پر اس نے کال ریسیو کر لی۔

”ہیلو بیٹا..... خیریت؟“ اس کی بھاری بھر کم آواز میری سماعت سے ٹکرائی۔

میں نے گھبرائے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”اکل! کیا آپ ابھی میرے پاس آ سکتے ہیں؟“

”کیا ہوا..... جرم شیک تو ہوا؟“ اس نے پوچھا۔

”یہاں آ جاؤ، پھر بتاتا ہوں۔“ میں نے گول مول جواب دیا۔ ”آپ سے ایک بہت ضروری معاملہ ڈسکس کرنا ہے۔“

”او۔ کے.....“ وہ تلی آمیز لہجے میں بولا۔ ”میں پندرہ بیس منٹ میں پہنچ رہا ہوں۔“

”ٹھکریا اکل۔“ کہتے ہوئے میں نے لائن کاٹ دی۔ اگلی کال میں نے عظیم کو کی۔ رابطہ ہونے پر اس نے مجھ سے استفسار کیا۔ اس کے انداز میں توشیح پائی جاتی تھی۔

”بردا اسر کا درد کیسا ہے؟“

”فراسفر ہونے کے لیے پر تول رہا ہے۔“ میں نے مذاق کے رنگ میں کہا۔

چنگیز خان کے دہشت ناک اور وحشت انگیز ”خط“ کو پڑھ کر میرے دل و دماغ پر جس اذیت نے حملہ کیا تھا، اب میں اس کے اثرات سے مکمل طور پر باہر آ گیا تھا۔ میرے اس جواب پر عظیم نے انھیں زدہ لہجے میں کہا۔

”بردا..... میں سمجھا تھا!۔“

”ارے یار..... تم جھکے ہوئے گھر پہنچے ہو اور میں

تمہیں پھر ایک ہم پر روانہ کرنا چاہتا ہوں۔“ میں نے...

سرری انداز میں کہا۔ ”اس طرح میرے سر کا درد تمہارے سر میں ٹرانسفر ہو جائے گا۔“

”بردا تم درد دہری کی بات کر رہے ہو، تمہارے لیے تو

حرام و حلال جانوروں کی پیدائش

یہ بھی کم حیران کن بات نہیں کہ اللہ تعالیٰ نے جن جانوروں کو ہمارے کھانے کے لیے حلال قرار دیا ہے۔ مثلاً گائے، بکری، مرغی، مچھلی وغیرہ ان کی پیدائش میں از حد برکت بھی رکھ دی ہے۔ روزانہ لاکھوں کی تعداد میں ذبح ہو رہے ہیں مگر ان کی تسلیں ہیں کہ ختم ہی نہیں ہونے کو آئیں۔ جبکہ وہ جاندار جنہیں حرام قرار دیا گیا ہے ذبح نہ ہونے کے باوجود ان کی تسلیں ختم ہو رہی ہیں اور ان کی تسلیوں کے تحفظ کی فکر دامن گیر ہے۔

☆☆☆

سطح زمین پر پھاڑوں کا کردار

زمین کی سطح پر بلند بالا پھاڑوں نے زمین کی محوری گردش میں ایک نیا متلا توازن قائم کیا ہوا ہے۔ (ٹھیک اسی طرح جس طرح ہم اپنی گاڑی کے پہیوں میں چھوٹے چھوٹے لوہے کے ٹکڑے چسپاں کر کے پہیوں کی محوری گردش کو Balance رکھتے ہیں) بصورت دیگر اگر یہ پھاڑ نہ ہوں تو زمین کا محور جغرافیائی اعتبار سے کسی ایک جہت میں قائم نہ رہے بلکہ بدلتا رہے۔

ترجمہ: اللہ تعالیٰ نے آسمانوں کو بلاستون بنایا تم ان کو کچھ رہے ہو اور زمین پر پھاڑ ڈال رکھے ہیں کہ وہ تم کو لے کر ڈاؤن ڈال نہ ہونے لگے اور اس پر ہر قسم کے جانور پھیلا کر گئے ہیں اور ہم نے آسمان سے پانی برسا یا پھر اس زمین میں ہر طرح کے عمدہ اقسام اگائے۔“ (سورۃ لقمان 31: آیت 10)

سعید الطغر صدیقی کی کتاب

”مادرائے آب و گل“ سے اقتباس

”جھوٹے.....“ وہ بے تکلفی سے بولی۔ ”اگر تم شارو کے ساتھ مصروف ہوتے تو مجھے بچ کرنے کی کوشش نہ کرتے۔“ ”جب میں تمہارے ساتھ مصروف ہوتا ہوں تو شارو کو بچ کرنے کی کوشش بھی نہیں کرتا۔“ میں نے معنی خیز لہجے میں کہا۔ ”کیا میں نے بھی ایسا کیا؟“

”تم بہت بد معاشر ہو۔“ وہ ایک خاص انداز سے بولی۔ ”بد معاشر کا کوئی موقع ہاتھ سے نہیں جانے دیتے۔“ ”اس کا ایک خاص سبب ہے۔“ میں نے کہا۔ ”وہ چپکے چپکے ہونے لہجے میں متشدد ہوئی۔ ”کیا؟“ ”تمہیں دیکھ کر خواہ مخواہ بد معاشر کرنے کی خواہش پیدا ہوتی ہے۔“ میں نے کہا۔ ”دل چل اٹھتا ہے اور میں مجبور ہو جاتا ہوں۔“

وہ ابھمن زدہ لہجے میں بولی۔ ”مجھ میں ایسی کیا خاص بات ہے؟“

”بتاؤں گا..... جب ہم لائک ڈرائیو پر جا سکیں گے۔“

”نال رہے ہو.....؟“

”نہیں..... منظم کر رہا ہوں۔“

”اوکے۔“ میں ٹھیک دس منٹ کے بعد تمہیں ریڈی ملوں گی۔“ اس نے معتدل انداز میں کہا۔ ”پھر جب تم اشارہ دو گے تو میں گھر سے نکل آؤں گی۔“

”جب میں تمہیں فون کروں تو تم اپنی ریڈ کلس پر سوار ہو کر مزہ لیاؤ۔“ میں نے کہا۔ ”میں تمہیں دہلیں پر جوائن کروں گا۔ تم ہماری گاڑی میں جا سکیں گے اور ڈرائیو کر دو گی۔“ اوکے؟

”اوکے۔“ اس نے جواب دیا۔

میں نے فون رکھا تو جشید نے اطلاع دی کہ شاہ جی آئے ہیں۔ میں نے جشید سے کہا کہ وہ شاہ جی کو ڈرائنگ روم میں بٹھائے، میں وہیں آ رہا ہوں۔ ٹھیک پانچ منٹ کے بعد میں اور نادر شاہ ڈرائنگ روم میں آئے سانسے پیٹھے

تھے۔ میں کوہیز سروس والا وہ لفافہ بھی اپنے ساتھ لایا تھا جس کی بارودی تحریر نے مجھے اس اقدام پر مجبور کیا تھا تاہم میں نے لفافے کے اندر والے پرچے کو بدل دیا تھا۔

میرے ہاتھ میں اس لفافے کو دیکھ کر نادر شاہ نے کوئی خاص تاثر نہیں دیا تھا۔ اس سے ظاہر ہوتا تھا کہ یا تو وہ اس لفافے کی حقیقت سے واقف نہیں تھا اور یا پھر وہ سب کچھ جانتا تھا اور اس معاملے میں اندر باہر سے بہت پکا تھا

اس لیے اس کے چہرے سے کچھ بھی جھلک نہیں رہا تھا۔

رکی ٹلیک سلیک کے بعد اس نے پوچھا۔ ”بیٹا!

گھر کی لوکیشن اور غیر وغیرہ نوٹ کرنا ہے جہاں نادر شاہ جائے گا۔ اس کے بعد تمہارا کام ختم ہو جائے گا۔ تم اپنے گھر چلے جانا۔ باقی باتیں ہم کل کریں گے۔“ ”سمجھ گیا۔“ اس نے کہا۔ ”میں تمہارے گھر کے قریب پہنچ کر تمہیں اطلاع دے رہا ہوں۔“

”ٹھیک ہے، میں تمہارا انتظار کر رہا ہوں۔“ میں نے کہا۔ ہمارے بیچ سیلر رابطہ ختم ہوا تو میں نے پتا کے نمبر پر

کال کی۔ اس نے فوراً میری کال ریسیو کر لی اور خاصی توانا آواز میں بولی۔

”ہیلو! کیا ہو رہا ہے؟“

”اپنی دوست کا انتظار۔“ میں نے شرارت بھرے لہجے میں جواب دیا۔

”دوستی سے متشدد ہوئی۔“ ”کون سی دوست؟“

”جو اس وقت قریب ہے۔“ میں نے ذوقی انداز میں کہا۔

”کس کے قریب.....؟“ وہ چپکی۔ ”تمہارے یا تمہارے دل کے؟“

”جو بھی سمجھ لو.....“ میں نے گول مول جواب دیا۔

”بھئی! میں تم سے چند گز کے فاصلے پر موجود ہوں۔“ وہ سہمے ہوئے لہجے میں بولی۔ ”اور شارو مجھ سے بھی کم فاصلے پر تمہارے دل میں بیٹھی ہے۔“

”تو تمہاری بیٹھی اس کی سی ہے۔“ میں نے جیسے لہجے میں کہا۔ ”میں نے کہا، جو بھی سمجھ لو اور..... تم نے یہ سمجھ لیا؟“

”تو کیا میں نے غلط سمجھا ہے؟“ اس نے پوچھا۔

”جیسا میں نے سمجھا، کیا دینا نہیں ہے؟“

”ہرگز نہیں!“ میں نے پوری قطعیت سے کہا۔ ”اگر اس وقت مجھے شارو کی یاد آ رہی ہوتی تو میں اسے کال کرتا۔ تمہیں فون کیا ہے تو اس کا بھی مطلب ہے کہ تم یاد آ رہی ہو اور..... میں تمہارا انتظار کر رہا ہوں۔“

”اوکے.....“ وہ خوشگوار انداز میں بولی۔ ”میں آ رہی ہوں۔“

”آنے کی ضرورت نہیں۔“ میں نے کہا۔ ”بس، اسٹیڈ بانی رہو۔ میں فری ہو کر تمہیں کال کرتا ہوں پھر ہم لائک ڈرائیو پر چلیں گے۔“

”آئیے یا اچھا ہے۔“ وہ سناٹا انداز میں بولی پھر چپکے ہوئے لہجے میں پوچھا۔ ”تم کس سے فری ہونے کے بعد مجھے کال کرو گے۔ اس وقت کس کے ساتھ ہو؟“

”شارو کے ساتھ۔“ بے ساختہ میرے منہ سے نکلا۔

میری جان بھی حاضر ہے۔“ وہ گہری سنجیدگی سے بولا۔ ”تم حکم کرو، مسئلہ کیا ہے؟“

”مسئلہ یہ ہے کہ آدھے گھنٹے کے اندر تم میرے پاس آ جاؤ۔“ میں نے بتایا۔ ”تمہیں ایک آدمی کے تعاقب میں روانہ کرنا ہے۔“

”کون آدمی؟“ اس نے چونکے ہوئے لہجے میں دریافت کیا۔ ”اور ایسی کیا ایمری آئی ہے جو کسی بندے کے تعاقب کی ضرورت پیش آ رہی ہے.....؟“

”اس آدمی کا نام ہے..... نادر شاہ!“ میں نے وضاحت کرتے ہوئے کہا۔ ”ایک خاص حوالے سے مجھے اس پر شک ہوا ہے۔ اس معاملے کی تفصیل میں تمہیں بعد میں بتاؤں گا۔ فی الحال یہ جان لو کہ شاہ جی چندہ میں منٹ میں میرے پاس پہنچ رہا ہے۔ میں اسے اس وقت تک اپنے گھر میں روکے رکھوں گا جب تک تم یہاں نہیں پہنچ جاتے۔ تمہیں گھر کے اندر نہیں آنا بلکہ باہر گلی میں یا کسی بھی ایسی جگہ پر رک کر انتظار کرنا ہے جہاں نادر شاہ کی نظر نہ پڑے۔ جب نادر شاہ مجھ سے ملاقات کرے گا تو تم محدود فاصلہ رکھ کر اس کا تعاقب کرو گے۔ تم نے اس کا گھر تو دیکھا ہوا ہے نا؟“

”ہاں، دیکھا ہے۔“ اس نے جواب دیا۔

”صرف ایک فیصد امکان اس بات کا ہے کہ میرے گھر سے نکل کر وہ اپنے گھر جائے۔“ میں نے کہا۔ ”باقی ننانوے فیصد میرا اندازہ ہے کہ وہ نارتھ ٹائم آباد کا رخ کرے گا۔“

”اوکے.....“ وہ معتدل انداز میں بولا۔ ”مجھے کیا کرنا ہے؟“

”تم بڑے محتاط انداز میں میری گلی ہی سے اس کے پیچھے لگ جاؤ گے۔“ میں نے کہا۔ ”اسے کسی بھی صورت اپنے تعاقب کا شک نہیں ہونا چاہیے۔ اگر وہ اپنے گھر جاتا ہے تو تم دس، چندہ منٹ تک اس کے گھر کے نزدیک رک کر انتظار کرو گے۔ میں ممکن ہے کہ وہ گھر کا چکر لگا کر واپس آئے۔ اگر وہ ایسا کرتا ہے تو تم نے پھر اس کے تعاقب میں لگ جانا ہے اور اگر وہ چندہ منٹ تک گھر سے باہر نہیں نکلتا تو پھر تم واپس اپنے گھر چلے جانا۔“

”کافی وقت کر کے میں نے ایک اطمینان بھری سانس خارج کی پھر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے کہا۔

”ان کیس، اگر میرے اندازے کے مطابق، وہ یہاں سے نکل کر سیدھا نارتھ ٹائم آباد جاتا ہے تو تم نے اس

خیریت تو ہے نا۔ تم نے اچانک مجھے کیوں بلا لیا، سب ٹھیک تو چل رہا ہے نا؟
 ”پریشانی والی کوئی بات نہیں اٹکل۔“ میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ ”بس، آپ سے تھوڑی معلومات حاصل کرنا ہیں۔“
 ”کیسی معلومات؟“ وہ سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔
 ”آپ ماں کے سچے خیر خواہ ہیں۔“ میں نے گہری سنجیدگی سے کہنا شروع کیا۔ ”اس لیے آپ میرے والد صاحب کے غلغلے و دستوں سے بھی اچھی طرح واقف ہوں گے؟“
 ”تمہارے باپ کا حلقہ احباب زیادہ وسیع نہیں تھا۔“ اس نے بتایا۔ ”بس چند افراد ہی سے اس کی میل ملاقات تھی۔“

”کیا آپ والد صاحب کے کسی ایسے دوست کو جانتے ہیں جس پر انہوں نے بہت سے احسانات کیے ہوں۔“ میں نے پوچھا۔ ”اور وہ شخص ادھر کراچی کے علاقے نارتھ ٹائم آباد میں رہتا ہو؟“
 اس کے چہرے پر انہیں کے تاثرات پیدا ہوئے۔ میرے سوال کا سیدھا جواب دینے کے بجائے انہوں نے مجھ سے پوچھ لیا۔
 ”بیٹا! مسئلہ کیا ہے۔۔۔ مجھے کھل کر بتاؤ!“
 ”مسئلہ کوئی نہیں ہے اٹکل۔“ میں نے سرسری انداز میں کہا۔

”میں ایک ایسے شخص کے بارے میں جاننا چاہتا ہوں جو نارتھ ٹائم میں رہتا ہے اور والد صاحب سے دوستی کا دم بھرتا ہے۔ اس کا نام چنگیز خان ہے۔۔۔!“
 آخری جملہ میں نے بڑے ڈرامائی انداز میں ادا کیا تھا۔ وہ اچھل پڑا اور بے ساختہ اس کے منہ سے نکلا۔
 ”چنگیز خان۔۔۔۔۔ یہ شخص تمہارے باپ کا دوست کیسے ہو سکتا ہے۔۔۔۔۔؟“

میں بڑی احتیاط اور سنجیدگی کے ساتھ نادر شاہ کے جذبات سے مکمل رہا تھا۔ اس کے بے اختیار اچھلنے پر میں نے تھوڑا آگے گھومتے ہوئے پوچھا۔

”کیا آپ کسی چنگیز خان کو جانتے ہیں؟“
 اس نے بڑی ہوشیاری سے میرے ہاتھ میں موجود لفافے کی طرف دیکھا اور اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے جواب دیا۔ ”ہاں، جانتا ہوں مگر وہ تو تمہارے باپ کا دشمن ہے۔ کیا سسلی بہن نے انہیں چنگیز خان کے بارے میں کچھ نہیں بتایا؟“

”ماں نے کسی شخص کا نام لیے بغیر مجھے اپنی چٹا سائی تھی۔“ میں نے کہا۔ ”شاید اس کا سبب یہ ہو کہ وہ میرے جذبات کو بھڑکا دیا نہیں جانتی تھیں۔ اگر وہ اپنے دشمنوں کے نام مجھے بتا دیتیں تو اس بات کا امکان تھا کہ میں غصے سے بے قابو ہو کر انتقام لینے اٹھ کھڑا ہوتا اور ماں مجھے خون خرابے سے بچانا چاہتی تھیں اسی لیے انہوں نے خاموشی سے ہمیشہ کے لیے پاکستان چھوڑنے کا فیصلہ کر لیا تھا لیکن۔۔۔۔۔“
 میں نے اپنے لہجے میں مصنوی دکھ بھرتے ہوئے لگائی توقف کیا تاکہ نادر شاہ کو ایسا محسوس ہو کہ ماں کی موت نے مجھے بے حد محروم کر دیا ہے پھر اضافہ کرتے ہوئے میں نے صرف اتنا کہا۔

”لیکن مالک کو یہ منظور نہیں تھا۔۔۔۔۔“
 ”سسلی بہن بہت ہی سمجھ دار اور بردبار خاتون تھیں۔“ وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا۔ ”تمہارا اندازہ بالکل درست ہے۔ تمہاری حفاظت اور سلامتی کی خاطر ہی انہوں نے انہیں چنگیز خان کے نام سے بہت دور رکھا ہوگا لیکن سسلی بہن اب اس دنیا میں باقی نہیں رہیں اور تم بھی یہاں سے جانے والے ہو لہذا انہیں چنگیز خان کے بارے میں بتانے میں، میں کوئی حرج محسوس نہیں کرتا۔۔۔۔۔“ اس نے ذرا دیر کو رک کر میرے چہرے کے تاثرات کا جائزہ لینے کی کوشش کی پھر اپنی بات کو آگے بڑھاتے ہوئے بولا۔
 ”چنگیز خان بہت ہی خطرناک قسم کا انسان ہے۔ اس نے تمہارے باپ کو قتل کر لیا تھا۔“

اب میرے اچھلنے کی باری تھی۔ ”یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں اٹکل؟“ میں نے اظہارِ لہجے میں سوال کیا۔ ”اگر چنگیز خان میرے والد صاحب کا دشمن ہے تو پھر یہ خط۔۔۔۔۔!“
 میں نے دانستہ جملہ ادھورا چھوڑا تو وہ سرسراتی ہوئی آواز میں مستفسر ہوا۔ ”خط۔۔۔ کیا مطلب؟“

”آپ خود دیکھ لیں۔“ میں نے کوریئر مین والی لفافہ اس کی جانب بڑھاتے ہوئے کہا۔

اس نے فوراً میرے ہاتھ سے وہ لفافہ لے لیا پھر کھول کر اس کے اندر موجود ریکورڈ کو بڑھنے لگا۔ میں نے اپنی عقابانی نگاہ اس کے چہرے پر گاڑ دی۔

پرچہ پر نظر پڑتے ہی اس کے دیدے پھٹ گئے۔ اسی لمحے میرے کپٹن فون کی سیخ فون دھیرے سے بجی۔ میں نے چیک کیا۔ وہ عظیم کا ایس ایم ایس تھا۔
 ”برو! میں کچل گیا ہوں۔“

”اوکے۔“ میں نے رپلائی کیا۔ ”جیسے ہی نادر شاہ

جانے کے لیے اٹھے گا، میں تمہیں اطلاع دے دوں گا۔“
 ”ٹھیک ہے۔ میں پوری طرح تیار بیٹھا ہوں۔“ اس نے کہا۔

میری نظر اس دوران میں مسلسل نادر شاہ کے چہرے پر جمی ہوئی تھی۔ وہ انہیں آمیزجیروں کے سمندر میں غوطہ زن تھا۔ یہ تحریر ایسی بھی طویل نہیں تھی کہ اسے پڑھنے میں زیادہ وقت لگتا۔ میرے اندازے کے مطابق، وہ اس خط کو بار بار پڑھ رہا تھا۔ میں نے مداخلت ضروری جانی اور ٹھہرے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

”اٹکل! آپ نے چنگیز خان کا خط پڑھ لیا؟“
 اس کی سرسراتی ہوئی آواز سنانی دی۔ ”یہ کیسے ہو گیا؟“

یہ میرے سوال کا جواب نہیں تھا۔ یا تو اس نے میری بات سنی ہی نہیں تھی۔ خط کی تحریر نے اس کی سماعت معطل کر دی تھی اور یا پھر اس نے میری بات کو سنی، ان سنی کر دیا تھا جس کا مطلب یہ تھا کہ اس وقت وہ ناقابلِ تعین صورتِ حال سے دوچار تھا۔ میں پوچھنے پر تیار نہ تھا۔

”کیا کیسے ہو گیا تھا جی۔۔۔۔۔؟“
 وہ قدرے سنبھلے ہوئے لہجے میں بولا۔ ”مم۔۔۔۔۔ میرا مطلب ہے۔۔۔۔۔ کہ چنگیز خان انہیں ایسا خط کیوں لکھے گا۔۔۔۔۔ اس کے اندر یہ تبدیلی کیسے آئی۔۔۔۔۔؟“

”جی تو۔۔۔۔۔ میں نے یہ دستور اس کی آنکھوں میں چھپا کتے ہوئے نظروں میں انداز میں کہا۔ ”میری بھی کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا۔ آپ نے بتایا ہے کہ یہ شخص ہمارے لیے ایک خطرناک دشمن کی حیثیت رکھتا ہے اور یہ میرا ہمدرد بن کر مجھے خط لکھ رہا ہے۔ یہ کیا معما ہے شاہ جی؟“

”میری سمجھ میں کچھ آ رہا ہے۔۔۔۔۔“ وہ بڑے شاطرانہ انداز میں بات کو بتاتے ہوئے بولا۔

”مجھے بھی سمجھا نہیں اٹکل۔“ میں نے جلدی سے کہا۔

”میں تو چنگیز خان سے ملاقات کے بارے میں سوچ رہا تھا اسی لیے آپ کو بلا رہا تھا کہ اس کے بارے میں آپ سے معلومات حاصل کر سکوں۔ مجھے تو یہ شخص خاصا بھلا لگا ہے۔“

”ہرگز نہیں!“ وہ بڑی شدت سے نفی میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ”تم اس شیطان سے ملنے کے بارے میں بھی بھول کر بھی نہیں سوچنا۔ میں اس کی چال کو اچھی طرح سمجھ رہا ہوں۔ یہ غیبت نہیں ٹرپ کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔ اس کی سازش کے جال میں قدم رکھنے کی غلطی نہیں کرنا چاہی۔۔۔۔۔ تم میری بات سمجھ رہے ہو نا؟“

سوری

گاگ۔ ”سردار صاحب دو انڈے دے دیجیے۔“
 سردار۔ ”سوری میں مرغی نہیں، دکاندار ہوں۔“

☆☆☆☆☆

جلدی

سردار ہوئی جہاز میں جھٹکرا کر رہا تھا کہ میں پچھلی سیٹ پر بیٹھوں گا۔ سب سمجھا کر تھک گئے کہ آپ کی سیٹ آگے ہے۔

ایک آدمی اٹھا اور سردار کے کان میں کچھ کہا۔ سردار بھاگ کر اگلی سیٹ پر بیٹھ گیا۔

لوگوں نے حیران ہو کر اس آدمی سے پوچھا۔ ”آپ نے ایسا کیا کہا کہ سردار فوراً مان گیا؟“

آدمی بولا۔ ”میں نے بس اتنا کہا ہے کہ آگے والے جلدی پہنچ جائیں گے۔“

☆☆☆☆☆

عیادت

سردار دوست سے۔ ”اب تمہاری کھانسی کا کیا حال ہے؟“

دوست۔ ”کھانسی تو بند ہو گئی ہے بس ذرا سانس رک رک کے آرہی ہے۔“

سردار۔ ”پریشان مت ہو۔ سانس بھی بند ہو جائے گی۔“

☆☆☆☆☆

COMMING SOON

سردار کی اپنے باپ سے لڑائی ہو گئی۔ سردار نے شے میں اپنے باپ کی تصویر اٹھائی اور قبرستان میں جا کر دیوار کے ساتھ لٹا کر نچلے لگا دیا۔

"COMMING SOON"

مرسلہ: تفسیر عباس باہر، اوکاڑہ

مارچ 2018ء

ی منزل می، یہ اسی وقت معلوم کیا جاسکتا تھا جب وہ کہیں

اس کی۔ اس کا یہ جملہ قابلِ غور اور نہایت ہی نوجہ کا حاصل

مارچ 2018ء

سسیپنس ڈائجسٹ

سے بھی کم اپنے ملک میں رکھے۔ اس معاملے میں غریب مرد چلے چارہ دل مسوس کر رہ جاتا ہے۔ اس کی یہ فطری خواہش تھیل اور تصور تک محدود رہتی ہے جبکہ صاحب ثروت مرد حضرات اپنی اس خواہش کو کبھی جامہ پہناتے ہیں۔ اس سلسلے میں ان کی پانچوں انگلیاں بھی میں اور سر کڑاہی میں ہوتا ہے۔ ایک بات ذہن میں رہے کہ میں مرد کی نفسیاتی خواہش کی بات کر رہا ہوں۔ جو جس اللہ سے دوستی کر لیتا ہے، اس ذات پاک کی خوب صورتی سے آشا ہو جاتا ہے پھر دنیا کی کوئی بھی حسین شے اس کی نگاہ میں نہیں سانی۔

”تم تو بڑے محل کر مردوں کی فطرت کو بیان کر رہے ہو۔“ وہ گہری نظر سے مجھے گھورتے ہوئے بولی۔ ”مجھے ایسے ہی صاف کو لوگ پسند ہیں۔“ وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولی۔ ”شاید اس لیے کہ میں خود بھی ایسی ہی ہوں۔“

”پلیز واپسی کے راستے پر گاڑی موڑ لو۔ ایک عمارت کو دیکھ کر مجھے یاد آ گیا ہے۔“ میں نے وضاحت کرتے ہوئے کہا۔ ”مذکورہ عمارت واپسی کے راستے پر پڑتی ہے۔ میں تھوڑی دیر کے لیے وہاں جانا چاہتا ہوں، اگر تمہیں کوئی اعتراض نہ ہو تو۔“

”مجھے کوئی اعتراض نہیں۔“ وہ ایک گہری سانس خارج کرتے ہوئے بولی۔ ”لیکن آگے نزدیک میں کوئی کٹ نہیں ہے۔ ہمیں چند کلومیٹر سیدھا جانے کے بعد واپسی کے لیے مڑنے کا راستہ لینا پڑے گا۔“

”ٹھیک ہے، جیسے تمہیں آسانی ہو۔“ میں نے سرسری انداز میں کہا۔

دراصل وہ بلڈنگ اچانک میری نگاہ میں آگئی تھی جس میں رجسٹری وی بیسٹل کاسٹ اپ لگا ہوا تھا۔ میں نے آج رات کے ابتدائی حصے میں اٹھ سے نو بجے تک یہیں پر جی ایم سر سے ملاقات کی تھی۔ یہ شخص میرے دل و دماغ میں اتر گیا تھا۔ سر کی باتوں میں بڑی کھراں اور گہرائی تھی۔ ہماری ایک کھٹے کی ملاقات پل بھر میں گزرتی تھی اور میرے اندر کھٹکی کے ایک وسیع و عریض صحرا کو بچھا گئی تھی۔ رجسٹری والی عمارت کو دیکھ کر میرا دل تھل تھل اٹھا تھا کہ میں جی ایم سر کے ساتھ مزید کچھ وقت گزاروں۔ اسی لیے میں نے جینا کو گاڑی موڑنے کے لیے کہا تھا۔

میری ہدایت پر جینا نے مذکورہ بلڈنگ کے سامنے واقع پل کے نیچے گاڑی پارک کی تو میں یہ دیکھ کر چونک اٹھا کہ بلڈنگ کے داخلی راستے کے قریب جی ایم سر کھل رہے تھے۔ ان کے ہمراہ ایک دہلا پٹا نوجوان بھی تھا۔ مجھ پر نگاہ

”وری کھل!“ میں نے زیر لب مسکراتے ہوئے کہا۔ ”ابھی میں نے تمہارے سامنے جس روک اسٹار کا ذکر کیا ہے، ذرا آگے بڑوں کے اعزاز میں منہ بگاڑ کر اس کا نام لو۔“

”شکارا۔۔۔۔۔ شاکیرا۔۔۔۔۔“ وہ ابھمن زدہ نظر سے مجھے دیکھنے لگی۔

”ویل سیڈ بے بی۔“ میں نے یہ دستور زیر لب مسکراتے ہوئے کہا۔ ”میرا اشارہ ٹھیکرا ازا تیل مبارک ہی کی طرف تھا۔ کیا تمہیں کسی اور نے اس بات کو پوائنٹ آؤٹ نہیں کیا؟“

”ہاں۔۔۔۔۔ بعض لوگوں کو ایسا لگتا ہے۔“ وہ بے پروائی سے بولی۔ ”لیکن میں نے بھی اس مشابہت پر زیادہ توجہ نہیں دی۔“

”پہلے بھی توجہ نہیں دی تو اب دو۔“ میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔

”اتنی شدید تاکید۔۔۔۔۔“ وہ خشک آلود نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے بولی۔ ”کیا ٹھیکرا تمہیں اچھی لگتی ہے؟“

اس کے سوال میں ایک خاص نوعیت کی اگلاؤڑی پائی جاتی تھی۔ میں نے صاف گوئی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔

”نہیں۔۔۔۔۔ آف کورس۔“

”اوہ۔۔۔۔۔ تو یہ معاملہ ہے!“ وہ معنی خیز اعزاز میں گردن ہلاتے ہوئے بولی۔ ”تمہارا دل ٹھیکرا میں اٹکا ہوا ہے، دوستی شمار سے چل رہی ہے اور مجھ سے کھٹے نام پاس۔“

”تم غلط سمجھ رہی ہو بیٹا۔“ میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”تم اور شمار میرے لیے دونوں اچھی دوست ہو۔“

بائی جہاں تک ٹھیکرا کا معاملہ ہے تو اس صف میں، میں کوئی اکیلا ہی نہیں کھڑا ہوں۔ میرے اندازے کے مطابق، اس دنیا کا کم از کم ہر دوسرا مرد ٹھیکرا کو پسند کرتا ہے اور ہر دوسرا مرد اس کا دیوانہ ہے۔

”تم مرد حضرات اتنے غدیے کیوں ہوتے ہو؟“ اس نے تبسم ریز لہجے میں پوچھا۔

”تم جانتی ہو، میں ساڈا کالونی کا اسٹوڈنٹ ہوں اس لیے تمہارے سوال کا میں ٹھیکری جواب دوں گا۔ تمہیں میرا جواب پسند آئے یا نہ آئے، تمہاری مرضی پر منحصر ہے۔“

”یہ تو میں جواب سننے کے بعد فیصلہ کر دوں گی۔“ وہ گاڑی کو میٹر پول سے شارح فیصل پر ڈالتے ہوئے بولی۔

میں نے کہا۔ ”مرد طبعاً عیاش ہوتا ہے۔ اس کی اولین خواہش یہ ہوتی ہے کہ دنیا بھر کی حسین و جمیل عورتوں کو وہ اپنے تصرف میں یا کم از کم اپنے قبضہ قدرت میں یا اس

لیے ہم لائٹ ڈرائیو پر نکل آئے تھے۔ اس خطے میں میری سوچ میں خاصی افراطی پچائی تھی۔ میں سونے سے پہلے اپنے دماغ کو پُر سکون کر دینا چاہتا تھا اسی لیے چاندنی رات میں چٹائی سمیت کو انجوائے کرنے نکل کھڑا ہوا تھا۔ جیسے ہی ہم زمرہ سے نکلے، اس نے نیچھی نظر سے میری طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

”اب بتاؤ، مجھ میں ایسی کون سی خاص بات ہے کہ مجھے دیکھتے ہی تمہیں بد معاشی سمجھنے لگی ہے؟“

”سوئی ابھی تک وہیں انگی ہوئی ہے۔۔۔۔۔!“ میں نے ونڈا سکرین کے پار نظر دوڑاتے ہوئے کہا۔

”اگر ریکارڈ کی سطح پر سوئی کے لیے بنے ہوئے مخصوص راستے میں کوئی خرابی ہو تو سوئی انک ہی جایا کرتی ہے۔“ وہ معنی خیز انداز میں بولی۔

”اوہ۔۔۔۔۔ تو ریکارڈ کی درست کے لیے راستہ صاف کرنا پڑے گا۔“ میں نے یہ دستور گاڑی سے باہر دیکھتے ہوئے کہا۔

”یہ تو تمہیں کرنا ہی ہوگا۔“ وہ ایک ادا سے بولی۔ ”میں اس وقت تمہاری کورٹ میں پڑی ہے۔“

”اوکے۔۔۔۔۔ اگر بال میری کورٹ میں ہے تو شات بھی مجھے ہی لگانا ہوگی۔“ میں نے اس کی جانب گردن موڑتے ہوئے کہا۔ ”تمہیں دیکھ کر دماغ میں بد معاشی کا کیڑا اس لیے کھلانے لگتا ہے کہ تمہاری شکل ایک جمیل اسٹیشن راک اسٹار سے بہت زیادہ ملتی ہے۔“

”اس راک اسٹار کا نام شمار ہے یا ڈیلفینا؟“ وہ عجیب سے لہجے میں بولی۔ ”یہ دونوں بھی تو اسٹیشن ہی ہیں نا۔۔۔۔۔!“

”تم میری بات کو مذاق میں لے رہی ہو۔“ میں نے ٹھوس انداز میں کہا۔ ”جبکہ میں سنجیدہ ہوں۔ کیا تم نے بھی آئینے میں خود کو غور سے نہیں دیکھا؟“

”روز کی بار دیکھتی ہوں۔“ وہ بے ساختہ بولی۔ ”مگر میں سمجھ نہیں پا رہی کہ میرے چہرے میں کون سی ورلڈ فیم راک اسٹار کی مشابہت پائی جاتی ہے۔“

”میں شکارا کی بات کر رہا ہوں۔“

”شکارا۔۔۔۔۔ واپٹ؟“ وہ برا سامنے بتاتے ہوئے بولی۔ ”کیا تم کسی لوکل منسٹر کا ذکر کر رہے ہو۔۔۔۔۔؟“

”برا سامنے بتانے کے بجائے تھوڑا مزہ بگاڑ کر بولو تو بات تمہاری سمجھ میں آجائے گی۔“ میں نے کہا۔ ”جیسا کہ عموماً آگے بڑھتے ہیں۔“

”تم کہنا کیا چاہ رہے ہو۔۔۔۔۔؟“ وہ احتجاجی لہجے میں بولی۔

میرا شک نارشاہ کی طرف گیا تھا۔“ میں نے عقلم کے خیال سے اتفاق کرتے ہوئے کہا۔ ”مجھے ایسا محسوس ہوا تھا کہ نارشاہ نے مجھے ڈرانے کے لیے یہ چال چلی ہے تاکہ میں خوفزدہ ہو کر فوراً سے پیٹر جیڈ واپس چلا جاؤں۔ میں نے چپک کر نے کے لیے شاہ جی کو اپنے پاس بلا یا اور اسے مذکورہ ڈھنگی آئینہ خط کے بارے میں بتایا۔ اس نے مجھے مشورہ دیا کہ میں جتنی جلدی ممکن ہو، یہاں سے چلا جاؤں ورنہ میری جان کو خطرہ ہے۔ میں یہ دیکھنا چاہتا تھا کہ نارشاہ میرے گھر سے نکل کر کس طرف کارخ کرتا ہے اسی لیے میں نے تمہیں اس کا تعاقب کرنے کو کہا تھا۔“

”سمجھ گیا برو۔“ وہ گہری سنجیدگی سے بولا۔ ”اور یہ کم بخت تمہارے پاس سے رخصت ہو کر ایم اے سوسائٹی کے ایک ایسے بنگلے میں پہنچا ہے جس کے گیٹ پر ’خان ہاؤس‘ نام کی تختی لگی ہوئی ہے۔“

”میں ممکن ہے، یہ پیٹریز خان کا گھر ہو۔۔۔۔۔“

”میری معلومات کے مطابق، میرے باپ کا قاتل پیٹریز خان کراچی کے علاقے نار تھ ناظم آباد میں رہتا تھا۔“

”ممکن ہے، اس نے رہائش تبدیل کر لی ہو۔“

”میں کسی طرح پتا چلانے کی کوشش کرتا ہوں کہ ’خان ہاؤس‘ میں کون رہتا ہے۔“ وہ سمجھ انداز میں بولا۔ ”ویسے یہ تو ثابت ہو گیا کہ نارشاہ مشکوک کردار کا مالک ہے۔“

”تم ٹھیک کہتے ہو۔“ میں نے تائیدی انداز میں کہا۔ ”میں ماں کی وجہ سے اس شخص کو برداشت کر رہا تھا ورنہ دروازہ اس سے یہ بندہ مجھے اچھا نہیں لگا تھا۔“

”ڈونٹ وری برو۔“ وہ تسلی آمیز لہجے میں بولا۔ ”میں ’خان ہاؤس‘ کے کینڈوں کی کنڈلی نکالنے کی کوشش کرتا ہوں۔ پھر سارے کنکسر محل کر سامنے آ جائیں گے۔“

”اوکے دوست! تم اپنی ریسرچ جاری رکھو۔“ میں نے کہا۔ ”کل دن میں ملتے ہیں۔ اب میں آرام کروں گا۔“

”تم بے فکر ہو کر سو جاؤ۔“ وہ مڑ غلوں لہجے میں بولا۔ ”میں سمجھ گیا کہ اب مجھے کیا کرنا ہے۔ کل جب ہماری ملاقات ہوئی تو تمہیں بتانے کے لیے میرے پاس بہت کچھ ہوگا۔۔۔۔۔ ان شاء اللہ!“

”ان شاء اللہ۔۔۔۔۔!“ میں نے چدل سے کہا۔

☆☆☆

جینا کی سرخ کھنکھ کرچی کی سڑکوں پر رواں دواں تھی۔ میں اسی کے پہلو میں پیٹر زینٹ پر موجود تھا اور وہ کار ڈرائیو کر رہی تھی۔ میں نے عقلم سے یہی کہا تھا کہ اب میں آرام کروں گا لیکن جینا چونکہ پہلے سے اسٹیشن بائی تھی اس

پڑتے ہی جی ایم سر کے چہرے پر مسکراہٹ نمودار ہوئی۔
 میں بیٹا کے ساتھ تیزی سے ان کی جانب بڑھ گیا۔
 وہ بڑی محبت سے ملے اور نرمی علیک مسلک کے بعد
 انہوں نے کہا۔ ”پر وگرام کی وجہ سے مجبوراً میں آپ کو زیادہ
 وقت نہیں دے سکا تھا۔ ہماری ملاقات ادھوری رہ گئی تھی۔
 مجھے پتا تھا، آپ دوبارہ میرے پاس آئیں گے اسی لیے میں
 آپ کے استقبال کی خاطر یہاں پہل رہا تھا۔“
 میں نے ان سے یہ پوچھنے کی غلطی نہیں کی کہ انہیں
 کیسے پتا چلا کہ میں دوبارہ ان سے ملنے آؤں گا؟ دیے سچی
 بات یہ ہے کہ میرا جی ایم سر کی طرف آنے کا کوئی ارادہ نہیں
 تھا کیونکہ ان کے یہ الفاظ میری یادداشت میں محفوظ تھے۔
 ”آپ کو بار بار مجھ سے ملنے کی ضرورت نہیں۔ یہ ہماری پہلی
 اور آخری ملاقات ہے۔“ جینیل والی بلڈنگ کو دیکھ
 کر کیا ایک میرے دل میں جی ایم سر سے ملنے کا خیال ابھرا
 تھا۔ تو کیا..... یہ خیال میرے ذہن کی سیلف پروڈکشن تھا یا
 کسی بیرونی قوت کے زیر اثر پیدا کیا گیا تھا؟ اگر آخر الذکر
 امکان پر غور کیا جاتا تو پھر بڑے وثوق کے ساتھ کہا جاسکتا
 تھا کہ یہ خیال میرے ذہن میں جی ایم سر نے اپنی کسی
 روحانی قوت کی مدد سے اجاگر کیا تھا اسی لیے وہ بلڈنگ سے
 باہر بڑے اعتماد کے ساتھ میرا انتظار کر رہے تھے۔ انہیں
 یقین تھا کہ ان کی خواہش کے مطابق میں ضرور آؤں گا اور
 میں بے اختیار ہو کر چلا آتا تھا۔
 ”سرا! آپ شرمندہ نہ کریں۔“ میں نے مؤدبانہ
 انداز میں کہا۔ ”میری اتنی اوقات کہاں کہ آپ جیسا عبقری
 میری راہ دیکھ رہا ہو۔“
 ”انسان کی اوقات پر بعد میں بات ہوگی۔“ وہ اپنی
 روشن آنکھوں سے میری طرف دیکھتے ہوئے بولے پھر
 اپنے قریب کھڑے ہو جانے لگا۔ ”تفسیر اتم میڈیم کو اندر
 لے جاؤ۔ ہم تھوڑی دیر میں آتے ہیں۔“
 ”میڈیم“ سے جی ایم سر کی مراد جیتا تھی۔ تفسیر نامی
 اس نوجوان نے فرماں برداری سے کہا۔
 ”اوکے سرا!“
 جیتا نے تفسیر کے ساتھ جانے سے پہلے سوالیہ نظر سے
 میری طرف دیکھا۔ میں نے اثبات میں گردن ہلادی۔ جی
 ایم سر مجھے اپنے ساتھ لے کر سروں روڈ پر ایک جانب
 بڑھنے لگے۔
 ”کھانا کھالیا آپ نے؟“ انہوں نے پوچھا۔
 میں نے جواب دیا۔ ”نہیں سر۔“

”جائے براٹھا ملے گا نا؟“

”آپ کا حکم سر آنکھوں پر۔“

”ادھر ہوں پر بہت عمدہ چائے پراٹھا ملتا ہے۔“ وہ

مجھے اپنی محبت میں چلائے ہوئے بولے۔ ”آپ کے

بہانے میں بھی کھا لوں گا۔“

میں نے مختصر کہا۔ ”جی سر۔“

وہ مجھے مختلف گلیوں میں سے گزار کر جینیل والی بلڈنگ

کے پچھواڑے والے علاقے میں لے آئے۔ ہم نے

ریلوے لائن کو عبور کیا اور مذکورہ ہوٹل پر پہنچ گئے۔ اس ہوٹل

پر بیٹھنے کے لیے کرسی میز کا بندوبست نہیں تھا بلکہ اس مقصد

کے لیے کئی ایک چوبلی تخت بچھے ہوئے تھے جن پر بیٹھے

ہوئے گا کہ چائے اور پراٹھے سے دل بہلا رہے تھے۔

ہم نے بھی ایک خالی تخت پر نشست جمائی۔

”آپ بھی سوچتے ہوں گے کہ میں آپ کو کس

ڈھابے پر لے آیا ہوں۔“ جی ایم سر نے ٹھہرے ہوئے

لہجے میں کہا۔ ”یہ جگہ آپ کے شایان شان نہیں ہے۔“

”ابھی کوئی بات نہیں ہے سر۔“ میں نے جلدی سے کہا۔

”میں آپ کی کمپنی میں بہت کمفرٹ مل کر رہا

ہوں۔“ چچر ہوٹل کا بھی ایک اپنا ہی مزہ ہے۔

جی ایم سر نے کوکڑ پراٹھے اور چائے کا آرڈر دیا

پھر ہمارے بیچ گفتگو کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ ”آپ اپنا سیل

فون آف کر دیں۔“ انہوں نے مشتاقانہ انداز میں کہا۔

میں نے فوراً ان کے حکم کی تعمیل کر دی۔

انہوں نے پوچھا۔ ”کیا آپ کے امریکا والے نمبر کا

سم کارڈ بھی سیل فون میں لگا ہوا ہے؟“

”جی سر۔“ میں نے اثبات میں جواب دیا۔

”کچھ عرصے کے لیے آپ اس سم کارڈ کو نکال کر کہیں

رکھ دیں۔“ وہ گہری سنجیدگی سے بولے۔ ”وہ عورت جو امریکا

سے آپ کے پیچھے آئی ہے، اس کے پاس آپ کا یہ نمبر ہے۔ وہ

اس نمبر سے آپ کو بے آسانی ٹریس کر سکتی ہے۔“

”میں ٹھیک کر آپ کی ہدایت پر لازمی عمل کروں

گا۔“ میں نے کہا۔ ”ویسے میری ٹریڈنگ اور ٹریڈنگ کے

لیے وہ میرے پاسپورٹ کا پاس کھارام بھی لے سکتی ہے۔“

پھر میں نے جی ایم سر کو بتایا کہ امریکی شہریت رکھنے

والے افراد کے میٹرو پاسپورٹ کے اندر ایک خفیہ چپ لگی

ہوتی ہے جس کی مدد سے اسٹیل ڈیٹا مینٹ جب چاہے

سیٹلائٹ سسٹم کے تحت دنیا کے کسی بھی حصے میں اپنے شہری

کی لوکیشن کا پتا چلا سکتا ہے۔ انہوں نے پوری توجہ سے میری

وقت

بات سنی اور میرے خاموش ہونے پر کہا۔

”گھوڑے کو چوری ہونے سے بچانے کے لیے

اسے کھونٹے پر منبٹولی سے باندھنے کا حکم ہے۔ اس کے بعد

اپنے معاملے کو اللہ کے سپرد کرنا چاہیے۔ پاسپورٹ چوبیس

گھنٹے آپ کے ساتھ نہیں ہوتا جبکہ یہ سیل فون آپ ہر وقت

کیری کرتے ہیں۔ یہ پاسپورٹ کی بہ نسبت آپ کے لیے

زیادہ خطرناک ثابت ہو سکتا ہے۔“

”آپ ٹھیک کہتے ہیں سر۔“ میں نے تائیدی انداز

میں گردن ہلائی۔

اس دوران میں میرے نے چائے پراٹھا سرور کیا۔

جی ایم سر نے کہا۔ ”کیا بات ہے۔ آپ کافی اچھے ہوئے

نظر آ رہے ہیں..... کوئی پریشانی ہے کیا؟“

”سرا! میں اپنی ایک دوست کے لیے بہت فکر مند

ہوں۔“ میں نے صاف کوئی سے کام لیتے ہوئے کہا۔

”کچھ عرصہ پہلے اسے امریکا سے انوا کر کے کیوبا پہنچا دیا گیا

تھا۔ مجھے اس کی کوئی خبر نہیں ہے۔“

”کیا آپ کے فکر مند ہونے سے اس کی خبر خرمل

جائے گی؟“ انہوں نے میری آنکھوں میں جھانکتے ہوئے

سوال کیا۔

”نہیں سر!“ میں نے نفی میں گردن ہلاتے ہوئے

جواب دیا۔ ”میں انسانی فطرت سے مجبور ہو کر اس کے

بارے میں سوچ رہا ہوں اور پریشان ہو رہا ہوں۔“

”تو گویا آپ یہ سمجھتے ہیں کہ آپ کے یوں پریشان

ہونے سے آپ کی دوست کی مشکل آسان ہو جائے گی؟“

وہ اپنی مقناطیسی آنکھوں کو میری آنکھوں میں گاڑتے

ہوئے مستفسر ہوئے۔

”نہیں سر!“ میں نے ایک مرتبہ پھر سر کوئی میں جنبش

ڈکی۔ ”اس مقصد کو حاصل کرنے کے لیے عملی اقدام کرنا

ہوگا۔“

”تو کریں عملی اقدام.....“ وہ عجب سے لہجے میں بولے۔

”بے ساختہ میرے منہ سے نکلا۔“ کیسے سر؟“

”اسے شدت سے یاد کریں۔“ انہوں نے سمجھ

انداز میں کہا۔ ”اور اس کے ساتھ ہی چائے پراٹھے پر بھی

لا جو دیں۔“

میں ان کی ہدایت پر عمل کرتے ہوئے شادو کو یاد

رہنے لگا۔ انہوں نے کہا۔

”انسانی جذبات کے اندر بے پناہ قوت ہوتی ہے۔

انیم ایڈاپٹس کی قید سے آزاد ہوتے ہیں۔ اگر یہ چاہیں

تو کروڑوں اربوں کلومیٹر کا فاصلہ نیوٹرون میں طے کر سکتے
 ہیں مگر..... آپ یہ کیا کر رہے ہیں؟“
 ان کے اچانک کیے گئے سوال نے مجھے چونکا دیا،
 میں نے پوچھا۔ ”میں نے کیا کر دیا سر؟“
 ”آپ اپنی گمشدہ دوست کے بارے میں سوچ
 رہے ہیں۔“
 ”آپ نے یہی تو کہا تھا۔“ میں نے الجھن زدہ نظر
 سے ان کی طرف دیکھا۔
 ”میں نے کہا تھا، اپنی دوست کو شدت سے یاد
 کریں۔“ وہ وضاحت کرتے ہوئے بولے۔ ”اور ”یاد“
 دماغ سے نہیں، دل سے کیا جاتا ہے۔ دماغ کا کام
 سوچنا ہے اور دل کا کام محسوس کرنا ہے۔ دماغ معاملات کو
 الجھاتا ہے اور دل معاملات کو سلجھاتا ہے۔ سو، ڈونٹ
 تھنک..... جسٹ ٹیل!“
 ”ہو گیا سر!“ میں پرجوش انداز میں بولا۔
 انہوں نے پوچھا۔ ”کیا ٹیل آئی ہے؟ آپ نے اپنی
 دوست کے بارے میں کیا محسوس کیا ہے؟“
 ”شادو کی عزت اور جان محفوظ ہیں۔“ میں نے
 جذبات سے مطلوب آواز میں بتایا۔
 ”بس اتنی سی بات تھی۔“ وہ بے تلے الفاظ میں
 بولے۔ ”آپ اپنے مقصد میں کامیاب ہو گئے۔ اس عمل کی
 پریکٹس گاہے بگاہے کرتے رہا کریں۔ رفتہ رفتہ آپ
 مشاق اور تجربہ کار ہوتے جائیں گے۔ آپ کے اندر ایک
 نادیدہ اپنی ٹیکنیشن انشال ہو چکی ہے۔ جب بھی آپ کسی
 ہنگامی صورت حال میں اس ایپ کو استعمال کریں گے، آپ
 کو موقع محل کی مناسبت سے فوری جواب مل جائے گا۔“
 جی ایم سر کا جوا ابتدائی تعارف مجھ تک پہنچا تھا اس کے
 مطابق، وہ اس ریجنل ٹی وی چینل میں آئی ٹی کے معاملات
 کو دیکھتے تھے لیکن میرے ذاتی تجربے کی روشنی میں نظر آ رہا
 تھا کہ وہ بہت ہی چٹکی ہوئی شخصیت ہیں۔ انہوں نے خود کو
 چھپانے کے لیے چینل کی اس جاب کا لبا لب اوڑھ رکھا تھا۔
 ”شکر ہے سر!“ میں نے ان کی طرف دیکھتے ہوئے
 عقیدت بھرے لہجے میں کہا۔ ”آپ نے میری بہت بڑی
 مشکل آسان کر دی ہے۔“
 ”شکر ہے اس مالک کا اور اس جس نے چائے پراٹھے
 کی شکل میں یہ رزق آپ تک پہنچایا ہے۔“ وہ میری طرف
 دیکھے بغیر گہری سنجیدگی سے بولے۔ ”اور آپ مالک کی اس
 نعمت کو لفٹ ہی نہیں کر رہے!“

میں نے ”سوری“ کہتے ہوئے چائے کا کپ اٹھالیا اور پراسٹے کی جانب ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا۔ ”آپ بہت مہمان ہستی ہیں۔“

”یہ جو میڈم آپ کے ساتھ آئی ہیں، انہیں آپ کے ساتھ وہی کچھ ہو گیا ہے جو آپ کو اپنی کشیدہ دوست کے ساتھ ہو چکا ہے۔“ میرے آخری جملے پر کوئی تبصرہ کرنے کے بجائے وہ تبصرے ہوئے انداز میں بولے۔ ”اس لیے آپ بھی اسے آزمانے کی کوشش نہیں کرنا تو قدرت آپ کی کشیدہ دوست کے حوالے سے آپ کو بھی کڑی آزمائش میں ڈال سکتی ہے۔“

”میں آپ کی ہدایت کو یاد رکھوں گا۔“ میں نے صدق دل سے کہا۔

”اسی میں آپ کی بھلائی ہے۔“ وہ معنی خیز انداز میں مجھے دیکھتے ہوئے بولے۔ ”محبت کرنے والے لوگ بڑے عجیب ہوتے ہیں۔ یہ کسی کی خاطر جان دینے میں ایک لمحہ نہیں لگاتے۔“

میں اندر سے کانپ کر رہ گیا تاہم زبان سے ایک لفظ نہ کہا۔

وہ بولے۔ ”آپ تینوں کسی شائستہ کے تین زاویوں کے مانند ایک دوسرے کے ساتھ بندھے ہوئے ہو چاہتے اور نہ چاہتے ہوئے بھی آپ لوگ خود کو ایک دوسرے سے زیادہ عرصے کے لیے دور نہیں کر سکتے۔ آپ اپنی کشیدہ دوست کے پیچھے بھاگتے اور یہ میڈم آپ کے تعاقب میں رہے گی۔ زندگی کی آخری سانس تک یہ دو دھوپ جاری رہے گی۔“

”کیا ہم لوگ کبھی اپنی منزل پر پہنچ بھی پائیں گے؟“ میں پوچھنے بنا نہ رہ سکا۔

”زندگی کی آخری منزل موت ہے۔“ وہ سرسراتی ہوئی آواز میں بولے۔ ”اور ہم سب ایک دائرے میں جو سزا اپنی اپنی منزل کی سمت رواں دواں ہیں۔“

میں سمجھ گیا کہ وہ دانت میرے سوال کا جواب دینے سے گریز کر رہے تھے۔ میں نے اس سلسلے میں اصرار مناسب نہ سمجھا اور پوچھا۔

”سرا! کیا آپ مجھے بتانا پسند کریں گے کہ ڈیلفینیا اسلام آباد میں کیا کرنے آئی تھی اور اب کراچی کا رخ کیوں کر رہی ہے؟“

”آپ کے دوسرے سوال کا جواب تو یہ ہے کہ وہ آپ کی ”محبت“ میں کراچی آ رہی ہے۔“ وہ معتدل انداز

میں بولے۔ ”البتہ، روالپنڈی اور اسلام آباد اسے ایک خاص مقصد سے بھیجا گیا تھا تاکہ وہ اس جڑے کا سراغ لگا سکے جو کم و بیش بیس سال پہلے امریکا سے اچانک غائب ہو گیا تھا۔ ان کا ایک بیٹا بھی تھا بالکل آپ کی عمر کا۔“

”ادمانی گاڈ!“ میں ایک گہری سانس لے کر رہ گیا۔ ”تو ڈیلفینیا غریبہ، الفریڈ اور ان کے بیٹے کی تلاش میں اسلام آباد آئی تھی؟“

”اسے پتا چلا ہے کہ یہ دونوں میاں بیوی اب اس دنیا میں باقی نہیں ہیں۔“ جی ایم سر نے انکشاف انگیز انداز میں بتایا۔ ”اس نے اپنے ذرائع استعمال کر کے یہ بھی معلوم کر لیا ہے کہ یہ جو اب امریکا سے پاکستان پہنچا تو ان کے ساتھ کوئی بچہ نہیں تھا لہذا اب آپ کی اس امریکی مہربان، قدر دان ڈیلفینیا کو کافی حد تک یقین ہو گیا ہے کہ انہیں جس باکمال نوجوان کی تلاش ہے وہ آپ کے سوا اور کوئی نہیں۔“

”یہ تو خاصی خطرناک صورت حال ہے سر۔“ میں نے تشویش بھری نظر سے ان کی طرف دیکھا پھر اپنی جیب سے چنگیز خان والا خط نکال کر ان کی جانب بڑھاتے ہوئے کہا۔ ”یہ دیکھیں، میں پہلے ہی کن جھمیلوں میں پھنسا ہوا ہوں۔“

انہوں نے بڑی توجہ سے وہ خط پڑھا پھر مجھے واپس کرتے ہوئے بولے۔ ”آپ نے جان بوجھ کر خود کو ان جھمیلوں میں پھنسا یا ہے ورنہ سیدھی سی بات تھی۔ آپ اپنی ماں کی خواہش کے مطابق ان کے حکم کی تعمیل کرتے۔ کسی جھگڑے پھڑے میں پڑنے کی ضرورت ہی نہیں تھی مگر مالک کا لکھا تو پورا ہوتا ہی ہے نا۔“ لچائی توقف کر کے انہوں نے مذکورہ خط کی جانب اشارہ کیا پھر ان الفاظ میں اضافہ کیا۔

”یہ سب لوگ کیڑوں مکوڑوں سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتے۔ ان میں سے کسی کے پیچھے بھاگنے کی ضرورت نہیں۔ اگر کوئی خود آگے بڑھے کہ آپ کا راستہ روکنے کی کوشش کرے تو اسے اپنے پاؤں کے نیچے چل ڈالیں۔ آپ کو درحقیقت جیل، کووں اور گدھوں کی جانب سے محتاط رہنا چاہیے۔ یہ لوگ بونی نوچنے میں ذرا دیر نہیں لگاتے۔ آپ میرا مطلب سمجھ رہے ہیں نا۔“

ان کا اشارہ ڈیلفینیا، ایمل بام اور آئزک جیسے افراد کی طرف تھا۔ جن کے لیے انہوں نے ”جیل“ کوئے اور گدھ“ کے الفاظ استعمال کیے تھے۔ میں نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ”جی سرا! میں اچھی طرح سمجھ رہا ہوں۔“

”آپ کا واسطہ اس وقت دنیا کے طاقتور ترین افراد

سے ہے۔“ وہ اپنی ہاتھوں کی پشت کو گھورتے ہوئے دھیمے انداز میں بولے۔ ”اسکل اینڈ یوز بڑی فعال سیکرٹ سوسائٹی ہے۔ ان سے بھی آگے کی چیز ”ایلیو میانی“ سیکرٹ سوسائٹی ہے۔“

”سرا! آپ ان لوگوں کے بارے میں بڑی وسیع معلومات رکھتے ہیں۔“ میں نے کہا۔ ”کیا آپ کو یہ خوف نہیں کہ آپ کی جان کو کوئی خطرہ لاحق ہو سکتا ہے؟“

”نہیں!“ وہ قطعی لہجے میں بولے۔ ”اس کی وجہ یہ ہے کہ میں نے آپ کو جو کچھ بتایا ہے کوئی خیرہ راز نہیں ہیں۔ ہاں، یہ ضرور ہے کہ سیکرٹ سوسائٹی سے متعلق ایسی باتیں بہت کم لوگوں کے علم میں ہیں۔ دیے سیکرٹ سوسائٹی والے عموماً اپنے رازوں کو چھپاتے ہیں لیکن کسی غیر متعلق (نان ممبر) شخص کو یہ اپنی خفیہ پرنٹس کی ہوا بھی نہیں لگنے دیتے۔“

”جی سرا! یہ تو میں بھی جانتا ہوں اسی لیے ڈیلفینیا نے مجھے اپنی سیکرٹ سوسائٹی کا ممبر بنانے کے لیے پورا زور لگا دیا تھا۔“ میں نے کہا۔

”لگا دیا تھا نہیں۔“ وہ صبح کرنے والے انداز میں بولے۔ ”بلکہ وہ اس وقت بھی اسی مشن پر کمر بستہ ہے۔“

”مجھے اندازہ ہے سر۔“ میں نے تائیدی انداز میں گردن ہلاتی پھر کہا۔ ”سرا! آپ سے ایک سوال پوچھوں؟“

”ضرور پوچھیں جناب۔“ وہ تبصرے ہوئے لہجے میں بولے۔ ”ہم اسی مقصد سے یہاں بیٹھے ہیں۔“

”فلٹے کی پروفیسر ایما ایمل بام نے مجھے بتایا تھا کہ یہودی پوری دنیا پر حکمرانی کے لیے ایک خصوصی جنگ کا آغاز کرنے والے ہیں۔“ میں نے کہا۔ ”اس حوالے سے ان کی مقدس کتاب تالمود میں بڑے واضح طور پر لکھا ہے کہ جب مسلسل چار مکمل چاند گرہن یہودیوں کے مذہبی تہوار والے مہینوں میں لگیں گے تو وہ پوری دنیا کا کنٹرول حاصل کرنے کے لیے میدان جنگ میں کود پڑیں گے۔ آپ اس بارے میں کیا کہتے ہیں؟“

”آپ ایک بات ذہن میں رکھیں کہ ”تالمود“ یہودیوں کی ایسی ہی کتاب ہے جیسے ہمارے ہاں احادیث کی کتب ہیں۔“ وہ سمجھانے والے انداز میں بولے۔

یہودی اکابرین نے تالمود میں بھی ترمیم و اضافہ فرما رکھا ہے۔ ہمیشہ کے لیے سلازی دنیا پر حکمرانی کا خواب بھی اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے جو بھی شرمندہ تعبیر نہیں ہو سکے گا۔“

”سرا! آپ یہ بات اسنے دھوکے سے کیسے کہہ رہے ہیں؟“ میں نے الجھن زدہ نظر سے ان کی طرف دیکھا۔

”اس وقت بھی تو ساری دنیا کو وہی چلا رہے ہیں۔ آگے چل کر یہ اور زیادہ مضبوط ہو سکتے ہیں۔“

”جتنا مضبوط ہوتا تھا، ہو لیے۔“ وہ غیر متزلزل لہجے میں بولے۔ ”اب ان کا غلط شروع ہونے والا ہے۔ یہ

اپنی حکمرانی کا عرصہ گزار چکے۔ قدرت کسی قوم کے ساتھ نا انصافی نہیں کرتی۔ کسی زمانے میں عیسائیوں کی پوری دنیا پر حکمرانی تھی۔ پھر یہی اعزاز مسلمانوں کو کافی عرصے تک حاصل رہا۔ آج کل یہودیوں کی باری چل رہی ہے۔ اگلا نمبر چینی قوم کا ہے۔“

”اوہ۔۔۔!“ میں ایک گہری سانس لے کر رہ گیا۔

”تو آپ یہ کہنا چاہ رہے ہیں کہ آئندہ کی سپر پاور چین ہوگا؟“

”بالکل!“ وہ چٹائی لہجے میں بولے۔ ”میں ایسا ہی سمجھتا ہوں اسی لیے میں مغرب چین جارہا ہوں۔“

”صرف گھومنے پھرنے یا۔۔۔“

”میں وہاں پر مستقل رہائش کے بارے میں سوچ رہا ہوں۔“ وہ میری بات پوری ہونے سے پہلے ہی بول اٹھے۔ ”میں کیا سوچ رہا ہوں، یہ تو میرے آقا کا فرمان ہے اور اب مرشد کا حکم بھی ہے۔“

”میں سمجھتا ہوں سر۔“ میں نے الجھن زدہ نظر سے ان کی طرف دیکھا۔

”صدیوں پہلے میرے آقا ﷺ نے فرمایا تھا، علم حاصل کرو چاہے اس کے لیے چین جانا پڑے۔“ وہ تبصرے ہوئے لہجے میں وضاحت کرتے ہوئے بولے۔ ”اس فرمان کے دو اسباب تھے۔ ایک تو یہ کہ چین عرب سے ایک

دور دراز ملک تھا۔ دوسرے یہ کہ چین اس زمانے میں علم و دانش کا گہوارہ ہوا کرتا تھا اور بلاشبہ آج بھی ہے۔ میں بھی اپنی

جہالت کو تپانے اور علم کی پیاس بجھانے چاہتا ہوں۔“

”آپ نے اس کائنات کی عظیم ترین ہستی کے جس فرمان کا ذکر کیا، میں اس سے اچھی طرح واقف ہوں۔“

میں نے عقیدت بھرے لہجے میں کہا پھر پوچھا۔ ”آپ نے کسی مرشد کے حکم کا تذکرہ بھی کیا ہے۔ یہ کیا معاملہ ہے

سر۔۔۔ کیا آپ صاحب سلسلہ ہیں؟“

”چند سال پہلے کسی شخص کے توسط سے میں شمالی علاقہ جات میں ان سے ملا تھا۔“ انہوں نے گہری سنجیدگی سے

بتایا۔ ”اس ملاقات میں مجھے یوں محسوس ہوا جیسے ساڑھے چودہ سو سال پہلے مسجد نبوی کے صحن میں آقا ﷺ کی محفل

میں بیٹھا ہوں۔ بس میں اسی لمحے ہار گیا۔ اپنا سب کچھ میں نے ان کی خدمت میں پیش کر دیا بلکہ میں نے اپنا آپ ان

وقت رات کے ساڑھے بارہ بج رہے تھے۔ ایک فوری خیال کے تحت میں نے اس سے پوچھا۔
”کیا تم کھانا کھا کر گھر سے نکلی تھیں؟“
”تمہیں اس سے کیا فرق پڑتا ہے؟“ وہ میری طرف دیکھے بغیر بولی۔

”فرق کیوں نہیں پڑتا۔“ میں نے نرم لہجے میں کہا۔
”تم میری دوست ہو۔ اگر تم گھر سے کھانا کھائے بغیر نکلی ہو تو یقیناً تمہیں بھوک لگ رہی ہوگی۔“
”میرا اتنا زیادہ خیال کرنے کا بہت شکریہ۔“ وہ رکھائی سے بولی۔

میں نے گاڑی سے باہر دیکھتے ہوئے اس کا غصہ کم کرنے کے لیے چھیڑ چھاڑ کا سلسلہ جاری رکھا۔
”اس میں شکریہ ادا کرنے والی کون سی بات ہے۔ مجھے خود بھی شدید قسم کی بھوک محسوس ہو رہی ہے۔ اگر کہیں کھانے پینے کے پوائنٹ پر چلاؤ تو توڑی پیٹ پوجا ہی کر لیتے ہیں۔“

”تمہیں بھوک لگ رہی ہے تو کھاؤ۔“ وہ بہ دستور روٹھے ہوئے انداز میں بولی۔ ”میں نہیں کھاؤں گی۔“
”مطلب یہ کہ تمہارا غصہ تھوکنے کا کوئی ارادہ نہیں۔“
میں نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا پھر پوچھا۔ ”اور یہ تم مجھے کہاں لے جا رہی ہو؟ یہ وہ راستہ تو نہیں جس سے ہم آئے تھے۔ کہیں مجھے پھانسی کا پروگرام تو نہیں؟“

”تمہاری طرحیں تو ایسی ہی ہیں کہ جس پر بہت زور کی پٹائی ہونا چاہیے۔“ وہ ڈرائیونگ پر توجہ مرکوز رکھتے ہوئے بولی۔ ”میں نے برج سے دوسرا راستہ لے لیا ہے اور اب میرا ہی ویکی طرف جانے کا ارادہ ہے۔“

میں نے وہابی کے راستے کی وضاحت پر غور نہیں کیا اور شرارت بھرے لہجے میں پوچھا۔ ”میں نے پچھلے ایک گھنٹے میں تمہارے ساتھ ایسی کون سی حرکت کی ہے جس پر تم اتنی برہمی دکھا رہی ہو۔ میں نے تو تمہیں چھوٹا سا گناہ نہیں کیا۔“
”اب میں بھی تمہیں چھوٹے گناہ نہیں دوں گی۔“ وہ مجھے گھورتے ہوئے بولی۔

”کیوں؟“ میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے پوچھا۔ ”میں نے ایسا کیا تھوڑا سا ہے جو تم اتنی ظالم بن گئی ہو؟“

”تمہارے پاس چھوٹے دلیلوں کی کیا کمی ہے۔“ وہ طنز یہ لہجے میں بولی۔ ”تین تین تو ایسی ہی ہیں۔“
”تم مجھ سے کچھ چھپانے کی کوشش کر رہی ہو۔“ میں نے کہا۔ ”جبکہ میں سمجھ رہا ہوں کہ تمہاری ناراضی کی وجہ کچھ

از میں بولے۔
”لیکن..... انہوں نے..... یہ لاک کیسے لایا.....؟“ میں نے بے چینی سے ان کی طرف دیکھا۔
”تو آپ کے مرشد سے بھی ملا بھی نہیں!“

”آپ کو ایسے چھوٹے موٹے کاموں کے لیے مرشد کے پاس جانے کی ضرورت نہیں۔“ وہ نہایت ہی سنجیدہ لہجے میں بولے۔ ”مرشد ہر جگہ موجود ہیں اور انہیں ہر شے کی خبر ہے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو آپ آج تک دوبارہ میرے پاس نہ آتے اور میں آپ کے استقبال کے لیے چھیل کے باہر نہ آ رہا ہوتا۔ میرا مرشد اللہ والا ہے اور..... اللہ والے کی تلافی آپ کو اچھی طرح معلوم ہے۔“

”آپ نے مجھے حیران کر دیا ہے سر!“ میں کپکپاتی ہوئی آواز میں بولا۔

”آپ کو اس وقت حیران نہیں بلکہ فکر مند ہونا ہے۔“ وہ مختصر انداز میں بولے۔
”کیوں سر.....؟“

”میزم آپ کی کپکپاتی کرنے کے لیے یہاں آ رہی ہیں۔“
”کون میزیم؟“ یہ سنا میرے منہ سے نکلا۔
”وہی لیڈی جس کے ساتھ آپ میرے پاس آئے۔“ انہوں نے بتایا۔ ”مزید انتظار ان کی برداشت سے بڑھ کر ہے۔ وہ نصیر کے ساتھ ادھر ہی آ رہی ہیں..... ہماری ان کی کا وقت آن پہنچا ہے اسلئے صاحب!“

ادھر ان کی بات ختم ہوئی، ادھر پچھلے ہوش کے سامنے پڑا کی سرخ فلفل نظر آئی۔ گاڑی کی تکی نشست پر تقریر کرنے والے جوان بیٹھا تھا۔ جی ایم سراٹھ کر کھڑے ہو گئے۔ میں بھی ان کی تقلید میں چوٹی تخت چھوڑ دیا۔

تقریر گاڑی سے نکل کر ہماری جانب بڑھنے لگا تو جی ایم نے مجھے سینے سے لگایا اور بہت زور سے بھیجا۔ چند لمحوں میں یہ چرخ جوش معائنہ اختتام پذیر ہو گیا۔ انہوں نے الفاظ کے ساتھ مجھے رخصت کر دیا۔

”اللہ آپ کا حامی و ناصر!“

☆☆☆

پینا کا موڈ آف تھا۔ وہابی کے سفر میں وہ سنجیدہ اور چپکلی تھی۔ میں اس کی ناراضی کا سبب جانتا تھا۔ اس کا خفا جان کر تھا۔ میں اسے پچھلے پریشا کر، کچھ بتائے بغیر وہاں سے ہو گیا تھا۔ جی ایم سر کے ساتھ ہونے والی اس اہم گفتگو میں اس قدر غور ہو گیا تھا کہ وقت گزرنے کا بالکل احساس نہ ہوا تھا۔ ہم گنگ جگک سوا کیا رہے وہاں پہنچے تھے اور اس

اسے ہلکان کر کے رکھ دیتا ہے لیکن جب کبھی جی کی مشکل میں پڑ جائے تو ایک شخص دوست کی طرح نام اس کی مدد بھی کرتا ہے۔ یہی معاملہ سیکرٹ سوسائٹی والوں کا بھی ہے۔ یہ اپنے شکار کے ساتھ ”نام ایڈ جری“ والا ٹھیل کھیتے ہیں۔ اسے دوڑاتے ہیں، بھاگاتے ہیں اور ہلکان کرتے ہیں اور جب وہ ہانپ کر زمیں بوس ہو جاتا ہے تو پھر اس کی جانب دوڑتی کا تھ بڑھاتے ہیں۔ جب یہ کسی کو اپنا دوست بنانے ہیں تو پھر وقار داری کا تقاضا بھی کرتے ہیں۔ ان کے ہاں بے وقافی اور خداری کا ایک ہی مطلب ہے..... موت! ایک ایسی موت جس کے سبب کو کوئی حل نہیں کر سکتا۔ باقی جہاں تک آپ کے سوال کا تعلق ہے تو..... انہوں نے ڈرا دیرو کو کر کے بڑی گہری نظر سے مجھے دیکھا پھر گہری سنجیدگی سے کہا۔

”جب آپ کے پاس کوئی آپشن باقی نہ رہے تو ان کے پیچھے گھس جائے گا۔ ڈرا پتا تو چلے کہ بغیر کھڑکیوں اور دروازوں والی پر اسرار عمارتوں کے اندر کون سا طلسماتی کھیل کھلایا جاتا ہے.....!“

”آپ کا مطلب ہے، ایسی صورت میں مجھے سیکرٹ سوسائٹی جو ان کر لیتا چاہیے؟“ میں نے حیرت بھرے لہجے میں استفسار کیا۔

”جی!“ انہوں نے اثبات میں گردن ہلا دی۔
”اور وہ..... روح کو گردی رکھوانے کا معاملہ.....!“
میں نے سرسراہٹ ہوئی آواز میں پوچھا۔ ”ان کی رکنیت کی بنیادی شرط یہی ہے اور میں کسی بھی قیمت پر یہ انورڈ نہیں کر سکتا۔“

”ہم اس وقت انتہائی صورت حال یعنی ”نہ پائے رفتن، نہ جائے ماندن“ کی بات کر رہے ہیں۔“ وہ سمجھانے والے انداز میں بولے۔ ”اول تو مجھے امید ہے، ایسی نویت آئے گی ہی نہیں، یہ صورت دیگر اگر آپ کو سوسائٹی جو ان کرنے کا فیصلہ کرنا ہی پڑتا ہے تو پریشان نہ ہوں۔ آپ اندر سے جو کچھ بھی ہیں اس میں کوئی تبدیلی نہیں آئے گی۔ اگر باہر سے آپ بھی بدل جائیں تو اس سے کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ مرشد نے آپ کی روح پر ایک ایسا لاک لگا دیا ہے کہ وہ مالک کائنات کے سوا کسی کے تصرف میں جاسی نہیں سکتی۔“

”مرشد نے میری روح پر لاک لگا دیا ہے.....“
شدت حیرت سے میری آواز کافی بلند ہو گئی۔ ”یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں سر؟“
”میں وہی کہہ رہا ہوں جو حقیقت ہے۔“ وہ معتدل

کے سپرد کر دیا۔ اب میں کچھ بھی نہیں ہوں۔ یہ جو کچھ آپ کو نظر آ رہا ہے، میرے مرشد کا دیا ہوا ہے۔ مرشد نے مجھے صرف دو باتوں کی تلقین کی تھی۔ اول، بلاغتر بق سل ورنگ اور مذہب و ملت آپ نے ہر انسان کا احترام کرتا ہے اور جی الامکان اس کی مدد بھی کرتا ہے۔ دوم، مرشد کی بات پر اپنے ذہن کو سونپنے کی زحمت نہیں دینا۔ دل و جان سے ایمان لا کر من و عن اس پر عمل کرتا ہے..... لگائی تو توقف کر کے انہوں نے ایک ہموار سانس خارج کی پھر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے بولے۔

”مرشد کا حکم کھانی دی پچھلے جوان کرلو۔ میں نے ایک لمحہ سوچے بغیر اس ریجنل چھیل پر ملازمت کر لی۔ اب مرشد کا حکم ہے چھیل جائیں..... اس حکم کی بھی تعمیل لازم ہے۔“
”اب سمجھ میں آگئی بات۔“ میں نے ستائشی نظر سے جی ایم سر کی جانب دیکھتے ہوئے کہا۔ ”کہ آپ کی پہلائی کس گڑا اسٹیشن سے ہے۔“

”جو شخص کسی گڑا اسٹیشن سے منسلک ہوتا ہے اس کی زندگی میں کسی چیز کی کمی نہیں رہتی۔“ وہ آسمان کی جانب نگاہ اٹھاتے ہوئے بولے۔ ”آج پورا چاند ہے۔ دیکھیں کیسا چمک رہا ہے۔“

آج تیرہواں روزہ تھا۔ اس حساب سے غروب آفتاب کے ساتھ ہی چاند کی چودہ تاریخ شروع ہوئی تھی۔ کھلے آسمان پر چودھویں کا چاند بڑا دل کش دلکش دکھائی دے رہا تھا۔ چاند کو چھوڑا اور اس بات پر غور کر دیکر سیکرٹ سوسائٹی والے کے کچھ کام نہیں کرتے۔ آپ بھی ڈیفینیا اور اس کی سوسائٹی کو ہلکا نہ لیں.....

”سرا! آپ مجھے ڈرا رہے ہیں؟“ میں نے ابھمن زدہ انداز میں پوچھا۔

”نہیں!“ وہ قلعی لہجے میں بولے۔ ”میں آپ کو سمجھا رہا ہوں تاکہ آپ سے کسی بھی قدم پر کوئی غلطی نہ ہو۔“

”سرا! اگر میرے پاس کوئی آپشن باقی نہ رہے۔ میں ان لوگوں کے سامنے مجبور ہو جاؤں تو ان حالات میں مجھے کیا کرنا چاہیے؟“ میں نے ایک نہایت ہی اہم سوال کیا۔
”آپ نے نام ایڈ جری کارٹون تو دیکھا ہوگا؟“
”جی، میں یہ کارٹون بہت شوق سے دیکھتا ہوں۔“

میں نے کہا۔
”اگر آپ شوق سے دیکھتے ہیں تو ایک بات آپ نے خاص طور پر نوٹ کی ہوگی۔“ وہ غم بھرے ہوئے لہجے میں بولے۔ ”اگرچہ نام ہر وقت جی کی پیچھے پڑا رہتا ہے اور

اور ہے۔ اگر تینوں کا کوئی ایسا ہوتا تو تم چیل پر پہنچنے سے پہلے مجھ سے خفا ہوتیں۔ جو کچھ بھی ہوا ہے اسی کھٹے سوا کھٹے میں ہوا ہے۔

”بدمیزی کی بھی حد ہوتی ہے۔“ وہ پھٹ پڑی۔
”مجھے وہاں بھڑا کر تم پتا نہیں کہاں غائب ہو گئے۔ میں بھوک پیاسی بیٹھی تمہارا انتظار کر رہی تھی اور بدعاشی دیکھو کہ تم نے اپنا فون بھی آف کر رکھا تھا۔“

”تم تو جانتی ہو، میں انتہائی بدتمیز اور بدعاش قسم کا انسان ہوں۔“ میں نے سرسری انداز میں کہا۔ ”جہاں تک سیل فون آف کرنے کی بات ہے تو وہ میں نے سر کے کہنے پر کیا تھا۔ باقی تمہیں میری وجہ سے جو کوفت اٹھانا پڑی اس کے لیے میں بے حد معذرت خواہ ہوں۔“

”جاؤ، تم جی کیا پناہ کرو گے۔“ وہ فراخ دلی سے بولی۔
”میں نے اس شرط پر تمہیں معاف کیا کہ آئندہ ایسی غلطی نہیں ہونا چاہیے۔“

”نہیں ہوگی میڈم۔“ میں نے ذریعہ مسکراتے ہوئے کہا۔

”میڈم؟“ اس نے سوالیہ نظر سے مجھے گھورا۔
”یہ ناکل تمہیں جی ایم سر نے دیا ہے۔“ میں نے جلدی سے وضاحت کرتے ہوئے کہا۔

اس نے چونک کر میری طرف دیکھا پھر جیسے انداز میں دریافت کیا۔ ”یہ جی ایم سر کون صاحب ہیں جو انہیں اتنی زیادہ اہمیت دے رہے ہو اور ان کے کہنے پر اپنا فون بھی آف کر دیتے ہو؟“

”جی ایم سر بہت عظیم شخصیت ہیں۔“ میں نے احترام بھرے لہجے میں چٹا کو بتایا۔ ”میری نظر میں ان کا درجہ، ایک روحانی راہنما کا ہے۔ وہ اس قابل ہیں کہ ان کی خواہش کی تعمیل کی جائے۔ میں دل و جان سے انہیں اپنا کرو مان چکا ہوں۔“

پھر میں نے اسے جی ایم سر کی چیل والی جاب کے بارے میں بھی تفصیل سے آگاہ کیا تاہم یہ نہیں بتایا کہ سر نے مجھے اس کا خیال رکھنے کی تاکید کی ہے۔ سر کی زبانی مجھے معلوم ہوا تھا کہ بیٹا میری جہالت میں گرفتار ہو چکی ہے۔ اگر میں سر کی باتیں اس کے علم میں لے آتا تو اس کا دماغ خراب ہو جاتا۔ وہ سر کی تلقین کو میری کمزوری سمجھ کر سیدہ زوری پر اتر آئی۔ وہ میرے ساتھ قربت کی جتنی منازل طے کر چکی تھی، اسی کی بنا پر وہ مجھ پر حاوی ہونے کی کوشش میں لگی رہتی تھی۔ اگر اسے یہ پتا چل جاتا کہ میں اپنے کردگی

ہدایت پر اس کا خیال رکھنے کا پابند ہوں تو پھر پتا نہیں، میرا کیا حشر کرتی۔ میں اس وقت جن حالات سے گزر رہا تھا، اس میں ڈسے داریوں کے بوجھ میں اضافہ کرنا دانش مندی نہیں تھی۔

”ہتا، وہاں کیا ہوا؟“ وہ خامے جوٹیلے انداز میں بولی۔
”کہاں؟“ بے ساختہ میرے منہ سے نکلا۔

”ارے، میں اس ریجنل چیل کی بات کر رہی ہوں۔“ اس نے بڑے خوشگوار انداز میں وضاحت کرتے ہوئے کہا۔
”میں نے وہاں ایک ایسے شخص کو دیکھا جو مجھے دعائی میں بھی ایک دو بار نظر آتا تھا۔ شاید وہ کوئی انکریٹر ہو۔“

چٹا کے لہجے سے مجھے اندازہ ہو گیا کہ اس کا موڈ بحال ہو گیا تھا۔ اب وہ اپنے مخصوص فطری انداز میں بات کر رہی تھی۔ ”معذرت“ نے خاصا موٹو کام دکھا دیا تھا۔

میں نے کہا۔ ”تو اس میں ایسی پریشانی والی کون سی بات ہے۔ شو بڑے متعلق افراد کا تو دعائی میں آنا جانا لگائی رہتا ہے۔“

”تم ٹھیک کہتے ہو میری پریشانی کا سبب یہ تھا کہ وہ انکریٹس مجھے پہچان نہ لے اور میرے ماضی کے حوالے سے کوئی ہلکی بات نہ کر دے۔“

”میری بات کو توجہ سے سنو بیٹا۔“ میں نے گاڑی سے باہر دیکھتے ہوئے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ”جس زاویہ سے تم ڈر رہی تھیں، اگر وہ انکریٹس پہچان بھی لیتا تو جیسے یقین ہے کہ وہ کوئی چپ حرکت نہ کرتا۔ اور پھر جب تم نے اللہ سے اپنے گناہوں کی معافی مانگ لی ہے تو مجھے یقین ہے، مالک اب تمہیں کسی انسان کے سامنے شرمندہ نہیں ہونے دیے گا۔ اس خوف کول و دماغ سے نکال دو کہ اس حوالے سے بھی تمہیں نعمت اٹھانا پڑے گی اور آخری بات یہ کہ..... میں نے ذرا دیر کو رک کر اس کی آنکھوں میں دیکھا اور ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔

”تم اپنے شرمناک ماضی کو دفن کر کے آگے بڑھ چکی ہو۔ تمہارے پاس اب خوش حال، حال اور روشن مستقبل ہے۔ مجھ سے وعدہ کرو کہ کبھی اپنے ماضی کا مجھ سے ذکر نہیں کرو گی اور نہ ہی کسی اس بارے میں سوچ کر خود کو گن گن کر دے گی۔“

”میں وعدہ کرتی ہوں کہ تمہاری بات پر عمل کروں گی۔“ وہ بھراؤنی آواز میں بولی پھر اس نے اپنا ہاتھ ہاتھ میرے دائیں ہاتھ پر رکھ دیا اور جذباتی لہجے میں کہا۔ ”تم بھی مجھ سے وعدہ کرو کہ اس مسئلے میں تم میرا ساتھ

وقت

تھی یا دانستہ وہ ایسا کرنا نہیں چاہتی تھی جیسا کہ اپنی اندرونی کیفیت کو ”دوستی، لطف اور اہانت“ ایسے لہارے اڈھا کر میرے سامنے پیش کر رہی تھی۔

”اگر تم مجھ پر اعتماد کرتی ہو تو یقین کر لو کہ میں ہر ممکنہ انداز میں تمہاری ہر پور مدد کروں گا۔“ میں نے صدقہ دل سے کہا۔ ”بتاؤ، تم مجھ سے کیا چاہتی ہو؟“
”میں ہمیشہ تمہارے ساتھ رہنا چاہتی ہوں۔“ اس نے میری توقع کے عین مطابق جواب دیا۔ ”میں تم سے دور ہونے کا تصور بھی نہیں کر سکتی۔“

میں نے کہا۔ ”تم میرے ساتھ ہی تو ہو.....!“
”میں نے جدہ میں مستقل رہائش اختیار کرنے کا فیصلہ اس لیے کیا تھا کہ تم نے مجھے یہی بتایا تھا کہ تم جدہ میں ہوتے ہو۔“ وہ میری سنی، ان کی کرتے ہوئے خواب ناک لہجے میں بولی۔ ”لیکن پھر تمہاری حقیقت کھل کر میرے سامنے آ گئی اور اب تم مجھے جرمی میں سیٹل ہونے کا مشورہ دے رہے ہو جو مجھے کسی بھی طور قبول نہیں ہے۔“

”پھر میں تمہارے لیے کیا کروں؟“ میں نے پوچھا۔
”اگر تمہیں واپس امریکا جانا ہے تو میرے لیے وہاں پہنچنے کا بندوبست کرو۔“ وہ غموں سے لہجے میں بولی۔ ”اگر تم ایسا نہیں کرو گے تو میں اپنی مدد آپ کے تحت کوشش کروں گی اور تمہارے پاس پہنچ کر دکھاؤں گی۔ میں تم سے زیادہ ضدی اور بھٹ ہوں۔“

”مجھے مت بتاؤ کہ تم کتنی ضدی اور بھٹ ہو۔“ میں نے کہا۔ ”یہ بات مجھ سے زیادہ اور کوئی نہیں جانتا۔ میں تم سے وعدہ کرتا ہوں کہ تمہیں امریکا ضرور بلاؤں گا لیکن فوری طور پر یہ ممکن نہیں۔“

”کیوں ممکن نہیں؟“ وہ تیز لہجے میں مستفسر ہوئی۔
”تمہیں پتا ہے کہ ماں نے میرے ریفرنس سے

امریکا کے وزٹ ویزا کے لیے اپلائی کیا تھا اور ان کا کام بھی ہو گیا تھا۔ یہ ساری تفصیل میں تمہیں بتا چکا ہوں۔“ میں نے اس کے سوال کے جواب میں بتایا۔ ”لیکن مالک کو ماں کا امریکا جانا منظور نہیں تھا اس لیے مالک نے ماں کو اپنے پاس بلا لیا۔ اس واقعے کی اطلاع امریکن امبیسی کو بھی ہے۔ اگر میں فوری طور پر دوبارہ اپنا ریفرنس استعمال کروں گا تو وہ ریویو بھی کر سکتے ہیں۔ میں ان کے مزاج کو اچھی طرح سمجھتا ہوں۔ تم تھوڑا انتظار کرو تو مناسب رہے گا۔“

”مثلاً کتنا انتظار؟“ اس نے پوچھا۔ ”تم تو دو چار دن میں یہاں سے نکل جاؤ گے۔“

”میرا پروگرام تو یہی ہے کہ میں اگلے ہفتے میں کسی بھی دن امریکا روانہ ہو جاؤں۔“ میں نے صاف گوئی سے کام لیتے ہوئے کہا۔ ”لیکن میں نہیں جانتا کہ ایسا ہو سکے گا یا نہیں۔ کل کیا ہونا ہے، یہ صرف مالک کے علم میں ہے یا پھر مالک اپنے کسی خاص بندے کو علم دے دے۔“

”ٹھیک ہے علی! تم جیسے کہو گے، میں ویسا ہی کروں گی۔“ اس نے کہا۔ ”میں ساری زندگی بھی تمہارا انتظار کر سکتی ہوں۔“

”میں ہر کام کے لیے کوشش ضرور کرنا چاہیے لیکن یہ نہیں سوچنا چاہیے کہ سب کچھ ہمارے ہاتھ میں ہے۔“ میں نے کہا۔ ”میں بعض معاملات کو مالک پر بھی چھوڑ دینا چاہیے۔“

”بے شک!“ وہ پورے یقین سے بولی۔ ”اور مالک جو بھی کرتا ہے اس میں بندے کی بہتری ہی ہوتی ہے۔“

”اب کی بات تم نے پتے کی بات۔“ میں نے کہا۔

”میں تو ہمیشہ پتے ہی کی بات کرتی ہوں۔“ وہ اتر آئی۔ ”لیکن معلوم نہیں، تمہارا دھیان کہاں ہوتا ہے۔“ پھر بڑے زعم سے بولی۔

”جب تم میرے ساتھ ہوتے ہو تو صرف میرے بارے میں بات کیا کرو۔“

”اور جب تمہارے ساتھ نہیں ہوتا تب تو اجازت ہے نا۔۔۔۔۔“

”یاد معاشی شروع۔۔۔۔۔“ اس نے مجھے گھورا۔

”جب تم موقع فراہم کرو گی تو میں کیوں چوکوں گا۔“ میں نے چوٹ کی۔

اس نے مجھے گھورا پھر اپنی غلطی کا احساس ہوتے ہی جلدی سے اس نے کہا۔ ”علی! کیا ہمارے پاس کرنے کے لیے اپنی باتیں کم ہیں جو ہم دوسروں کو ڈسٹنس کرتے پھریں۔ قدرت نے ہمیں جو موقع دیا ہے اسے ضائع نہیں کرنا چاہیے۔“

ہم سی وی پیج گئے، مجھے ذرا بھی بھوک نہیں تھی لیکن پتا چوکنہ میری وجہ سے بھوک بیٹھی رہی تھی اس لیے میں نے بھی غار پر کیا تھا کہ اس کی طرح مجھے بھی شید بھوک محسوس ہو رہی ہے۔ ہم نے ریسٹورنٹ سے چند فوڈ آؤٹ لے لیے اور اس کے پیچھاڑے لگی ہوئی بیچوں کی طرف آ گئے۔ یہاں سے سمندر بہت قریب تھا۔ ہم نے ایک بیچ پر نشست جمائی اور پیٹ پوجا میں مصروف ہو گئے۔

وہ چودھویں کے چاند کی رات تھی۔ نصف شب کے وقت پورا چاند ہمارے سر پر تھا۔ شعلہ جاندی چاروں

طرف پھیلی ہوئی تھی۔ سمندر کے کنارے یہ نظارہ کچھ زیادہ ہی دل کش اور رومان پرور محسوس ہو رہا تھا۔ مرطوب سالم ہوائیں چاندنی رات کی تحراکگریزی میں کئی گنا اضافہ کر رہی تھیں۔ اس سنگ اور بیٹھنے میں اس وقت ریش نہیں تھا لہذا ہمیں عمل تنہائی میر تھی۔ ہم پیٹ پوجا کے ساتھ ساتھ بات بات بھی کر رہے تھے۔ میں نے اس سے پوچھا۔

”دینا! تمہارا کب تک اس گھر میں رہنے کا ارادہ ہے؟“

”وہاں اب ایک پل بھی رکنے کو میرا دل نہیں چاہتا۔“ اس نے کہا۔ ”میں چند دن کی بجوری ہے۔“

”کیسی بجوری؟“ میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔

”میں نے اپنا چائنا ڈاؤن والا اپارٹمنٹ سٹل کر لیا۔“

”کافیصلہ کر لیا تھا اور اس سلسلے میں، میں نے اپنی دوست نو بتا بھی دیا ہے۔“ اس نے جواب دیا۔ ”اس نے کہا ہے کہ ہفتہ دس دن میں وہ اپنا کوئی اور بندوبست کر کے اپارٹمنٹ خالی کر دے گی۔“

میں بیٹا کے چائنا ڈاؤن والے اس اپارٹمنٹ پر آیا۔ مرتبہ چائنا تھا اور وہاں اس کے ساتھ کچھ وقت بھی گزارنا تھا۔ میں نے کہا۔

”اس کا مطلب ہے، جب تک وہ اپارٹمنٹ خالی نہیں ہو جاتا تم ادھر ہی ہو گی جہاں اس وقت رہ رہی ہو؟“

”دوسرا آپشن تمہارا گھر ہے۔“ وہ میرے چہرے پر نگاہ جماتے ہوئے بولی۔ ”جب تک تم کراچی میں ہو، میں تمہارے پاس شفٹ ہو جاتی ہوں، اگر تمہیں کوئی اعتراض نہ ہو تو۔۔۔۔۔“

”مجھے کوئی اعتراض نہیں۔“ میں نے کہا۔ ”لیکن،۔۔۔۔۔“

”بھلا تمہارے لیے محفوظ نہیں ہے۔“

”یہ کیا بات ہوئی۔“ وہ انجمن زدہ نظر سے مجھ دیکھتے ہوئے بولی۔ ”جو گھر تمہارے لیے محفوظ ہے، میرے لیے کیوں نہیں؟“

”تمہیں یقین نہیں آئے گا۔“ میں نے صاف گوئی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔ ”لیکن حقیقت یہی ہے کہ وہ میرے لیے بھی قطعی غیر محفوظ ہے۔“

”مجھے واقعی یقین نہیں آیا۔“ وہ حیرت سے آگے بڑھتا ہوا بولی۔ ”تم یقین دلانے کی کوشش کرو۔“

”اس کا سبب ہماری دشمنی ہے۔“ میں نے کہا۔ ”دشمنی جس کی نذر میرا باپ ہوا اور اسی دشمنی نے میری ماں کی زندگی کا چراغ گل کر دیا۔ یہ ایک طویل، دکھ بھری کہانی ہے۔“

”مجھے تھوڑا بہت اندازہ تو ہے لیکن میں اس بارے میں زیادہ نہیں جانتی۔“ وہ ہمدردی بھرے انداز میں بولی۔

”کیا تم مجھے یہ اسٹوری سنانا پسند کرو گے؟“

بیٹا اب میرے استے قریب آگئی تھی کہ یہ معاملات اس کے ساتھ شیئر کرنے میں کوئی حرج نہیں تھا پھر جی ایم سر نے بھی مجھے اس کی سنجیدگی، خلوص اور وفاداری کا یقین دلایا تھا۔ اس کے بعد بیٹا میرے لیے میسر ہو گئی تھی۔

”میں تمہیں اپنی دشمنی کی داستان تفصیل سے سناؤں گا۔“ میں نے کہا۔ ”مگر یہاں بیٹھ کر نہیں۔ کھانا ختم کرو، مگر چلے ہیں پھر اطمینان سے بات ہوگی۔“

”اوکے۔“ یہ ٹھیک ہے۔“ وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولی۔

میں نے پوچھا۔ ”تمہارے رات کو دیر تک گھر سے باہر رہنے پر کسی کو اعتراض تو نہیں ہوگا؟“

”بہرگز نہیں!“ وہ غلطی انداز میں بولی۔ ”میں جس کے لیے کام کرتی تھی وہ ہستی اس دنیائے رخصت ہو چکی ہیں اور میں نے اس تاریک راہ کو ترک کر کے روشنی کا سفر شروع کر دیا ہے۔ اب میں اپنی زندگی کے ہر معاملے کے لیے مکمل طور پر آزاد ہوں۔ میں جہاں بھی رہوں، کسی کو کوئی اعتراض نہیں ہے۔ ویسے اس پٹنگ کا چارج آئی ٹی گنبد نے سنبھال لیا ہے اور میں اسے اپنے فیصلے سے آگاہ کر چکی ہوں۔“

”پھر تو ٹھیک ہے۔“ میں نے اطمینان سے گردن ہلاتے ہوئے کہا۔ ”تم صبح ہی میرے پاس شفٹ ہو جاؤ۔ جو لوگ، وہ دیکھا جائے گا۔“

”تم میری وجہ سے پریشان نہیں ہونا۔“ وہ غصے سے لہجے میں بولی۔ ”مجھے اپنی زندگی کی پروا نہیں۔ موت تو ایک سفاک حقیقت ہے۔ سات پروں میں چھپ کر بیٹھنا، اور، یہ بتانا سنا بنالیتی ہے پھر اس سے کیا ڈرنا۔ اگر تمہارا ساتھ مجھے میرے رہے تو میں اس سفاک حقیقت کی آنکھوں سے آنکھیں ڈال کر اس کا مقابلہ کر سکتی ہوں۔ میں اب اس شہن میں تمہارے ساتھ ہوں۔ آگ اور خون کا یہ کھیل ہم دونوں مل کر کھیلیں گے۔“

ان لمحات میں وہ ایک بدلی ہوئی بیٹا دکھائی دے رہی تھی۔ مجھے اس کے چہرے میں ایک شیریں کی بہادری آئی۔ اس کے تہور دیکھ کر میرے دل کو خاصا اطمینان ملا۔ مجھے یہ سمجھنے میں ذرا بھی دقت محسوس نہیں ہوئی کہ اس کا گھر ساتھ رہنا زیادہ ضروری تھا بجائے اس کے کہ میں اسے دور بھاگتا یا اسے خود سے دور کرنے کی کوشش کرتا۔

دانشوروں نے کیا

☆ ہر آدمی سے خوش اخلاقی سے پیش آؤ لیکن بے تکلفی بہت کم لوگوں کے ساتھ رکھو اور ان بہت کم لوگوں پر اعتماد کرنے سے پہلے انہیں اچھی طرح آزمائو۔

☆ جس نے ایک بار اعتماد جھٹی کی ہو، اس پر کبھی بھروسہ نہ کریں۔

☆ اعتماد کا پودا، آہستہ آہستہ نشوونما پاتا ہے۔

☆ جو شخص اپنے خلوص کی قسمیں کھائے، اس پر اعتماد نہ کریں۔

☆ اپنے آپ پر اعتماد رکھنے والے ہی فتح حاصل کرتے ہیں۔

☆ عورتیں مردوں پر بالکل اختیار نہیں کرتیں لیکن کسی خاص مرد کے معاملے میں اپنے اس اصول کو بھول جاتی ہیں۔

مرسلہ: راحیل نواب..... ملتان

سادگی

ایک سردار ٹی وی خریدنے گیا۔ دکاندار نے ایک ٹی وی دکھایا۔

”سر، یہ لے لیں اس کا ریوٹ گلی کے کونے سے ہی چیل پکڑ لیتا ہے۔“ کچھ دنوں بعد سردار ٹی وی واپس کرنے آ گیا۔

دکاندار نے کہا۔ ”سر، کیا خرابی ہے؟“

سردار نے کہا۔ ”خرابی تو کوئی نہیں ہے بس بندہ بار بار گلی کی کڑ پر جاتے تو اچھا نہیں لگتا۔“

☆☆☆☆☆☆

لاعلاج

ڈاکٹر۔ ”آپ کے شوہر ٹھیک ہو سکتے ہیں اگر آپ ان کا خیال رکھیں، ٹینشن نہ دیں، بڑائی نہ کریں اور ان کی دیکھ بھال کریں۔“

شوہر۔ ”ڈاکٹر نے کیا کہا؟“

بیوی۔ ”لاعلاج ہو تم۔“

☆☆☆☆☆☆

میں ایک حتیٰ فیصلے پر پہنچنے کے بعد ریٹائرمنٹ سے اٹھ گیا۔

☆☆☆

جب ہم گھر پہنچے تو وہاں میرے لیے کافی پریشانی پائی جاتی تھی۔ مجھے دیکھتے ہی جمیدہ نے فوراً گیت کھول دیا۔ ہم گاڑی سے نیچے اترے تو جمیدہ نے فکرمندی سے پوچھا۔
”سرا! آپ کہاں چلے گئے تھے۔ سب خیریت تو ہے؟“

”میں تو خشک شاک ہوں۔“ میں نے جواب دیا۔
”مگر تمہارے حواس کیوں اڑے ہوئے ہیں؟ کیا کوئی پریشانی والی بات ہے؟“

”ہم سب آپ کے لیے فکرمند تھے۔“ وہ ایک گہری سانس خارج کرتے ہوئے بولا۔ ”اور آپ کا خون بھی آف آ رہا تھا۔ مگر ہے، آپ خیریت سے سلامت لوٹ آئے ہیں۔“
”میرے فون کا چارج ختم ہو گیا تھا اس لیے وہ آف ہو گیا۔“ میں نے ایک فوری بہانہ کیا پھر اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے پوچھا۔ ”میرے لیے کون سب پریشان تھے؟“
”میں، بنگالی باپو اور شاہ جی۔“ اس نے بتایا۔

”تمہاری اور بنگالی باپو کی پریشانی تو سمجھ میں آتی ہے۔“ میں نے چونکے ہوئے لہجے میں دریافت کیا۔ ”لیکن شاہ جی کو کیا فکرا تھا جو کوئی میسر ہو؟“

”پتا نہیں سر۔۔۔۔۔“ وہ سادگی سے بولا۔ ”شاہ جی یہاں آئے تھے اور آپ کے بارے میں پوچھ رہے تھے۔ بتا رہے تھے کہ انہوں نے آپ کو کون کون کئے مگر آپ کا فون بند آ رہا تھا۔ وہ آپ سے کوئی ضروری بات کرنا چاہ رہے تھے۔ جب آپ سے فون پر رابطہ نہیں ہو سکا تو وہ یہاں آئے تھے۔ کہہ کر گئے ہیں کہ آپ جیسے ہی آئیں، میں انہیں آپ کی آمد کی اطلاع دوں۔“

”تمہیں اس سے رابطہ کرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔“ میں نے تاکید کے لہجے میں کہا۔ ”تھوڑا فون چارج کرلوں پھر میں خود اس سے بات کر لوں گا۔“

”خشک ہے سر۔۔۔ میں سمجھ گیا۔“ وہ فرماں برداری سے گردن ہلاتے ہوئے بولا۔

”میں نے پوچھا۔“ نادر شاہ کو تم نے اندر تو نہیں بٹھایا تھا؟“
”نہیں سر!“ وہ نفی میں ہرگز جھکتے ہوئے بولا۔ ”میری ان سے گیت پر ہی بات ہوئی تھی۔ ویسے آپ شاہ جی کو کال کر لیجئے گا۔ انہوں نے ایک بڑی عجیب کی تھی۔“

”کیا عجیب بات؟“ میں نے چونکے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

اس نے بتایا۔ ”وہ کہہ رہے تھے کہ آپ کی جان کو خطرہ ہے۔۔۔۔۔!“

میں نے اپنے چہرے کے تاثرات سے یہ ظاہر نہیں ہونے دیا کہ شاہ جی کے ”استفسار“ پر مجھے حیرت ہوئی ہے۔ میں نے بے پروائی سے کہا۔ ”کیسی کوئی بات نہیں ہے جمیدہ۔ نادر شاہ دراصل آئی ٹی کمپنی کو پیش آنے والے واقعے کی وجہ سے گھبرا گیا ہے اس لیے اسے میری فکر رہنے لگی ہے کہ کہیں میرے ساتھ بھی کوئی ناخوشگوار واقعہ پیش نہ آجائے۔ بس اتنی ہی بات ہے۔“

”اللہ آپ کی حفاظت کرے سرا!“ وہ دعائیہ انداز میں بولا۔

”میں نے کہا۔“ آئین۔۔۔۔۔!“
”آپ کے لیے کھانا لگو آؤں سر؟“ اس نے پوچھا۔
”نہیں، ہم نے کھانا کھالیا ہے۔“ میں نے جواب دیا۔ ”اب ہم آرام کریں گے اور جب تک میں خود نہ اٹھوں، کوئی مجھے ڈسٹر ب نہ کرے۔“

”خشک ہے سرا! آپ کو فکر کرنے کی ضرورت نہیں۔“ وہ مودبانہ انداز میں بولا۔

”اور کوئی بھی مجھ سے ملنے آئے تو اسے اس وقت تک بیٹھنے کے اندر داخل ہونے کی اجازت نہیں دینا جب تک مجھے اس کی آمد کی اطلاع نہ دے دو۔“
”آپ کے حکم کی تعمیل ہوگی سر۔“

”گڈ۔۔۔۔۔!“ میں نے سر اٹھانے والے انداز میں کہا۔
”تم اپنی میڈم کے تنگ خوار اور سچے وفادار ہو۔ مجھے تم سے ایسی ہی سمجھ داری کی توقع ہے۔ جب میں بیٹھنے پر موجود نہ ہوں تو کسی بھی شخص کو اندر نہیں آنے دینا، چاہے وہ میرا دوست عظیم ہی کیوں نہ ہو۔ یہ بہت ضروری ہے۔“

”میں نے آپ کی ہدایات کو ذہن نشین کر لیا ہے سر۔“ وہ گہری سنجیدگی سے بولا۔ ”آپ کو کبھی شکایت کا موقع نہیں دوں گا۔۔۔۔۔ ان شاء اللہ!“

”شبابش!“ یہ کہتے ہوئے میں نے جمیدہ کو رخصت کر دیا۔

ہم بیڈ روم میں آئے تو بیٹا نے کہا۔ ”یہاں کی صورت حال تو خاصی کمپیر نظر آ رہی ہے اور یہ نادر شاہ کچھ زیادہ ہی ایلیٹیشن میں دکھارہا؟“

”تم بالکل درست انداز میں سوچ رہی ہو۔“ میں نے تائیدی انداز میں گردن ہلاتے ہوئے کہا۔ ”ہم ذرا فزیش ہو جائیں پھر اس پر کھل کر بات کرتے ہیں۔“

وقت

ٹھیک پندرہ منٹ کے بعد۔۔۔۔۔ تازہ دم ہو کر ہم ایک دوسرے کے رو برو بیٹھے ہوئے تھے۔ میں نے نہایت ہی مختصر جگہ جامع انداز میں بیٹا کو اپنی زندگی کی کہانی سنا دی۔ سیکرٹ سوسائٹی کے موضوع کو میں نے دانستہ ہی نہیں کیا تھا۔ میرا فکس پیکیٹر خان سے والد صاحب کی دشمنی اور ماں کی موت تک محدود تھا۔ میں نے پیکیٹر خان کا خط بھی بیٹا کو دکھایا اور نادر شاہ کے رکیکشن سے بھی اسے آگاہ کیا۔ اس سے قبل میں بیٹا کو ماں کے ٹرسٹ والے منصوبے کی تفصیلات بتا چکا تھا۔

اس نے پوری توجہ سے میری بات سنی اور میرے خاموش ہونے پر گہری سنجیدگی سے کہا۔ ”مجھے تو یہ نادر شاہ کافی مشکوک شخص لگ رہا ہے۔ جہاں تک میں سمجھ پائی ہوں، یہ بندہ ہمیں خوفزدہ کر کے یہاں سے بھگاتا چاہتا ہے تاکہ میڈم کی رقم پر آزادانہ پیش کر سکے۔ مجھے شک ہے، یہ خط بھی نادر شاہ ہی کی کارستانی ہے۔“

”میرا اور عظیم کا بھی یہی خیال ہے۔“ میں نے کہا۔
”علی! اس مسئلے کا ایک آسان ساحل ہے۔“ وہ سوچ میں ڈوبے ہوئے لہجے میں بولی۔

”میں نے پوچھا۔“ کون ساحل؟“
”تم میڈم کے بیٹے ہو۔“ اس نے کہا۔ ”تم ان کے اکلوتے وارث ہو۔ تم اگر چاہو تو نادر شاہ سے سارے اختیارات واپس بھی لے سکتے ہو۔“

”یہ جتنا آسان نظر آتا ہے، حقیقت میں اتنا ہے نہیں۔“ میں نے صاف گوئی سے کام لیتے ہوئے کہا۔ ”یہ بات درست ہے کہ میں سلیٹی حیدر علی کا راجہ اکلوتا بیٹا ہوں مگر قانوناً اس بات کو ثابت کرنا تقریباً ناممکن ہے اور میں اس تکبیزے میں بھی نہیں پڑنا چاہتا۔ اگر ایسا کرنا ممکن بھی ہے تو اس مقصد کو حاصل کرنے کے لیے خاصے پاز بیٹا پڑیں گے اور میرے پاس اتنا وقت نہیں ہے۔ پھر سب سے بڑی بات یہ کہ مجھے اس دولت و جائیداد سے کوئی دلچسپی بھی نہیں ہے۔“

”تم عجیب بات کر رہے ہو۔“ وہ حیرت سے میری طرف دیکھتے ہوئے بولی۔ ”یہ کسی اور کی نہیں، تمہاری اپنی دولت ہے۔ اس پر صرف اور صرف تمہارا حق ہے۔“

”میں جانتا ہوں۔“ میں نے اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے کہا۔ ”اور اگر میں اپنی آئی پر آ جاؤں تو میں یہ سب کچھ حاصل بھی کر سکتا ہوں لیکن مجھے ماں سے کیے ہوئے وعدے کا پاس کرنا ہے۔ ماں کا خواب ضرور پورا ہوگا۔“

آواز

چیزیں چھوٹی ہی نہیں بہت بڑی بھی ہو رہی ہیں مثلاً یہ اہلیک سسٹم ملاحظہ فرمائیں۔ آئی پوڈ کے لیے بنایا گیا ڈوک سسٹم پرانے وقتوں کے عظیم الجثہ بیٹاؤں اور گراموفون سے بھی بڑا ہے۔ اس کی لمبائی چار فٹ ہے۔ اس میں 28 اہلیکزر لگے ہیں۔ کسی بھی آئی پوڈ وغیرہ کو اس سے منسلک کر دیں، پھر اس کی ”بیس خراش“ دیکھیں۔ وہ بھی اس صورت میں جب اس کی آواز بہت بڑھا دی جائے، یہ کانوں کے پردے بھاڑ سکتی ہے۔ 125 واٹس کی طاقت سے 95 ڈیسی بل کی آواز خارج ہوتی ہے جو اگر کانوں سے مسلسل نکلے تو رت ساعت سے مستقل محرومی کا خطرہ ہوتا ہے۔ اتنی شدید آواز ایک بڑے طیارے کے ٹیک آف پر آتی ہے۔ اس کا وزن قد کاٹھ کی مناسبت سے ہے، یعنی 102 کلو گرام۔ لیکن اس کی خوبی یہ ہے کہ آپ آواز کو بہت کم بھی کر سکتے ہیں یعنی یہ بیک وقت بہت شدید، تیز اور نہایت لمبی آواز دے سکتی ہے۔

الموسینین کی کمپنی ”اسٹوڈیو پر“ نے اسے بنایا ہے۔ آج کے دور میں مشینیں ہاتھوں سے نہیں بنائی جاتیں لیکن اسے ہاتھوں سے بنایا گیا ہے، یہ اس کی اضافی خوبی ہے۔ آپ اس سے ڈی پیلیپر پائی وی بھی منسلک کر سکتے ہیں۔ اسے ”وال آف ساؤنڈ“ کا نام درست طور پر دیا گیا کیونکہ یہ دیوار کی طرح وسیع و عریض نظر آتی ہے۔

فون نمبر

- 1۔ فجر 2 فرض، ظہر 4 فرض، عصر 4 فرض، مغرب 3 فرض، عشاء 4 فرض، 3 وتر واجب۔
- 2۔ فون آنسوؤں کا ڈالنا نہ بھولیں۔
- 3۔ سنت اور نوافل کے ذریعے رابطے کو مزید بڑھایا جاسکتا ہے۔
- 4۔ ارجنٹ کال آنسوؤں سے بھر پور چہرے سے تہجد۔
- 5۔ فری کال۔ درود شریف ابراہیمی کثرت سے۔

مرسلہ: ملک محمد انور، جی ٹی روڈ، واہ کینٹ۔

”یہ میرا امریکا والا نمبر ہے۔“ میں نے بتایا۔
 ”میرے رہائش گاہ کے لیے میں یہ نمبر کارڈ
 اپنے سیل فون سے نکال کر رکھوں۔“
 ”تمہارے گرو نے ایسا کیوں کہا؟“ اس نے الجھن زدہ
 انداز میں پوچھا۔ ”کیا اس کے پیچھے بھی کوئی راز چھپا ہوا ہے؟“
 ”جی ایم سر کی ہر بات کے پیچھے کوئی نہ کوئی راز
 پوشیدہ ہوتا ہے۔“ میں نے کہا۔
 ”سم کارڈ کو سیل فون سے نکال کر رکھ دینے میں کون
 سی حکمت پوشیدہ ہے؟“ اس کی الجھن میں اضافہ ہو گیا۔
 ”میرا یہ نمبر ڈیلفینیا کے پاس محفوظ ہے۔“ میں نے
 اسے بتایا۔ ”سر کا خیال ہے کہ وہ اس نمبر کے ذریعے میری
 لوکیشن ٹریس کر سکتی ہے۔“
 ”تمہاری باتوں سے تو یہی ظاہر ہوتا ہے کہ ڈیلفینیا
 اس وقت کراچی میں موجود ہے۔“ اس نے سوالیہ نظر سے
 مجھے دیکھا۔
 ”وہ پچھلے چند روز سے راولپنڈی اور اسلام آباد میں
 تھی۔“ میں نے اسے بتایا۔ ”آج رات کسی وقت وہ کراچی
 پہنچ جائے گی اسی لیے سر نے مجھے یہ احتیاطی تدبیر اختیار
 کرنے کو کہا ہے۔“
 ”مکمل ملاقات میں تم نے مجھے بتایا تھا کہ وہ تمہاری
 دوست ہے اور جدہ سے تمہارے پیچھے یہاں آ رہی ہے۔“
 وہ بولتی ہوئی نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے بولی۔ ”بعد میں جدہ
 والی کہانی ٹیک لگی۔ تم امریکا سے آئے ہو تو یہ ڈیلفینیا بھی
 امریکا سے تمہارے پیچھے لگ کر یہاں تک پہنچی ہے۔ کیا
 واقعی یہ تمہاری دوست ہے؟“
 ”یہ ایسی دوست ہے کہ جس کے اندر ایک خطرناک
 دشمن چھپا ہوا ہے۔“ میں نے سیل فون اٹھاتے ہوئے کہا۔
 ”اور یہ ایک ایسی دشمن ہے کہ جس کے اندر ایک مہربان
 دوست پوشیدہ ہے۔“
 میں نے پتا سے گفتگو کے دوران میں عظیم کو ٹیکسٹ
 کر دیا۔ ”جب کل جمعے کی نماز کے بعد میرے پاس آؤ تو
 میرے لیے اپنے فریول ایجنٹ سے بارہ جولائی کی صبح کی
 کسی قلائع کا کراچی ٹو جدہ کا ایک ڈی ٹکٹ بنوالا نا۔ یہ سب
 نادر شاہ کو اٹھانے کے لیے ہے۔“ اس کے بعد میں نے
 ٹیکسٹ میں اپنی پرسنل ڈیٹیل بھی ڈال دی۔
 ”تمہارا اس سے دور مجھے بتاؤ اور جیسے کا مطلب یہ ہوا
 کہ تم اس کی وجہ سے کوئی سنگین خطرہ محسوس کر رہے ہو۔“ پتا
 نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”کیا میرا اندازہ غلط ہے؟“

”نہیں۔ تم نے صد فیصد درست اندازہ قائم کیا
 ہے۔“ میں نے تائیدی انداز میں کہا۔ ”جب تک میں اس
 کی دوستی قبول نہیں کر لیتا، وہ میرے لیے بدترین دشمن ہے
 اور اگر میں اس کا، دوستی کے لیے اپنی جانب بڑھا ہوا ہاتھ
 تھام لیتا ہوں تو پھر وہ اس دنیا کی ساری نعمتیں، تمام سہولتیں،
 سب آسائشیں میرے قدموں میں ڈھیر کر دے گی۔“
 ”اوہ..... کیا وہ بہت پیسے والی ہے؟“
 ”وہ نہایت ہی بااختیار اور با اقتدار ہے۔“ میں نے
 جواب دیا۔ ”جیسا اس کی نظر میں کوئی حیثیت نہیں رکھتا۔“
 اسی لمحے میرے سیل فون کی تصحیف فون بجی۔ میں نے
 دیکھا، عظیم نے رپلائی کیا تھا۔ ”برو! کیا تم ابھی تک جاگ
 رہے ہو؟“
 ”نہیں۔ میں تو سو گیا تھا۔“ میں نے جی پی مصلحت
 اور دروغ گوئی سے کام لیتے ہوئے کہا۔ ”ابھی آکھ کلی تو
 تمہارا ٹیکسٹ نظر آیا۔ سو جا رہا تھا کہ پتا ہوں۔“
 ”کیا ڈیلفینیا سے جینکس مل رہی ہے؟“ پتا نے پوچھا۔
 ”نہیں۔ یہ عظیم ہے۔“ میں نے بتایا۔
 ”کیا تم سے دو منٹ کے لیے بات ہو سکتی ہے؟“
 عظیم کا ٹیکسٹ موصول ہوا۔
 ”میں نے رپلائی کیا۔“ ”شیدر۔“
 اگلے ہی لمحے اس کی کال آگئی۔ میں نے کال ریسیو
 کی تو اس نے کہا۔ ”برو! میں چند اپ ڈیٹس تم سے شیئر کرنا
 چاہتا ہوں۔“
 ”ضرور..... میں سن رہا ہوں۔“ میں ہر تن گوش
 ہو گیا۔
 ”نادر شاہ محمد علی سوسائٹی کے جس بنگلے میں گیا تھا وہ
 کسی کے ڈی خان کی ملکیت ہے۔“ عظیم نے مجھے بتایا۔
 ”کے ڈی خان نے اپنا بنگلا جینید خان نامی ایک شخص کو کرائے
 پر دے رکھا ہے۔ جینید خان کا تعلق شو بڑے سے ہے۔ اس نے
 مذکورہ بنگلے میں پرائیویٹ پروڈکشن ہاؤس کھول رکھا ہے۔“
 ”سب تو ٹھیک ہے۔“ میں نے کہا۔ ”لیکن نادر
 شاہ کا کسی ٹی وی پروڈیوسر سے کیا تعلق بنتا ہے؟“
 ”برو! میں نے تمہیں اس وقت اپنی بات سنانے کی
 زحمت ایسے ہی نہیں دی۔“ وہ پرچوش انداز میں بولا۔ ”میں
 نے نادر شاہ اور جینید خان کے بیچ ٹکشن کا پتا بھی چلا لیا ہے۔
 میرا ایک دوست اسی گلی میں رہتا ہے جہاں جینید خان کا
 پروڈکشن ہاؤس ہے۔ میرے دوست کی جینید خان سے اچھی
 علیک دلی ہے۔ وہ اکثر جینید خان سے ملنے اور ڈراموں کی

ریکارڈنگ دیکھنے اس بنگلے پر جاتا رہتا ہے۔ میرے اس
 دوست کا نام ساجد محمود ہے۔ نادر شاہ جب بنگلے کے اندر گیا
 تو میں ساجد کی طرف چلا گیا تھا۔ وہ اپنے چند دوستوں کے
 ساتھ بنگلے کے سامنے کرسیاں ڈالے بیٹھا تھا۔ میں بھی وہیں
 بیٹھ کر ساجد سے گپ شپ کرنے لگا۔ تھوڑی دیر میں اس
 کے دوست رخصت ہو گئے۔ میں ساجد کے گھر کے باہر بیٹھا
 ادھر ادھر کی باتیں کر رہا تھا کہ نادر شاہ جینید خان والے بنگلے
 سے برآمد ہوا۔ مذکورہ دونوں بنگلے زیادہ دوری پر نہیں ہیں۔
 میں نے دیکھا، نادر شاہ کے ساتھ ایک بھاری بھر کم شخص بھی
 تھا۔ میں ایسے زاویے پر بیٹھا تھا کہ نادر شاہ مجھے دیکھ نہیں سکتا
 تھا تاہم وہ میری نگاہ میں تھا۔ ساجد نے خود کلائی والے
 انداز میں کہا۔
 ”لگتا ہے، خان صاحب نے مرغا گھر لیا ہے۔“
 ”کون خان صاحب..... کیا مرغا؟“ میں نے
 الجھن زدہ لہجے میں ساجد سے پوچھا۔
 اس دوران میں نادر شاہ اپنی گاڑی میں بیٹھ کر وہاں
 سے روانہ ہو گیا تھا۔ ساجد نے میرے استفسار کے جواب
 میں بتایا۔ ”یہ جو پروڈکشن ہاؤس والے جینید خان ہیں نا، یہ
 کافی دنوں سے ایک اسٹیٹ ایجنٹ کو گھیرنے کی کوشش
 کر رہے تھے۔ وہ پرائیویٹ پروڈکشن میں اسٹیٹ ایجنٹ
 سے سرمایہ کاری کروانا چاہتے تھے۔ مجھے یقین ہے کہ خان
 صاحب اپنے مقصد میں کامیاب ہو گئے ہیں ورنہ وہ کسی کوئی
 آف کرنے بنگلے سے باہر تک نہیں آتے۔“
 میں نادر شاہ اور ایک بھاری بھر کم شخص کو بنگلے سے
 نکلنے ہوئے دیکھ چکا تھا لیکن میں نے ساجد پر اپنی دلچسپی کو
 ظاہر نہیں ہونے دیا اور عام سے لہجے میں کہا۔
 ”ہاں یار! پیسے میں بڑی طاقت ہے۔ ہر کوئی اسی
 کے پیچھے بھاگ رہا ہے۔“
 ”عظیم! تمہیں اندازہ نہیں، یہ جینید خان کتنا شاطر اور
 گھاگ شخص ہے۔“ ساجد نے معنی خیز انداز میں کہا۔
 ”میری ایک بات نوٹ کر لو۔ یہ اسٹیٹ ایجنٹ کو فٹ پاتھ پر
 لے آئے گا۔“
 ”میری بلا سے یار۔“ میں نے بیزاری سے کہا۔ ”وہ
 اسٹیٹ ایجنٹ کو کسی شیش محل میں بٹھائے یا فٹ پاتھ پر
 بھیج دے، مجھے ان دونوں سے کیا لگتا رہتا۔“
 ”تھوڑی دیر کے بعد میں ساجد کو ”خدا حافظ“ کہہ
 کر وہاں سے لوٹ آیا۔ سچی میں نے تمہیں ٹیکسٹ کیا تھا۔“
 عظیم نے تمام تفصیلات بیان کر چکا تو میں نے کہا۔
 ”یار! تم نے بڑی سستی خیر معلومات فراہم کی ہیں۔ یہ بد ذات
 نادر شاہ ہمارے سامنے کل طور پر ایکسپوز ہو گیا ہے۔ اب
 اس بات میں کسی شک و شبہ کی گنجائش باقی نہیں رہی کہ چیکر
 خان والا وہ نفرت انگیز اور دھمکی آمیز خط نادر شاہ ہی نے
 مجھے ڈیلور کروایا تھا تا کہ میں خوفزدہ ہو کر فی الفور یہاں سے
 روانہ ہو جاؤں اور وہ میری ماں کی دولت پر عیش کر سکے لیکن.....
 میں نے لگائی تو قوت کر کے دانت پیسے اور سناتے
 ہوئے لہجے میں کہا۔
 ”میں اس کینے کو یہ گھناؤنا کھیل نہیں کھیلے دوں گا۔
 ماں کا پیسا اس طرح برباد ہو، یہ میں کسی قیمت پر برداشت
 نہیں کروں گا۔“
 ”فکر نہیں کرو برو! وہ تلی آمیز لہجے میں بولا۔ ”میں
 نے نادر شاہ سے خشن کے لیے ایک زبردست منصوبہ بنالیا
 ہے۔ وہ خبیث آئی سلی کی ایک پیسا بھی ادھر ادھر نہیں
 کر سکے گا تم سب کچھ پر چھوڑ دو۔“
 ”نادر شاہ افکار کے فوراً بعد میرے پاس آئے گا۔“
 میں نے اسے بتایا۔ ”تم سوا آٹھ بجے تک پہنچ جانا اور وہ
 ٹکٹ بھی بخوار کر اپنے ساتھ لانا جس کا ذکر میں نے ٹیکسٹ
 میں کیا تھا۔ میں چاہتا ہوں، تم ایسے وقت میں میرے
 پاس پہنچو جب نادر شاہ پہلے سے موجود ہو اور اسے یہی محسوس
 ہو کہ تم میرا ٹکٹ ڈیلور کرنے آئے ہو۔“
 ”ٹھیک ہے، میں ٹھیک ساڑھے آٹھ بجے شام
 تمہارے بنگلے پر ہوں گا۔“ اس نے حتیٰ لہجے میں کہا۔ ”اور
 یہ ڈی ٹکٹ کوئی مسئلہ نہیں ہے لیکن شام سے پہلے دن میں بھی
 تو ہماری ملاقات ہونا ہے نا۔ تم نے اپنی والدہ کا پاسپورٹ
 اٹھانے جانا ہے۔“
 ”پاسپورٹ میں کلکٹ کر لوں گا۔“ میں نے کہا۔
 ”تم اطمینان سے شام میں آ جاؤ۔“
 ”ٹھیک ہے برو۔“ اس نے کہا۔ ”جیسی تمہاری مرضی۔“
 ”لیکن تم مجھے بتاؤ گے کہ نادر شاہ کے حوالے سے تم
 نے کیا منصوبہ بنا رکھا ہے۔“ میں نے کہا۔
 ”پلان ازوری سیمبل۔“ وہ سرسری انداز میں بولا۔
 ”جب کل شام میں نادر شاہ تمہارے گھر سے رخصت ہوگا تو
 راستے میں کسی جگہ سے چند نامعلوم افراد اسے اٹھالے
 جائیں گے۔ یہ مقام جہاں سے نادر شاہ کو اٹھایا جائے گا، وہ
 تمہارے بنگلے سے کافی فاصلے پر ہوگا۔ شاہ جی کو نہایت ہی
 رازداری کے ساتھ ایک خفیہ اڈے پر پہنچا دیا جائے گا
 جہاں پر میرے آدمی اس کی اچھی خاصی ”خاطر داری“

میں بولی۔
 ”علی! تم تو خاصی تشویشناک پوزیشن سے گزر رہے ہو لیکن تمہارے چہرے سے کوئی پریشانی نہیں دکھاتی۔“
 ”کیا رونی صورت بنا کر ہم اپنے حالات کی سختیوں کو ختم کر سکتے ہیں؟“ میں نے کہا۔ ”یا اس طرح ہمارے مصائب کم ہو سکتے ہیں؟“
 ”تم ایک بہادر اور حوصلہ مند انسان ہو۔“ وہ سوچ میں ڈوبے ہوئے لہجے میں بولی۔ ”میں تمہارے لیے کچھ کرتی ہوں۔۔۔۔۔۔“
 ”کیا۔۔۔۔۔۔!“ میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا اور پوچھا۔ ”بڑا اہم میرے لیے کیا کرنا چاہتی ہو؟“
 ”میں تمہارے لیے ایک محفوظ پناہ گاہ کا بندوبست کروں گی۔“ وہ پُر عزم لہجے میں بولی۔ ”بس، مجھے ایک دن دو۔ تھوڑا ہوم درک کرنا ہوگا۔“
 ”کیا واقعی یہ کام تمہارے بس کا ہے؟“ میں نے متذبذب انداز میں پوچھا۔
 ”کیوں نہیں۔“ وہ عجیب سے لہجے میں مستغفر بولی۔ ”کیا تم مجھے اتنا ہی بے بس سمجھتے ہو؟“
 ”میرا یہ مطلب نہیں تھا۔۔۔۔۔۔“ میں نے جلدی سے کہا۔
 ”میں تمہاری حفاظت کے لیے ایک ایسی پناہ گاہ کا انتظام کروں گی جو ڈیلفینیا کے خواب و خیال میں بھی نہیں ہوگی۔“ وہ اپنی ہی دھن میں بولتی چلی گئی۔ ”اس کمپنی کی سوچ کا پرندہ بھی وہاں پر نہیں مار سکے گا۔۔۔۔۔۔“
 میری سلامتی کے لیے وہ ڈیلفینیا جیسی بارسوخ اور خطرناک عورت کے سامنے ڈٹ کر کھڑی ہو گئی تھی۔ جی ایم سر کی بات پر مجھے رتی برابر بھی شک نہیں تھا کہ بیٹا میری خاطر اپنی جان بھی دے سکتی تھی۔ اس کے تئیر سے ایسے ہی عزائم کا اظہار ہوتا تھا۔

ان لحاظ میں اس جاں نثار حسینہ پر مجھے بہت پیار آیا۔ میں نے تجویزیت بھرے انداز میں کہا۔
 ”اتنی دور بیٹھ کر تم کیا خاک میری حفاظت کر پاؤ گی!“
 اس کا چہرہ گنار ہو گیا۔ وہ ہونٹ سمجھ کر انداز دل ربانی سے مسکرائی پھر چہم سے میرے پہلو میں آ گئی۔
 ☆☆☆☆
 گیارہ جولائی کی دوپہر کو میں نے بیٹا کے ساتھ جاکر امریکن ایکسپریس سے ماں کا کینسل ویزا والا پاسپورٹ کلیکٹ کر لیا۔ بیٹا اب میرے پاس ہی شفٹ ہو گئی تھی۔ میں نے اپنا بیڑوم استعمال کے لیے اسے دے دیا اور خود ماں والے بیڑوم میں غفلت ہو گیا تھا۔ ماں والا بیڑوم، ماسٹر بیڑوم تھا اور وہاں سی سی وی کیسروں کی کارکردگی کو دیکھ کر نے کے لیے مکمل انتظام موجود تھا۔ ماں حسب ضرورت اپنے کمرے میں بیٹھ کر بیٹے کے سامنے والے اور غائبی جیسے کو مانیٹرنگ کرتی رہتی تھیں۔ میں بچنے والے تین دن سے ایسی صورت حال سے گزر رہا تھا کہ اس حفاظتی انتظام کی طرف میرا دھیان نہیں گیا تھا لیکن درحقیقت یہ بہت مفید نظام تھا اور اس کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جاسکتا تھا۔
 دن میں عظیم نے فون کر کے مجھے بتا دیا تھا کہ اس نے ”نامعلوم افراد“ کے ساتھ ڈیل کر لی تھی۔
 خجک اٹھ بیچے شام نادر شاہ میرے پاس پہنچ گیا۔ میں ڈرائنگ روم میں اسی کے انتظار میں بیٹھا تھا۔ بیٹا بھی میرے ساتھ وہاں موجود تھی۔ نادر شاہ نے وقت کی پابندی کا بہت خیال رکھا تھا۔ رسی علیک سلیک کے بعد اس نے کہا۔
 ”میں انتظار کر کے سیدھا تمہاری طرف آ گیا ہوں۔“
 بیٹا نے تم نے بہت اچھا کیا جو فوراً اوپس جانے کا فیصلہ کر لیا۔“
 ”آپ میرے بڑے ہیں اکل۔“ میں نے برخوردارانہ انداز میں کہا۔ ”میں آپ کے مشورے کو بھلا کیسے نظر انداز کر سکتا تھا اور پھر سارے حالات میں بھی میرے سامنے ہیں۔ ماں کو جس طرح ٹارگٹ کر کے موت کے گھاٹ اتار دیا، میں اس وحشت ناک منظر کو کبھی فراموش نہیں کر سکتا۔ آپ سچ کہتے ہیں، میرے لیے یہاں خطرہ ہی خطرہ ہے۔“
 ”اللہ تمہیں اپنی حفظ و امان میں رکھے بیٹا۔“ وہ معنی خیز نظر سے بیٹا کی طرف دیکھتے ہوئے مجھ سے بولا۔ ”کیا تمہارا کمٹ بن گیا ہے؟“

بیٹا کی طرف وہ پہلے بھی دو تین مرتبہ سوالیہ انداز میں دیکھ چکا تھا۔ میں نے بیٹا کے حوالے سے اس کے دماغ کے کیڑے جھانسنے سے قبل اس کے پیٹ کے مروڑ کا علاج ضروری جانا اور فرماں برداری سے کہا۔
 ”جی اکل! میرا اکل کا کمٹ بن گیا ہے۔ ابھی تھوڑی دیر میں عظیم وہ کمٹ لے کر بیٹیں آ رہا ہے۔ جب تک آپ اگر یہاں موجود رہے تو اپنی آنکھوں سے دیکھ لیجئے گا۔“
 ”ہاں۔۔۔۔۔۔ میں کچھ دیر ابھی ہوں یہاں۔“ وہ ایک بار پھر کن انکھیں سے بیٹا کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ ”پھر میں ایک ضروری کام سے نکلوں گا۔“
 میں نے دل میں کہا۔ ”چاچو جان! آپ کے

درمیان ڈیلفینیا زیر بحث تھی اور میں بیٹا کو اس کی طاقت اور اختصار کے بارے میں بتا رہا تھا۔ بیٹا بڑی حاضردماغ تھی۔ ادھر عظیم سے میری گفتگو اختتام پذیر ہوئی، ادھر اس نے ڈیلفینیا کے تذکرے کو جاری کر دیا تھا۔ میں نے کہا۔
 ”یہ فارمولا طالب، مطلوبہ پر استعمال کرتا ہے۔“
 ”کیا مطلب ہے تمہارا؟“ اس نے پوچھا۔
 ”اس وقت نادر شاہ ہمارا مطلوبہ ہے اور ہم اس کے طالب۔“ میں نے وضاحت کرتے ہوئے کہا۔ ”اس لیے ہم یہ فارمولا اس پر استعمال کر رہے ہیں جبکہ ڈیلفینیا کے معاملے میں صورت حال اس کے برعکس ہے۔ اس کیس میں وہ طالب اور میں مطلوب ہوں اور۔۔۔۔۔۔ وہ مجھ پر یہ فارمولا استعمال کرنے والی ہے۔ وہ کسی وقت بھی مجھے منظر سے غائب کر کے اپنے کسی خفیہ اڈے پر پہنچا دے گی اور بڑے خطرناک انداز میں مجھ سے سوال و جواب کا سلسلہ شروع کر دیا جائے گا۔“

میں نے یہ بات بڑی سنجیدگی سے کی تھی اور اس میں کوئی مبالغہ آرائی بھی نہیں تھی۔ ڈیلفینیا اسی نوعیت کے عزائم کے ساتھ میرے تعاقب میں تھی۔ ایک بار وہ مجھے ایک دوست کی حیثیت سے بہتر سمجھنے کے لیے مہمان بنا کر پریسٹن ہال والے فنگلے پر ٹھہرا چکی تھی۔ اب کی بار اس کا انداز دوستانہ نہیں، دشمنانہ تھا۔ اگر اب میں اس کے ہتھے چڑھ جاتا تو وہ یقیناً مجھے کسی عقوبت خانے کی یا تار پر لے جاتی۔
 میری بات کے جواب میں بیٹا کے چہرے پر سرسراہٹیں نمودار ہوئی پھر اس نے تشویش بھرے میں لہجے میں کہا۔
 ”یہ ڈیلفینیا تو بہت ہی خطرناک عورت لگتی ہے۔“
 ”تمہاری سوچ سے بھی کہیں زیادہ۔“ میں نے کہا۔ وہ جن لوگوں کی آواز کا وہ اس دنیا کے طاقتور ترین افراد ہیں۔ یہ الفاظ دیگر اس دنیا کا نظام دہی لوگ چلا رہے ہیں۔“
 ”میں ڈیلفینیا کے سوٹ اپ کے بارے میں تفصیلاً جانتا چاہتی ہوں۔“ وہ گہری دچکپی آتے ہوئے بولی۔ ”کیا ایک دوست کی حیثیت سے تم مجھے یہ سب بتانا پسند کرو گے؟“
 ”ضرور۔۔۔۔۔۔“ میں نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ”ایک دوست ہونے کے ناتے تمہیں میرے تمام آن اینڈ آف کا علم ہونا چاہیے۔“

اس کے بعد میں نے مختصر الفاظ میں بیٹا کو ڈیلفینیا کی ہسٹری، عزائم اور مقاصد کے بارے میں بتا دیا۔ البتہ میں ”اسکل اینڈ بوز“ کے داخلی معاملات کی تفصیل میں نہیں گیا تھا۔ اس نے نہایت انہماک سے میری بات سنی پھر مجھے لہجے میں نے یہ بات بھی یاد دلائی کہ وہ گہری سنجیدگی سے بولا۔
 ”اوکے ٹھیک ہے۔“ میں نے کہا۔
 مزید ایک منٹ کی گفتگو کے بعد ہمارے بیچ سیلوار رابطہ موقوف ہو گیا۔ اس دوران میں بیٹا بڑی توجہ سے مجھے دیکھ رہی تھی۔ میں نے سل فون رکھا تو اس نے پوچھا۔
 ”کس کمپنی کی منصوبہ بندی کی جا رہی ہے؟“
 میں نے اسے عظیم سے ہونے والی گفتگو کا خلاصہ سنا دیا۔ پوری بات سننے کے بعد اس نے کہا۔ ”شاہ جی اسی قابل ہے۔“ اس کے انداز میں نفرت پائی جاتی تھی۔
 ”جو جس قابل ہو اس کے ساتھ ویسا ہی سلوک کیا جائے تو وہ خوش رہتا ہے۔“ میں نے دیکھے لہجے میں کہا۔
 ”یہ فارمولا تم ڈیلفینیا پر استعمال کیوں نہیں کرتے؟“
 اس نے عجیب سے لہجے میں دریافت کیا۔
 عظیم کا فون آنے سے پہلے میرے اور بیٹا کے

سارے ضروری کام تو ناک منہ سے باہر نکلنے والے ہیں
تھوڑی دیر میں۔۔۔ پھر میں نے بیٹا کی جانب اشارہ کرتے
ہوئے نادر شاہ سے کہا۔ ”انگل! آپ ان کو تو جانتے ہی
ہوں گے؟“

”ہاں بیٹا۔“ وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے
بولے۔ ”یہ سلسلی بہن کے ساتھ کام کرتی تھیں۔“
”اب میرے ساتھ ہیں۔“ میں نے انکشاف انگیز
انداز میں بتایا۔

وہ ٹپکٹیں جھپکاتے ہوئے بولا۔ ”میں سمجھا نہیں بیٹا۔۔۔؟“
”جینا سے تیری دوستی ہو چکی ہے اور یہ آج سے ادھر
ہی شفٹ ہو گئی ہیں۔“ میں نے وضاحت کرتے ہوئے کہا۔
”یہ میرے ساتھ جدہ میں پارٹنرشپ بزنس کرنے کا ارادہ
رکھی ہیں۔ میں وہاں پہنچ کر ان کے لیے ویزا کا بندوبست
کروں گا۔ بزنس ویزا کے لیے ان کے تمام ضروری
کاغذات میں اپنے ساتھ لے کر جا رہا ہوں۔ جب تک ان
کا ویزا آئیں ا جاتا، یہ ادھر اسی جگہ پر قیام کریں گی اگر آپ
کو کوئی اعتراض نہ ہو تو۔۔۔۔۔“

بات کے اختتام پر میں نے گہری نظر سے اس کی
آنکھوں میں جھانکا۔ اس کے چہرے پر متذبذب کے آثار
نمودار ہوئے پھر وہ فوراً سنبھل گیا اور بھڑکے ہوئے لہجے
میں بولا۔

”نن۔۔۔۔۔ نہیں۔۔۔۔۔ مجھے کیوں اعتراض ہو گا بیٹا۔
ویسے ویزا آنے میں کتنا عرصہ لگے گا؟“
اس کے ذہن میں کچھ یک رہا تھا۔ میں نے واضح
طور پر محسوس کیا کہ وہ بیٹا کے پینکے پر قیام والی بات سن کر کچھ
پریشان ہو گیا تھا۔ میں نے بہ دستور اس کی آنکھوں میں
دیکھتے ہوئے پوچھا۔

”انگل! آپ یہ کیوں پوچھ رہے ہیں؟ کیا کوئی
الجھن ہے آپ کے ذہن میں؟“
”نہیں بیٹا، ایسی کوئی بات نہیں۔“ وہ پوری طرح سنبھلتے
ہوئے خامسے مضبوط لہجے میں بولا۔ ”مجھے کوئی پریشانی یا الجھن
نہیں ہے۔ میں تو اس وجہ سے پوچھ رہا ہوں کہ میں نے آپ کو
بتایا تھا ناکہ آپ کے جانے کے بعد میں یہ گھر ایک فیملی کو کچھ
عرصے کے لیے کرائے پر دینا چاہتا ہوں۔“

”اچھا تو یہ بات ہے۔“ میں نے بے پروائی سے
کہا۔ ”پھر تو آپ شانت ہو جائیں۔ بیٹا کا ویزا آنے میں
زیادہ تاخیر تھوڑی لگے گا۔ زیادہ سے زیادہ ایک ہفتہ لگے گا۔
آپ بیٹا کے جانے کے بعد یہ بنگلا کرائے پر اٹھا دیجیے گا۔“

”ٹھیک ہے بیٹا! جیسی تمہاری خوشی۔ میں پہنچ کر لوں
گا۔“ وہ سرسری مانند انداز میں بولا تاہم اس کے چہرے
پر الجھن موجود تھی۔

اگرچہ اس نے الفاظ سے اپنے اطمینان کا اظہار کر دیا
تھا لیکن یہ اطمینان اس کے چہرے یا آنکھوں سے نہیں
جھلک رہا تھا۔ اس کا ذہن کہیں اور لٹکا ہوا تھا۔ کہاں؟ میں
اس بات کا اندازہ نہیں لگا سکا تاہم میں نے اپنی بات کی
مضبوطی کے لیے کہا۔

”اور انگل! جب بیٹا کا ویزا آجائے تو آپ ہی نے
اس کے لیے ٹکٹ وغیرہ کا بندوبست کرنا ہے۔ یہ آپ کو ٹکٹ کا
ایڈونٹ دے دیں گی۔ آپ میری بات سمجھ رہے ہیں نا؟“
”جی بیٹا! میں اچھی طرح سمجھ گیا۔“ وہ سرکوا شہابی
جنبش دیتے ہوئے بولا۔ ”آپ نے فکر ہو کر جائیں۔ باقی
سب مجھ پر چھوڑ دیں۔ ہر کام آپ کے حسب مشا ہو گا۔“
اسی وقت جیشدے نے آکر بتایا کہ عظیم آیا ہے۔ میں
نے جشید سے کہا۔ ”عظیم صاحب کو یہاں پہنچا دو۔۔۔ پھر میں
نے نادر شاہ کی طرف گردن گھماتے ہوئے کہا۔
”لیں انگل! میرا ٹکٹ تو آ گیا۔۔۔۔۔!“

وہ نامراد میرے یہاں سے جانے پر اندر سے اتنا
خوش تھا کہ اس طرف ایک لمبے کے لیے بھی اس کا دھیان
نہیں گیا کہ جب میں نے اپنا ٹکٹ عظیم سے بنوایا ہے تو بیٹا
کے ٹکٹ کی ذمہ داری میں اسے کیوں سونپ رہا ہوں۔

عظیم نے ڈرائنگ روم میں پہنچ کر بہ آواز بلند
”السلام علیکم“ کہا پھر میرے سامنے والے صوفے پر بیٹھنے کے
بعد ڈی ٹکٹ والا لفافہ میری جانب بڑھاتے ہوئے کہا۔

”برو اکل میج دس بجے آپ کی فلائٹ ہے۔ آپ
آٹھ بجے تک انر پورٹ پہنچ جانا اور بہت معذرت۔۔۔۔۔ میں
تمہیں سی آف کرنے نہیں آسکوں گا۔“

”نووایشن۔“ میں نے معتدل انداز میں کہا۔ ”بیٹا مجھے
انر پورٹ چھوڑ آئے گی۔ پھر میں نے ٹکٹ والا لفافہ نادر
شاہ کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

”انگل ٹکٹ آ گیا ہے۔ آپ بھی چیک کر لیں۔۔۔۔۔“
میں نے لفافہ کھولے بغیر نادر شاہ کو ہتھوڑا دیا تھا۔ اس
نے لفافے میں سے ٹکٹ نکال کر دیکھا۔ چند لمحوں تک وہ
بے غور ٹکٹ کا جائزہ لیتا رہا پھر ٹکٹ کو لفافے میں رکھ کر لفافہ مجھے
واپس کرتے ہوئے بولا۔

”ٹھیک ہے بیٹا۔ اللہ تمہیں خیر نصیب سے ملے
جائے۔ جدہ پہنچ کر کچھ سے رابطہ ضرور کرنا۔ جب تک تم صبح

وقت

سلامت اپنے گھر نہیں پہنچ جاتے، مجھے تمہاری فکر لگی رہے گی۔“
”ٹھیک ہے انگل! میں اپنے پہنچنے کی آپ کو لازمی
اطلاع دوں گا۔“ میں نے معتدل لہجے میں کہا۔ ”اور اس
کے بعد بھی آپ سے رابطے میں رہوں گا۔“

”جیتے رہو بیٹا۔“ وہ دعائیہ انداز میں بولا پھر کہا۔
”اب آپ مجھے اجازت دیں اور آپس میں گپ شپ کریں۔
مجھے ایک ضروری کام سے نہیں جانا ہے۔“
پھر وہ مجھ سے اور عظیم سے ٹیک پیڈ کر کے رخصت
ہو گیا۔

اس کے جانے کے بعد عظیم نے کہا۔ ”چاچو جی! ہم تو
گپ شپ کریں گے ہی، آپ اپنی خیر منائیں۔ آپ کی جو
حاجات بننے والی ہے، اس کے بارے میں آپ نے بھی
خواب و خیال میں نہیں سوچا ہو گا۔“
”عظیم کی اس بات پر میں اور بیٹا نے اختیار پس پڑے۔
عظیم نے بیٹا سے پوچھا۔ ”آپ نے جرمنی جانے کا
فیصلہ کر لیا ہے نا؟“

”نہیں یار۔“ بیٹا کے بجائے میں نے جواب دیا۔
”ابیں اب امریکا جانا ہے۔ فی الحال تو یہ میرے پاس اسی
پینکے پر شفٹ ہوئی ہیں۔ جب تک میں پاکستان میں ہوں،
یہ ادھر ہی رہیں گی۔“

”اور جب تم امریکا چلے جاؤ گے تو یہ وہاں تمہارے
پاس پہنچ جائیں گی۔“ عظیم نے معنی خیز انداز میں باری
باری ہم دونوں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ”کیا میں غلط
سوچ رہا ہوں؟“

”تمہارا اندازہ کافی حد تک درست ہے۔“ میں نے
اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے کہا۔ ”فی الحال یہ حالیہ مشن
میں ہمارے ساتھ ہیں۔ تازہ ترین صورت حال ان کے علم
میں ہے۔ ہمارے درمیان دوستی کا رشتہ استوار ہو چکا
ہے۔ یوں سمجھ لو کہ ہم تینوں ایک کھینٹی ہیں۔“

”میں نے تو سن رکھا ہے، تو از کھینٹی اینڈ تھری
اززن۔“ عظیم نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ”پھر ہم تینوں ایک
کھینٹی کیسے ہو سکتے ہیں؟“

”آپ نے جو سن رکھا ہے وہ ایک انگریزی محاورہ
ہے۔“ بیٹا نے براہ راست عظیم سے کہا۔ ”بہت سے
انگریزی محاورے ہمارے مشرقی ماحول میں مؤثر ثابت نہیں
ہوتے بلکہ حقیقت کو بیان کرنے کے لیے ان کے معنی اور
مفہوم الٹ جاتا ہے۔“
”بہت خوب!“ عظیم نے بیٹا پر ایک بھرپور نگاہ

دیدہ دلیری

شاہ کرلیف

قانون اور اصول کو جب بالاختیار طبقہ اپنی رعایا سمجھنے لگے تو مظلوم کو کچھ ایسا ہی لنگڑا لولا انصاف ملتا ہے جیسے کہ یہاں... رسم و رواج تو شاید رعایا کو جکڑ رکھنے کا محض بہانہ ہوتے ہیں ورنہ ان پر عمل درآمد کا اطلاق پر ایک پریکسٹاں ہوتا۔

دور دل کو کھیت کرنے والے اصفوں کی بے ایمانی اور بے اصولی کا مجرا



ہونے والی تھی۔ اس بار ایفون کی فصل تلف کرنے کے لیے فضائی اچرے بھی نہیں کیا گیا تھا، اس لیے سمندر خان جانتا تھا کہ اس بار اسے اچھا منافع حاصل ہونے والا ہے۔ مگر اس وقت اس کی سوچ کا محور اس کی بیٹی زرنگ تھی

سمندر خان اس رقت اپنے گھر کے سامنے کھڑا پر خیال نظروں سے وہاں موجود کھیت کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اس کے چہرے پر گہری تشویش اور رنج و غم کے تاثرات موجود تھے۔ سامنے اس کے کھیت میں ایفون کی فصل پک کر تیار

”یار! تم نے تو واقعی شاہ جی کو آلو بنا دیا۔“ پوری بات سننے کے بعد عظیم نے تہقیر لگاتے ہوئے کہا۔ ”یہ کمیتہ شخص اسی سلوک کا مستحق ہے۔“

”ابھی تو میں نے اسے صرف آلو ہی بنایا ہے۔“ میں نے دانت پیستے ہوئے کہا۔ ”آگے آگے دیکھتے جاؤ، ہوتا ہے کیا۔۔۔۔۔!“

ادھر میری بات ختم ہوئی، ادھر عظیم کے سیل فون کی گھنٹی بج اٹھی۔ عظیم نے بتایا۔ ”شاہ کر کا فون ہے۔“

”کون شاہ کر؟“ میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔

”ارے یار! وہی نامعلوم افراد کا ایک ساتھی۔“ عظیم نے جواب دیا۔ ”ابھی تھوڑی دیر پہلے میری اسی سے تو بات ہوئی تھی۔ میں نے شاہ کر ہی کے توسط سے یہ فون کی ہے۔“

”ٹھیک ہے، اس کی کال انیٹر کرو۔ ہو سکتا ہے، وہ تمہیں منزل پر پہنچنے کی اطلاع دینا چاہ رہا ہو۔“ میں نے مربیانہ انداز میں کہا۔ ”لیکن سیل فون کا اسٹیکر آن کر دو تاکہ ہم دونوں بھی شاہ کر کی بات سن سکیں اور تمہیں بعد میں یہ کہانی ہمیں نہ سنانا پڑے۔“

عظیم نے میری ہدایت پر عمل کرتے ہوئے سیل فون کا اسٹیکر آن کیا پھر شاہ کر کی کال ریسیو کر لی۔ اگلے ہی لمحے عظیم بھائی اغضب ہو گیا۔۔۔۔۔

”کیا ہوا شاہ کر؟“ عظیم نے تشویش بھرے لہجے میں دریافت کیا۔

”یونیورسٹی روڈ پر چار پولیس موٹارز نے ہماری ہائی روف کو گھیرے میں لے لیا ہے۔“ شاہ کر نے خوفزدہ انداز میں بتایا۔ ”پولیس والوں کے ارادے بڑے خطرناک نظر آ رہے ہیں۔ میں منظر سے غائب ہو رہا ہوں۔ مجھے فون نہیں کرنا کیونکہ میں اپنا فون آف کر رہا ہوں۔۔۔۔۔“

اسٹیکر خاموش ہو گیا۔ یقیناً شاہ کر نے رابطہ منقطع کر دیا تھا اس لیے اس کی آواز بلند ہوئی تھی۔ اس کے ساتھ ہی ڈرائنگ روم کی فضا میں سناٹا چھا گیا۔

ہم تینوں ہکا بکا ایک دوسرے کی صورت دیکھ رہے تھے۔ ہم میں سے ہر ایک کی آنکھوں میں یہی سوال تھا۔

”یہ کیا ہو گیا؟۔۔۔۔۔“

انگوں حوصلوں اور انہوں کے بیچ رلائی۔ کبھی محبتوں اور چاہتوں کے مدد گیت سنائی اس ناقابل فراموش داستان کے مزید واقعات اگلے ماہ ملاحظہ کریں

اضطراری انداز میں دریافت کیا۔

”شاہ جی کو محمد علی سوسائٹی میں داخل ہونے سے پہلے ہی اٹھایا گیا ہے۔“ اس نے انکشاف انگیز انداز میں اعلان کیا۔

”نامعلوم افراد میں سے دو نے گمن پوائنٹ پر اسے گاڑی میں سے نکال کر اپنی ہائی روف میں شفٹ کیا اور اپنی منزل کی جانب روانہ ہو گئے جبکہ باقی دو نامعلوم افراد بائیک پر سوار مذکورہ ہائی روف کے پیچھے جا رہے ہیں تاکہ کسی ہنگامی صورت حال میں وہ ہائی روف کو گور دے سکیں۔ انہی میں سے ایک نامعلوم فرد نے مجھے فون کر کے یہ تفصیل بتائی ہے۔“

”مطلب یہ کہ انتہائی سیریس مریض کو ایسیوبیس میں ڈال کر اسپتال کی طرف روانہ کر دیا گیا ہے۔“ میں نے جیسے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”اب منزل پر پہنچانے کے بعد اس کا آپریشن کیا جائے گا۔“

”نامعلوم افراد نے شاہ جی کو محمد علی سوسائٹی کے نزدیک سے اٹھایا ہے۔“ عظیم نے پُرسوج انداز میں کہا۔

”اس کا مطلب یہ ہوا کہ وہ یہاں سے رخصت ہونے کے بعد سیدھا جینہ خان کے پاس جا رہا تھا۔“

”مجھے تو لگتا ہے، خان ہاؤس میں اس کم بخت کی نال دہی ہوئی ہے۔“ میں نے بیزاری سے کہا۔ ”جب تک یہ اپنی ذرا ذرا سی بات چینہ خان تک نہ پہنچا دے، اس کا کھانا ہضم نہیں ہوتا۔ مجھے شک نہیں بلکہ یقین ہے کہ یہ جینہ خان کو اطلاع دینے جا رہا تھا کہ میں کل صبح جدہ واپس جا رہا ہوں۔ یہ میرا دوسرا خط کو لے کر بھی سیدھا محمد علی سوسائٹی میں واقع ”خان ہاؤس“ ہی پہنچا تھا۔“

”تم نے اس خط کے ذریعے نادر شاہ کو کیسا بے وقوف بنا دیا تھا علی۔۔۔۔۔!“ چنانچہ رلب مکرراتے ہوئے بولی۔

عظیم نے باری باری ہم دونوں کی طرف دیکھا پھر ابھمن زدہ انداز میں استفسار کیا۔ ”تم کو کس خط کا ذکر کر رہے ہو؟“

میں نے گزشتہ رات جب عظیم کو نادر شاہ کے خاتب پر مامور کیا تھا اور وہ شاہ جی کا چچا کرتے ہوئے خان ہاؤس تک جا پہنچا تھا تو میں نے اسے چنگیز خان کے زہر لے خط کے بارے میں تو بتا دیا تھا لیکن اس خط کا تذکرہ کرنا بھول گیا تھا جو میں نے نادر شاہ کو بھیجا تھا۔

عظیم کے استفسار پر میں نے اسے اس خط کی اسٹوری سادی جو میں نے چنگیز خان والے خط کی تحریر کی کاپی کر کے خود لکھا تھا اور مذکورہ خط کا مفہوم اصل خط کے برعکس ہو گیا تھا۔

جس کی وجہ سے وہ کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہیں رہا تھا جس نے اس کی عزت کا سرعام جنازہ نکال کر اسے ذلیل و رسوا کر ڈالا تھا۔

زرگل اس قبیلے کے سردار شیرخان کے بیٹے بہادر خان کے ساتھ گھر سے بھاگ گئی تھی۔ ان دونوں کے درمیان کب محبت کی چٹکیں بڑھیں اور کب ان کی دیوانگی اس حد تک جا پہنچی کہ وہ اس وادی سے فرار ہونے پر مجبور ہو گئے، سمندر خان آخری وقت تک ناظم رہا۔ اب اس کے پاس اپنی عزت اور غیرت بچانے کا ایک ہی طریقہ تھا کہ زرگل اور بہادر خان کو پکڑ کر وادی میں واپس لایا جائے اور پھر موت کے گھاٹ اتار دیا جائے۔ غیرت کے نام پر قتل اس علاقے کا قانون تھا۔

سمندر خان کے علاقے کا نام چٹان وادی تھا۔ شاید یہ نام یہاں پہلی ہوئیں لا تعداد پہاڑی چٹانوں کی وجہ سے تجویز کیا گیا تھا۔ اگرچہ کھنڈی وچکی کے باعث یہاں روزگار کے دوسرے مواقع بھی پیدا ہو چکے تھے مگر اب بھی یہاں کے مکینوں کا سب سے بڑا روزگار ایوان کی کاشت ہی تھا کیونکہ کسی دوسرے کام میں اتنا منافع ممکن نہ تھا جتنی وجہ تھی کہ پرکشش ترقی ترقی و ترقی کے باوجود یہاں کے باشندے اس پیشے کو ترک کرنے پر تیار نہیں تھے۔ سمندر خان کا شمار بھی ایسے ہی لوگوں میں ہوتا تھا۔ تاہم اس کے پاس بہت ٹھوڑی سی زمین تھی، اس لیے اس کا شمار علاقے کے غریب افراد میں ہوتا تھا۔

سمندر خان اب بچپن برس سے اوپر کا ہو چکا تھا۔ وہ مضبوط جسم اور لمبے قد کا شخص کا مالک تھا۔ اس کی دو بیٹیاں زرگل اور فرشتہ گل تھیں۔ جوانی میں سمندر خان کی بیوی جنت گل خوب صورتی میں اپنی مثال آپ تھی اور اس کی خوب صورتی کا اثر اس کی دونوں بیٹیوں پر بھی آیا تھا، وہ بھی حسن و جمال میں اپنی ماں سے کسی صورت کم نہیں۔ خاص کر چھوٹی بیٹی فرشتہ گل تو گویا کوئی حور معلوم ہوتی تھی۔ جو بھی اسے دیکھتا اس کے چہرے کی مصومیت اور پاکیزگی دیکھ کر مہو بہو رہ جاتا۔ وہ اپنی بڑی بہن زرگل سے تین سال چھوٹی تھی۔

سمندر خان کو بچنے کی بڑی ترغیب تھی مگر وہ بیٹیوں کی پیدائش کے بعد جنت گل کی گود ہری نہ ہو سکی اور سمندر خان کی یہ خواہش نشہ ہی رہ گئی۔

اس وقت وہ ایک مشکل صورت حال سے دوچار تھا۔ اس کی بڑی بیٹی زرگل نے سردار کے بیٹے کے ساتھ گھر سے

فرار ہو کر پورے قبیلے میں اس کا منہ کالا کر دیا تھا اور اب اس کے پاس اپنی عزت بچانے کی ایک ہی صورت تھی کہ زرگل اور اس کے عاشق کو واپس لا کر یہاں کے دستور کے مطابق موت کے گھاٹ اتار دیا جائے۔

چٹان وادی میں برسوں سے یہ دستور رائج تھا کہ جس کی بیٹی اپنے کسی آشنا کے ساتھ گھر سے فرار ہو جائے، وہ اسے اپنے ہاتھوں سے قتل کر دیتا تھا۔ اب سمندر خان کو بھی اس قانون پر عملدرآمد کرنا تھا۔ اسے زرگل اور اس کے آشنا بہادر خان کو اپنے ہاتھوں سے موت کے سپرد کرنا تھا مگر وہ جانتا تھا کہ اس بار یہ اتنا آسان نہ ہوگا کیونکہ بہادر خان اس قبیلے کے سردار شیرخان کا اکلوتا بیٹا تھا۔

اگرچہ وادی کے دستور کے مطابق گھر سے فرار ہونے والے لڑکا اور لڑکی دونوں ہی قصور وار سمجھے جاتے تھے اور دستور کے مطابق دونوں کو موت کی سزا سنائی جاتی تھی مگر سمندر خان کو اس حقیقت کا بھی ادراک تھا کہ زرگل تک تو بات ٹھیک تھی مگر سردار شیرخان اتنی آسانی سے اپنے اکلوتے بیٹے کو موت کے سپرد نہیں ہونے دے گا۔ بہر حال یہ باتیں بعد میں طے ہونا تھیں کہ قبیلے کے لوگ اپنے دستور کو ترجیح دیتے ہیں یا سردار کو۔ فی الحال سب سے اہم مسئلہ یہ تھا کہ ان دونوں کو گرفتار کر کے واپس چٹان وادی لایا جائے اور پھر جرگے کے سامنے پیش کیا جائے جو دونوں کا موقف سننے کے بعد ان کی سزا کا فیصلہ کرتا۔

کیونکہ کسی لڑکے اور لڑکی کے گھر سے فرار ہو کر ایک اجتماعی مسئلہ سمجھا جاتا تھا، اس لیے چٹان وادی کے تقریباً پچاس کے قریب سب لوگوں نے بہادر خان اور زرگل کی تلاش میں روانہ ہو چکے تھے۔ سمندر خان کو امید تھی کہ یہ افراد بہادر خان اور زرگل کو کسی بڑے شہر پہنچنے سے پہلے گرفتار کرنے میں کامیاب ہو جائیں گے ورنہ پھر انہیں واپس لانا تقریباً ناممکن ہو جاتا۔ وہاں بڑی تعداد میں امریکی این جی اوڑ کام کر رہی تھیں اور شہر میں خاصی بڑی تعداد میں امریکی فوج بھی موجود تھی تھی اس لیے وہاں کسی قسم کی زبردستی بھی نہیں کی جاسکتی تھی اور اس طرح سمندر خان ہمیشہ کے لیے کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہ رہتا۔

وہ خود بھی ان دونوں کے تعاقب میں جانا چاہتا تھا مگر تعاقب میں جانے والوں میں سردار شیرخان کے آدمی بھی شامل تھے۔ انہوں نے اسے روک دیا تھا۔ سمندر خان اس کی وجہ بھی جانتا تھا۔ سردار شیرخان کو خطرہ تھا کہ کہیں سمندر خان جوش میں آکر اس کے بیٹے پر گولی نہ چلا دے۔

اس وقت وہ انہی پریشان کن حالات میں الجھا ہوا تھا کہ ایک طرف واقع اس کے تین مردوں پر مشتمل چھوٹے سے گھنے مکان سے اس کی چودہ سالہ بیٹی فرشتہ گل برآمد ہوئی۔ اس کے ہاتھوں میں ایک چھوٹی سی گڑیا تھی جس سے وہ کھیل رہی تھی۔ اسے دیکھ کر سمندر خان کے چہرے پر برہمی کے تاثرات عود آئے۔

”جنت گل! تم کہاں مر گئی ہو؟“ اس نے غصیلے لہجے میں اپنی بیٹی کو آواز دی۔

”کیا ہوا؟“ دوسرے ہی لمحے مکان کے اندر سے اس کی بیوی بھی برآمد ہوئی۔ اس کے لہجے میں گھبراہٹ کا عنصر نمایاں تھا۔

”اسے میری نظروں سے دور لے جاؤ۔“ سمندر خان نے فرشتہ گل کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ”ایسا نہ ہو کہ میرے صبر کا پیمانہ لبریز ہو جائے اور میں اسے گولی مار دوں۔“

”زرگل کے کیے کی سزا اسے کیوں دینا چاہتے ہو۔ اس کا کیا قصور ہے؟“ جنت گل تیز لہجے میں بولی۔

”اس کا بیٹی قصور کیا کم ہے کہ یہ ایک لڑکی ہے۔“ ”زرگل کا قصہ اس پر مت نکالو۔“ جنت گل نے جواب دیتے ہوئے کہا۔ ”جب بہادر خان نے زرگل کا رشتہ مانگا تھا تو تم نے انکار کیوں کر دیا تھا؟ اگر تم اس رشتے کو قبول کر لیتے تو آج ہمیں یہ دن نہ دیکھنا پڑتا۔“

”میں نے انکار نہیں کیا تھا۔“ سمندر خان پھر سے ہوئے لہجے میں بولا۔ ”مگر یہ قبیلے کا دستور ہے کہ رشتہ مانگنے کے لیے خاندان کے کسی بڑے کو آنا پڑتا ہے۔ جب بہادر خان کا باپ ہی راضی نہیں تھا تو پھر میں کیسے آمادگی ظاہر کرویتا؟ یہ تو میرے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ زرگل اور بہادر خان کے درمیان خفیہ معاشرت چل رہا تھا اور میرے انکار کے بعد وہ گھر سے بھاگنے کا منصوبہ بنائے بیٹھے ہیں۔ تمہیں ضرور اس بات کا پتا ہوگا مگر تم نے جان بوجھ کر اپنی بیٹی کے اس جرم پر پردہ ڈالے رکھا۔“

”میں نے کتنی بار قسم کھا کر تمہیں یقین دہانی کرائی ہے کہ میں اس معاملے سے بے خبر تھی۔ زرگل پہاڑ کی پہچلی جانب بکریاں چرانے کے لیے جاتی تھی اور شاید وہیں اس کے اور بہادر خان کے درمیان ملاقات ہوتی تھی جو محبت میں بدل گئی۔“

”جو اس بندہ کو جنت گل۔“ سمندر خان اتنی زور سے دھاڑا کہ فرشتہ گل ہم کمراس سے لپٹ گئی۔

”عورت سے زیادہ مکار و دغا راستی اس روئے زمین پر نہیں ہے۔“ سمندر خان نفرت بھرے لہجے میں بولا۔ ”تم عورتوں کو کھنڈ مردوں کی خدمت گزادی کے لیے پیدا کیا گیا ہے۔ تمہاری حیثیت مردوں کی پاؤں کی جوتی سے زیادہ نہیں ہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ تم عورتوں کی وجہ سے ہی مردوں کی عزت خاک میں ملتی ہے۔ زرگل بھی میری بیٹی ہونے کے ساتھ ساتھ ایک عورت ہی تھی۔ اس نے ایک غیر مرد کے ساتھ گھر سے بھاگ کر میری برسوں کی کمائی ہوئی عزت کھوں میں خاک میں ملا ڈالی۔“

”تمہاری ماں بھی ایک عورت ہی تھی سمندر خان۔“ جنت گل سے شاید اپنی توہین برداشت نہ ہو سکی تھی۔

”میری مرحومہ ماں کو درمیان میں مت لاؤ۔“ سمندر خان گرج دار آواز میں بولا۔ ”وہ بہت عظیم عورت تھی کیونکہ اس نے مجھ جیسا بہادر اور غیرت مند بیٹا پیدا کیا تھا مگر تم کیا ہو؟ تم تو بیٹا پیدا کرنے کی صلاحیت سے ہی محروم ہو۔ اس لیے خود کو محسوس اور بے گناہ ثابت کرنے کی کوشش مت کرو۔“

جنت گل نے اس بار سمندر خان کی باتوں کا کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ جانتی تھی کہ اگر وہ مزید بولی تو سمندر خان آپس سے باہر ہو جائے گا اور ممکن تھا اسے مارا، پھینکا بھی شروع کر دیتا۔ خاموش رہنے میں ہی عافیت تھی، اس کی بوڑھی بڈیوں میں اب سمندر خان کی مار کھانے کی سکت نہیں رہی تھی۔ چٹان وادی میں عورتوں کا اپنے مردوں کے ہاتھوں پٹنا عام سی بات تھی اور اسے محبوب بھی نہیں سمجھا جاتا تھا۔

اسی لمحے گھوڑے کی ٹاپوں کی آواز نے سمندر خان اور جنت گل کی توجہ اپنی جانب مبذول کروالی۔

گھڑسوار خاصی تیز رفتار سے گھوڑا دوڑاتا ہوا سمندر خان کے گھر کی جانب ہی آ رہا تھا۔ قریب آنے پر سمندر خان نے اسے پہچان لیا۔ یہ اسی کے قبیلے کا ایک نوجوان تھا۔

”مبارک ہو سمندر خان! تمہاری اور قبیلے کی عزت بچ گئی ہے۔“ قریب آتے ہی وہ بولا۔ تاہم اس نے گھوڑے سے اتارنے کی زحمت نہیں کی تھی۔ زرگل اور بہادر خان کے تعاقب میں جانے والے انہیں پکڑ کر واپس لانے میں کامیاب ہو گئے ہیں۔

”تم کو بھی مبارک ہو۔“ نوجوان کی بات سن کر سمندر خان نے برسرِ تل لہجے میں کہا۔ ”صرف میری ہی نہیں پورے قبیلے کی عزت بچ گئی ہے۔ وہ دونوں اب کہاں ہیں؟“

”وہ دونوں اب سردار شیر خان کی قید میں ہیں۔ کل ان کی سزا کا تعین کرنے کے لیے جرگہ بیٹھے گا۔ سردار شیر خان کا کہنا ہے کہ جرگے کے افراد جو بھی فیصلہ کریں گے وہ قبول کرے گا، چاہے یہ فیصلہ اس کے بیٹے کے خلاف ہی کیوں نہ ہو۔“ نوجوان نے جواب دیتے ہوئے کہا۔

”جرگے کا کیا وقت مقرر کیا ہے؟“ سمندر خان نے استفسار کیا۔

”کل صبح سورج طلوع ہونے کے کچھ دیر بعد ہی سردار کے ڈیرے میں جرگہ بیٹھ جائے گا۔ مقررہ وقت پر پہنچ جانا۔ اب اجازت چاہتا ہوں۔“ یہ کہتے ہوئے اس نوجوان نے گھوڑا واپسی کے لیے موڑا اور پھر اسے دوڑاتا ہوا سمندر خان کی نگاہوں سے اوجھل ہوتا چلا گیا۔

اس کے جاتے ہی سمندر خان نے مطمئن چہرے کے ساتھ جنت گل کی جانب دیکھا جس کے چہرے پر اب خوف کے ساتھ ساتھ گہرے رنج و غم کے تاثرات بھی نمایاں تھے۔ شاید اس لیے کہ اسے اندازہ ہو چکا تھا کہ اب اس کی بیٹی کو مرنے سے کوئی طاقت نہیں بچا سکتی۔ اس کی عبرتناک موت یقینی ہو چکی تھی۔ زرگل اپنی چھوٹی بہن فرشتہ گل سے بہت مختلف تھی۔ وہ بچپن سے ہی بے چین اور باغیانہ طبیعت کی مالک ہونے کے ساتھ ساتھ خاصی سنہ پخت بھی واقع ہوئی تھی۔ کبھی کبھی تو باپ کے سامنے بھی سیدتان کرکڑی ہو جاتی تھی، اس وجہ سے اکثر اوقات سمندر خان سے مار کھاتی رہتی تھی۔ ایک دفعہ تو سمندر خان نے اسے گولی مارنے کا ہی فیصلہ کر لیا تھا۔ اگر جنت گل اس کے قدموں میں گر کر اس کی منت سماجت نہ کرتی تو شاید وہ اپنے ارادے پر عمل بھی کر گزرتا اور اب وہ چاہ کر بھی اپنی بیٹی کی کوئی مدد کرنے سے قاصر تھی۔

وہ زرگل کی ماں تھی مگر اس کے باوجود اسے آخری وقت تک اندازہ نہ ہوا کہ اس کی بیٹی کسی کی محبت میں گرفتار ہو کر اس کے ساتھ بھاگنے کا منصوبہ بنا چکی ہے۔ ورنہ شاید وہ زرگل کے آگے ہاتھ جوڑ کر اسے روک لیتی مگر اب بہت دیر ہو چکی تھی۔ زرگل اور بہادر خان گرفتار ہو چکے تھے اور کل انہیں سزا دینے کے لیے جرگہ بیٹھ رہا تھا۔ گویا اس کی بیٹی کے پاس بس آج رات ہی کی زندگی تھی۔

جنت گل جب رات کو سونے کے لیے لیٹی تو نیند اس کی آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔ اس کے سامنے دوسری چار پائی پر سمندر خان گہری نیند سو رہا تھا۔ وقتاً فوقتاً اس کے خراٹوں کی آواز بھی کمرے میں گونج رہی تھی۔ فرشتہ گل، جنت گل کے

ساتھ لیٹی سو رہی تھی۔ وہ چودہ سال کی تھی مگر جنت گل کو اندازہ تھا کہ وہ اپنی طور پر وہ اپنی عمر سے ابھی کہیں چھوٹی ہے۔ اس کے معصوم ذہن کو اس حقیقت کا ادراک نہیں تھا کہ اس کی بڑی بہن کس مصیبت سے دوچار ہو چکی ہے۔

یہ رات جنت گل پر بہت بھاری تھی۔ آنسوؤں کا گویا ایک سیلاب تھا جو اس کی آنکھوں سے رواں تھا۔ اس کے لیے یہ صورت حال بڑی کرناک تھی کہ جس بیٹی کو اس نے بڑی محبت سے اپنی بساط کے مطابق پال پوس کر جوان کیا تھا، اسے کل وادی کے قانون کے مطابق اس کا اپنا بیٹا باپ موت کے سپرد کر دے گا۔ جنت گل کو اس وقت شدت کے ساتھ اس بات کا احساس ہو رہا تھا کہ صنف نازک ہونے کے ناتے وہ کس قدر بے بس اور ناتواں مخلوق ہے۔ شاید سمندر خان نے ٹھیک ہی کہا تھا کہ اس وادی میں عورتوں کی اوقات مردوں کی جوتی کے برابر ہے۔ وہ اپنی پوری زندگی میں اس وادی سے باہر نہیں نکلی تھی۔ تاہم اس نے وادی سے باہر شہری طرز زندگی کے بارے میں بھی بہت کچھ نہ رکھا تھا۔ اس نے سنا تھا کہ وہاں عورتوں اور مردوں کو مساوی حقوق حاصل ہیں۔ اگر کوئی مرد کسی عورت پر تشدد کرے تو وہ عورت قانون کا سہارا لے سکتی ہے۔ مرد کا عورت پر تشدد ایک سنگین جرم تصور کیا جاتا ہے مگر اس وادی میں تو عورت پر تشدد بالکل عام بات تھی۔

جب اسے زرگل کے بہادر خان کے ساتھ بھاگنے کی خبر ہوئی تو ایک ماں ہونے کے ناتے اس کی دلی خواہش تھی کہ وہ دونوں تعاقب میں جانے والوں کی پکڑ میں نہ آسکیں اور کہیں دور جا کر اپنی نئی دنیا بسالیں مگر جنت گل کی یہ خواہش پوری نہ ہو سکی تھی۔ قبیلے کے لوگ بہادر خان اور زرگل کو زندہ گرفتار کرنے میں کامیاب ہو چکے تھے۔ بہادر خان سردار کا بیٹا تھا۔ آج تک گھر سے بھاگنے والی کسی لڑکی کو زندہ نہیں چھوڑا گیا تھا۔ جنت گل کی وہ رات سسکیوں اور جھپکوں میں روتے ہی گزر گئی۔ صبح کے وقت اسے ہلکی ہلکی نیند آنے لگی مگر سمندر خان کی آواز نے اسے بڑبڑا کر اٹھنے پر مجبور کر دیا۔

”جنت گل! اٹھ جاؤ آج ہوگی، مجھے جرگے میں جانا ہے۔“

”آ رہی ہوں آہستہ بولو، فرشتہ گل سو رہی ہے۔“

جنت گل نے کہا اور پھر اپنی چار پائی سے اٹھ کھڑی۔

”کیا بات ہے، تمہاری آنکھیں کیوں سوچی ہوئی ہیں؟“ اس نے قبوہ بنا کر سمندر خان کے سامنے رکھا تو اس نے استفسار کیا۔

”سمندر خان! زرگل ہماری اولاد ہے۔ تم اپنے ہی

ہاتھوں اپنی اولاد کو موت کے سپرد کرنے جا رہے ہو۔“ جنت گل رد ہائے لہجے میں بولی۔

”میرے لیے وہ اسی دن مر گئی تھی جس دن اس نے ایک غیر مرد کے ساتھ گھر سے بھاگنے جیسا مذہم فعل سرانجام دیا تھا۔ بطور ایک غیرت مند باپ اس پر عملدرآمد کرنا میرا فرض ہوگا۔“ سمندر خان نے قبوہ کا گھونٹ لیتے ہوئے کرخت لہجے میں کہا۔

”وہ ہماری بیٹی ہے سمندر خان۔ میں تسلیم کرتی ہوں کہ اس نے غلطی کی ہے مگر اس کی یہ غلطی معاف بھی تو کی جاسکتی ہے۔ تم مجھے وہاں لے جاؤ، میں جرگے کے افراد سے اپنی بیٹی کے لیے رخصت کی بجائے نکاحوں کی۔“

”کواس بند کرو۔“ سمندر خان نے فرماتے ہوئے کہا۔ ”تمہاری باتوں سے میں کمزور پڑنے والا نہیں ہوں۔ چٹان وادی کے کیمپوں کے فیصلے بھی چٹانوں کی طرح مضبوط اور اٹل ہوتے ہیں۔ میرے بعد آنے والی نسلیں بھی مجھے ایک غیرت مند باپ کے طور پر یاد رکھیں گی۔ جب کبھی بھی چٹان وادی کی غیر قوم کا ذکر آئے گا۔ سمندر خان کا نام سرفہرست ہوگا۔“

یہ کہتے ہوئے اس نے قبوہ کا آخری گھونٹ لیا اور ایک طرف رخ اپنی کلاشکوف اٹھا کر کھڑا ہو گیا۔ جرگے میں جانے کے لیے اس نے اپنی پگڑی نہیں پہنی تھی کیونکہ یہ یہاں کا قانون تھا کہ جس گھر کی کوئی عورت گھر سے بھاگے اس گھر کا کوئی مرد اس وقت تک اپنی پگڑی نہیں پہن سکتا تھا جب تک وہ گھر سے بھاگنے والی لڑکی کو اپنے ہاتھوں سے موت کی نیند نہ سلا دے۔

جرگے کا وقت ہو رہا تھا اس لیے سمندر خان گھر سے باہر نکل آیا۔ جنت گل بھی پریشان چہرہ لیے اس کے ساتھ ہی باہر نکل آئی۔

”سمندر خان! زرگل تمہاری بیٹی ہے۔“ اسے اپنے پیچھے جنت گل کی بے چین سی آوازیں سنائی دے رہی تھیں مگر وہ بے پروائی سے آگے بڑھتا رہا۔ جب وہ سردار شیر خان کے ڈیرے پر پہنچا تو جرگے کی کارروائی دیکھنے کے لیے خاصی بڑی تعداد میں لوگ آئے ہوئے تھے۔ سامنے ایک بڑی سی کرسی پر سردار شیر خان براجمان تھا۔ اس کے پیچھے اس کے سب آدی بڑے مودبانہ انداز میں کھڑے تھے۔ زرگل کا باپ ہونے کے ناتے سمندر خان بھی اس مقدمے کا ایک اہم فریق تھا اس لیے اسے بھی بیٹھنے کے لیے کرسی پیش کر دی گئی۔ سمندر خان سب کو سلام کرتا ہوا کرسی

پر بیٹھ گیا۔ اسی لمحے ان افراد میں سے ایک شخص کھڑا ہو گیا اور اس نے اونچی آواز میں بولنا شروع کر دیا۔

”جیسا کہ آپ سب حضرات جانتے ہیں کہ آج آپ کو بہادر خان اور زرگل کی سزا کا تعین کرنے کے لیے بلایا گیا ہے۔ آپ جانتے ہیں کہ ہم لوگ اپنی عزت اور غیرت پر کبھی سمجھوتا نہیں کرتے۔ چاہے ہمیں اپنی جان دینی پڑے یا کسی کی جان لینی پڑے۔“

”آج بہادر خان اور زرگل کو بھی یہاں کے قانون کے مطابق سزا دی جائے گی تاکہ ان دونوں کا انجام دوسروں کے لیے باعث عبرت ہو۔ مگر یہ تقاضائے انصاف ہے کہ ہر ماں کو صفائی کا پورا پورا موقع دیا جائے۔ اس لیے میں کارروائی کے آغاز کا باقاعدہ اعلان کرتے ہوئے ملزمان کو حاضر کرنے کا حکم دیتا ہوں۔“ یہ کہتے ہوئے وہ شخص اپنی کرسی پر بیٹھ گیا۔

سردار شیر خان نے اس شخص کا حکم سن کر پیچھے کھڑے ایک آدمی سے کان میں کھسک بھری کہ وہ اٹھاتے ہوئے ایک طرف بڑھ گیا۔ کچھ ہی دیر میں بہادر خان اور زرگل کو سب آدمیوں کے نرٹے میں جرگے کے سامنے پیش کر دیا گیا۔

بہادر خان چھٹ سے بھی نکتے ہوئے قہقارے کا ایک کڑیل اور خور بنو جوان تھا، زرگل اس کے ساتھ کھڑی تھی تاہم اس نے برقع اودھ رکھا تھا۔

بہادر خان کے چہرے پر خوف کے تاثرات نہیں تھے تاہم تذبذب کے تاثرات ضرور موجود تھے۔ اس کے چہرے سے صاف عیاں ہو رہا تھا جیسے وہ کوئی فیصلہ کرنے کے بارے میں کشمکش کی کیفیت سے دوچار ہو کیونکہ وہ قبیلے کے سردار کا بیٹا تھا اس لیے اسے بھی بیٹھنے کے لیے کرسی پیش کر دی گئی تھی جبکہ زرگل کو صنف نازک ہونے کے باوجود کھڑا ہی رہنے دیا گیا۔

سمندر خان خاموشی سے بیٹھا جرگے کی کارروائی کے آغاز کا انتظار کر رہا تھا۔ اس کے چہرے پر زرگل کے لیے نفرت کے تاثرات موجود تھے۔

”بہادر خان.....“ ان افراد میں سے ایک باریش شخص بولا۔ ”تم نے اور زرگل نے گھر سے بھاگ کر نہ صرف قبیلے کی غیرت کو لگا دیا ہے بلکہ یہاں کے قانون کو توڑنے کی بھی جسارت کی ہے۔ کیا تم اپنے جرم کا اعتراف کرتے ہو؟“

”نہیں۔“ بہادر خان کے بولنے سے پہلے ہی سردار شیر خان بول پڑا۔ ”اصل مسئلہ یہ نہیں کہ یہ دونوں گھر

سے بھاگے ہیں بلکہ اصل مسئلہ یہ ہے کہ ان دونوں میں سے یہ فیصلہ کس کا تھا۔ ہو سکتا ہے کہ میرے بیٹے نے زرگل کو گھر سے بھاگنے پر اکسایا ہو۔ ایسی صورت میں زرگل کے ساتھ رعایت برتی جاسکتی ہے اور اسے سزائے موت نہیں دی جاسکتی لیکن اگر یہ ثابت ہو جائے کہ زرگل نے میرے بیٹے کو ہرنایا تھا تو پھر سزا کا اطلاق بھی صرف اسی پر ہوگا۔

”مگر سردار شیر خان! آج سے پہلے بھی قانون رائج رہا ہے کہ فرار ہونے والے لڑکا اور لڑکی دونوں کو برابر کا قصور وار تسلیم کیا جاتا ہے۔۔۔۔۔“ ان معززین میں سے ایک شخص بولا۔

”میں تسلیم کرتا ہوں کہ آج سے پہلے ایسا ہی ہوتا رہا ہے۔“ سردار نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ”مگر وہ سزا اس لیے دی جاتی رہی ہے کہ دونوں ہی قصور وار ٹھہرتے تھے فرار کا فیصلہ ان کا مشترک ہوتا تھا۔

”مگر میرا بیٹا بہادر خان تو فیصلہ کرنے کے قابل ہی نہیں ہے کیونکہ تقریباً ایک ماہ پہلے اس پر ایک بر اسرار بیماری کا حملہ ہوا تھا جس کی وجہ سے اس کے ذہن پر گہرا اثر ہوا ہے۔ اب اس کا ذہنی توازن ٹھیک نہیں رہا۔ یہ بظاہر ہوش مند شخص دکھائی دیتا ہے مگر حقیقت یہ ہے کہ بیماری کے بعد سے یہ نیم پاگل ہو چکا ہے۔ میری آپ سب سے اتنا س ہے کہ فیصلہ کرتے وقت اس کی ذہنی بیماری کو ضرور مد نظر رکھا جائے۔ آپ سب جانتے ہی ہیں کہ میں کسی کے ساتھ زیادتی پر برداشت نہیں کر سکتا۔ چاہے وہ میرا بیٹا ہو یا کوئی اور۔“ اگرچہ شیر خان نے بات کرتے ہوئے اپنا لہجہ نرم ہی رکھا تھا اور الفاظ کا بھی مناسب چناؤ کیا تھا مگر اس کے باوجود جرگے کے کئی افراد نے اس کے الفاظ میں پوشیدہ دھمکی کو واضح طور پر محسوس کر لیا تھا۔ سردار انہیں کیا چلتا ناچا رہا تھا وہ بخوبی سمجھ چکے تھے۔ جرگے کے افراد کو اس حقیقت کا بھی اندازہ تھا کہ سردار سے خاصیت مول لے کر چٹان وادی میں رہنا بہت مشکل تھا۔

انہیں اب بہت سوچ سمجھ کر فیصلہ کرنا تھا۔ شیر خان کے بدلتے ہوئے تہور سب کو دکھائی دے رہے تھے۔ ان سب کو اندازہ ہو رہا تھا کہ وہ اپنے اکلوتے بیٹے کو بچانے کے لیے آخری حد تک جائے گا اور اس کی خاطر وہ کسی خونریز تصادم سے بھی گریز نہیں کرے گا۔

”سردار شیر خان! آپ کے بیٹے کا ذہنی توازن ٹھیک نہیں ہے بات آپ کو ثابت کرنا ہوگی۔ کیا آپ کے بیٹے کے پاگل پن کا کوئی گواہ موجود ہے؟“ جرگے کے ایک فرد نے

مفاہانہ لہجے میں شیر خان کو مخاطب کیا۔

”میں اس سلسلے میں بیسوں گواہ پیش کر سکتا ہوں۔“ شیر خان مضبوط لہجے میں بولا۔ ”وہی تو میری گواہی کافی ہے مگر شاید باپ ہونے کی وجہ سے میری گواہی کو غیر جانبدارانہ سمجھا جائے اس لیے میں اپنے بیٹے کے حق میں چند دوسرے گواہ پیش کرتا ہوں۔“ یہ کہتے ہوئے اس نے ایک طرف کھڑے کچھ افراد کو اشارہ کیا تو وہ افراد آگے بڑھ کر جرگے کے افراد کے سامنے آ گئے۔

یہ سب اسی قبیلے کے مکین تھے۔ ”ہم سب اس بات کے گواہ ہیں کہ سردار شیر خان کا بیٹا بہادر خان بیماری کی وجہ سے اپنا ذہنی توازن کھو چکا ہے۔“ گواہان میں سے ایک بارٹش شخص بولا۔

”کیا باقی افراد بھی یہی گواہی دیتے ہیں؟“ جرگے کے ایک فرد نے پوچھا۔

”ہاں ہم سب بھی اس بات کے گواہ ہیں کہ سردار کے بیٹے کا ذہنی توازن ٹھیک نہیں ہے۔“ باقی افراد نے بھی ایک زبان ہو کر جواب دیا۔ سردار شیر خان نے انہیں رات ہی اچھی طرح ذہنی نشین کر دیا تھا کہ انہیں کیا کہنا ہے۔ اس لیے وہ سب بڑے پُر اعتماد انداز میں کھڑے تھے اور پھر اس گواہی کے بعد شیر خان سے انعام بھی تو ملنا تھا۔ شیر خان نے جرگے کے افراد کی طرف دیکھتے ہوئے چپکے چپکے کہا۔

”کیا ایک نیم پاگل شخص پر بھی اس سزا کا اطلاق ہوگا جو کسی ہوش مند انسان پر ہوگا؟ اگر واقعی تو پھر مجھے آپ سب کی ذہنی صحت پر بھی شبہ ہوگا۔ حقیقت تو یہ ہے کہ اس سارے فساد کی جڑ یہ لڑکی ہے، اسی نے میرے بیٹے کو ہرنایا تھا۔ دیکھیے۔ اس کے باپ کا جھکا ہوا سر۔ افسوس اس لڑکی نے تو اس کی عزت کی بھی کوئی پروا نہیں کی۔“ شیر خان نے باقاعدہ سمندر خان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا جس نے سردار کو اپنی طرف اشارہ کرتے دیکھ کر واقعی میں سر جھکا لیا تھا۔

”اتنے افراد کی گواہی نظر انداز کرنا ناممکن ہے۔“ جرگے کا ایک فرد شیر خان کی حمایت کرتے ہوئے بولا۔ ”اگرچہ یہ ثابت ہو گیا ہے کہ بہادر خان کا ذہنی توازن ٹھیک نہیں ہے پھر بھی میں چاہوں گا کہ بہادر خان ہمیں بتائے کہ اس لڑکی نے اسے گھر سے فرار ہونے کے لیے کس طرح مجبور کیا تھا؟“

اس شخص کا سوال سن کر سب کی نگاہیں بہادر خان کی جانب مبذول ہو گئیں۔ مجھے میں گویا ایک سکوت سا طاری

ہو گیا۔ بہادر خان کا جواب بہت اہمیت کا حامل تھا۔ زرگل بھی اپنی جگہ خاموش کھڑی تھی اگرچہ اس نے نقاب اوڑھ رکھا تھا مگر نقاب کی باریک جالی سے وہ سب کچھ دیکھ سکتی تھی۔ اسے پکڑے جانے کے بعد بہادر خان کے ساتھ نہیں رکھا گیا تھا بلکہ اسے ایک علیحدہ کمرے میں بند کیا گیا تھا۔ اس وادی میں سرکیں اور گاڑیاں نہیں تھیں۔ کچے راستے بنے ہوئے تھے جن پر سڑک کے لیے گھوڑوں اور خچروں کا استعمال ہوتا تھا۔ بہادر خان نے اسے نئی زندگی کی امید دلائی تھی۔ اس سے محبت کے بلند و بانگ دعوے کیے تھے اور وعدہ کیا تھا کہ شہر پہنچتے ہی وہ دونوں نکاح کر لیں گے۔

زرگل اس حقیقت سے بخوبی آگاہ تھی کہ کسی غیر مرد کے ساتھ گھر سے فرار ہونے کا کیا مطلب ہے۔ وہ جس معاشرے میں رہ رہی تھی، وہاں اسے ایک مذموم اور ناقابل معافی فعل سمجھا جاتا تھا۔ یہ ایک ایسا جرم تھا جس کی سزا موت کے سوا کچھ نہیں تھی۔

اگرچہ وہ بچپن سے ہی باغیانہ مزاج رکھتی تھی مگر اس کے باوجود شاید وہ بھاگنے کا فیصلہ نہ کرتی لیکن بہادر خان کی محبت میں مجبور ہو کر وہ ایسا کر بیٹھی تھی۔ بہادر خان نے اسے ایک حسین اور خوشگوار زندگی کا خواب دکھلایا تھا۔ اس نے کہا تھا کہ اگر اس کے باپ نے اس کا رشتہ نہیں اور طے نہ کر رکھا ہوتا تو وہ بھی یہ فیصلہ نہ کرتا۔ اس نے قسم کھا کر زرگل کو تعین دہانی کرائی تھی کہ وہ زندگی بھر ساتھ بھائے گا۔ دھوکا نہیں دے گا۔ جب وہ قسمیں کھا کر اسے اپنی محبت کا یقین دلارہا تھا تو پھر زرگل کیسے پیچھے رہ سکتی تھی۔ بہادر خان پچھلے ایک سال سے اس کے پیچھے پڑا تھا۔ چھپ کر اس سے ملنے کے لیے آتا تھا، اس کی ایک جھلک دیکھنے کے لیے گھنٹوں انتظار کیا کرتا تھا۔ اس کی منتقلی مزاحمتی نے آخر کار زرگل کو بھی ہتھیار ڈالنے پر مجبور کر دیا۔

وہ اس کے ساتھ ایک نئی زندگی کی امید لے کر گھوڑے پر سوار ہوئی تھی۔ بہادر خان کا گھوڑا بہت برق رفتار اور طاقتور تھا۔ دوسو ادوں کے وزن کے باوجود صبح سے لے کر شام تک مسلسل دوڑ سکتا تھا۔ برق رفتاری میں قبیلے کا کوئی دوسرا گھوڑا اس کا مقابلہ نہیں کر سکتا تھا۔ شاید وہ شہر تک پہنچنے میں کامیاب بھی ہو جاتے مگر راستے میں ایک ہتھر پر ٹھوکر لگنے سے گھوڑے کی ٹانگ زخمی ہو گئی جس کی وجہ سے وہ لنگڑا کر چلنے لگا۔ اس کی اس سست روی کے باعث ہی تعاقب میں آنے والے ان تک رسائی حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئے تھے۔ بہادر خان کے پاس اپنی کلاشکوف

گزشتہ

مانتا پڑے گا کہ ہمارا ملک ابھی بہت پسماندہ ہے۔ یوں دیکھ کر وغیرہ تو بڑی چیزیں ہیں۔ نگاہ التفات تک کے لیے لائسنس مطلوب ہوتا ہے اور شادی کے لیے لڑکی کا پابند صوم و صلوٰۃ اور کھڑا اور قبول صورت ہونا شرط ہے اور لڑکے کے لیے ضروری ہے کہ گزریڈا فسر ہو۔ عالی خاندان ہو، پنجابی اور اثنا عشری کو ترجیح دی جائے گی وغیرہ۔۔۔۔۔ یہاں طلب مغرب میں مزے بیٹھے اثر خواب آوری۔ اگلے روز آکسفورڈ اسٹریٹ پر جاتے ہوئے ہم ایک جگہ ٹھکے۔ بڑے بڑے حرفوں میں لکھا تھا۔ ”آئیے آئیے۔ نئے نئے دوست بنائیے۔“ دوستی بڑی اچھی چیز ہے اور شاعر تک فصیح کر گیا ہے۔ تو برائے وصل کردن آدمی۔ پردیس میں تو یوں بھی بے یاری و مددگاری کا ساما ہوتا ہے۔ ہم نے قریب جا کر دیکھا تو کاؤنٹر پر کھڑی دو شیزہ نے ہمیں ایک فارم تھما دیا اور ایک ڈاڑھی والے نو جوان کا کھڑے کھڑے بوسہ لیا۔ ہم نے رشک کیا کہ کاش یہ فارم ان صاحب کو دیا جاتا اور۔۔۔۔۔ شاید جلدی میں گزرا اور دو بدل ہو گئی ہوتی۔ ابن انشا کے سفر نامے ”دنیا گول ہے“ سے اقتباس

- میں اسے بے ایمان کہنا نہیں چاہتا لیکن اگر کسی کے پاس اس سے بہتر لفظ ہو تو میں منہ بانی رقم دے کر لفظ خریدنے کو بھی تیار ہوں۔
- جان آفت آگ۔ وہ جس جگہ آگ بھی جلا نہ سکے۔
- ہاں دوڑ میں ساری محنتیں پارسلٹ ملتی ہوتی ہیں۔
- صلیب وہ ہے جسے میں پسند کرتا ہوں مگر دل کش وہ ہے جو مجھے پسند کرتی ہے
- مجھے بڑھاپا پسند ہے بشرطیکہ اس کا مستقبل روشن ہو۔
- تم ہی سہا ہوا اگرچہ سیکھ نہ سیکھو۔

موجودہ تھی مگر اسے آدمیوں کے ساتھ مقابلہ کرنا دانش مندی نہیں تھی۔ اس لیے اس نے گرفتاری دے دی تھی، بہر حال اب وہ پکڑے جا چکے تھے۔

زرگل بڑے حوصلے کے ساتھ اپنی جگہ کھڑی تھی۔ اسے پکڑے جانے کے بعد سے کھانے پینے کے لیے کچھ نہیں دیا گیا تھا۔ پیاس کی شدت سے اس کا حلق سوکھ رہا تھا مگر وہ پھر بھی یہ سب کچھ حوصلے سے سہہ رہی تھی۔ اس نے بہادر خان کے ساتھ جینے مرنے کی تسلیں کھائی تھیں۔ جینے کے امکانات تو شاید اب معدوم ہو چکے تھے مگر ساتھ میں مرنے کے امکانات روشن تھے اور وہ بہادر خان کے ساتھ مرنے کو بھی تیار تھی۔ عہد کیا تھا اور اب وفائے عہد کا وقت آچکا تھا۔ اسے یقین تھا کہ بہادر خان بھی پیچھے نہیں ہٹے گا۔ وہ شخص نام کا بہادر نہیں تھا اور نہ ہی موت کو سامنے دیکھ کر گھبرانے والوں میں سے تھا۔

یہ زرگل کے خیالات تھے اور خیالات کا تعلق بھی خیالی دنیا سے ہوتا ہے۔ حقیقت کی دنیا بڑی مختلف اور سخت ہوتی ہے۔ بہادر خان نے جرم کے فرد کے سوال کا جو جواب دیا اس نے زرگل کو حقیقت کی دنیا میں آنے پر مجبور کر دیا۔ اسے ایسا محسوس ہوا جیسے کسی نے اسے آسمان سے زمین پر پٹخ دیا ہو۔

”ہاں۔ زرگل نے ہی مجھے فرار کی راہ دکھائی تھی۔ اسی نے مجھے مجبور کیا تھا، ورنہ میرا سمندر خان کی عزت پر قدغن لگانے کا کوئی ارادہ نہیں تھا۔ زرگل نے مجھے دھکی دی تھی کہ اگر میں نے اس کی بات نہ مانی تو وہ مجھے بدنام کر دے گی اور لوگوں سے کہے گی کہ میں نے اس کی عزت پر حملہ کرنے کی کوشش کی ہے۔ پیادگی کی وجہ سے میرا ذہن پہلے ہی صحیح طرح کام نہیں کرتا، اس لیے میں نے پریشانی کے عالم میں زرگل کے ساتھ قبیلے سے فرار کا فیصلہ کر لیا۔“

زرگل نے متحیر لگائے ہوں سے بہادر خان کا جواب سنا، لمحہ بھر کے لیے تو اسے یقین ہی نہ آیا کہ یہ جواب بہادر خان نے دیا ہے۔ وہ بزدل نہیں تھی، بچپن سے ہی اپنے ساتھ ہونے والی زیادتیوں اور نا انصافیوں پر سراپا احتجاج تھی اور اس وجہ سے اپنے باپ سمندر خان سے مار بھی کھائی تھی پھر بہادر خان کا اتنا بڑا جھوٹ کیسے برداشت کر لیتی۔

اس نے نیکلت اپنا نقاب الٹ دیا اور چٹختی ہوئی بہادر کی جانب بڑھی۔ ”ذلیل انسان! میں تمہیں زندہ نہیں چھوڑوں گی۔“ اس کی جارحانہ پیش قدمی پر بہادر خان اپنی کرسی سے اٹھ کر ایک جانب کھڑا ہو گیا۔ زرگل شاید غصے

کے عالم میں اپنے ناخنوں سے بہادر خان کا منہ لوج لیتی مگر سردار شیر خان کے اشارے پر اس کے دو آدمیوں نے آگے بڑھ کر اطراف سے اس کے دونوں ہاتھوں کو مضبوطی سے پکڑ لیا۔ زرگل نے خود کو چھڑانے کی ناکام کوشش کی مگر وہ طاقتور مردوں کی گرفت میں بے بس ہوئی۔

”بے جیا لڑکی!“ اسی لمحے سمندر خان اپنی کلا شکوف سیدھی کرتا ہوا کھڑا ہو گیا۔ ”تم نے گھر سے بھاگ کر بطور باپ تو میرا سر شرم سے جھکا ہی دیا تھا مگر آج بھرے جھمبے میں بے پردہ ہو کر رہی کسی کسر بھی پوری کر دی ہے۔ میں تمہارے ناپاک وجود کو مٹا دوں گا۔“ یہ کہتے ہوئے اس نے اپنی کن کارخ زرگل کی جانب کر دیا۔

”نہیں سمندر خان۔“ اسی لمحے سردار شیر خان کی دہاڑی تھوٹی آواز ابھری تو اس نے ٹریگر سے انگلی ہٹائی۔

”سمندر خان میں تمہارے جذبات کو سمجھ سکتا ہوں۔“ شیر خان تیز لہجے میں بولا۔ ”مگر ابھی جرم کے لیے فیصلہ نہیں سنایا ہم سب یہاں کے قانون کے پابند ہیں اور قانون کا احترام کرتے ہیں۔ میں تمہیں مشورہ دوں گا کہ تم خود پر قابو رکھتے ہوئے صبر و تحمل سے کام لو اور جرم کے لیے فیصلے کا انتظار کرو۔“

”سردار ٹھیک کہہ رہا ہے سمندر خان۔“ جرم کا ایک فرد شیر خان کی تائید میں بولا۔ ”تمہیں اپنی غیرت مندی کا مظاہرہ کرنے کا پورا پورا موقع دیا جائے گا۔ فی الحال صبر سے کام لو اور اپنی کلا شکوف نیچے کر کے کرسی پر بیٹھ جاؤ۔“

سردار اور جرم کے فرد کی بات سن کر سمندر خان گود میں کلا شکوف رکھ کر دوبارہ کرسی پر بیٹھ گیا تاہم اس کے چہرے سے عیاں ہو رہا تھا کہ اس نے بڑی مشکل سے ضبط کیا ہے۔

”لڑکی۔۔۔ تمہیں بھی صفائی کا پورا پورا موقع دیا جائے گا مگر تم شاگنے کی اجازت ہرگز نہیں دی جا سکتی۔ آرام سے اپنا موقف بیان کرو۔“ جرم کا وہی شخص درشت لہجے میں بولا جس نے سمندر خان کو صبر سے کام لینے کا مشورہ دیا تھا۔

”مردوں کے معاشرے میں کسی عورت کے موقف کی بھلا کیا حیثیت؟“ زرگل کے بے باک اور دلیرانہ لہجے نے سب کو حیرت زدہ کر دیا۔

”میں تسلیم کرتی ہوں کہ میں نے بہادر خان کے ساتھ بھاگ کر قبیلے کے قانون کو توڑا ہے اور میرا یہ اقدام غلط بھی ہے۔ میں بہادر خان کی باتوں میں آگئی تھی کیونکہ میں نے جرم کیا ہے اس لیے مجھے یہاں کے قانون کے

مطابق جو بھی سزا سنائی جائے گی میں اسے قبول کروں گی مگر قانون سب کے لیے برابر ہوتا ہے۔ قانون میں سزا کا تعین کرتے وقت عورت اور مرد کی تفریق نہیں کی جاتی۔ مجھے جرمے کی جانب سے دی جانے والی ہر سزا قبول ہے مگر اس سزا کا اطلاق بہادر خان پر بھی ہوتا ہے۔ یہ کہاں سے پاگل نظر آتا ہے؟“

”اس کے پاگل پن کی اتنے افراد نے گواہی دی ہے۔ ہم ان کی گواہی کیوں تسلیم نہ کریں؟“ اس شخص نے زرگل سے کہا۔ اس کا لہجہ بدستور درشت تھا۔ شاید وہ عورتوں سے اسی طرح بات کرنے کا عادی تھا۔

”چونکہ ان سب گواہان کا حق پانی سردار شیر خان سے وابستہ ہے۔ ان کی گواہی غیر جانبدارانہ کیسے ہو سکتی ہے؟“ زرگل پُر اعتماد لہجے میں بولی۔

فوری طور پر جرم کے اس فرد سے کوئی جواب نہ بن پڑا مگر اسی لمحے جرم کے ایک اور فرد اس کی مدد کو آگے بڑھا اور بولا۔ ”اگر یہ تسلیم کر بھی لیا جائے کہ ان کی گواہی غیر جانبدارانہ نہیں ہے تو پھر بھی بہادر خان کی گواہی تمہاری گواہی سے زیادہ وزن رکھتی ہے کیونکہ مدعویت سے افضل پیدا کیا گیا ہے۔ کسی کمتر عورت کی گواہی کو کسی افضل مرد کی گواہی پر فوقیت نہیں دی جا سکتی۔“

”وہ افضل مرد اسی کمتر عورت کے بطن سے جنم لیتا ہے۔“ زرگل نے زہر خند لہجے میں جواب دیا۔ زرگل کی بات وہاں موجود تمام افراد کے لیے ناقابل برداشت تھی۔ اس نے بڑی بیباکی سے وہاں موجود افراد کی آنا پر براہ راست حملہ کیا تھا۔

”مجھے کے اندر سے غصے اور تہمیں ڈوبی دلی دلی آوازیں ابھرنے لگیں۔ سمندر خان کا چہرہ بھی سرخ ہو گیا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ اگر آئندہ اس کے ہاں کسی بیٹی کی پیدائش ہوئی تو وہ اسے اسی وقت زمین میں دفن کر دے گا۔ اسے اب بس فیصلے کا انتظار تھا۔ اس کے بعد تو شاید وہ زرگل کو مارنے میں ایک لمحے کی تاخیر بھی نہ کرتا۔

”خاموش۔“ اسی لمحے سردار شیر خان کی تحکمانہ آواز ابھری تو مجمعے میں ابھرنے والی سبھناٹ ختم ہو گئی۔

”دیکھا میں نے کہتا تھا کہ یہ لڑکی آکسانے اور بھڑکانے میں خاصی مہارت رکھتی ہے۔“ قدرے توقف کے بعد شیر خان بولا۔ ”جب اس کی باتوں سے یہ سارا مجمع بھوک سکتا ہے تو پھر میرے معصوم اور بھولے بھالے بیٹے کی بھلائی کی حیثیت ہے۔ میرے خیال میں اب حقیقت سب پر واضح

ہو چکی ہے، اب اپنا فیصلہ سنا دینا چاہیے۔“

سردار کی بات سن کر تمام افراد دم آواز میں آہیں میں صلح مشورہ کرنے لگے۔

زرگل ابھی سردار کے آدمیوں کی گرفت میں تھی۔ وہ اپنے سامنے کھڑے بہادر خان کو گھور رہی تھی جو مسلسل اس سے نظریں ملانے سے گریزاں تھا۔ بہادر خان کو کرات اس کے باپ شیر خان نے تھی۔ یہ ذہن نشین کر دیا تھا کہ اسے جرمے میں کیا کہنا ہے۔ باقی معاملات وہ خود سنبھال لے گا۔

یہ حقیقت تھی کہ بہادر خان زرگل کو پسند کرتا تھا اور اس سے شادی کا خواہش مند بھی تھا۔ اس نے شیر خان کو اس رشتے پر راضی کرنے کی بہت کوشش کی تھی مگر شیر خان مسلسل انکاری تھا۔ وہ بہادر خان کے سلسلے میں اپنے کسی عزیز کو زبان دے چکا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ وہ زرگل کو لے کر اس جگہ سے فرار ہوا تھا۔ وہ زرگل کے ساتھ ایک نئی دنیا بسانا چاہتا تھا مگر قسمت نے اس کا ساتھ نہ دیا اور گھوڑا ازمنی ہونے کی وجہ سے وہ پکڑا گیا۔

پکڑے جانے کے بعد اسے اس حقیقت کا بخوبی ادراک ہو چکا تھا کہ اگر اس نے اپنے باپ کے حکم پر عمل نہ کیا تو دنیا کی کوئی طاقت اسے موت سے نہیں بچا سکتی گی۔ بہادر خان بھی دل ہی دل میں خوفزدہ ہو گیا تھا اور اسی وجہ سے اس جرمے کے سامنے گواہی دیتے ہوئے باپ کے حکم پر عمل کر ڈالا تھا اور پھر اس کے باپ نے ٹھیک ہی تو کہا تھا کہ زندگی دوبارہ نہیں ملے گی۔ زرگل جیسی میلوں لڑکیاں دوبارہ مل جا سکتی گی۔

اسی لمحے جرم کے افراد کی آہیں میں گفت و شنید ختم ہو گئی۔ شاید وہ کسی فیصلے پر پہنچ گئے تھے۔ ان میں سے ایک بارش شخص کھڑا ہوا اور اس نے باقاعدہ اعلان شروع کر دیا۔

”ہم سب ایک متفقہ فیصلے پر پہنچ گئے ہیں۔ ہم نے تمام فریقین کو اپنا اپنا موقف پیش کرنے کا پورا پورا موقع دیا ہے۔ ہم نے زرگل اور بہادر خان کی باتیں بھی سنی ہیں۔ اگر زرگل کی یہ بات تسلیم کر بھی لی جائے کہ بہادر خان کے پاگل پن کی گواہی دینے والے افراد سردار شیر خان کے زیر اثر ہیں تو پھر بھی ہم یہی فیصلہ کرتے۔“

”بہادر خان کا کہنا ہے کہ زرگل نے اسے گھر سے بھاگنے پر مجبور کیا تھا اور کیونکہ اس کی ذہنی حالت ٹھیک نہیں تھی، اس لیے وہ زرگل کی باتوں میں آکر بہک گیا تھا جبکہ

زرگل کا کہنا ہے کہ اسے بہادر خان نے ایسا کرنے پر اکسایا تھا، دونوں طرف سے لگا گیا الزام انصاف کے تقاضوں کے مطابق برابر بٹھرتا ہے مگر کیونکہ صورت کی گواہی آدمی تسلیم کی جاتی ہے اس لیے بہادر خان کو مرد ہونے کی وجہ سے فوقیت دی جاتی ہے اور ہم اس کے موقف کو تسلیم کرتے ہیں۔

”کیونکہ وہ ذہنی طور پر بیمار ہے اس لیے اس پر ہمارے قبیلے کے قوانین کا اطلاق نہیں ہوتا۔ غیرت کے نام پر سزا صرف باہوش شخص کو ہی دی جاسکتی ہے تاہم ان سب باتوں کے باوجود بہادر خان کو بری الذمہ بھی قرار نہیں دیا جاسکتا کیونکہ اس سے بہر حال گناہ سرزد ہوا ہے۔ اس لیے اسے پچاس دینوں کی قربانی کرنا ہوگی تاکہ اس کے گناہ کا کفارہ ادا ہو جائے۔“

”بہادر خان کے برعکس زرگل ایک بہ ہوش و حواس اور عقلمند لڑکی ہے، اس نے گھر سے فرار ہو کر بے حیائی کی ایک ایسی مثال قائم کی ہے جس کی سزا موت کے سوا کچھ نہیں ہو سکتی اس لیے ہم زرگل کے لیے سزائے موت تجویز کرتے ہیں اور دستور کے مطابق اس سزا پر عملدرآمد اس کا باپ سمندر خان کرے گا۔“

”مجھے فیصلہ منظور ہے۔“ شیر خان مسرت بھرے لہجے میں بولا۔

”یہ کیا فیصلہ ہے بے فیرو؟“ زرگل خود کو سردار کے آدمیوں کے چھڑانے کی ناکام کوشش کرتے ہوئے بولی۔

”سیدھی طرح کیوں نہیں کہتے کہ سردار کے بیٹے کے خلاف فیصلہ کرنے کی تم لوگوں میں جرات ہی نہیں۔“

”سب لوگ پیچھے ہٹ جاؤ۔“ اسی لمحے سمندر خان اپنی کلاشکوف سیدھی کرتے ہوئے دوبارہ کھڑا ہو گیا تو وہ دونوں آدمی زرگل کو چھوڑ کر پیچھے ہٹنے چلے گئے جنہوں نے سردار کے حکم پر اسے گرفت میں لے رکھا تھا۔ اطراف سے دوسرے افراد بھی اس خطرے کے پیش نظر پیچھے ہٹ گئے کہ کہیں ناگہانی طور پر سمندر خان کی گولیوں کی زد میں نہ آ جائیں۔ سب کو اندازہ ہو گیا تھا کہ سمندر خان اب زرگل پر گولیاں برسائے ہی والا ہے۔ زرگل اپنی جگہ تن کر کھڑی ہو گئی تھی۔

”سمندر خان۔“ اسی لمحے ایک فرد نے اسے گولی چلانے سے روک دیا۔ ”ہمارے دستور کے مطابق مرنے والے سے اس کی آخری خواہش ضرور پوری کی جاتی ہے۔“ اس شخص نے کہا اور پھر وہ زرگل کی جانب متوجہ ہو گیا۔

”زرگل اگر تمہاری کوئی آخری خواہش ہو تو بتاؤ۔ تمہاری ہر جائز خواہش پوری کی جائے گی۔“

اس کا سوال سن کر زرگل ہذیانی انداز میں جس پڑی اور پھر بولی۔ ”ہاں میری ایک آخری خواہش ہے اور یہ بالکل جائز خواہش ہے مگر آپ لوگوں کے لیے اسے پورا کرنا شاید ممکن نہ ہو۔“

”تم اپنی خواہش بیان تو کرو یہ فیصلہ کرنا ہمارا کام ہے کہ تمہاری خواہش پوری کی جاسکتی ہے یا نہیں۔“ اس شخص نے اپنی بات پر زور دیتے ہوئے کہا۔

”میرا بیاس کی شدت سے حلق سوکھ گیا ہے میری جگہ کوئی اور لڑکی ہوتی تو شاید پانی مانگتی مگر میں تم لوگوں سے اپنی پیاس بجھانے کی درخواست نہیں کروں گی۔ میری آخری خواہش بس اتنی ہی ہے کہ بہادر خان کا نام تبدیل کر کے بزدل خان رکھ دیا جائے کیونکہ اگر کوئی گیدڑ کا نام شیر بھی رکھ دے تو وہ بچ بچ شیر نہیں بن جاتا۔ اس نے مجھ سے محبت کے بڑے بلند و بالا گدھے کیسے تھے یہ کہتا تھا کہ یہ پہاڑوں کا سینہ چرنے کی ہمت رکھتا ہے۔“

”اے خود پر بڑا ناز تھا مگر اب مجھ پر اس کی حقیقت منکشف ہو گئی ہے۔ یہ تو ایک چوہے سے بھی زیادہ گیارا ہے۔“

زرگل کے الفاظ بہت توہین آمیز تھے۔ بہادر خان کا چہرہ جتنا اٹھا مگر وہ پھر بھی خاموش ہی رہا کیونکہ اسے زندگی عزیز تھی۔

”سمندر خان جبرگے کے فیصلے پر عملدرآمد کرو۔“ اسی لمحے شیر خان نے دہاتے ہوئے کہا۔ شاید اس سے اپنے بیٹے کی توہین برداشت نہیں ہوئی۔

”ہٹ جاؤ میرے صبر کا پیمانہ اب لبریز ہو گیا ہے۔“

سمندر خان ادبچی آواز میں بولا اور پھر اس کی انگلی ٹریمر پر سخت ہوتی چلی گئی۔

”زرگل کو پانی تو پلا دو۔“ ایک فرد ادبچی آواز میں بولا۔ ”جان لینے سے پہلے تو جانور کو بھی پانی پلایا جاتا ہے۔“

مگر اس کی بات سمندر خان نے نظر انداز کرتے ہوئے ٹریمر دبا دیا۔ تر ترائی آواز کے ساتھ ہی سمندر خان کی کلاشکوف سے لگتا ہوا برست زرگل کا سینہ چھلکی کر گیا اور وہ ایک دم اس کے زمین پر جا گری۔ اس کا جسم کچھ دیر کے لیے تڑبا اور پھر ساکت ہو گیا۔ اس کی پٹنی پٹنی لہجہ اب بے نور ہو چکی تھی مگر ان بے نور آنکھوں میں گویا بہت سے سوالات ثبت ہو گئے تھے بہت سی حسرتیں جھلک رہی تھیں۔

”شاباش سمندر خان شاباش۔“ سردار شیر خان نے

آگے بڑھ کر سمندر خان کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ ”تم نے اپنی بیٹی کو مار کر یہ ثابت کر دیا ہے کہ تم ایک غیرت مند شخص ہو۔ زرگل کو مارتے وقت نہ تمہارے ہاتھ کانپنے نہ تم ہچکچاتے۔ میں تمہیں سلام پیش کرتا ہوں اور ساتھ ہی اپنی پگڑی بھی۔“ یہ کہتے ہوئے شیر خان نے اپنی پگڑی اتار کر سمندر خان کے سر پر رکھ دی۔

سردار کا کسی کو اپنی پگڑی پیش کرنا اس کی بہت بڑی عزت افزائی تھی۔ سمندر خان نے اپنی کلاشکوف کندھے سے لٹکانی اور پھر بڑے فخر سے انداز میں تن کر کھڑا ہو گیا۔

”زرگل کی لاش کو لے جاؤ اور وادی کی سب سے گہری کھائی میں چھپک دو۔ اسے وادی کے قبرستان میں دفن نہیں کیا جاسکتا۔ وہاں ہماری مائیں بہنیں اور بیٹیاں مدفون ہیں۔ اس بدکردار لڑکی کا مردہ جسم اس قابل ہے کہ اسے سانپ چھو کھا جائیں۔“ سردار شیر خان نے دعوت بھرے لہجے میں کہا تو اس کے دو آدمیوں نے آگے بڑھ کر زرگل کی لاش کو اٹھایا اور پھر ڈیرے کے خارجی دروازے کی جانب بڑھ گئے۔ وہ جانتے تھے کہ انہیں کہاں جانا ہے۔

”میں آپ تمام افراد کو بھی ایک منعخانہ فیصلہ کرنے پر مبارک باد پیش کرتا ہوں۔“ سردار نے تمام افراد کی جانب متوجہ ہو کر کہا۔ ”چاہے کچھ بھی ہو انصاف کا دان کبھی بھی ہاتھ سے نہیں چھوڑنا چاہیے۔ آپ کے فیصلے کے مطابق بہادر خان کی طرف سے کل ہی پچاس دینوں کی قربانی دے دی جائے گی تاکہ سب کو یقین آ جائے کہ یہاں کا قانون سب کے لیے برابر ہے اور قانون کا اطلاق سردار کے بیٹے پر بھی اسی طرح ہوتا ہے جس طرح کسی عام آدمی پر۔ ساتھ ہی ساتھ میں نفست ختم کرنے کا بھی اعلان کرتا ہوں۔“

شیر خان نے کہا تو نفست میں شامل اور دیگر افراد سردار اور سمندر خان سے ہاتھ ملاتے ہوئے ڈیرے سے باہر نکلتا شروع ہو گئے۔

بہادر خان سب سے الگ تھلک ایک طرف خاموشی سے کھڑا ہوا تھا۔ اس کے ذہن میں زرگل کے کہے ہوئے الفاظ ابھی تک گونج رہے تھے کہ گیدڑ کا نام شیر رکھ دیا جائے تو وہ بچ بچ شیر نہیں بن جاتا۔ بہادر خان کو اپنے پورے وجود پر ایک نامعلوم سا بوجھ محسوس ہو رہا تھا اور شاید یہ بوجھ اب اسے عمر بھر اٹھانا تھا۔

”اچھا سردار اب مجھے بھی اجازت دیجیے۔“ سمندر خان نے بھی جانے کی اجازت طلب کی۔

”ٹھیک ہے مگر تمہاری عزت افزائی کے لیے میرے

آدمی تمہیں گھر تک چھوڑنے ساتھ جائیں گے حشمت خان!۔“ یہ کہتے ہوئے سردار شیر خان نے اپنے ایک آدمی کو آواز دی تو ایک بڑی بڑی موچوں والا شخص سامنے آ گیا۔

سمندر خان بھی حشمت خان کو اچھی طرح جانتا تھا۔ یہ سردار کا بہت قریبی اور اہم آدمی تھا۔ یہ بات پورے قبیلے میں مشہور تھی کہ سردار اپنے تمام آدمیوں میں سب سے زیادہ اعتماد حشمت خان پر ہی کرتا ہے۔

”حشمت خان! دو سح آدمی ساتھ لے لو اور سمندر خان کو عزت کے ساتھ اس کے گھر تک چھوڑ آؤ۔“ یہ کہتے ہوئے اس نے حشمت خان کو مخصوص انداز میں آنکھ سے اشارہ بھی دیا۔

”جی بہتر خان صاحب۔“ حشمت خان نے مسکراتے ہوئے کہا۔

سمندر خان سردار کے آدمیوں کے ہمراہ ڈیرے سے باہر آ گیا۔ جب وہ ڈیرے میں داخل ہوا تو اس کی گردن جھکی ہوئی تھی مگر اب وہ گردن اٹھا کر بڑی شان اور حمکت سے چل رہا تھا۔ کچھ ہی دیر میں وہ سب چلتے چلتے سمندر خان کے کچے مکان کے پاس پہنچ گئے۔

”تم دونوں یہیں ٹھہرو مجھے سمندر خان سے بہت ضروری بات کرنی ہے۔“ حشمت خان نے کہا تو ان کے پیچھے چلنے والے دونوں شخص افراد وہیں رک گئے۔

”تمہیں مجھ سے کیا بات کرنی ہے؟“ سمندر خان نے حیرت بھرے لہجے میں سوال۔

”میں تمہیں سردار کا ایک پیغام پہنچانا چاہتا ہوں۔ میں اسی کی ایما پر تمہارے ساتھ آیا ہوں۔ میرے خیال میں بیٹے کی بات ہو جائے تو بہتر ہے۔“ حشمت خان نے جواب دیتے ہوئے کہا۔

وہ دونوں چلتے چلتے اب سمندر خان کے گھر کے سامنے پہنچ چکے تھے۔ عین اسی وقت گھر کے اندر سے سمندر خان کی بیوی جنت گل برآمد ہوئی۔ سمندر خان کی چھوٹی بیٹی فرشتہ گل بھی اس کے ہمراہ تھی۔ جنت گل نے بغور سمندر خان کے چہرے کا جائزہ لیا پھر اس کی پگڑی کی جانب دیکھا اور ساری صورت حال اسے کچھ میں آ گئی۔ اسے سمندر خان کے تھمتائے چہرے اور سر پر موجود خوب صورت پگڑی سے ہی اندازہ ہو چکا تھا کہ اس کی بیٹی زرگل اب اس دنیا میں نہیں رہی تھی۔ گولیاں چلنے کی آواز اس نے بھی سنی تھی تو گویا اس وقت ایک باپ اپنی ہی اولاد کا خون بہا رہا تھا۔ آنسوؤں کا ایک سیلابی ریلہ تھا جو نیکھت جنت گل کی

آنکھوں سے بہہ نکلا۔ اس نے برقی آنکھوں کے ساتھ ایک حسرت بھری نگاہ آسان پر ڈالی اور فرشتہ گل کا ہاتھ تمام کر مکان کے اندر چلی گئی۔

”آؤ حشمت خان! ایک طرف بیٹھے ہیں۔“ سمندر خان نے کہا تو وہ سر ہلاتا ہوا اس کے ہمراہ ایک طرف بھیجی ہوئی ایک پرانی سی درزی پر بیٹھ گیا۔ ”معاف کرنا حشمت خان اگرچہ تم میرے مہمان ہو مگر اس وقت میں تمہاری توجہ سے تو اسے نہیں کر سکتا۔ تم نے میری بیوی کی حالت تو دیکھ لی ہے۔“

”کوئی بات نہیں۔“ حشمت خان نے تقریبی لہجے میں جواب دیا۔ ”وہ ایک ماں ہے اپنی بیٹی کے لیے غمزدہ ہونا اس کی فطرت میں شامل ہے۔ بہر حال اس وقت ان باتوں کو چھوڑ دو، مجھے تم سے بہت اہم بات کرنی ہے۔“

”ہاں تم نے کہا تھا کہ سردار نے میرے لیے کوئی پیغام بھیجا ہے۔“ سمندر خان نے استفسار کیا۔

”بات دراصل یہ ہے میرے دوست۔“ حشمت خان نے باقاعدہ تجوید پاندہتے ہوئے کہا۔ ”سردار شیر خان بہت رحم دل انسان واقع ہوا ہے۔ اسے تمہاری غربت کا بڑا احساس اور دکھ ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ تمہاری یہ غربت دور ہو جائے۔ اگر یہ زرنگی والا معاملہ درمیان میں نہ چپکتا تو میں پہلے ہی اس بارے میں تم سے بات کر چکا ہوتا۔ دراصل سردار نے تمہاری غربت دور کرنے کے لیے تمہیں ایک پیشکش کی ہے اس نے تمہاری چھوٹی بیٹی فرشتہ گل کے لیے رشتے کا پیغام بھیجا ہے۔“

”یہ تم کیا کہہ رہے ہو حشمت خان۔“ سمندر خان متعجب لہجے میں بولا۔ ”فرشتہ گل ابھی بہت چھوٹی ہے اور بہت معصوم بھی اور پھر سردار کا بیٹا بہادر خان پہلے زرنگی کو ہکا کر لے گیا تھا۔ کیا اب اس سے فرشتہ گل کا رشتہ مناسب ہوگا؟“

”تم غلط سمجھ رہے ہو۔“ حشمت خان نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے جواب دیا۔ ”سردار شیر خان نے فرشتہ گل کا رشتہ بہادر خان کے لیے نہیں بلکہ اپنے لیے مانگا ہے۔ وہ خود تمہاری بیٹی سے نکاح کرنا چاہتا ہے۔ اس نے ایک دو دفعہ فرشتہ گل کو دیکھا تھا اور اسی وقت اسے اپنی دہن بنانے کا فیصلہ کر لیا تھا۔“

”یہ تم کیا کہہ رہے ہو حشمت خان۔“ سمندر خان نے حیرت بھرے لہجے میں کہا۔ ”جانتے بھی ہو کہ فرشتہ گل ابھی صرف چودہ سال کی ہے اور شاید ذہنی طور پر اپنی عمر سے بھی کہیں چھوٹی جبکہ سردار شیر خان کی عمر پچاس برس سے بھی

تجاوز کر چکی ہے۔“

”تو کیا ہوا؟“ حشمت خان نے نامحاند لہجے میں کہا۔ ”کیا یہ کوئی انہونی بات ہے؟ کیا اس سے پہلے ہمارے قبیلے میں کبھی ایسا نہیں ہوا۔“

”مگر سردار بہت بوڑھا ہو چکا ہے۔“ سمندر خان نے حذبذب لہجے میں کہا۔

”مرد بھی بوڑھا نہیں ہوتا۔ یہ کیوں نہیں سوچتے کہ سردار کو اپنی دامادی میں قبول کر لینے سے قبیلے میں تمہاری کتنی عزت ہوگی۔“

”مگر لوگ باتیں بنائیں گے کہ سمندر خان بے حس ہو گیا ہے۔ پچیسوں کے لالچ میں اپنی چودہ سالہ بیٹی کو ایک پچاس سالہ شخص سے بیاہ دیا ہے۔“ سمندر خان نے مضطرب لہجے میں کہا۔

”اس وقت اس بات کو چھوڑو، یہ دیکھو کہ بدلے میں بال کتنا مل رہا ہے۔ سردار رشتہ قبول کر لینے کی صورت میں تمہیں اپنی ایفون کی فصل کے کل منافع میں سے بیس فیصد حصہ دے گا۔ تم جانتے ہی ہو کہ وہ کتنی بڑی زمین کا مالک ہے۔ اس کے علاوہ نکاح کے وقت پانچ لاکھ نقد بھی دے گا۔“ حشمت خان نے آگے کی طرف جھکتے ہوئے کہا۔ اتنی بڑی پیشکش کا سن کر سمندر خان انگشت بدنداں رہ گیا۔

”کیا واقعی؟“ اس نے سرت بھرے لہجے میں پوچھا۔

”بالکل.....“ حشمت خان اثبات میں سر ہلاتے ہوئے بولا۔ ”سردار اپنا سرتو کٹوا سکتا ہے مگر اپنے قول سے نہیں پھر سکتا۔ ویسے بھی تم جانتے ہی ہو کہ سردار گوند سننے کی عادت نہیں ہے۔“

اس کی بات سن کر سمندر خان سوچ میں پڑ گیا۔ سردار کو انکار کر کے اس سے خاصیت مول نہیں لی جاسکتی تھی اور پھر اس کی پیشکش بھی بہت بڑی تھی۔ سمندر خان کی تو قسمت ہی بدل جاتی۔ اگرچہ جنت گل اپنی بیٹی کے اس رشتے پر بھی رضامند ہونے والی نہیں تھی مگر تھوڑا سا تنقید کر کے اس کی زبان بند کی جاسکتی تھی۔

حشمت خان ٹھیک ہی تو کہہ رہا تھا کہ یہ وقت زیادہ سوچ بچار کا نہیں تھا۔ سردار کی پیشکش قبول کر لینے میں عافیت بھی تھی اور فائدہ بھی۔ ”مجھے منظور ہے۔“ فیصلہ کرتے ہی سمندر خان بولا۔ ”مگر سردار کو کہہ دو کہ ایفون کے منافع میں سے تو بیس فیصد ٹھیک ہے مگر نقد میں پانچ نہیں پورے دس لاکھ لوں گا..... پورے دس لاکھ۔“



انتقام

انجمن داروق حاصل

یہ بات تو طے ہے کہ مجرمانہ ذہنیت کے حامل افراد کبھی انصاف کے تقاضے پورے نہیں کر سکتے... انہیں بھی اپنے زور بازو پر بڑا ناز تھا... لیکن وہ پھر بھی عقل والوں سے مقابلہ نہ کر سکے... کیونکہ عقل کا پھندا ان کے گلے میں اٹک گیا تھا جہاں بازو زور لگانے کے باوجود رہائی نہ پاسکے۔

جوش میں ہوش کھو دینے والے

مجرموں کا غیر تاک انجمن

دروازے پر پہنچ کر کھنٹی بجانے سے پہلے میں نے آئینے میں اپنے سراپا کا جائزہ لیا۔ سو ڈالر میں، میں نے بالوں کی نئی وگ خریدی تھی اور جیکے ہوئے شانوں کو سیدھا کرنے کے لیے خصوصی سوٹ پر بھی میرے ساڑھے

کیا۔ ”جناب اچھے تھامس کہتے ہیں۔ چند منٹ پیشتر میں نے پیٹرول پمپ لیز پر لینے کے لیے بات کی تھی۔“

”اوہو..... تو مسٹر تھامس آپ ہیں؟ آئیے اندر تشریف لے آئیے۔“ مکان اندر سے انتہائی شاندار تھا۔ قیمتی فرنیچر اور دیگر قسم کی آرائشی اشیاء بڑے سلیقے سے سجائی گئی تھیں۔ ایک تنہا شخص کے لیے یہ مکان ضرورت سے زیادہ بڑا تھا۔ ”کیا آپ کو پیٹرول پمپ چلانے کا سابقہ تجربہ بھی ہے؟“

”جی ہاں اس سے پہلے میں کئی پیٹرول پمپوں پر کام کر چکا ہوں۔“

”ٹھیک ہے۔ اگر آپ ساز و سامان کے اڈھائی سو ڈالرز ادا کر سکتے ہیں تو کل صبح سے ہی پمپ کھول لیں۔“

”جناب! جیسا کہ میں پہلے کہہ چکا ہوں۔ میرے پاس زیادہ رقم نہیں ہے۔ کیا آپ نے میرے بینک سے قرض کی بات کی تھی؟“

”یقیناً میں بینک گیا تھا۔“ اس نے اس طرح جواب دیا جیسے وہ میرے سوال پر چونک گیا ہو۔ ”میں نے ان تمام لوگوں کے اکاؤنٹ چیک کیے جن سے میرا کاروبار ہے۔ میرے میں پیٹرول پمپ ہیں اور میں نے ان سب کے لیے ساز و سامان کے ڈھائی سو ڈالرز وصول کیے ہیں۔“

”مجھے افسوس ہے مسٹر اپروز میں نے آپ کا وقت برباد کیا۔“ میں نے اٹھتے ہوئے کہا۔

”ایک منٹ ٹھہریے۔ شاید میں اس پمپ کے لیے کچھ رعایت دے سکوں۔“

”صرف اس پمپ کے لیے کیوں؟“ میں نے استفسار کیا۔

”اس کا ساز و سامان پرانا ہو چکا ہے اور میں نہیں چاہتا کہ یہ پمپ بند پڑا رہے۔“ اس نے ہاتھ اٹھا کر میری طرف اشارہ کرنے کے انداز میں دیکھا اور میری نظر اس کے اٹھے ہوئے ہاتھ پر پڑی۔ اس کے دائیں ہاتھ کی انگلی میں پڑی انگلی میں ایک بڑا سا ہیرا جگمگا رہا تھا۔

”کیا آپ ساز و سامان کے لیے ایک معاہدے پر دستخط کر دیں گے؟“

”یقیناً۔“ میں نے جلدی سے جواب دیا۔ وہ سامنے پڑی ہوئی ایک ڈبیک کی طرف پلٹا اور پھر معاہدے کے فارموں کا ایک پیڑ اٹھا لیا۔ اس نے معاہدے کے چند فارم نکال کر ڈرائنگ روم کی میز پر پھیلا دیے اور انہیں پُر کرنے لگا۔

”ہم معاہدے اور لیز کے سمجھوتے کی دو دو کاپیوں پر دستخط کریں گے اور ایک ایک کاپی اپنے پاس رکھیں گے۔“

میں نے سمجھوتے کا مسودہ پڑھا..... ایک کلن پرتھن سینٹ۔

”ایک کلن پرتھن سینٹ کیا کرانے کے اعتبار سے زیادہ نہیں؟“ میں نے حیرت زدہ ہو کر کہا۔

”مسٹر تھامس ایسی بھی تو سوچیں کہ آپ سے کسی قسم کی رقم لیے بغیر صرف آپ کی زبان پر اعتبار کرتے ہوئے میں پیٹرول پمپ آپ کے حوالے کر رہا ہوں۔ اس بنیاد پر کیا میں کچھ زیادہ منافع لینے کا حق دار نہیں ہوں؟“ اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”ٹھیک ہے مسٹر اپروز، میں معاہدے پر دستخط کر دوں گا اور کل صبح ہی پیٹرول پمپ کھول لوں گا۔“

”یہ ہوئی نایاب۔“ یہ کہتے ہوئے مسٹر اپروز کے چہرے پر اطمینان کا تاثر نمودار ہوا۔ انہوں نے پیٹرول پمپ کی چابیاں اور وہاں کی ساری اشیاء کی فہرست تمبا کر مجھ سے اشیاء کی فہرست پر دستخط لے لیے۔

”مسٹر اپروز! میں اس شخص سے کہاں مل سکتا ہوں جو اس سے قبل پیٹرول پمپ چلاتا رہا ہے۔“ میں نے دروازے سے نکلنے سے پہلے سوال کیا۔

”آپ اس سے کیوں ملنا چاہتے ہیں؟“ وہ کچھ مضطرب نظر آنے لگا۔

”میں اس سے کچھ معلومات حاصل کرنے کے لیے ملنا چاہتا ہوں۔“

”آپ اس سے نہیں مل سکیں گے کیونکہ میں نہیں جانتا کہ وہ اب کہاں ہوگا۔“

”لیکن اس نے پیٹرول پمپ بند کیوں کر دیا؟“ میں نے اصرار کیا۔

”میرے خیال میں وہ کسی حادثے کا شکار ہو گیا تھا..... خدا حافظ۔“

یہ کہتے ہوئے اس نے دروازہ بند کر لیا۔ مجھے تالا لگانے کی آواز سنائی دی۔

☆☆☆

دوسرے دن سورج طلوع ہونے سے قبل ہی میں ایک ٹیکسی میں پیٹرول پمپ جا پہنچا۔ جتیاں جلا گئیں۔ تیل اور ٹانروں کی الماریاں ٹھیک کیں اور سامنے بھی ہوئی برف صاف کی۔ چند منٹ بعد ہی میرا پہلا گاہک اندر داخل ہوا۔ ایک اچھے سلازمین کی طرح میں اسے گاہکوں سے بہت ہی دوستانہ قسم کا رویہ رکھتا تھا اور انہیں مطمئن کرنے کی ہر ممکن

کوشش کرتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ گاہک مجھے بہت پسند کرتے تھے لیکن مسٹر اپروز کو میری تاجرانہ صلاحیتوں پر شک تھا کیونکہ میں نے پیٹرول کی لینز کا نرخ، دو سینٹ فی کلن زیادہ رکھا تھا نیز ٹائریوب اور دوسرا سامان انتہائی کم قیمت پر فروخت کرتا تھا۔

پہلے ہفتے کے آخر تک میں نے پیٹرول بہت ہی کم فروخت کیا تھا لیکن دوسری اشیاء کی فروخت بہت بڑھ چکی تھی۔ سلازمین صرف مجھے زیادہ سے زیادہ سامان دینے کو تیار تھے بلکہ ایک ہفتے کے ادھار پر مال دے رہے تھے۔ پیٹرول کے پلانٹ سے مجھے ادھار نہیں مل سکتا تھا اور مجھے پیٹرول کی زیادہ ضرورت بھی نہیں تھی۔ دوسرے ہفتے کے پہلے دن میں رات کو پمپ بند کرنے کی تیاری کر رہا تھا کہ ایک لمبی سیاہ بیوک کار پمپ کی حدود میں داخل ہوئی اور دروازے کے قریب رک گئی۔ دو لمبے ترنگے آدی کار سے اترے اور آفس میں داخل ہو گئے۔

”کیسے کیسے ہیں؟“ ان میں سے ایک نے شیشے کو ہاتھ سے صاف کرتے ہوئے سوال کیا۔

”فرمایئے جناب۔“ میں نے انک انک کر کہا اور انہیں مشتبہ نظروں سے دیکھتے ہوئے سوال کیا۔ ”میں آپ کی کیا خدمت کر سکتا ہوں؟“

”میں اور میرا ساتھی تاجروں کو تحفظ دینے کا کام کرتے ہیں۔ معمولی سی ہفتہ وار اجرت پر ہم آپ کے پمپ کو آتشزدگی، کھڑکی کے شیشے ٹوٹنے اور دوسرے نقصانات سے تحفظ فراہم کریں گے اور آپ کو بھی ٹھکوں اور غنڈوں سے محفوظ رکھیں گے۔“

”جی مجھے ابھی ایسا کوئی مسئلہ درپیش نہیں ہے۔“ میں نے منمناتے ہوئے جواب دیا۔ اس شخص نے اپنے ساتھی کو اشارہ کیا۔ دوسرا آدی کار سے اتر کر اندر آیا اور غصہ کر ایک پتھر پمپ کے بڑے شیشے پر دے مارا۔ شیشہ چھٹا کے سے ٹوٹ کر زمین پر آ رہا۔

”میرا مطلب سمجھ گئے۔“ اجنبی نے سوال کیا۔

”جی ہاں۔“ میں نے ہونٹ کاٹتے ہوئے جواب دیا۔ اجنبی اچانک پلٹا۔ اس نے میرا اگر بیان پکڑ لیا اور مجھے دھکا دے کر ڈبیک کی دوسری طرف لے آیا۔

”تم حادثے کا شکار ہو سکتے ہو۔“ اس نے سرگوشی کے انداز میں کہا۔ میں نے تھوک نچتے ہوئے جواب دیا۔

”اس کی ضرورت نہیں پڑے گی، میں ادا کیلی کر دوں گا۔“

سنہری باتیں

☆ ہاتھوں کی خوبصورتی کے لیے ہاتھوں سے صدقہ کریں۔

☆ آواز کی خوبصورتی کے لیے تلاوت قرآن کریں۔

☆ آنکھ کی خوبصورتی کے لیے اللہ کے خوف سے آنسو نکالیں۔

☆ چہرے کی خوبصورتی کے لیے طہارت کے ساتھ وضو کریں۔

☆ دل کی خوبصورتی کے لیے اللہ کا ذکر کریں۔

☆ دماغ کی طاقت کے لیے اللہ کی بارگاہ میں سجدہ کریں۔

اللہ کو پسند ہے

- وہ دل جس میں مخلوق کا درد ہو۔
- وہ جگہ جہاں اللہ کا ذکر ہو۔
- وہ آنکھیں جس میں حیا ہو۔
- وہ شخص جو وعدہ وفا کرتا ہو۔
- وہ آنسو جو خوفِ خدا سے گرے۔
- وہ خدمت جو بغیر مطلب کے ہو۔

کترینیں

☆ زندگی میں چھوٹا بن کر رہو گے تو اللہ پاک بڑی نعمتیں دیں گے۔

☆ بڑا ہونے پر تو ماں بھی گود سے اتار دیتی ہے۔

☆ تمام تعریفیں اس اللہ رب العزت کے لیے جو اتنا کریم اور مہربان ہے کہ ہماری عبادت اور تقویٰ کو تو ہمارے چہروں سے ظاہر کر دیتا ہے مگر ہمارے گناہ ساری دنیا سے پوشیدہ رکھتا ہے۔

مرسلہ: راجیلہ شفیق، سندھی ہوٹل، نیوکراچی

دوست

☆ اچھے دوست کو اچھے وقت سے زیادہ عزیز رکھتا ہوں کیونکہ اچھا دوست اچھا وقت دے سکتا ہے مگر اچھا وقت اچھا دوست نہیں پیدا کر سکتا۔ (شیخ سعدی رحمۃ اللہ)

مرسلہ: محمد جاوید خان، تحصیل ملی پور

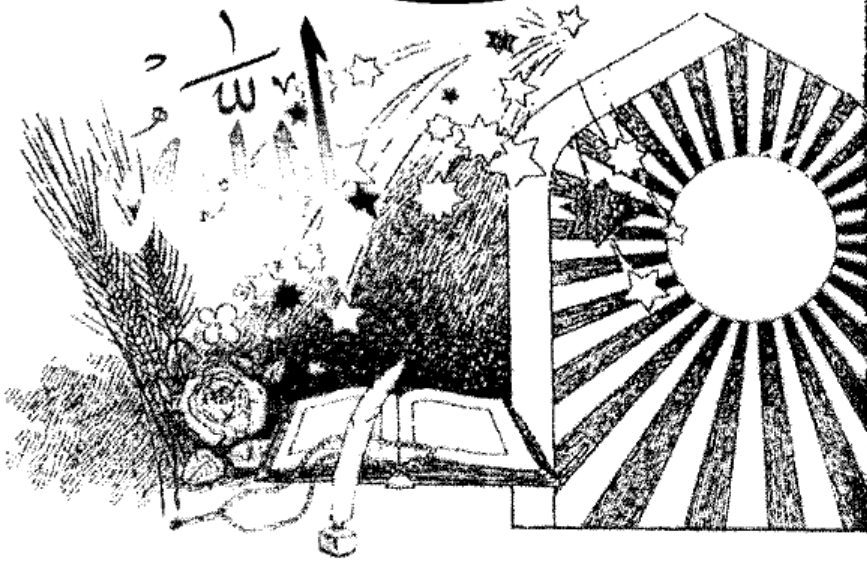
تیسرا حصہ

حضرت موسیٰ علیہ السلام

رضوانہ صاحبہ

بادشاہت کو خطرہ ہمیشہ سے رہا ہے اور ہمیشہ ہی رہے گا... یہ دور مختلف انبیاء کے آنے کا اور تبلیغی کام کرتے رہنے کا تھا... ان میں مصریوں کے بادشاہ فرعون کا قصہ سرفہرست ہے... حیرت ہے قدرت بھی کیسے کیسے نظارہ دکھاتی ہے۔ نجومیوں نے ایک انتہائی طاقتور بادشاہ کے لیے نومولود بچے کو خطرے کی علامت بنا کر اشارہ نہ دیا تھا اور انہی اندیشوں میں اس وقت پیدا ہونے والے تمام نومولود بچے قتل کر دیے گئے ماسوائے ایک کے... جسے اللہ نے فرعون کی ہلاکت کا سبب اور اپنا پیغمبر بنا کر دنیا میں اتارا تھا۔ اس دور کی تمام مائیں خوف و دہشت کا شکار تھیں۔ ایسے میں موسیٰ کی ماں کو غیبی آواز آئی ”اس کو دودھ پلا... پھر جب تجھے اس کی جان کا خطرہ ہو تو اسے دریا میں ڈال دے اور کچھ غم اور خوف نہ کر کہ ہم اسے تیرے ہی پاس لوٹائیں گے اور اسے پیغمبروں میں شامل کریں گے۔“ سبحان تیری قدرت، یہ وعدہ پورا ہوا۔

مصر کی سرزمین پر مصریوں کی زرخیز اور خمسبر کے نجات کا احوال



حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرت ہارون علیہ السلام نے عرض کیا۔

”پروردگار! ہمیں اندیشہ ہے کہ وہ ہم پر زیادتی کرے گا یا ہم پڑے گا۔ فرمایا ڈرو مت۔ میں تمہارے ساتھ ہوں سب کچھ سن رہا ہوں اور دیکھ رہا ہوں۔ جاؤ اس کے پاس اور کہو کہ ہم تیرے رب کے فرستادہ ہیں۔ بنی اسرائیل کو ہمارے ساتھ جانے کے لیے چھوڑ دے اور ان کو تکلیف نہ دے۔ ہم تیرے پاس تیرے رب کی نشانی لے کر آئے ہیں اور سلامتی ہے

پیٹرول کے ٹینک خالی ہو چکے تھے۔ ٹائر، بیٹری اور دوسرا سامان بھی تقریباً یک چکا تھا۔ سپلائر نیا سامان دے کر واجبات وصول کر چکے تھے۔ جیسے ہی میں نے باہر کی بڑی لائٹس آف کیں، سیاہ بیوک دروازے کے پاس آ کر رکی۔ طویل قامت دیونما آدی گاڑی سے نیچے اترا اور ایک بریف کیس لیتے ہوئے آفس میں داخل ہوا۔ اس کا سامنے اس کی پشت پر ساتھ ساتھ آ رہا تھا۔ طویل قامت آدمی نے بریف کیس میری میز پر رکھ دیا اور ہاتھوں پر دستانے چڑھانے لگا۔

”دوسو ارز۔“ اس نے سرگوشی میں مطالبہ کیا۔

”ٹھیک ہے۔“ میں نے مکرراتے ہوئے کہا۔ ”رقم تیار ہے۔“ میں نے میز کی دراز کھلی اور سائیکلنگ لگا ہوا ریو اور نکال لیا پھر سوچنے کا موقع دیے بغیر ہی دونوں کی آنکھوں کو نشانہ بنا ڈالا۔

گولیاں نکلنے ہی وہ فرش پر گر پڑے۔ میں نے ریو اور جیب میں رکھ لیا اور انتہائی احتیاط سے ان کے بریف کیس کا معائنہ کیا۔ میری توقع کے مطابق یہ لوگ میری دکان پر آنے سے پہلے اور بھی کئی جگہوں سے بھتا وصول کر کے لائے تھے۔ بریف کیس میں غنڈا لکس کی مد میں وصول کیے ہوئے سات ہزار ڈالر موجود تھے۔ میں نے پیٹرول پمپ پر کمانی ہوئی رقم بھی اس میں شامل کی اور بریف کیس کو آٹھنگی سے بند کر دیا۔

میں نے دگ اتاردی اور جھکے ہوئے شانے صبح کرنے کے لیے لگائے جانے والے پیڈ بھی تھیں کے نیچے سے نکال لیے۔ یہ دونوں چیزیں میں نے احتیاط سے سوٹ کیس میں رکھ لیں اور تھوڑی دیر بعد سوٹ کیس اور رقم سے بھرا ہوا بریف کیس لیے بڑی شان سے لمبی سیاہ بیوک میں بیٹھ گیا۔

اصلی لیو تھامس کا نام میں نے ڈائریکٹری سے حاصل کیا تھا۔ پولیس جب اسے گرفتار کرے گی تو وہ یقیناً حیرت زدہ رہ جائے گا اور اس سے زیادہ حیرت مسٹر ایروڈ کو اس وقت ہوگی جب وہ دیکھے گا کہ لیو تھامس اس شخص سے قطعی مختلف ہے جسے اس نے پیٹرول پمپ لیز پر دیا تھا۔

شاید میرا یہ کام قرین انصاف نہ معلوم ہو لیکن وہ شخص میرا حقیقی بھائی اور دو معصوم بچوں کا باپ تھا جسے ان لوگوں نے دریائیں ڈبو کر ہلاک کر دیا تھا۔

”یقیناً تم ایسا ہی کرو گے۔“ اس کے بعد اس نے میری پیٹھ اور چہرے پر کچے برسائے شروع کر دیے۔ تھوڑی دیر بعد اس نے ہاتھ روکا اور مجھے کرسی پر دھکیل دیا۔

”میں اگلے جمعے کی رات کو پہلی قسط لینے آؤں گا۔ دو سو ڈالر تیار رکھنا۔“ اس نے میرا سر پیچھے کی طرف جھکایا اور چہرہ قریب لاکر تنہا منہ لہجے میں بولا۔

”یاد رکھنا تمہیں دوسو ڈالر تیار رکھنا ہیں۔“

”ٹھیک ہے، ٹھیک ہے۔“ میں نے ہٹکاتے ہوئے کہا۔ ”ایسا ہی ہوگا۔“

دوسرے دن میں نے پیٹرول پمپ سے مسٹر ایروڈ کو فون کیا۔

”مسٹر ایروڈ! اکل کچھ لوگ میرے پاس آئے تھے۔“ میں نے اسے بتایا۔

”اوہ۔“ اس نے سرد مہری سے جواب دیا۔

”دو افراد جو خود کو تاجروں کی حفاظتی سروس کا آدمی ظاہر کر رہے تھے۔ انہوں نے مجھے مارا پیٹا اور دوسو ڈالر فی ہفتہ طلب کر رہے ہیں۔“ میں نے غصے سے کہا۔

”ٹھیک ہے بیٹے۔ یہ دنیا بڑی ظالم شے ہے۔“

”آپ ان کے بارے میں جانتے تھے مسٹر ایروڈ؟“

”ہو سکتا ہے کہ میں انہیں جانتا ہوں لیکن اس سے کیا فرق پڑتا ہے؟“

”اس شخص کا کیا بنا جس نے مجھ سے پہلے پیٹرول پمپ لیز پر لیا تھا؟“

”بیٹے! غالباً اس نے ادائیگی نہیں کی تھی۔ دو ہفتے قبل دریا سے اس کی لاش ملی ہے۔“

”مسٹر ایروڈ! اس کے بعد آپ کو یہ توقع نہیں رکھنی چاہیے کہ میں پیٹرول پمپ چلاؤں گا۔“

”کیا کہا..... میرے خیال میں تم ایک اچھے لڑکے ہو۔“ ایروڈ نے جواب دیا۔

”لیکن میں آپ کو تین سینٹ فی میلن اور ان بد معاشوں کو دوسو ڈالر فی ہفتہ ادائیں کر سکتا۔“

”یاد رکھو! تم نے لیز اور ایک معاہدے پر دستخط کیے ہیں۔“ اس نے غصے سے دھمکی دی۔ ”اگر تم نے پمپ بند کیا تو میں تم پر مقدمہ کر دوں گا۔“

☆ ☆ ☆

اگلے جمعے کی رات کو میں نے حساب کتاب کیا تو میرے پاس تقریباً پانچ ہزار ڈالر کی رقم موجود تھی۔

اس کے لیے جو راہ راست کی پیروی کرے۔ ہم کو وحی سے بتایا گیا ہے کہ عذاب ہے اس کے لیے جو جھٹلائے اور منہ موڑے۔“ (طہ)

دونوں بھائیوں نے یہ سنا کہ وہ فرعون کے محل میں جائیں گے اور اسے دعوت حق دیں گے لیکن پھر کچھ سوچ کر حضرت ہارون نے یہ تجویز دی کہ پہلے بنی اسرائیل کے بزرگوں کو جمع کر کے انہیں اپنی حالت سے آگاہ کیا جائے تاکہ فرعون کے مقابلے میں وہ ان کے حمایتی بن جائیں۔

صبح ہوئی تو انہوں نے قبیلے کے بزرگوں کو اپنے گھر میں جمع کیا اور جو کچھ ان پر گزرا تھا، وہ سب کہہ سنایا۔ ان بزرگوں نے یہ سن کر کہ خداوند نے بنی اسرائیل کی خبر لی اور ان کے دکھوں پر نظر کی انہوں نے اپنا سر جھکا کر سجدہ کیا اور یو کا بد کو مبارک باد دی کہ خدا نے ان کے بیٹوں کو بنی اسرائیل کا نجات دہندہ بنایا ہے۔

ان کی والدہ نے جب یہ سنا کہ وہ فرعون کے دربار میں جانے کا ارادہ رکھتے ہیں تو بڑے شغف سے انہیں روکنے لگیں۔ ”تم ایک ایسے شخص کے پاس جانا چاہتے ہو جو صاحب تاج و تخت بھی ہے اور ظالم و مغرور بھی۔ وہ تمہارے ساتھ نہ جانے کیا سلوک کرے۔ تم عام مصریوں تک جا کر اپنا پیغام کیوں نہیں پہنچاتے۔“

”اماں جان! آپ گھبرائی کیوں ہیں۔ ہمیں کہا گیا ہے کہ ہم فرعون کے پاس جائیں۔ خدا کا حکم ٹالنا نہیں جاسکتا۔ اس نے ہمیں یہ نوید بھی سنائی ہے کہ ہم ضرور کامیاب ہوں گے۔ عام مصریوں کے پاس جانے کا کوئی فائدہ نہیں۔ وہ سب فرعون کے غلام ہیں اور اس سے ڈرتے ہیں۔ وہ بھی ہماری بات نہیں سنیں گے۔ ہاں اگر ہم نے فرعون کو قائل کر لیا تو سب ہمارے قائل ہو جائیں گے اور پھر ہمیں بنی اسرائیل کو نکال لے جانے کے لیے فرعون ہی کی اجازت کی ضرورت ہوگی۔“

”میں تو اس لیے ڈرتی ہوں کہ وہ تمہیں کوئی نقصان نہ پہنچائے۔“

”کیا آپ کو اللہ کے وعدے پر یقین نہیں؟“

”مجھے تو اس پر بھی یقین ہے اور اس کے رسول موسیٰ پر بھی۔ مجھے یہ بھی خبر ہے کہ میں اس کی ماں ہوں۔“

”تو پھر ہمیں خوشی خوشی اجازت دیں اور ہمارے لیے دعائے خیر کریں۔“

”اللہ ہمیں کامیاب کرنے والا ہے اور میں اپنے اس فعل پر تادم ہوں کہ میں نے جنہیں روکنے کی کوشش کی۔“

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنا بیٹا جبرائیل اور فرعون کے محل کی طرف چل دیے۔ حضرت ہارون ان کے پیچھے پیچھے تھے۔ وہ جس بازار سے بھی گزرے استہزائی قہقہوں نے ان کا پیچھا کیا۔ ایک جگہ کر کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ان لوگوں سے پوچھا۔

”تم لوگ ہمیں فرعون کے پاس جاتے ہوئے دیکھ کر ہنس کیوں رہے ہو؟“

”اس لیے ہنس رہے ہیں کہ جب تم وہاں سے واپس آؤ گے یالاے جاؤ گے تو تمہاری حالت ہمیں رونے پر مجبور کر دے گی۔ ہمیں جتنا ہنسا ہے ابھی ہنس لیں۔“ انہوں نے کہا اور ایک ساتھ پھر کئی قہقہے بلند ہوئے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام جس عظیم مقصد کے لیے روانہ ہوئے تھے ان نادانوں سے الجھ کر اس مقصد سے غافل نہیں ہو سکتے تھے۔ وہ آگے بڑھتے چلے گئے اور فرعون کے محل کے سامنے جا کر رک گئے۔

حضرت موسیٰ کے لیے یہ نیک نیتا تھا اس محل کے لیے حضرت موسیٰ علیہ السلام۔ پہرے دار انہیں اچھی طرح جانتے تھے لیکن اس وقت ان کے چہرے پر جو جلال تھا، وہ اس سے لرزہ بر اندام تھے۔ ان کے پیچھے سے پہلے یہ خبر بھی پہرے داروں تک پہنچ گئی تھی کہ وہ فرعون سے دودھ ہاتھ کرنے آ رہے ہیں۔ انہیں حضرت موسیٰ علیہ السلام سے محبت بھی تھی اور فرعون سے ڈرتے بھی تھے۔ انہوں نے بھی وہی مشورہ دیا جو ابتدا میں ان کی والدہ دے چکی تھیں۔

”آپ کیوں فرعون سے جھگڑا مول لیتے ہیں۔ کیا آپ اس کی جلالت و عظمت سے واقف نہیں؟“

انہوں نے وہی جواب پہرے داروں کو بھی دیا جو وہ والدہ کو دے چکے تھے۔

”ہم اپنی رضا سے یہاں نہیں آئے۔ خدا کا حکم ہے اور ہم اسے ٹال نہیں سکتے اور تم فکر نہ کرو۔ وہ ہمارا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔“

اس وقت تک پورے شہر میں خبر پھیل چکی تھی۔ بہت سے لوگ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ لگے چلے آئے تھے۔ محل کے سامنے ایک بھیڑی جمع ہو گئی تھی۔ کوئی فرعون کی خدائی سے اس کے منہ پر انکار کرنے آیا تھا۔ کچھ لوگ حضرت موسیٰ

علیہ السلام کی ہمت کو داد دے رہے تھے تو کچھ لوگ ان پر افسوس کر رہے تھے۔

کچھ دیر کی سیل و جھت کے بعد محل کا دروازہ ان پر کھول دیا گیا۔ غالباً فرعون نے نہیں چاہتا تھا کہ موسیٰ علیہ السلام پر دروازے بند کر کے یہ تاثر دیا جائے کہ فرعون ان سے مقابلے کی تاب نہ لاسکا۔ انہی دیر میں اسے یہ موقع بھی مل گیا کہ وہ اپنے شیروں کو اپنے گرد جمع کر سکے۔

حضرت موسیٰ نے خوف و خطر اندر داخل ہوئے اور اس کے تخت کے قریب پہنچ کر اس سے مخاطب ہوئے۔

”اے فرعون۔“

”تم دیوتاؤں کے دیوتا کو سجدہ کیوں نہیں کرتے؟“ فرعون کے ایک مشیر نے انہیں ٹوکا۔ ”کیا تو نہیں جانتا کہ تو آسمان

راہ کے منظر کے سامنے کھڑا ہے۔“

”اس کا سبب تو میں بعد میں بتاؤں گا، اس وقت تو میں وہ وجہ بتاؤں گا جس نے مجھے یہاں آنے پر مجبور کیا۔ میں تجھے بتانے آیا ہوں کہ تجھے خدا نے اپنا خیر اور رسول بنا کر تیرے پاس بھیجا ہے۔ اے فرعون! تم مجھ سے دو باتیں چاہتے ہیں۔ ایک یہ کہ خدا پر یقین لاؤ کہ میں کو اس کا شریک نہ بناؤں۔ دوسرے یہ کہ ظلم سے باز آؤ کہ بنی اسرائیل کو اپنی غلامی سے نجات دے۔“

”تو نے اپنے دل سے یہ دونوں باتیں خود گھڑی ہیں۔“ فرعون نے حقارت سے کہا۔

”مجھے یہ جرات کیسے ہو سکتی ہے کہ خدا کا نام لے کر اپنی جانب سے کوئی بات کہوں۔ میری صداقت اس سے ظاہر ہوتی ہے کہ تجھے خدا نے انجرات عطا کی ہیں لہذا تیرے لیے مناسب یہی ہے کہ صداقت و حق کے اس پیغام کو قبول کر اور بنی اسرائیل کو جنہیں تو نے قیدی بنا کر رکھا ہے، چھٹکارا دے کر میرے ساتھ کر دے تاکہ میں انہیں پیغمبروں کی اس سر زمین میں لے جاؤں جہاں ذات واحد کے سوا یہ کسی اور کی پرستش نہ کریں۔“

”ہاں! فرعون کی آواز گونجی۔ ”کیا یہ شخص بنی اسرائیل ہی کا ایک فرد نہیں؟“

”میں نے تو اس کے بچپن ہی میں کہہ دیا تھا۔“

”کیا اس کی قوم ہماری غلام نہیں؟“

”یہ بھی غلام ہی ہے بلکہ خاندانہ اور غلام۔“

خاندانہ اور غلام کا سنا ہے ہی محتاج (فرعون) کو کچھ یاد آ گیا۔ اب وہ حضرت موسیٰ علیہ السلام سے مخاطب ہوا۔

”اے موسیٰ! کیا تو وہی نہیں ہے جس نے میرے گھر میں پرورش پائی؟ بچپن کی زندگی میں میں گزاری اور کیا تجھے وہ وقت بھی یاد نہیں جب تو نے ایک مصری کو قتل کر دیا تھا اور کہیں بھاگ گیا تھا۔ تجھے نہ ان احسانات کا پاس ہے جو میرے گھرانے کے تجھ پر ہیں اور نہ یہ خوف کہ تو ایک مجرم ہے جسے میں کسی وقت بھی گرفتار کر سکتا ہوں۔“

”مجھے تیری کسی بات سے انکار نہیں۔ میں نے تیرے گھر میں پرورش پائی۔ یہی تو قدرت کی کرشمہ سازیاں ہیں۔ جو میرا بھی دشمن تھا اور میری قوم کا بھی، اس سے میری چاکری کرائی۔ اگر اسے میں احسان مان بھی لوں تو تیرا یہ احسان مجھ پر ہے۔ اس سے یہ کہاں ثابت ہوا کہ اس کے صلے میں تو میری قوم کو اپنا غلام بنالے۔ بنی اسرائیل جیسی عظیم قوم سے بیگار لے اور ان سے ذلیل کام کرائے۔ جہاں تک مصری کے قتل کا واقعہ ہے اس وقت میں بتکے والوں میں سے تھا۔ یہ واقعہ اچانک ہوا تھا اور نزول وحی سے قبل ہوا تھا۔ پھر اللہ نے مجھے نبوت دی اور مجھے رسولوں میں سے بنالیا۔“

فرعون نے یہ چاہا تھا کہ اپنے احسانات یا دلا کر حضرت موسیٰ علیہ السلام کے جذبات کو بھار جائے لیکن ان کی دلیل سن کر لا جواب ہو گیا۔ اب وہ اپنی کرنا چاہتا تھا تاکہ اگر گردیشیے ہوئے لوگوں پر فرعون کی کمزوری ظاہر نہ ہو۔

”اے موسیٰ! میں نے بہت چاہا کہ تجھے وہ رعایت دوں جو خاندانہ اور غلاموں کو دی جاتی ہے لیکن تو اس کا اہل نہیں۔ اب تو جج جیتا تجھے مصری دیوتا نے اپنا نمائندہ بنا کر میرے پاس بھیجا ہے جسے تو نبوت اور رسالت کا نام دے رہا ہے؟“

مصری مختلف دیوتاؤں کی پرستش کرتے تھے جن میں سے بعض تو خاص خاص قبیلوں اور علاقوں کے تھے اور ان سب سے بلند آسمان راع تھا یعنی سورج۔

مصریوں کے اثر سے بہت سے بنی اسرائیل کے لوگ بھی ان دیوتاؤں کی پرستش کرنے لگے تھے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام بنی اسرائیل سے تعلق رکھتے تھے۔ وہ یہی جتانے کے لیے ان سے یہ سوال کر رہا تھا کہ مجھے سمجھانے چلے آئے ہو، بنی اسرائیل تو خود ان کی پرستش کرتے ہیں۔

اس کا ایک ہوشیار مصاحب رخ نسواں بحث پر برابر نظر رکھے ہوئے تھا اور بھانپ گیا تھا کہ فرعون لا جواب ہوتا جا رہا ہے۔ اگر حضرت موسیٰ علیہ السلام غالب آگئے تو فرعون کی قوم پر اس کا بہت برا اثر پڑے گا۔ کسی طرح اس مناظرے کو روک دیا جائے اور پھر کوئی تدبیر سوچی جائے۔

رخ نسوے نے ایک مرتبہ پھر حضرت موسیٰ علیہ السلام کو سمجھانے کی کوشش کی اس سے پہلے بھی وہ گفتگو میں دخل دے چکا تھا۔ ”موسیٰ! اس نکل میں تم کوئی سے نہیں ہو۔ فرعون سے بھی واقف ہو اور اس کے مرتبے سے بھی۔ فرعون کی جو حیثیت اس کی قوم میں ہے اس سے بھی واقف ہو۔ مصری قوم اس کی عبادت کرتی ہے۔ تمہیں اگر اس لیے ہاک گفتگو کرنے کی اجازت دی جا رہی ہے تو اسے بھی اپنے لیے رعایت سمجھو۔ یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ تم فرعون سے دشمنی مول لے کر اپنی قوم کو ہلاکت میں ڈال دو۔ تمہیں اگر مال و دولت درکار ہے جس کے لیے تم نے یہ ڈھونڈ کر جایا ہے تو میں فرعون سے تمہاری سفارش کر سکتا ہوں۔“

”اس کے لیے مجھے تمہاری سفارش کی ضرورت نہیں۔ اگر میرا منہ بند رکھنے کے لیے فرعون مجھے مال و دولت دینا چاہتا ہے تو خود اپنی زبان سے کہے۔“

رخ نسوے کا جب تک احساس ہوا کہ وہ اپنے نام میں خود بخشن گیا ہے۔ اگر موسیٰ کے سامنے مال و دولت کے ڈھیر لگائے گئے تو یہ خبر چھپی نہیں رہے گی۔ لوگوں میں فوراً باتیں نہیں کی کہ فرعون کے پاس حضرت موسیٰ علیہ السلام کی باتوں کا جواب نہیں تھا۔ اس پیشکش کے جواب میں فرعون نے بھی اس کی طرف غصے سے دیکھا تھا۔

رخ نسوے نے ایک فلک بازی کھائی اور فرعون کے کان میں کہا۔ ”اس گفتگو کو چند روز کے لیے موقوف کر دیا جائے۔ اس کے بعد کوئی تدبیر سوچی جائے۔“

فرعون کا ترش بھی اب دلائل کے تیروں سے خالی ہو چکا تھا، وہ تو خود فرار کے مواقع ڈھونڈ رہا تھا۔ اس نے رخ نسوے کو اشارہ کر دیا۔

رخ نسوے نے کہنا شروع کیا۔ ”دیوتائی کے دیوتا تجھے ایک موقع اور دینا چاہتے ہیں۔ اس وقت بہتر ہے اس گفتگو کو موقوف کر دیا جائے اور تو چند روز بعد حاضر ہو۔ اس عرصے میں تو بھی سوچ لے گا کہ تیری قوم کے مفاد میں کیا ہے اور میں بھی کوشش کروں گا کہ فرعون کے غصے میں کمی آجائے ورنہ تو وہ تجھے قید میں ڈالنے کا ارادہ کر ہی چکا ہے۔“

”میں بھی کوئی جلدی نہیں ہے۔ ہم تو خود ہی چاہتے ہیں کہ فرعون اس طرح ایمان نہ لائے جیسے کہ اس کے بیروکار خوف اور لالچ سے اس پر ایمان لے آئے ہیں۔ ہم اسے سوچنے کا موقع دیتے ہیں تاکہ وہ خوب اچھی طرح سوچ سمجھ کر فیصلہ کر لے۔“

رخ نسوے نے کچھ آدمیوں کو کل کے بڑے پھاٹک کے ارد گرد پھیلا دیا تھا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرت ہارون علیہ السلام جیسے ہی باہر آئیں، انہیں گرفتار کر لیا اور جب تک میرا حکم نہ آئے انہیں باتوں میں الجھائے رکھنا۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کے رخصت ہوتے ہی مصاحب خاص نے فرعون کو مشورہ دیا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی گرفتاری کے احکام دے دیے جائیں۔

”تو جب بھی سوچے گا ان سارے سوچے گا۔ بنی اسرائیل کو ایک راہنما مل گیا ہے۔ اگر اسے گرفتار کیا گیا تو اس کی پوری قوم اس کی رہائی کے لیے اٹھ کھڑی ہوگی اور ملک میں فساد برپا ہو جائے گا۔ اس کا علاج تو یہ ہے کہ موسیٰ کو اس کی قوم کی نظر دلوں میں گرا دو۔ اس کی قوم کو یہ احساس دلادو کہ موسیٰ اپنی قوم کے کام نہیں آ سکتا بلکہ فرعون سے اچھے کا نتیجہ قوم کے حق میں اچھا نہیں ہوگا۔ موسیٰ کو اس وقت جانے دو لیکن یہ افواہ پھیلا دو کہ موسیٰ، فرعون کو قائل کرنے میں ناکام رہا۔ لا جواب ہو کر واپس چلا گیا اور کہہ گیا ہے کہ تیار ہی کر کے دوبارہ آئے گا۔“

حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرت ہارون علیہ السلام جب تک گھر پہنچے، مصری قوم میں یہ خبر گردش کرنے لگی کہ مناظرے میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کو شکست اٹھانی پڑی ہے۔ وہ فرعون کے سامنے ٹک نہیں سکے اور فرار ہو گئے۔

یہ خبر حضرت موسیٰ کو اس وقت معلوم ہوئی جب ان کی بہن حضرت مریم کے شوہر گھر تشریف لائے اور انہوں نے بازاروں میں ہونے والی گفتگو سے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو آگاہ کیا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے انہیں حقیقت سے آگاہ کیا لیکن وہ پورے شہر کو سمجھانے نہیں جاسکتے تھے۔ انہوں نے معاملہ خدا پر چھوڑ دیا۔

وہ فرعون کی مکاری کو سمجھ گئے تھے کہ انہیں بدنام کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے لیکن یہ خوش آئند بات بھی تھی۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ فرعون کے پاس دلائل ختم ہو گئے ہیں اور وہ قائل ہونے لگا ہے۔ یہ اس کی خدہ ہے جو اسے آخری حربے

اس کی مزید وضاحت فرعون کے قریب بیٹھے ہوئے ایک مشیر نے کی۔

”موسیٰ! تم ان دیوی دیوتاؤں سے واقف تو ہو گے۔ تم نے مصر ہی میں پرورش پائی ہے۔ ان کی پرستش بھی کرتے رہے ہو گے اور آج سورج دیوتا سے مخالفت پر کمر بستہ ہو۔ تم ضرور کسی شیطانی طاقت کے قبضے میں آ گئے ہو۔“

”میں تمہارے بنائے ہوئے معبودوں کا قائل نہیں۔ میں تو صرف ایک ہی ہستی کا قائل ہوں جو جارتی ہے، زندگی دیتی ہے۔ وہ اکیلا ہے، اس کے سوا کوئی نہیں۔ وہی رب العالمین ہے۔“

”یہ تو نئی بات کیا سنا تا ہے کہ میرے علاوہ بھی کوئی رب ہے کہ جس کو تو رب العالمین کہتا ہے۔ اگر یہ صحیح ہے تو اس کی حقیقت بیان کر۔“

اب یہ معلوم ہوتا تھا کہ وہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ مناظرے پر آمادہ ہو گیا ہے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ارشاد فرمایا۔ ”اگر تم مجھ میں یقین اور ایمان صحیح کی تمنا رکھتے ہو تو مجھ کو سمجھنا چاہیے کہ میں جس ہستی کو رب العالمین کہتا ہوں، وہ ذات اقدس ہے جس کے قبضہ قدرت میں آسمان، زمین اور ان دونوں کے درمیان کل مخلوقات کی رہو بیت ہے۔ فرعون! کیا تو دعویٰ کر سکتا ہے کہ کائنات میں جو کچھ ہے اسے تو نے پیدا کیا ہے؟ اگر نہیں اور یقیناً نہیں تو پھر رب العالمین کی رہو بیت سے انکار کیوں کرتا ہے؟“

اس دلیل کا جواب فرعون کو تو سمجھا نہیں، وہ اپنے ارد گرد بیٹھے ہوئے وزیروں کی مدد لینے پر مجبور ہو گیا۔

”تم سنتے ہو یہ کسی عجیب بات کہہ رہا ہے۔ میری رہو بیت سے انکار کرنے کے لیے کسی کیسی عجیب باتیں کر رہا ہے۔“

”آپ اس سے کہتے کیوں نہیں کہ مارا اور زندہ کرنا تو آپ کے اختیار میں بھی ہے۔ آپ ابھی کسی کے قتل کا حکم جاری کریں تو اسے قتل کر دیا جائے۔ جسے قتل کا حکم دیا جائے اسے معاف کر دیں اور حیات بخش دیں۔“

”میں نے معاف کرنے کا نہیں کہا۔ میں تو یہ کہتا ہوں کہ کسی کو قتل کر کے دوبارہ زندہ فرمادیں۔ وہ مصری جو میرے ہاتھ سے قتل ہو گیا تھا اسی کو زندہ کر دیں۔ تم لوگ کیسے خوشامدی درباری ہو کہ جو اپنے آپ کو رب کہتا ہے اس سے اتنا سا امتحان بھی نہیں لے سکتے۔“

”تو اپنے رب سے کیوں نہیں کہتا کہ اس مصری کو زندہ کر دے جو تیرے ہاتھوں سے قتل ہوا تھا۔“

”میرے رب کی خدائی ایک نظام کے ماتحت ہے۔ ہر چیز کا ایک وقت مقرر ہے۔ جب وقت آئے گا، وہ مصری زندہ کر دیا جائے گا۔ کیا تو اس پر بھی ایمان نہیں رکھتا کہ جو میرا وہ دوبارہ زندہ ہوگا اور اسے زندہ کرنے والا میرا رب ہوگا تو نہیں۔“

”اس طرح تو میں بھی کہہ سکتا ہوں کہ میرا رب جی چاہے گا میں مصری کو زندہ کر دوں گا۔“

”کیا تو ان اصولوں کے برخلاف کسی انسان کو پیدا کر سکتا ہے جو اصول خدا نے مقرر کیے ہیں۔ کیا تو میرے خدا کے مقرر کردہ اصولوں کا کوئی متبادل نظام پیدا کر سکتا ہے؟ اگر نہیں تو رب العالمین کی رہو بیت سے انکار کیوں کرتا ہے؟“

”جب تیرا رب تمام مخلوقات کا خالق و مالک ہے اور اس مرتبے پر ہے کہ اس کے سوا کوئی عبادت کے لائق نہیں تو پھر پہلے کے لوگوں نے اس کے فیروں کی پرستش کیوں کی؟ ستاروں، سیاروں اور چاند سورج کو معبود کیوں بنایا؟ تو اس وقت ان کی رہبری کے لیے کیوں نہیں اتارا گیا؟“

”اس کا علم میرے پروردگار کے پاس ہے اور یہ تیرے معبود بننے پر دلیل نہیں۔ تجھ سے پہلے کے لوگوں نے جو کچھ کیا وہ سب اللہ تعالیٰ کے پاس محفوظ ہے۔ اس لیے کہ میرا پروردگار وہ ہے جس کی رہو بیت کے اثر سے تیرا اور تیرے باپ کا وجود بھی خالی نہیں۔ تیرے آباؤ اجداد کو بھی وہی وجود میں لایا تھا جو تجھے وجود میں لایا۔“

فرعون کے پاس ان دلیلوں کا کوئی جواب نہیں تھا۔ جب کسی کے پاس کوئی جواب نہ ہو اور سامنے کو بھی تیار نہ ہو تو پھر سیدی راہ سے ہٹ کر اتنا پ شاپ باتیں کرنے لگتا ہے۔ فرعون کے پاس بھی جواب ختم ہو گئے تھے۔ اس نے اپنے مصاحبوں کو طلب کیا۔

”یہ فیصلے اپنے حواس کھو بیٹھا ہے۔ اس کا ذماغ چل گیا ہے۔ میں یاگوں سے کیا بحث کروں۔“

”فرعون! اس کا مطلب ہے تیرے پاس مجھے جھٹلانے کے لیے کوئی دلیل نہیں رہی۔ ایک مرتبہ پھر زن لے کہ یہ جو شرقت و مغرب اور اس کے درمیان ساری کائنات نظر آتی ہے، اس کی رہو بیت جس کے قدرت میں ہے اس کو میں رب کہتا ہوں یعنی رب العالمین۔ اگر تم ذرا بھی عقل سے کام لو اور ضد چھوڑ دو تو یہ آسانی اس حقیقت کو پا سکتے ہو۔“

سپینس ڈائجسٹ 228 مارچ 2018ء

ذکر الہی

ایک بندہ خدا ایک رات اللہ اللہ کر رہا تھا تاکہ اس مالک حقیقی کے ذکر سے اس کے ہونٹ شیریں ہو جائیں۔
ایکس نے یہ دیکھا تو اس کے پاس جا کر بولا۔
”اوپے وقف چپ کر تب تک اللہ اللہ کرنے میں مصروف رہے گا۔ کبھی اس کی طرف سے جواب بھی آیا ہے
تجھے؟ جب جواب نہیں مل رہا تو اس کے ذکر کیا فائدہ؟“
وہ بندہ خدا سوچ میں پڑ گیا۔ اس کا دل بہت دکھا۔ اسی خیال میں اسے نیند آگئی۔ کیا دیکھتا ہے کہ حضرت خضر
علیہ السلام تشریف فرما ہیں اور اس سے پوچھتے ہیں۔ ”اے اللہ کے بندے! اتونے ذکر کیوں چھوڑ دیا؟“
اس نے جواب دیا۔ ”میں فکر مند ہو گیا ہوں کہ مجھے اللہ کی طرف سے جواب کیوں موصول نہیں ہوا۔ مجھے ڈر
ہے کہ کہیں میرے پروردگار نے مجھ پر اپنا دروازہ بند تو نہیں کر دیا۔“
حضرت خضر علیہ السلام نے فرمایا۔ ”مجھ سے اللہ نے ارشاد فرمایا ہے کہ تجھ کو یہ بتاؤں کہ تو جو اللہ اللہ کرتا ہے وہ
ہماری ہی تو صدائے لیک ہے۔ وہ سوز و گداز جو تیرے دل میں پیدا ہو گیا ہے، وہ بھی تو ہمارا ہی بیجا ہوا ہے۔ کیا میں نے
ہی تجھے اس ذکر میں مصروف نہیں کیا؟ کیا تیرا خوف، تیرا عشق الہی ہماری عنایت نہیں؟ تو جب ایک بار اللہ کہہ کر پکارتا ہے تو
تیرے ذکر میں ہماری بے شمار لیک پوشیدہ ہوتی ہے۔ جو میرا ذکر نہیں کرتے ان کے منہ اور دل پر قفل لگے ہوئے ہیں۔“
اس حکایت میں یہ.... پوشیدہ ہے کہ بندہ جب اللہ کو یاد کرتا ہے، اسے پکارتا ہے تو اس کا مالک و خالق
اس کی پکار سنتا اور جواب دیتا ہے۔

انتخاب: میمونہ عزیز، کراچی

”مجھے خداوند نے بشارت دی ہے کہ یہ سختیاں کچھ دن رہیں گی، اس کے بعد میں تجھے مصر سے نکال لے جاؤں گا۔ تم
فرعون کی دسوس سے باہر چلے جاؤ گے۔“
”تم نے تو کہا تھا تم ہمارے نجات دہندہ ہو۔ ہم تمہارے وعدوں پر خوش ہو گئے تھے مگر اب تو مصری تمہارا بدلہ بھی ہم
سے لے رہے ہیں۔“
”میرا وعدہ غلط ہو سکتا ہے مگر میرے رب کا وعدہ غلط نہیں ہو سکتا۔ وہ تمہیں فرعون سے ضرور نجات دلانے گا۔ اب تم
راستے سے ہٹ جاؤ اور مجھے جانے دو۔“
بنی اسرائیل نے راستہ سے دے دیا لیکن صاف ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ ایسا بے دلی سے کر رہے ہیں۔ آگے چل کر اگر سختیاں
اور بڑھیں تو وہ حضرت موسیٰ کے بالکل ہی خلاف ہو جائیں گے۔
حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرت ہارون علیہ السلام شاہی محل کے پچانک پر پہنچے تو خلاف توقع پہرے داروں نے
کھڑے ہو کر ان کا استقبال کیا۔ اندر جانے میں بس اتنی دیر لگی جتنی دیر میں فرعون انہیں اندر آنے کی اجازت دیتا۔
فرعون نہایت کدو فر کے ساتھ اپنے مشیروں کو ارد گرد لیے تخت پر بیٹھا تھا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے گفتگو میں پہل کی۔
”اے فرعون! ہم نے تجھے سوچنے کا موقع خوب دے دیا۔ تیرے مشیروں نے تجھے کیا صلاح دی اور تو نے کیا فیصلہ کیا؟“
”نبی بات میں مجھ سے پوچھتا ہوں۔ تو نے مجھے اپنا رب مان کر اپنی قوم کے لیے بھلائی کیا کیا نہیں؟“
”ہمارا پروردگار تو وہ ایک ہی پروردگار ہے جس نے دنیا کی ہر چیز کو اس کا وجود بخشتا اور ہر طرح کی ضروری قوتیں
دے کر اس پر زندگی و گل کی راہیں کھول دیں۔ جس نے ہر چیز کو کثرت جسم و وجود عطا کی اور ہر سب کو منزل کمال کی طرف چلنے
کی راہ دکھائی۔ تم کیسے رب ہو سکتے ہو۔ تم تو دوسرے انسانوں کی طرح خالی ہو۔ تم میرے رب پر ایمان لاؤ یا پھر بنی اسرائیل
کو مصر سے نکل جانے کی اجازت دو۔“
”اے موسیٰ! نبی باتیں تم پہلے بھی کہہ چکے ہو۔ میں تمہاری یک بیک سے تنگ آ گیا ہوں۔ اب تم میری ربوبیت تسلیم
کر ورنہ میں تمہیں قید میں ڈال دوں گا اور تمہاری قوم کو طرح کی آذیتیں دوں گا۔“
”اگر تو رب ہوتا تو بنی اسرائیل بھی تیری ہی مخلوق ہوتے۔ خیر ان باتوں کو چھوڑ۔ ہم ایک بار پھر تجھ سے کہتے ہیں کہ ہم

استعمال کرنے پر مجبور کر رہی ہے۔
ابھی یہ مشکل ایک دن گزرا تھا کہ بنی اسرائیل کے بہت سے لوگوں نے ان کے گھر کو گھیر لیا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام
باہر نکلے تو یہ لوگ بہت مشتعل تھے۔

”اے موسیٰ! تم کیا آئے ہماری مشکلات کو اور بڑھ گئیں۔ اس سے تو ہم پہلے ہی اچھے تھے۔“
”صاف صاف بتاؤ۔ میں نے تمہاری کون سی مشکلیں بڑھا دیں؟“
”تم نے فرعون کو ناراض کر دیا۔ اب وہ تمہارا بدلہ ہم سے لے رہا ہے۔“
”کیسا بدلہ؟“

”فرعون نے بیگار لینے والوں اور سرداروں کو جو ہم پر حاکم ہیں، حکم دیا ہے کہ اب تم بنی اسرائیل کو انہیں بنانے کے
لیے ”بکس“ بن دینا جیسے اب تک دیتے رہے ہو۔ وہ سردار اب ہم سے کہہ رہے ہیں کہ ہم خود ہی جا کر ہمیں بنوئیں اور اتنی ہی
انہیں بنائیں جتنی پہلے بناتے تھے۔ اب موسیٰ تم ہی بتاؤ کہ ہم ہمیں بنوئیں یا انہیں بنائیں۔ تم ہمیں سچ بتاؤ و فرعون سے تم
نے کیا باتیں کی ہیں؟“

”میں نے تو تم لوگوں کو مصر سے باہر لے جانے کی بات ہے۔“
”وہ ہمیں کالی کے طعنے دے رہا ہے اور کہہ رہا ہے کہ ہم کام سے بچنے کے لیے موسیٰ کے ساتھ مصر سے باہر جانا چاہتے
ہیں لہذا اس کا حکم ہے کہ ہم سے سخت سختی لے جائے۔“
حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا۔ ”تم فرعون کے مظالم سے مت گھبراؤ۔ صبر و شکر سے کام لیتے رہو اور خدا کی ذات
سے مایوس نہ ہو۔“

ایک بوڑھا آدمی آگے بڑھا اور حضرت موسیٰ علیہ السلام سے گستاخی سے پیش آیا۔ ”خداوند تمہیں کبھے اور تمہارا انصاف
کرے، تم نے تو فرعون اور اس کے خادموں کی نظروں میں ہمیں ایسا گرا دیا ہے کہ گویا ہمارے قتل کے لیے ان کے ہاتھ میں تلواریں
دے دی ہے۔ ہمیں ہمارے حال پر چھوڑ دو۔ ہم یہاں بہت خوش ہیں۔ ہم مصر کو چھوڑ نہیں اور نہیں جائیں گے۔“
”اے میری قوم کے لوگو! میں فرعون کے پاس اپنی مرضی سے نہیں گیا تھا۔ میں تمہاری خواہشوں کے سامنے خدا کے
فرمان کو نظر انداز نہیں کر سکتا، البتہ اسی سے پوچھوں گا کہ تو نے مجھے فرعون کے پاس کیوں بھیجا اور میرے لوگوں کو برائی میں
کیوں ڈالا۔ اب تم لوگ جاؤ اور مجھے خداوند سے پوچھنے دو۔“
وہ لوگ چلے گئے تو حضرت موسیٰ علیہ السلام پر دلی نازل ہوئی۔

”میں فرعون کے دل کو سخت کروں گا اور اپنے نشان اور عجائب ملک مصر میں کثرت سے دکھاؤں گا تو بھی فرعون تمہاری نہ
سنے گا۔ تب میں مصر کو ہاتھ لگاؤں گا اور اسے بڑی بڑی مزامیں دے کر اپنے لوگوں بنی اسرائیل کے جھوٹے ملک مصر سے نکال
لاؤں گا اور میں جب مصر پر ہاتھ چلاؤں گا اور بنی اسرائیل کو ان میں سے نکال لاؤں گا تب مصری جانیں گے کہ میں خداوند ہوں
اور جب فرعون تم کو کہے کہ اپنا بچہ لکھاؤ تو اپنی لاشی کو لے کر فرعون کے سامنے ڈال دینا تاکہ وہ سب بن جائے۔“
ادھر یہ دلی نازل ہو رہی تھی، دوسری طرف فرعون گھبراہٹ کے عالم میں اپنے درباریوں کو لیے بیٹھا تھا۔ اس کے مشیر
اسے مشورہ دے رہے تھے کہ وہ موسیٰ سے ہونے والی گفتگو میں رب العالمین کا تذکرہ نہ چھیڑے۔ لگتا ہے وہ اس موضوع پر
خوب تیار کر کے آئے تھے گفتگو کو موسیٰ کی ذات تک محدود رکھے اور اس سے یہ کہے کہ اگر وہ رسالت کا دعویٰ کرتا ہے تو وہ اس کا
کوئی ثبوت پیش کرے اور کوئی معجزہ دکھائے۔ پس وہ لا جواب ہو جائے گا۔

اس کے مشیروں کے دل میں اللہ ہی نے یہ بات ڈالی ہوگی کیونکہ اللہ کو اپنا بچہ لکھا تھا۔ اسی کے لیے راہ ہموار کی
جاری تھی۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام ایک مرتبہ پھر فرعون کے دربار میں جانے کے لیے گھر سے نکلے۔ اس مرتبہ انہیں روکنے
والے مصری نہیں بلکہ خود بنی اسرائیل کے لوگ تھے جو ان کی راہ میں کھڑے تھے۔

”موسیٰ! تم پھر فرعون سے اعلان جنگ کرنے جا رہے ہو۔ تمہاری ذاتی دشمنی میں ہماری مصیبت آگئی ہے۔ تم اس سے
لڑائی مول لے رہے ہو اور ہم پر سختیاں بڑھتی جا رہی ہیں۔ ہم نہیں ہرگز اس کے پاس نہیں جانے دیں گے۔“
”میری قوم کے نادان لوگو! حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا۔ ہم دونوں بھائیوں کو اپنا کام کرنے دو اور کچھ دن
صبر سے کام لو۔“

تھے کہ تمام لوگ ایک جگہ اکٹھے ہوں تو وہ اللہ کی نشانیں اور براہین کو سب کے سامنے روز روشن کی طرح واضح کر دیں۔ خدا کا معجزہ غالب رہے گا تو ناچار ان کو صداقت اور حق کے سامنے جھکنا پڑے گا اور اقرار کرے بغیر کوئی چارہ نہ رہے گا۔ نیز یہ سوچا کہ اگرچہ ”وحی الہی“ کے مطابق صداقت کا یقین دلا چکا ہوں تاہم فرعون اور اس کے ساتھی اسے جادو کہتے رہے ہیں اور عوام کو اصل حقیقت سے بے خبر رکھنے کی کوشش کرتے رہے ہیں۔ اگر مظاہرہ عوام کے سامنے ہوا اور انہوں نے صداقت کا اقرار کر لیا تو کسی کو لب کشائی کا موقع نہ مل سکے گا۔

”اس کام کے لیے پہلا وقت یوم الزینت (جشن کاروز) ہے۔ تیرے باہر جادوگر اس روز چاشت کے وقت شہر سے باہر میدان میں جمع ہو جائیں۔“

یہ وقت آپ نے اس لیے طے کیا کہ اس وقت آفتاب کی روشنی انتہا کو پہنچ جاتی ہے۔ دن چڑھ چکا ہوتا ہے اور ہر چیز خوب واضح اور روشن ہو جاتی ہے۔

فرعونیوں نے باہمی مشورے سے طے کیا کہ فی الحال تو موسیٰ اور ہارون کو مہلت دو اور اس دوران تمام قلمرو سے ماہر جادوگروں کو دار السلطنت میں جمع کر دو اور پھر موسیٰ کا مقابلہ کراؤ۔

اس دن کے آنے میں ابھی کئی ماہ تھے۔

نجاہ مصری کہتے ہیں کہ غالباً یوم الزینت سے مصریوں کی عید کا وہ دن مراد ہے جو وفا النیل کے نام سے مشہور ہے کیونکہ ان کے یہاں تمام عیدوں میں سب سے بڑی عید کا دن یہی تھا۔

☆☆☆

حضرت موسیٰ علیہ السلام کی بعثت کا زمانہ مصری تمدن کی جو تاریخ پیش کرتا ہے اس میں یہ بات بہت نمایاں نظر آتی ہے کہ مصری علوم و فنون میں سب سے زیادہ ایک مستقل علم کی حیثیت حاصل تھی اور اسی بنا پر ساحرین کا رتبہ مصریوں میں بہت بڑا سمجھا جاتا تھا۔ شاہی دربار تک میں انہیں رسوخ حاصل ہوا کرتا تھا۔ اہم سرکاری معاملات میں بھی انہی کی جانب رجوع کیا جاتا تھا۔

قدیم قوموں کی عام گمراہیوں میں سے ایک گمراہی یہ بھی رہی ہے کہ وہ جادو کی مذہبی حیثیت کے قائل تھے۔ اسی اعتقاد کے پیش نظر وہ اس کو سکھاتے تھے۔ مصر بھی انہی میں سے ایک تھا۔ یہی وجہ تھی کہ مصری قوم پر فرعون کا یہ جادو چل گیا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام جادو گر ہیں اور یہ اپنے جادو کے زور پر مصری حکومت پر قابض ہونا چاہتے ہیں اور اس کا ایک ہی علاج ہے کہ باہر جادو گردوں کو جمع کر کے موسیٰ کو شکست دے دی جائے۔

لغت میں سحر کے معنی امر مخفی اور پوشیدہ چیز کے ہیں چنانچہ صبح کے اول وقت کو سحر اس لیے کہتے ہیں کہ ابھی دن کی روشنی پوری طرح نمودار نہیں ہوئی اور علمی اصطلاح میں سحر ایسے عجیب و غریب امور کا نام ہے جن کے وجود پذیر ہونے کے اسباب نظر سے اوجھل ہوں اور بادی النظر میں محسوس نہ ہوتے ہوں۔

”سحر حقیقت ہے یا نظر کا دھوکا؟ اس بارے میں یہ رائے پائی جاتی ہے کہ سحر حقیقت ہے اور معترضوں کی اثرات رکھتا ہے۔ حق تعالیٰ نے اس میں ایسے مضامین رکھ دیے ہیں جیسے زہر ہیں۔

اس کے برعکس معجزہ دراصل براہ راست خدا کے تعالیٰ کا فعل ہے جو بغیر اسباب کے ایک صادق کی صداقت کے لیے وجود میں آتا ہے اور وہ کسی اصول و قوانین پر مبنی نہیں ہوتا کہ ایک فن کی طرح سکھا جاسکے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کو عصا اور ید بیضا کے نشانات اس لیے عطا کیے گئے کہ ان کے زمانے میں مصر جادو کا مرکز سمجھا جاتا تھا لہذا اتفاقاً تھا کہ ایسے زمانے میں مبعوث ہونے والے نبی کو ایسے معجزات عطا ہوں جو انی نوع (جادو) سے تعلق رکھتے ہوں تاکہ جب انکار پر اصرار حد سے زیادہ بڑھ جائے تو نبی یہ ثابت کرے کہ اس کے پاس جو معجزہ ہے وہ بشری دسترس سے باہر ہے۔

☆☆☆

”موسیٰ (موسیٰ) چاہتے ہیں کہ اپنے جادو سے تم کو تمہارے ملک سے نکال دیں اور تمہارے شاکستہ مذہب کو نیست و نابود کر دیں۔ تم اپنا جادو کا قبیلہ اٹھا کر اور پھر قطار باندھ کر آؤ۔ جو غالب رہا وہی کامیاب ہوا۔“ (ط)

در بار یوں نے فرعون کو مشورہ دیا اور فرعون نے اپنے تمام اعیان و ارباب کا نام احکام جاری کر دیے کہ تمام قلمرو میں جو مشہور اور ماہر جادو گر ہیں ان کو جلد از جلد دار السلطنت روانہ کر دو۔

دو لوگ یہاں اپنے خدا کے بھیجے ہوئے آئے ہیں۔ ہم نے اس کا پیغام تجھ تک پہنچا دیا۔ اب تم لوگ باز آ جاؤ اور مگر ان سے کنارہ کشی اختیار کر لو۔“

”تیرے پاس کیا ثبوت ہے کہ تو ایک ان دیکھے خدا کا بھیجا ہوا ہے۔“

”میں خدا کی جانب سے واضح نشان لے کر آیا ہوں۔“

”اگر تو چاہے تو لا، وہ نشان دکھا۔“

حضرت موسیٰ علیہ السلام آگے بڑھے اور اللہ کے حکم کے مطابق اپنا عصا (لاٹھی) زمین پر ڈال دی۔ یہ عصا زمین پر گرتے ہی اڑ دے کی شکل اختیار کر گیا۔ اس اڑ دے نے حرکت کی تو کھلی جگہ میں مل گیا، لوگ اس کی بے ادبی کرتے ہوئے اس کے سامنے سے بھاگ کھڑے ہوئے۔ اس کی اجازت کے بغیر کوئی انھنی کی جرات نہیں کرتا تھا اور اب بھاگتے پھرتے تھے۔ خود فرعون نے اپنے پاؤں کیٹھ لیے تھے۔

”موسیٰ! یہ کیا؟“

”یہ اللہ کی نشانیں ہیں سے ایک نشانی ہے۔“

”تو سراسر جادو ہے۔ اب اس اڑ دے کو قابو کرو۔ ہم نے تمہارا جادو دیکھ لیا۔“

فرعون کو زبردست شکست ہوئی تھی۔ وہ خود کو ”رب“ کہلاتا تھا اور اب ایک اڑ دے سے خوفزدہ ہو کر اپنے تخت پر پاؤں سینے بیٹھا تھا اور حضرت موسیٰ علیہ السلام سے کہہ رہا تھا کہ وہ اس کے پاس اس کو قابو کریں۔ اپنا بھرم رکھنے کے لیے کہ ضرور ہا تھا کہ یہ جادو ہے لیکن وہ خدا ہی کیا جس پر جادو اثر کر جائے اور اس کے پاس اس کو قابو بھی نہ ہو۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے سانپ کو اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ ہاتھ میں آتے ہی وہ عصا کی شکل اختیار کر گیا۔ پھر حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنا ہاتھ گریبان میں ڈالا اور نکالا تو انتہائی تیز روشن اور چمکدار ہو گیا۔ پھر واپس اپنے گریبان میں ڈالا تو اصلی حالت میں آ گیا۔

سانپ نے لاٹھی کی شکل اختیار کر لی تھی۔ درباریوں کا خوف کسی حد تک زائل ہو چکا تھا۔ ان کے حواس بحال ہوئے تو ان کے دل پہلے کی طرح ایک مرتبہ پھر سخت ہو گئے۔

درباریوں نے فرعون سے کہا: ”یہ تو بہت بڑا جادو گر ہے۔ یہ ہمیں خوفزدہ کر کے ملک مصر سے نکال دینا چاہتا ہے تاکہ خود حکومت کرے اس کے فریب میں ہرگز نہ آنا۔“

”تم نے مجھ سے نشانیاں طلب کی تھیں۔ میں نشانیاں دکھا چکا۔ تم اب بھی اسے جادو کہتے ہو۔ یاد رکھا اگر اب بھی تم انکار کرو تو کوئی عذاب تمہارے لیے تیار کھڑے ہیں۔“

فرعون نے بے بسی سے درباریوں کی طرف دیکھا جیسے پوچھ رہا ہو اب کیا لاٹھی عمل اختیار کیا جائے۔ ہامان آگے بڑھا تاکہ صورت حال کو سنبھالے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ موسیٰ کا جادو درباریوں پر چل جائے۔

”تم جو دس سال مصر سے باہر رہے ہو تو تم نے یقیناً کسی ماہر جادو گر سے جادو سیکھ لیا ہے۔ مگر یاد رکھو کہ مصر میں اس فن کے بڑے بڑے ماہر موجود ہیں۔ تم ان سے مقابلہ کر کے ثابت کرو گے کہ تم کسی کے بھیجے ہوئے پیغمبر ہو یا جادو گر ہو۔“

”افسوس کہ تم مجھے جھوٹا سمجھ کر اپنے لیے عذاب خرید رہے ہو۔“

”بس اب مقابلے سے بھاگنے کی باتیں مت کر۔ مقابلے کا کوئی دن مقرر کر لے تاکہ تیرا جھوٹ سب پر ظاہر ہو جائے۔“

”میں مقابلے کے لیے تیار ہوں لیکن وعدہ کر کہ اگر تو مقابلہ ہار گیا تو میرے خدا پر یقین لے آئے گا اور میری قوم کو مصر سے چل جانے کی اجازت دے گا۔“

”اور اگر تو ہار گیا؟“

”تیرے پاس یہ سوچنے کی گنجائش ہی نہیں کیونکہ میں جادو گر نہیں جو تیرے ساحر مجھے شکست دے دیں گے۔ میں تو خدا کا بھیجا ہوا فرستادہ ہوں اور جو کچھ میں نے دکھا یا وہ جادو نہیں معجزات ہیں۔“

فرعون کے دل میں کہیں نہ کہیں یہ خوف چھپا ہوا تھا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو شکست نہیں ہو سکتی۔ اسی لیے وہ ان کی شرط ماننے کو تیار نہیں تھا اور بات کو کھمپا کر مارتے کی کوشش کر رہا تھا۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے بھی زیادہ اصرار نہیں کیا کہ کہیں فرعون مقابلے سے دستبردار نہ ہو جائے۔ وہ چاہتے ہی یہ

گی۔ کیا تمہارا ایمان اتنا کمزور ہو گیا ہے کہ فرعون سے ڈرنے لگے ہو۔ ایک غیر فانی کے مقابلے میں فانی سے ڈرتے ہو۔ کیا بھول گئے کہ تمہارے اجداد ایک خدا کی عبادت کرتے تھے اور ایمان کے مضبوط تھے۔ جاؤ اپنے اپنے گھروں کو جاؤ۔ آرام سے بیٹھو۔ ”خ انتا اللہ ہماری ہوئی۔“

حضرت ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ وہ ستر جادوگر تھے جو حضرت موسیٰ علیہ السلام کے مقابلے پر آئے۔ مقابلے سے ایک دن پہلے فرعون نے ساحروں کو طلب کیا اور ان کا حوصلہ بڑھانے کے لیے ان سے وعدہ کیا کہ اگر انہوں نے موسیٰ کو شکست دے دی تو وہ انہیں اتنا انعام دے گا کہ ان سے سنبھالا نہیں جائے گا اور سب کو اپنے مقربین خاص میں شامل کر لے گا۔

جادوگروں نے بھی انعام کے لالچ میں آ کر فرعون سے بڑے بڑے وعدے کر لیے۔ یہ وعدے کچھ ایسے بے جا بھی نہیں تھے۔ جادوگروں کو بتایا گیا تھا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے پاس ایک عصا ہے جو سانپ بن جاتا ہے۔ اس کے علاوہ ان کے پاس کوئی اور جادو نہیں۔ جادوگروں کو اپنی کثرت پر بھی ناز تھا۔ عید کا دن آیا تو فرعون اپنی پوری فرعونیت کے ساتھ میدان میں پہنچا۔ اس کے لیے ایک اونچی جگہ پر تخت بچھایا گیا تھا۔ وہ تخت نشین ہوا تو درباری بھی حسب مراتب بیٹھ گئے۔

لاکھوں کا مجمع تھا جو اس مقابلے کو دیکھنے آیا تھا۔ ان میں بنی اسرائیل بھی تھے۔ ان کے لیے یہ صرف مقابلہ نہیں، ان کی قسمت کا فیصلہ تھا۔ ایک طرف مصری جادوگروں کا گروہ اپنے ساز و سامان محراب سے لیس کھڑا تھا۔ دوسری جانب خدا کے رسول حق کے پیغام بڑھائی اور راستی کے پیکر حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرت ہارون علیہ السلام کھڑے تھے۔ جادوگر ایک مرتبہ پھر فرعون کے تخت کے قریب گئے اور کہنے لگے کیا ہمارے لیے انعام ہے اگر ہم غالب رہیں۔ فرعون نے کہا ضرور اور یہی نہیں بلکہ مقربین یا گاہ شاہی بنو گے۔

فرعون کا تو یہ حال تھا کہ اگر اس وقت اس سے کچھ بھی مانگا جاتا تو وہ دینے کو تیار ہو جاتا۔

جادوگر فرعون کے پاس سے ہٹ کر اپنی جگہ پر آئے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے قہر تلخ ادا کرتے ہوئے جادوگروں کو مخاطب کیا۔ فرعون اور اس کے درباری ان کی آواز کو صاف سن رہے تھے۔

”افسوس ہے تم پر کہ تم ہمیں جادوگر کہہ کر خدا پر جھوٹا الزام لگا رہے ہو اور ہمارے مقابلے پر اتر آئے ہو۔ مجھے ڈر ہے کہ اللہ تمہیں اس بہتان طرازی کی سزا میں عذاب دے کر تم کو جڑ سے نہ اکھاڑ پھینکے کیونکہ جس کسی نے بھی بہتان باندھا وہ نافرمانی رہا۔“

درباریوں کو فکر ہوئی کہ کہیں جادوگر ان کی باتوں میں آ کر مقابلے سے دستبردار نہ ہو جائیں کیونکہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی باتیں سن کر جادوگر آپس میں سرگوشیاں کرنے لگے تھے۔ ان کے درمیان آپس میں اختلافات ہو گئے تھے۔ کچھ کہنے لگے یہ پیغمبر کا کلام ہے اور یہ جادوگر نہیں ہیں۔ کچھ کہہ رہے تھے یہ جادوگر ہیں۔

درباریوں نے یہ حال دیکھا تو جادوگروں کو مخاطب کیا۔

”یہ دونوں بھائی بلاشبہ جادوگر ہیں۔ یہ چاہتے ہیں کہ جادو کے زور سے تم کو تمہارے وطن سے نکال دیں اور تم پر غلبہ کر لیں۔ تم اپنا کام شروع کرو اور پرے باندھ کر موسیٰ کے مقابلے میں ڈٹ جاؤ۔ آج جو بھی غالب آ جائے گا وہی کامیاب ثابت ہوگا۔“

قرآن نے اس مضمون کو یوں بیان کیا۔

”حضرت موسیٰ (علیہ السلام) نے کہا افسوس تم پر۔ دیکھو اللہ پر جھوٹی تہمت نہ لگاؤ۔ ایسا نہ ہو کہ وہ کوئی عذاب بھیج کر تمہاری جڑ اکھاڑ دے۔ جس کسی نے جھوٹ بات بنائی وہ ضرور نافرمان ہوا۔ بس آپس میں لوگ ردو کر کرنے لگے اور پوشیدہ سرگوشیاں شروع ہوئیں پھر (درباری) بولے یہ دونوں بھائی ضرور جادوگر ہیں۔ یہ چاہتے ہیں اپنے جادو کے زور پر تمہیں تمہارے ملک سے نکال کر باہر کریں اور پھر تمہارے شرف اور تمہاری عظمت کے مالک بن جائیں۔ پس اپنے سارے داؤ جمع کرو اور پر باندھ کر ڈٹ جاؤ۔ جو آج بازی لے گیا وہی کامیاب ہوا۔“ (سورہ طہ)

تمام مجمع دم بخود کھڑا تھا۔ ہر ذہن یہ سوچ ضرور رہا تھا کہ ایک طرف فرعون جیسے بادشاہ کی ریاستی طاقت اور جادوگروں

ان خطوط کے علاوہ اس نے ایسے افراد بھی مختلف شہروں میں دوڑا دیے جو جادوگروں سے رابطہ کریں اور انہیں مقابلے کے لیے آمادہ کر کے دار الحکومت میں لے کر آئیں۔

قدرت الہی کی حکمت مسلسل اپنا کام کر رہی تھی۔ یہ افراد جس شہر میں بھی پہنچے حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرت ہارون علیہ السلام کا تذکرہ ضرور کرتے۔

ابھی تک حضرت موسیٰ علیہ السلام کا پیغام حق فرعون کے دربار سے باہر نہیں نکلا تھا۔ مصر کے دوسرے شہروں میں لوگ ان کے نام سے بھی واقف نہیں تھے۔ فرعون خود ان کی شہرت میں اضافہ کر رہا تھا۔

ان کے نام کے ساتھ ان کے پیغام کا ذکر بھی ضرور ہوتا تھا۔ یہ بھی بتایا جاتا تھا کہ ان کی لاٹھی سانپ بن جاتی ہے اور وہ اسے اللہ کی نشانی کہتے ہیں۔ لوگوں میں یہ چہ میگوئیاں ہونے لگی تھیں کہ ہوسکا ہے وہ واقعی بنی ہوں جیسے کہ ان سے پہلے بنی آتے رہے ہیں۔

بعض جادوگر تو مقابلے سے پہلے اپنے حریف کے بارے میں زیادہ سے زیادہ معلومات کے خواہش مند تھے اور جب انہیں یہ بتایا جاتا کہ موسیٰ وہی ہیں، جنہیں پہلے ہونے پانی میں صندوق سے نکالا گیا تھا اور پھر فرعون کے گھر میں پرورش پا کر جوان ہوئے اور پھر مصر سے کہیں چلے گئے اور اب آئے ہیں تو یہ کہتے ہوئے آئے ہیں کہ وہ اللہ کے رسول ہیں۔

ان جادوگروں میں سے بہت سوں کو یہ حالات سن کر یقین ہو گیا تھا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام ہی وہ ہیں جن کے آنے کی پیش گوئی نبیوں نے کی تھی۔

وہ یہ سوچتے بھی تھے کہ ان سے مقابلہ کرنا بے کار ہے لیکن فرعون کے حکم سے بے بس تھے اور یہ شوق بھی دامن گیر تھا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو اپنی آنکھوں سے دیکھیں۔

بعض کو یہ تعجب ہوتا تھا کہ وہ کیسے جادوگر ہیں جو تعداد میں صرف دو ہیں اور فرعون ان کے مقابلے کے لیے ہزاروں جادوگروں کو اکٹھا کر رہا ہے۔

یہ سوچ سوچ کر ان کے دل ڈرے جا رہے تھے۔ غرض مقابلے سے پہلے ہی ان جادوگروں پر بے دلی سی طاری ہو گئی تھی یوم الزلیعہ میں دن دن بانی رہ گئے تھے کہ جادوگروں کے قافلے دھڑا دھڑا دار الحکومت پہنچنے لگے۔

فرعون نے لوگوں کو خوفزدہ کرنے کے لیے ان جادوگروں کو رتھوں میں بٹھایا اور سڑکوں پر ان کا گشت کرایا۔ یہ جادوگر طرح طرح کے جادو دکھاتے ہوئے سڑکوں سے گزر رہے تھے۔

مصریوں میں ایک خاص قسم کا جوش و خروش تھا۔ انہیں بے چینی سے اس دن کا انتظار تھا جب یہ مقابلہ منعقد ہو۔ صرف جادوگر ہی نہیں، دوسرے شہروں کے عام لوگ اس منظر کو دیکھنے کے لیے دار الحکومت کا رخ کر رہے تھے۔

ایک جشن تھا جو عید سے پہلے ہی برپا ہو گیا تھا۔ مصریوں کے گھروں میں خوشیوں کے چراغ جل رہے تھے لیکن بنی اسرائیل کے دل خوف اور اندیشوں سے کانپ رہے تھے۔ انہیں یہ ڈر تھا کہ اگر اس مقابلے میں موسیٰ کو شکست ہوگی تو پھر فرعون کے مظالم کی حد نہیں ہوگی۔ اب تک تو ہم فرعون ہی سے سٹ رہے تھے اب یہ جادوگر بھی ہم سے بدلے لیں گے۔

مصر میں بنی اسرائیل کے بارہ قبیلے تھے۔ ان کے بارہ سرداروں نے آپس میں طے کیا کہ موسیٰ کے پاس چلا جائے اور انہیں سمجھا جائے کہ وہ اس مقابلے سے دستبردار ہو کر ہمیں مصیبت سے بچالیں۔ یہ سردار جمع ہو کر حضرت موسیٰ علیہ السلام کے پاس پہنچے۔ کچھ مشتعل تھے کچھ نرم خو۔

”اے موسیٰ! کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ تم فرعون سے صلح کر لو تا کہ ہماری جانیں بچ جائیں۔“

”کیوں تمہاری جانوں کو کیا ہوا۔ مقابلہ تو ہم دو بھائی کر رہے ہیں۔“

”اگر آپ کو شکست ہوئی تو پھر ہماری خیر نہیں۔“

”تم لوگوں نے یہ سوچ بھی کیسے لیا کہ مجھے شکست ہوگی۔“

”کیا تم جادوگروں کی کثرت تعداد کا مقابلہ کر سکتے ہو؟“

”تم انہیں جادوگر کہتے ہو اور یہ خوف بھی رکھتے ہو کہ ہمیں شکست ہو جائے گی۔ یہ تو سمجھو کہ ہم جادوگر نہیں۔ ہمیں تو خدا ان کے مقابلے پر بھیج رہا ہے۔ جادوگروں کا خدا فرعون ہے اور ہمارا خدا رب العالمین ہے۔ پھر ہمیں شکست کیسے ہو جائے

”موسیٰ تم سب کا استاد ہے۔ تم سب نے سازش کر رکھی تھی۔ اسی لیے تو نہ صرف اتنی جلدی شکست تسلیم کرنی بلکہ میری رعایا ہوتے ہوئے میری اجازت کے بغیر موسیٰ کے خدا پر ایمان لے آئے تاکہ دوسرے لوگ بھی تمہاری پیروی کریں لیکن میں ایسا ہونے نہیں دوں گا۔ تم میں کوئی جو میرے ساتھ نہ آئے گا کہ آئندہ کسی کو ایسی غداری کی جرأت نہ ہو۔ پہلے تمہارے ہاتھ پاؤں کنواؤں گا اور پھر سب کو سولی پر چڑھاؤں گا۔ اگر موسیٰ کا خدا تمہیں بچا سکتا ہے تو بچالے۔ ابھی سب کو معلوم ہو جائے گا کہ مصریوں کا خدا میں ہوں۔“

جادوگروں نے بھی ترکی پر ترکی جواب دیا۔
”ہم یہ بھی نہیں کر سکتے کہ چٹائی کے جو روشن دلائل ہمارے سامنے آ گئے اور جس خدا نے ہمیں پیدا کیا ہے اس سے منہ موڑ کر تیرا حکم مان لیں تو جو فیصلہ کرنا چاہتا ہے کر گزر۔ تو زیادہ سے زیادہ یہی کر سکتا ہے کہ دنیا کی اس زندگی کا فیصلہ کر دے۔ ہم تو اپنے پروردگار پر ایمان لائے کہ وہ ہماری خطائیں بخش دے خصوصاً جادوگری کی خطائیں پر تو نے ہمیں مجبور کیا تھا۔ ہمارے لیے اللہ ہی بہتر ہے اور وہی باقی رہنے والا ہے۔“
ان جادوگروں نے اسی پر اکتفا نہیں کیا بلکہ فرعون کو بھی نصیحت کر ڈالی۔

”اے فرعون! تو مجرموں میں سے مت ہو جا۔ ہماری طرح تو بھی ایمان لے آؤ نہ جہنم تیرا ٹھکانا ہوگا۔ کیا تجھے خود اور لوٹکی بستیوں یا دنیوں۔ اب بھی وقت ہے ایمان لے آ۔“

فرعون کے لیے عذاب عظیم مقرر ہو گیا تھا۔ کھلی نشانیاں دیکھ کر بھی اس کے دل کی سختی میں نرمی پیدا نہ ہو سکی۔ اس کی ضد اور بے جا مصیبت نے اسے راہ راست پر نہ آنے دیا۔ اس نے حکم دیا کہ جو جادوگر موسیٰ کے خدا پر ایمان لے آئے ہیں انہیں سولی پر لٹکا دو۔ تاکہ دوسروں کو معلوم ہو کہ مجھے سے غداری کرنے والوں کا انجام کیا ہوتا ہے۔
فرعون نے ان ایمان لانے والوں کو عذاب سے دو چار کر کے سولی پر چڑھا دیا۔ یہ مبینہ یں کہتے ہوئے سولی پر چڑھ گئے۔
”ہمارے رب ہم پر میری مثال اور ہم کو اسلام کی حالت میں وفات دے۔“

جادوگروں کے علاوہ اسرائیلیوں جو ان میں سے بھی ایک مختصر جماعت مسلمان ہو گئی مگر وہ فرعون کے ظلم و ستم کی دہر سے اعلان نہ کر سکی۔

”پھر موسیٰ علیہ السلام پر کوئی ایمان نہیں لایا مگر صرف ایک۔۔۔ گروہ جو اس قوم کے جو جوانوں کا گروہ تھا۔ وہ بھی فرعون اور اس کے سرداروں سے ڈرتا ہوا کہ کہیں کسی مصیبت میں نہ ڈال دے۔“ (سورۃ یونس)

جب اس عظیم واقعے میں حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنے آپ کو فرعون کی شکست سے دو چار ہوا تو اس کا پریشانی اور گہرا ہمت میں جھٹلا ہوا فطری تھا لیکن اس کی ضد کا برا ہو کر دل کی سختی مزید بڑھ گئی۔ اسے اپنی عافیت سے زیادہ اپنی شان و شوکت کی فکر تھی۔ شاید اب تک وہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی طرف سے زیادہ فکر مند نہیں ہوا تھا۔ یہ جھٹھار ہاتھ کا تھا کہ انہیں زیر کر لے گا۔ دوسرے یہ کہ اب تک موسیٰ اور اس کے درمیان ہونے والی گفتگو اس کے بار تک محدود تھی لیکن اس نے خود ہی گھمنڈ میں آ کر اس جنگ کو محل سے باہر مکیدان میں منتقل کر دیا۔ اب اسے یہ ڈر ہو رہا تھا کہ اگر موسیٰ سے متاثر ہو کر میری قوم موسیٰ پر ایمان لے آئی تو میرے اقتدار کا سورج بالکل ہی غروب ہو جائے گا۔ وہ خود کو ”رب“ کہلاتا تھا اس کا غرور خاک میں مل گیا تھا۔

یہی حال اس کے سرداروں کا تھا۔ اس اقتدار میں وہ بھی فرعون کے شریک تھے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے اقتدار کا مطلب یہ تھا کہ انہیں بھی زوال کا منہ دیکھنا پڑتا۔ وہ جو فرعون کے نام پر اپنی قوم سے دولت بنورے میں لگے ہوئے تھے وہ سب دروازے بند ہو جاتے۔ یہی سردار فرعون کو غلط مشورے دے کر اس کے کفر میں اضافہ کرتے چلے جا رہے تھے اور اپنے اقتدار کو بول دینے کی کوششوں میں مصروف تھے۔ یہ شکست تو ایسی تھی کہ ان کے ہوش بالکل ہی اڑ گئے۔

تمام سرداروں کی قوم جمع ہوئے اور فرعون کو گھیر کر بیٹھ گئے۔ موجودہ صورت حال پر غور کرنے لگے اور جب بہت باتیں ہو چکیں تو انہوں نے ایک زبان ہو کر فرعون سے استفسار کیا۔

”کیا تو موسیٰ اور اس کی قوم کو یونہی چھوڑنے کا کردہ ملک میں فساد چاہتے پھر میں؟ تجھے اور تیرے دیوتاؤں کو ٹھکراتے رہیں؟ کیا تو اپنی کمزوری اپنی قوم پر ظاہر کر دے گا کہ تو نے موسیٰ اور اس کی قوم کو زندہ چھوڑ دیا؟ آج جو لوگ تجھے سجدہ کرتے ہیں، تو چاہتا ہے وہ تجھے سجدہ کرنا چھوڑ دیں اور موسیٰ کی باتوں میں آ کر تجھ سے بغاوت کریں اور اس کی قوم ہم پر غالب آ جائے؟ اگر تو نے ابھی کوئی تدبیر نہ کی تو یہ قند بڑھتا جائے گا۔ جلد کوئی تدبیر کر ورنہ ہمیں اجازت دے۔“

کی کثیر تعداد ہے، دوسری جانب دو بھائی اکیلے ہیں۔ ان کی پشت پر کوئی دنیادی طاقت نہیں۔ وہ پھر بھی خوفزدہ نہیں۔ کوئی بات ضرور ہے وہ جو کہتے ہیں وہ خدا کے بھیجے ہوئے رسول ہیں۔ شاید یہی سچ ہے۔ پھر شیطان اپنا کام دکھاتا تھا۔ باطل خیالات انہیں گھیر لیتے تھے۔ فرعون کی طاقت کا خیال آتا تھا۔ یہ خیال مصریوں کے دلوں میں بھی تھا کہ موسیٰ کی بات مان کر اپنے دیوتاؤں کو چھوڑنا پڑے گا۔ مصیبت بھی غالب آ رہی تھی۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام بنی اسرائیل میں سے تھے اور مصریوں کے نزدیک بنی اسرائیل غیر مذہب تھے۔ اگر موسیٰ کی عملداری ہو گئی تو بنی اسرائیل ان پر حاوی ہو جائیں گے۔ مفت کے غلام ہاتھ سے چلے جائیں گے۔

جادوگروں کی صفوں میں بھی یہی باتیں ہو رہی تھیں لہذا وہ آگے بڑھنے میں پس و پیش کر رہے تھے۔ انعام کا لالچ انہیں اکساتا تھا اور عذاب کا خوف روکتا تھا۔

مصریوں نے قحطی کی گھبراہٹ شروع کیا کہ آگے کیوں نہیں بڑھتے۔ آگے بڑھو اور موسیٰ کا غرور خاک میں ملا دو۔ جادوگروں نے یہ آوازیں سنیں تو انہیں ہوش آیا۔ ان میں سے کچھ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے پاس پہنچے۔

”موسیٰ! اپنی تبلیغ کو چھوڑ۔ تیرے کلام کا ہم پر کوئی اثر ہونے والا نہیں۔ اب تو تم یہ بتاؤ کہ ابتدا ہمارے جانب سے ہو یا پہل تم کرو گے؟“

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے نہایت اطمینان سے جواب دیا۔ ”میں نے تمہیں تلقین کر کے اپنا حق ادا کر دیا۔ اب تمہارا فیصلہ اللہ کے ہاتھ میں ہے۔ رہا پہل کرنے کا معاملہ تو میں تمہارے مقابلے پر نہیں آیا ہوں تم میرے مقابلے پر آئے ہو۔ جادو کا دعویٰ مجھے نہیں تمہیں ہے لہذا پہل بھی تم ہی کرو۔“

جادوگروں نے کہا اچھا تو پھر ہم دکھاتے ہیں۔ یہ لوگ اپنے ساتھ رسیاں اور لائیاں لائے تھے۔ یہی ان کا جادوئی ساز و سامان تھا۔ انہوں نے رسیوں کے ٹکڑے اور لائیاں زمین پر پھینک دیں اور نعرے لگاتے گئے۔
”فرعون کی عزت کی قسم! ہم ہی غلبہ پانے والے ہیں۔“

اچانک ان کے جادو کی وجہ سے ایسا دکھائی دیا کہ ان کی رسیاں اور لائیاں سانپ بن کر دوڑ رہی ہیں۔ ہزاروں سانپ میدان میں دوڑ رہے تھے۔ یہ ایسا خوفناک منظر تھا کہ سب کی سانسیں رک گئی تھیں۔ یہ منظر دیکھ کر حضرت موسیٰ علیہ السلام کے دل میں خوف پیدا ہوا۔ اپنی شکست کا خوف نہیں بلکہ یہ ڈر پیدا ہوا کہ عوام الناس ان کے جادو کو دیکھ کر دھوکے میں نہ آ جائیں۔ اسی وقت حضرت موسیٰ علیہ السلام پر وحی نازل ہوئی۔

”اندیشہ نہ کر تو ہی غالب ہوگا۔ تیرے دام میں ہاتھ میں جھوٹا بھی ہے فوراً پیچھک دے۔ جادوگروں کی تمام بناوٹیں نکل جائے گی۔ انہوں نے جو کچھ کیا ہے محض جادوگروں کا فریب ہے اور جادوگر کسی راہ سے آگے کامیاب نہیں ہو سکتا۔“

اجازت الہی کی دیر بھی حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنا عصا زمین پر پیچھک دیا۔ زمین پر گرے ہی یہ لامحی عظیم شکل و صورت والا اثر ڈھا بن گئی۔ اس کے پاؤں بھی تھے اور بڑی موٹی گردن اور بھیا تک انتہائی چوڑی گھبراہٹ سے والی شکل تھی۔ اسے دیکھتے ہی لوگ ادھر ادھر بھاگنے لگے۔ یہ اثر ڈھا جادوگروں کی بھیگی ہوئی رسیوں کی طرف متوجہ ہوا اور ایک ایک کر کے سب کو نکلے لگا۔

یہ ایسا کرشمہ تھا جو جادوگروں کے دل و دماغ میں بھی نہ آیا ہوگا۔ وہ آنکھیں پھاڑے اس منظر کو دیکھ رہے تھے۔ ان کے دلوں نے گواہی دی کہ یہ کوئی جادو اور شعبہ نہیں بلکہ یہ ایسا حق ہے جس پر حق کے سوا کوئی قادر نہیں ہو سکتا۔ حقیقت ان پر کھل گئی۔

اللہ نے ان کے دلوں سے غفلت کے پردے ہٹا دیے وہ پروردگار کے حضور سجدہ ریز ہو گئے۔ انہوں نے فرعون کی موجودگی کی پروا بھی نہیں کی اور حاضرین کو گواہ بنا کر اقرار کیا۔

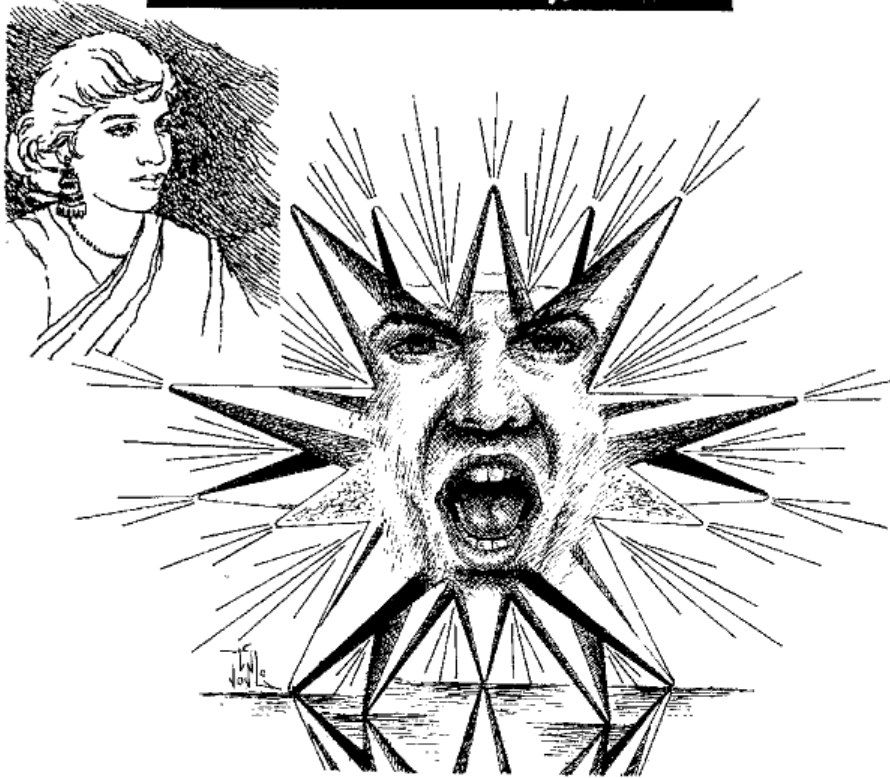
”ہم ہماروں اور موسیٰ کے رب پر ایمان لے آئے جو کچھ موسیٰ نے دکھا یا ہم اپنے ظلم کے مطابق کہتے ہیں کہ یہ ہرگز جادو نہیں بلکہ جادو سے... بالآخر خدا کا مجزہ ہے۔ اس کا سحر سے دور کا بھی واسطہ نہیں۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام بے شک خدا کے رسول ہیں۔“

فرعون ان کے منہ سے الفاظ نہیں چھین سکتا تھا لیکن پھر ہاتھ کا اس کا فرام فریب تار تار ہو گیا ہے۔ موسیٰ (علیہ السلام) کو شکست دینے کی جو آخری تدبیر بھی وہ بھی نہ کام ہوئی۔ اب اس نے مصریوں کو بھگانے کے لیے فریب کا دوسرا راستہ اختیار کیا۔

ناکام منظر امام

کامیابی ہو یا ناکامی... ہمیشہ عمل اور یہ عملی کی چادر میں پوشیدہ ہوتی ہے۔ وہ بھی کچھ ایسا کرنا چاہتے تھے جس سے دنیا بھی حیران رہ جائے، کچھ کرنا بھی نہ پڑے... اس کے لیے تو انسان کو بڑی میٹھی اور گہری نیند کی ضرورت ہوتی ہے اور نیند کے بعد ایک تفصیلی خواب بھی چاہیے ہوتا ہے۔

ناکامی سے منہ چھپانے اور ڈر جانے والوں کے لیے ایک حساس تحریر



کر خلا میں جھولتا رہ گیا۔

وہ بہت محکمہ فیز پوزیشن میں پھنسا ہوا تھا۔

اس کا ایک بیروٹے ہوئے تختے کے اندر دھنسا ہوا

جھول رہا تھا اور دوسرا بیروٹے والی سیز جیوں میں اٹکا ہوا تھا

حامد کے لیے آج کا دن ہی منحوس تھا۔

پہلا حادثہ تو یہ ہوا کہ فلیٹ سے نکل کر جب وہ لکڑی

کی سیز جیوں کے ذریعے نیچے اترنے لگا تو اچانک ایک

سیز جی کا تختہ ٹوٹ گیا اور اس کا ایک پیر اس تختے میں دھنس

سرداروں نے فرعون کو اتارنا ہیچینہ کر دیا کہ اس کے غضب نے خود اسے گھیر لیا اور وہ کفر و منکرات کی طرف تیزی سے بڑھنے لگا۔ غصے کے عالم میں اپنی نشست سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

”اب تم دیکھتے جاؤ کہ میں موئی اور اس کی قوم کے ساتھ کیا کرتا ہوں۔ میں ابھی حکم دیتا ہوں کہ بنی اسرائیل کی اولاد زینہ کو پیدا ہوتے ہی قتل کر دیا جائے اور صرف لڑکیوں کو زندہ رکھا جائے تاکہ ہم جو انہوں نے پر انہیں اپنی باندیاں بنائیں۔“

اس وقت دربار میں ہونے والی یہ گفتگو جب دربار سے باہر نکلی تو اس اعلان نے بنی اسرائیلیوں کو ہراساں کر دیا کہ فرعون ہمارے بیٹوں کو قتل کرے گا۔

فرعون مصر کا یہ دوسرا اعلان تھا جو بنی اسرائیل کے بچوں کے قتل کے بارے میں کیا گیا۔ حضرت موئی علیہ السلام کی پیدائش سے پہلے بھی یہ اعلان کیا گیا تھا۔ اس وقت اس اقدام کا مقصد یہ تھا کہ حضرت موئی علیہ السلام کو دنیا میں آنے سے روکا جائے اور اب مقصد یہ تھا کہ حضرت موئی علیہ السلام کی شان و شوکت کو خاک میں ملایا جائے اور ان کی قوم کو ان کے خلاف کھڑا کر دیا جائے۔

ایسا معلوم ہوتا ہے اس ظالمانہ فعل میں کچھ دنوں کے لیے کمی آگئی تھی اب پھر اس پر عمل کرنے کا اعلان کیا گیا۔ مقصد یہ تھا کہ اگر موئی علیہ السلام کسی وقت فرعون کے لیے لشکر تیار کریں تو انہیں فوجاں میسر نہ آسکیں۔

بنی اسرائیل کی بہتوں میں جان کا خوف پھر سے دار بنا ہوا تھا۔ ہوا کو وہ چراغ ہی نہیں مل رہا تھا جسے وہ بھجائے، گھروں میں اندھیرا تھا۔ صرف ایک بڑے گھر میں چراغ روشن تھا جہاں اسرائیلی قبیلوں کے سردار آپس کی مخالفتوں کو بھلا کر بنی صورت حال پر غور کر رہے تھے۔ غور و فکر کے بعد وہ اس نتیجے پر پہنچے تھے کہ بنی اسرائیلیوں کے ذمے دار حضرت موئی علیہ السلام ہیں بلکہ اس سے پہلے بھی انہی کی پیدائش کو روکنے کے لیے ہمارے بچوں کو قتل کیا جا رہا تھا۔

جب کسی قوم پر غلامی کی حالت میں صدیاں گزر جاتی ہیں تو وہ صرف مفلس و بدحال ہی نہیں ہو جاتی بلکہ ہمت و شجاعت کا جوہر بھی ان میں سے نکل جاتا ہے۔ وہ اپنی موجودہ حالت سے اتنے مطمئن ہو جاتے ہیں کہ اس سے نکلنے کی کوشش ہی نہیں کرتے بلکہ جب کوئی مصلحت یا نتیجہ انہیں اس حالت سے نکلنے کے لیے کوشاں ہوتا ہے تو راہ کی سختیوں سے گھبرا کر خود نکات دہندہ کو لازم دینے لگتے ہیں۔ یہی حال حضرت موئی علیہ السلام کی قوم کا تھا بار بار یہ کہتے نظر آتے... کہ ہم غلام ہی شعیب تھے، تم نے فرعون سے لڑائی کیوں مول لی۔ اب وہ اس اعلان کا سبب بھی حضرت موئی علیہ السلام ہی کو سمجھ رہے تھے لہذا پھر سے ہوئے حضرت موئی علیہ السلام کے پاس پہنچ گئے۔

”کیا ہم نے نہیں کہا تھا کہ فرعون کے پیچھے ہوئے جاؤ گروں سے مقابلہ نہ کرو۔ کیا ہم نے صلاح نہیں دی تھی کہ فرعون سے صلح کرو۔ اب فرعون نے ہمارے بچوں کے قتل کا حکم دے دیا ہے۔ اس سے تو ہم غلام اچھے تھے۔ اب ہماری نسل کشی کی جائے گی۔“

”اس سے اندازہ کر لو کہ فرعون اللہ اس کے رسول اور بنی اسرائیل کا کھلا دشمن ہے۔ تم اس کے خلاف اٹھ کھڑے کیوں نہیں ہوتے۔“

”فرعون تو ہمارا دشمن ہے ہی لیکن ہم پر یہ مصیبتیں صرف تمہاری وجہ سے آئی ہیں۔ ہم تو سمجھ رہے تھے کہ تمہارے آ جانے سے ہمارے مصائب میں کمی آجائے گی لیکن یہ تو پہلے سے بھی بڑھ گئی ہیں۔ تم خود بھی ہلاک ہو گے اور ہمیں بھی ہلاک کرو گے۔ ہم تمہاری خاطر فرعون سے جنگ کرنے والے نہیں۔“

حضرت موئی علیہ السلام نے انہیں سمجھایا۔ ”اللہ سے مدد چاہو اور صبر کرو۔ بلاشبہ زمین اللہ کی ملکیت ہے وہ اپنے بندوں میں سے جس کو چاہتا ہے وراثت بنا دیتا ہے اور انجام (کی کامیابی) منتفیوں کے لیے ہی ہے۔ وہ وقت فریب ہے کہ تمہارا پروردگار تمہارے دشمن کو برا دے گا اور تم کو اس زمین کا خلیفہ بنادے گا اور پھر دیکھو کہ تم کس طرف عمل کرتے ہو۔“

(جاری ہے)

ماخذات

قصص القرآن، مولانا محمد حفظ الرحمن، قصص الانبیاء، ابن کثیر، توریت، ارض القرآن، سلیمان ندوی، ترجمان القرآن، ابوالکلام آزاد، انبیائے قرآن، جمیل احمد۔

اور بہت نیچے فرش تھا۔ اگر وہ تختہ مکمل ٹوٹا ہوتا تو وہ سیدھا نیچے آ جاتا۔

اوپر سے کسی فلیٹ کا دروازہ بند ہونے کی آواز آئی۔ وہ سمجھ گیا کہ خطی اکرم نیچے آ رہا تھا۔ اکرم ایک بوڑھا آدمی تھا اور حامد کی طرح وہ بھی اکیلا ہی رہتا تھا۔ اس کی باتیں دماغ کھانے والی ہوا کرتیں۔

وہ سیزہیاں اترتا ہوا حامد کے پاس آ کر رک گیا۔ "حامد صاحب! آپ اس طرح کیوں لنگ رہے ہیں؟" اس نے حیرت سے پوچھا۔

"جناب! میں بخیر ہوں۔" حامد نے بتایا۔ "خود دیکھ لیں۔ سیزہی ٹوٹ گئی ہے۔"

"تو کیا ہوا۔ ایک ہنگسے سے اپنا بیڑ باہر نکال لیں۔" اکرم نے کہا۔

"بہت مشکل ہے۔ میں کوشش کر کے دیکھ چکا ہوں۔"

"دیکھیے یہ تو کوئی بات نہیں کہ آپ نے پورا راستہ گھیر رکھا ہے۔ اب مجھے نیچے جانا ہے تو کیسے جاؤں۔"

"تمہارا کیا خیال ہے کہ میں جان بوجھ کر اس میں ٹھس گیا ہوں۔" حامد غصے سے بولا۔ "میں مجھے شوق ہو گیا ہے کہ اپنے آپ کو اس مصیبت میں ڈال لوں۔"

اس دوران نیچے والی منزل کا ایک آدمی اوپر جانے کے لیے سیزہیوں پر آ یا اور حامد سے خطی سیزہی پر آ کر رک گیا۔ "او بھائی، وہ اکھڑ لچے میں بولا۔" یہ کیا رولا بچایا ہے۔ ہوا ایک طرف۔ مجھے اوپر جانا ہے۔"

"ارے بھائی! میرا پاؤں اس تختے میں پھنس گیا ہے۔" حامد نے کہا۔ "خدا کے لیے میری مدد کرو۔ نکالو مجھے۔"

اب اس آدمی پر اصل سیزہی روشن واضح ہوئی تھی۔ "ہاں یار۔ تو تو واقعی پھنس گیا ہے۔ اب کیا کرے گا۔۔۔ کیسے نکلے گا؟"

"بھائی! میں اپنی کوشش سے نکل نہیں سکتا۔ تم سب مل کر کوئی راستہ نکالو۔"

کچھ اور لوگ بھی آ کر اوپر نیچے رک گئے۔ وہ سب مل کر اس صورت حال پر غور کر رہے تھے۔ اب یہ بات ہو رہی تھی کہ دس بار بلڈنگ کے مالک کو کہا جا چکا ہے کہ وہ لکڑی کی سیزہیاں ختم کر کے سینٹ کی پکی سیزہیاں بنادے لیکن وہ سننا ہی نہیں ہے۔

ایک صاحب نے کہا۔ "میں اس بندے کی اسی طرح پھنسی ہوئی تھی اور اخبار والوں کو سمجھوں گا۔"

"اس سے کیا ہوگا؟" کسی نے پوچھا۔

"تم دیکھ لینا کیا ہوتا ہے۔ عدالت اس کا نوٹس لے گی۔ بلڈنگ کے مالک کے خلاف کیس ہو جائے گا۔"

"اور جب تک کیا میں اسی طرح پھنسا ہوں۔" حامد حلق پھاڑ کر چلا یا۔

"نہیں، نہیں۔۔۔ تم بھی نکل آؤ گے۔"

"بلکہ تمہارے لیے تو ایک زبردست چانس ہے۔"

ایک نے کہا۔ "کمانی کا ایسا سہرا چانس ہر ایک کو نہیں ملتا۔"

"اب اس میں میری کون سی کمانی ہو جائے گی؟"

"بہت سامنے کی بات ہے حامد بھائی۔" ایک نوجوان نے کہا۔ "تم اس بلڈنگ کے مالک پر کیس کر سکتے ہو۔ تم یہ کہہ سکتے ہو کہ تم کو ایک ضروری ایگریمنٹ پر سائن کرنے کے لیے جانا تھا لیکن سیزہی میں پھنسنے کی وجہ سے تم نہیں جا سکتے۔"

"اور اس پر دوسرا کیس یہ بتا ہے کہ اس سیزہی کی وجہ سے تمہاری ٹانگ ڈنچی ہو گئی ہے۔"

"تم سب کے سامنے تماشائین کر رہے گئے ہو۔" کسی اور نے لقمہ دیا۔

"کم از کم پچاس لاکھ کا کیس ہو سکتا ہے اس پر۔"

"بھائی! پچاس لاکھ تو بہت زیادہ ہیں۔" کسی نے کہا۔

"نہیں کمال صاحب! اس جیسے دولت مند بندے کے لیے یہ کچھ نہیں ہیں۔"

"خدا کے لیے تم لوگ مجھے نکالنے کی کوشش کرو۔"

حامد نے کہا۔ "میں کب تک پھنسا ہوں۔"

"حامد بھائی! ذرا یہ تو سوچو کہ تمہاری وجہ سے پوری بلڈنگ میں رہنے والوں کا کتنا بیلا ہو جائے گا۔ یہ سیزہیاں ختم ہو جائیں گی۔ پکی سیزہیاں بن جائیں گی اور تم پوری بلڈنگ کے ہیرو کہلاؤ گے۔"

اس دوران میں حامد کے فلیٹ کے سامنے والے فلیٹ کی شہلا بھی آ کر اس بیڑ میں شامل ہو گئی تھی۔ حامد کا دل اسے دیکھ کر کئی بار دھڑکا تھا اور اس کا بھی شاید یہی حال ہو۔ وہ بھی حامد کے اس کیس میں دلچسپی لینے لگی تھی۔

اس نے حامد کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "حامد صاحب! شاید آپ کے علم میں نہ ہو کہ میں ایک چینیٹ کے لیے کام کرتی ہوں۔"

"نہیں۔ یہ مجھے نہیں معلوم تھا۔" حامد مسکرا دیا۔

"آپ ہمارے چینیٹ کو انٹرویو دے دیں۔ یہ ہماری آج کی بریکنگ نیوز ہوگی۔"

"وہ تو شیک ہے لیکن اس انٹرویو کی بنیاد کیا ہوگی؟"

"وہ یہ بتائیں گے کہ آپ میں کتنا حوصلہ ہے۔ کتنی برداشت ہے۔ آپ کس عزم کے ساتھ اس مصیبت کا مقابلہ کر رہے ہیں۔"

آس پاس کھڑے لوگوں نے تائیاں بجا دیں۔

حامد کی دھڑکنیں تیز ہونے لگی تھیں۔ شہلا خود اس کی طرف متوجہ ہوئی تھی۔ اگر یہ حادثہ برپا نہیں ہوتا تو وہ ہمیشہ کی طرح اسے نظر انداز کرتی ہوئی اس کے برابر سے گزر جاتی۔

اب وہ دل ہی دل میں اس حادثے کا شکر گزار ہونے لگا تھا اور جہاں تک خود اس کے پھنسنے کا معاملہ تھا۔ یہ کوئی اتنی بڑی بات نہیں تھی۔ وہ ذرا سا جھٹکا دے کر اپنے پیرو کو آگے پیچھے کر کے اس سیزہی سے نکل سکتا تھا۔

اس دوران میں بلڈنگ کا ایک آدمی اپنے ہاتھ میں ایک فائل لیے ہوئے آ گیا۔ اس نے دیکھوں جیسا کالا کوٹ پہن رکھا تھا۔ حامد کے لیے وہ اچھی تھا۔ اس نے آتے ہی اپنا تعارف کر دیا۔ "ناچیز کو تسلیم فاروقی کہتے ہیں۔" اس نے بتایا۔ "میں دیوانی مقدمات کا ماہر ہوں۔ اس حادثے کا سننے ہی میں نے مالک کے خلاف کیس تیار کر لیا ہے۔ اب سب کے اور خاص طور پر آپ کے سامنے کروانے ہیں۔"

"دیکھیں صاحب! کیا مالک پچاس لاکھ دے دے گا؟" شہلا نے پوچھا۔

"میڈم! آپ پچاس لاکھ کی بات کر رہی ہیں، میں نے تو اتنی لاکھ کا پروگرام بنایا ہے۔"

دیکھ کے اس بیان پر زوردار تائیاں بجا لگیں۔

شہلا نے اس بار لگاتار پچاس لاکھ کے انداز میں حامد کی طرف دیکھا۔ "پلیز! سامان کروں گا۔"

"ہاں ہاں، میں تیار ہوں۔" حامد جھجک کر بولا۔

بلڈنگ کا چوکیدار ایک بڑے سے شارپ میں ہوئی کی جائے اور بسکٹ لے آیا تھا۔ یہ چائے سلطان احمد نے منگوائی تھی۔

"بھائی! میں نے سوچا کہ تم اتنی دیر سے جھینے ہوئے ہو، کچھ کھا یا پینا نہیں ہوگا۔ اس لیے چائے اور بسکٹ منگوائی ہے۔"

سلطان احمد کے اس جذبے کو بے حد سراہا گیا تھا۔

نیچے کی منزل کے استاد معظم کے یہاں سے چائے کی ایک درجن پیالیاں آگئی تھیں۔ سلطان احمد نے سب سے پہلے شہلا کو چائے پیش کی تھی۔ "یہ لیں میڈم! یہ چائے لی لیں۔"

"ارے میں کیوں، آپ حامد صاحب کو دیں۔"

بانسری عشق اور منشیات

حال ہی میں اخبارات میں ایک خبر شائع ہوئی ہے۔ اس میں بتایا گیا ہے کہ پولیس نے کراچی کی ایک نواحی بستی سے ایک انوکھے منشیات فروش کو گرفتار کیا ہے۔ انوکھا ان منٹوں میں کہ اس شخص کا طریقہ واردات سب سے نرالا تھا۔ اس کے پاس بانسری تھی۔ جب یہ دیکھتا کہ دور دور تک کوئی پولیس والا نہیں ہے، کوئی دیکھ نہیں رہا تو بانسری کی تان چھیڑ دیتا۔ جیسے ہی نغما اس میں کے سر پر پھیلنے پھیلنے لوگوں کو غم ہو جاتا کہ معاملہ صاف ہے۔ وہ بھاگ کر آتے اور اس سے اپنی مطلوبہ منشیات خرید لے جاتے۔ ہم نے زندگی میں بار بار چین کی بانسری سنا ہے۔ وہ والا حامد پڑھا اور سنا ہے اس کا سچ مفہوم بھی سمجھ میں نہ آ سکا۔ وہ اس لیے کہ بانسری تو بے چینی میں بجائی جاتی ہے۔ آدمی بے چین ہو یا دل بے چین ہو۔ اصل میں دونوں ایک ہیں۔ اب جبکہ ہم نے یہ خبر پڑھی تو اس حامد کے اس فیصلہ مفہوم سمجھ میں آ گیا۔ بزرگوں نے سچ کہا ہے کہ عقل آتے آتے آتی ہے۔ ظاہر ہے اگر آتے آتے آتی ہے تو جاتے جاتے چلی بھی جاتی ہوگی۔

ہو سکتا ہے جن پولیس والوں نے نواز منشیات کو پکڑا وہ موسیقی سے بھی نہ رکھتے ہوں۔ انہیں نوازی پسند نہ ہو یا وہ کن رن نہ ہوں۔ یہ بھی ممکن ہے کہ انہیں وہ راگ پسند نہ آیا ہو جو وہ اس وقت بجا رہا تھا۔ کچھ بھی ہو ہمارے خیال میں وہ بے سرا تو نہیں ہو سکتا۔ اگر وہ بے سرا ہوتا تو اسے دنوں سے چین کی بانسری کیسے بجا سکتا تھا؟

ہم کتابوں میں پڑھتے آئے ہیں اور بزرگوں سے سنتے آئے ہیں، کہا جاتا ہے ایک زمانے میں استاد ایسا راگ گاتے تھے کہ آگ لگ جاتی تھی۔ اس وقت یقیناً تانچس ایسا نہ ہوتی ہوگی۔ ورنہ اتنی ٹھنڈی میں بڑنے کی کیا ضرورت تھی؟ یہ بھی بتایا جاتا ہے کہ بعض راگ ایسے تھے جو گائے جاتے تھے تو بارش ہونے لگتی تھی۔ اگر واقعی یہ بات سچ ہے تو کراچی کے اوپر گھومتے ہوئے بادلوں کو وہ راگ سنانا چاہیے۔

خفق عقل کی کتاب "سرخ سفید سیاہ" سے آذین رضوان، کراچی کا انتخاب

سیاسی پارٹیاں

آپ ذرا تھوڑا سامانی میں جھانکے کیا کیا نام سامنے آتے ہیں۔ ری پبلکن پارٹی، جناح عوامی لیگ، عوامی لیگ، آزاد پاکستان پارٹی، پیپلز عوامی پارٹی، عوامی مسلم لیگ، جنس پارٹی، نظام اسلام پارٹی اور نہ جانے کیا کیا پارٹیاں ہیں۔ اب انہیں ڈھونڈ چرائے رخ زیا لے کر یہ پارٹیاں اس طرح ٹوٹیں کہ کوئی ان کا نام لیوا تک نہ رہا حالانکہ ان میں سے بعض برسراقتدار بھی رہیں۔ مگر دیکھیے، نئے نامیوں کے نشان کیسے کیسے وہ جو غالب نے کہا ہے۔

مری تعمیر میں مضمر ہے اک صورت خرابی کی چنانچہ پارٹیاں بنتی بھی رہیں اور ٹوٹتی بھی رہیں۔ پھر ان میں سے نئی نئی پارٹیاں جنم لیتی رہیں۔ مارشل لا کے دور میں کیا کیا پارٹیاں وجود میں آئیں، کیسے کیسے حمایتی پیدا ہوئے، لیکن وقت کا دھارا سب کو بہا کر لے جاتا ہے۔ اب وہی لوگ جمہوریت کے گمن گار رہے ہیں، جمہوریت کی خوبیاں نگوار رہے ہیں۔ حد تو یہ ہے کہ مارشل لا والے بھی جمہوریت کے فوائد بیان کر رہے ہیں۔ مصیبت یہ ہے کہ ہماری قوم کا حافظہ ہمیشہ سے کمزور چلا آ رہا ہے۔ لاکھ روغن بادام ملو، چاہے جتنا خیرہ گاؤں بان غمیرین کھلاؤ، کتنا ہی شربت اثار پلاؤ، اس کی یادداشت پر کوئی اثر نہیں ہوتا۔ کھایا پیا کچھ نہیں، گلاس توڑا دو روپے۔ چلیے حساب صاف ہو گیا۔

معاف کیجیے بات کہاں سے کہاں چلی گئی۔ کہنے کا مقصد یہ ہے کہ پارٹیاں ٹوٹی ہی نہیں بنی بھی ہیں۔ ایک ایک پارٹی سے کئی نئی بنی ہیں۔ اب مسلم لیگ ہی کو دیکھ لیجیے۔ کتنی ٹکٹیں بن گئیں۔

اقتباس: ہسرخ، سفید، سیاہ از شمع قتیل

”کچھ کہہ نہیں سکتے۔ بہت سے لوگ پیٹنی کے لیے بھی اس قسم کی حرکت کرتے ہیں۔ پچھلے دنوں خبر آئی تھی کہ تاجپور کا ایک آدمی بغیر پیرا شوت جہاز سے کود کر مر گیا تھا۔“

”معاف کیجیے گا۔ مجھے ایسا بے گئی موت کا کوئی شوق نہیں ہے۔“

”یہ بھی ہو سکتا ہے کہ تم نے پیسوں کے لالچ میں ایسا کیا ہو۔ اسی لالچ کے لیے تو آدمی کچھ بھی کر سکتا ہے۔“

”بے وقوف انسان۔“ ایک بزرگ خفا ہو گئے۔

”اب اس بے چارے حامد کو کیا معلوم ہے یہ سودا اسی لالچ میں ہوگا۔“

”مارے سب جانتا ہوں میں۔ یہ سب اس وکیل اور اس شخص کی ملی بھگت ہے۔“ اکرم نے کہا۔

حامد کا دل چاہا کہ وہ کسی طرح اس بیڑھی سے باہر نکل کر اس کم نعت کا گلا دے لیکن اس کا بدلہ اس شخص نے لے لیا تھا جس نے حامد کی حمایت کی تھی۔ اس نے ایک زوردار گھونسا اکرم کو جڑوا تھا۔ بندے میں اکرم نے اسے مگر ماری تھی۔

ذرا سی دیر میں وہاں بولا ہونے لگا تھا۔ کچھ لوگ اکرم کی حمایت میں آ گئے تھے اور کچھ اس دوسرے شخص کی حمایت میں۔ اچھی خاصی مار پیٹتے ہوئے لگی تھی۔

اتنی دیر میں شہلا حامد کے پاس آ کر کھڑی ہو گئی تھی جبکہ دوسرے لوگوں کی توجہ لڑنے والوں کی طرف تھی۔

”شہلا! حامد دھیرے سے بولا۔“ میری ٹانگ اب حرکت کرنے لگی ہے۔ میں اب بڑی آسانی سے اس پھندے سے نکل سکتا ہوں۔“

”نہیں حامد نہیں..... پلیز ایسا مت کرنا۔“ شہلا بول نکلا کر بولی۔

”وہ کیوں۔“ حامد حیران رہ گیا تھا۔

”خود سوچو۔ اگر تم نے خود کو باہر نکال لیا تو ہمارے خوابوں کا کیا ہوگا۔ تم اسی لالچ روپے کہاں سے حاصل کر دو گے۔ قدرت نے تمہیں زندگی سنوارنے کا ایک موقع دیا ہے۔ اس چانس کو... برادامت کرو۔ پھر میں تمہارے ساتھ ہوں نا۔“

”شہلا! یہ دیکھو۔ کیا میں پندرہ دن اسی طرح گزار دوں۔“ حامد نے پوچھا۔

”کوئی فرق نہیں پڑتا۔ جہاں تم نے اپنی پوری زندگی اسی طرح گزار دی ہے، وہاں پندرہ دن اور کئی۔“ شہلا نے کہا۔

”اور میں تمہیں خوش کرنے اور بہلانے کے لیے ساری کوششیں کروں گی۔“

”تم تو جانتی ہو لیکن اس لالچ آپ کو کہاں سے دوں؟“

”وہ جو اسی لالچ میں گئے بیٹا..... ان میں سے دس مجھے دے دینا۔ زندگی بھر دو عا میں دوں گا۔ میری بیٹیاں بھی یاد کیا کریں گی۔“

”ابو! کہاں ہیں میرے پاس اسی لالچ۔“

”میں جانتا ہوں بیٹا۔ مجھے اس وکیل پر پورا بھروسہ ہے۔“ بزرگ نے کہا۔ ”بہت قابل آدمی ہے۔ یہ تم کو اسی لالچ دلا کر رہے گا۔“

”چاچا میاں۔“ شہلا نے بزرگ کو مخاطب کیا۔

”آپ کو شرم آتی چاہیے کہ ایک آدمی مصیبت میں پھنسا ہوا ہے اور آپ اس کے پیسوں سے اپنا حصار مانتے چلے آئے ہیں۔“ پھر اس نے سب کی طرف دیکھا۔ ”آپ سب کان کھول کر سن لیں۔ ان کے پاس جتنے پیسے ہوں گے، ان کا حساب کتاب میں رکھوں گی۔ یہ نہیں ہوگا کہ کوئی دس لاکھ لے کر چلا جا رہا ہے۔ کسی کو پاؤں نکل رہے ہیں۔ نہیں ایسا نہیں ہوگا۔ ایک ایک پائی کا حساب میرے پاس ہوگا۔“

”کیوں! کیا تم حامد صاحب کی بیوی ہو؟“ ایک عورت نے جل کر پوچھا۔

”ہوں تو نہیں۔ لیکن وہ بھی سچی ہوں۔“ شہلا ترخ کر بولی۔

حامد مسکرا دیا۔ اس دوران پہلی بار اس نے خوشی کی کوئی خبر نہ لی تھی۔ اس نے شہلا کی طرف دیکھا۔ وہ لکھوٹ بھرے انداز میں حامد کو کچھ رہی گئی۔

اچانک ایک عورت نے اعلان کیا۔ ”حامد بھائی! آج رات کا کھانا میری طرف سے ہوگا۔ آپ بتا دیجیے، آپ کی پسندیدہ ڈش کیا ہے۔ دیکھیں صاحب تکلف مت کیجیے گا۔“

”یہ لو۔“ ایک دوسری عورت چپک کر بولی۔ ”رات کے کھانے کا تو میں نے سوچ رکھا تھا۔“

”چلو۔ تم صبح کا ناشتا کر دینا حامد بھائی کو۔“

حامد کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اسے روٹنا چاہیے یا ناشتا چاہیے۔ تکلیف تو ہو رہی تھی لیکن امکانات روشن ہوتے جا رہے تھے۔ ایک طرف تو اسی لالچ کا آسرا ہو گیا تھا۔ دوسری طرف شہلا جیسی لڑکی کی توجہ حاصل ہونے لگی تھی۔ یہ سب اسی بیڑھی کی وجہ سے ممکن ہو سکا تھا۔

”حامد صاحب! کیا آپ کے ساتھ یہ پہلا حادثہ ہے یا پہلے بھی ہو چکا ہے؟“ شبلی اکرم نے پوچھا۔

حامد ہنسا کر رہ گیا۔ ”آپ کا کیا خیال ہے کہ مجھے اس قسم کی مصیبت میں پڑنے کا شوق ہے؟“

”ان کو کبھی مل جائے گی۔ پہلے آپ تو لیں۔“

شہلا کے بعد حامد کو بھی چائے دی گئی۔ بکٹ بھی دیے گئے۔ وکیل صاحب چائے ختم کرتے ہی کیس فائل کرنے کے لیے روانہ ہونے لگے لیکن اس سے پہلے انہوں نے حامد سے کہا۔ ”حامد صاحب! ایک ہزار روپے تو دیں۔“

”ایک ہزار..... وہ کیوں؟“

”مجھے بلڈنگ کے مفاد کے لیے میں آپ سے اپنی وکالت کی فیس تو نہیں لے رہا لیکن تمہارے والوں کو کچھ دینا پڑے گا۔“

”تمہارے والوں کو..... میں سمجھا نہیں۔“

”ارے بھائی۔ اس کی ایف آئی آر کئی گئی۔“ وکیل نے کہا۔ ”تا کہ مالک کو گرفتار کر کے عدالت میں پیش کیا جائے۔ پھر آپ کی طرف سے کیس فائل ہوگا اور آپ کے حق میں فیصلہ ہوتے ہی اسی لالچ دھوکے میں جائیں گے۔“

”بھائی جان! اور یہ فیصلہ کتنے دنوں میں ہوگا؟“

حامد نے کراہتے ہوئے پوچھا۔ اب اس کا ہیرا چھا خاصا درد کرنے لگا تھا۔

”کم از کم پندرہ دن تو لگ ہی جائیں گے۔“ وکیل نے بتایا۔ ”وہ بھی اس لیے کہ یہ امر جیسی کیس ہے۔“

”وکیل صاحب! کیا آپ پاگل ہو گئے ہیں۔“ حامد چلا یا۔ ”میں پندرہ دنوں تک اسی طرح لٹکا رہوں۔“

”تو کچھ حاصل کرنے کے لیے کچھ قربانی بھی دینی پڑتی ہے۔“ وکیل طنزیہ انداز میں بول کر دوسروں سے مخاطب ہوا۔

”کیوں بھائیو! کیا میں غلط کہہ رہا ہوں؟“

”نہیں بھائی جان! آپ بالکل شیک کہہ رہے ہیں۔ رقم بھی تو معمولی نہیں ہے۔ اسی لالچ میں نہیں ہوتے۔“

”حامد میاں! ایک بزرگ نے مخاطب کیا۔

”جی فرمائیں۔“ حامد جھلا کر بولا۔

”تم کو تو یاد ہوگا بیٹا کہ میں تمہارے والد صاحب کا دوست ہوا کرتا تھا۔“ بزرگ نے کہا۔ ”اور میں بھی اسی بلڈنگ میں رہتا ہوں۔“

”جی فرمائیں۔“

”بیٹا! تمہارے والد مجھے بہت عزیز رکھتے تھے۔ میرا بہت خیال رکھتے تھے۔ تو تم بھی میرا خیال رکھنا بیٹا۔“

”آپ بتا تو دیں..... کیسے خیال رکھوں۔“

”بیٹا! صرف دس لاکھ۔ میری دو جوان بیٹیاں ہیں۔ دونوں اس دس لاکھ میں تمٹ جائیں گی۔“

تنہائی

نادیہ نور

رقابت اور انتقام میں انسان اندھا ہو جاتا ہے۔ اسے بھی کچھ نظر نہیں آرہا تھا سوائے اپنے ساتھ ہونے والی زیادتی کے... جیون سنا تھی جب بار بار ساتھ بدلتے کا عادی ہو تو نہ منزل اس کی منتظر ہوتی ہے اور نہ ہی رستے اس کا ساتھ دیتے ہیں۔ اس نے بھی ”جب میرا نہیں تو کسی کا نہیں“ والے فارمولے پر عمل کر ڈالا اور اپنی زندگی سے مطمئن ہو گئی۔

خون بہا دینے والے برقیے موسم کی لہو گرما دینے والی واردات کا احوال



ہوئے بال چہرے پر پڑے ہیں۔ آنکھیں مندی ہوئی اور منہ کھلا ہوا ہے۔ وہ گھبرا کر جاگ اٹھی اور جلدی سے لیپ روشن کر دیا۔ لہجہ بھرتک اس نے ان آوازوں کو سنا جو گیراج کا دروازہ ہوا کے زور سے بار بار کھٹنے اور بند ہونے سے

لیون کے رخصت ہونے کے بعد کی رات کرکشی نے خواب دیکھا کہ وہ گنجد ہو گئی ہے۔ خواب میں کرکشی نے خود کو دوری سے دیکھا تھا کہ وہ چٹ پڑی ہوئی ہے۔ اس کا جسم ایک سفید رنگ کے سلیب کے اندر رکھا ہوا ہے۔ بھرے

ہوگا۔ یہاں کے لوگ ہمارے بارے میں طرح طرح کی باتیں بنائیں گے۔ ہاں، پچاس لاکھ سے تم اپنا کوئی بزنس شروع کر دینا۔ میرا خیال ہے کہ یونیک کا کام سب سے اچھا رہے گا۔ میں خود ٹین ڈیزائنر ہوں، اسی لیے میں وہ بزنس سنبھال سکتی ہوں۔“

”چلو۔ جیسے تمہاری مرضی۔“ حامد کی آنکھوں میں بہت سے خواب اتر آئے تھے۔

”اور ایک بات اور..... شادی کے بعد ہم سب سے پہلے اسلام آباد اور مرئی وغیرہ کی سیر کو جائیں گے۔“

”چلو یہ بھی منظور ہے۔ میں تو اب تمہارے کہنے پر چل رہا ہوں۔“

اس دوران میں ایک آدمی ان دونوں کے پاس آ گیا۔ ”معاف کیجئے حامد صاحب! میں آپ کو ڈسٹرب کر رہا ہوں۔ میرا نام مختار ہے۔ میں پچھلے ہفتے اس بلڈنگ میں کرائے دار کی حیثیت سے آیا ہوں۔ میں خود وکیل ہوں اور ہائی کورٹ میں پریکٹس کرتا ہوں۔“

”جی فرمائیے مختار صاحب۔“

”جناب! مجھے جیسے ہی آپ کے ساتھ ہونے والے اس حادثے کی خبر ملی، میں نے سب سے پہلا کام یہی کیا کہ سید جانج کے پاس پہنچ گیا۔“

”جج کے پاس! وہ کیوں؟“

”آپ کے کس کو اسٹرونگ بنانے کے لیے۔ جج سے بات ہو چکی ہے۔ آپ کو ایک کروڑ پچاس لاکھ ملنے والے ہیں۔ وہ یہی فیصلہ سنائے گا۔“

”کیا؟“ حامد کے ہوش اڑ گئے تھے۔ ”ایک کروڑ پچاس لاکھ۔“

”جی ہاں۔ میں بھی کچا کام نہیں کرتا۔“

اسی وقت وہ سبھی تھوڑی سی ہلکی گڑی کا زینہ چمرا کر ٹوٹ گیا اور حامد قلا بازیاں کھاتا ہوا چپٹا ہوا، نیچے گرتا چلا گیا۔

سر کے بل کرنے کی وجہ سے اس کے دماغ میں شدید چوٹ آئی تھی۔ ہاسپتال تک جاتے جاتے اس کا انتقال ہو گیا تھا۔

اس کی موت کے بعد صرف اتنا ہوا کہ بلڈنگ کے مالک نے گڑی کا زینہ ختم کروا کے سینٹ کا پکا زینہ بنوا دیا اور اس کیس کو حادثہ قرار دے کر فراموش کر دیا گیا۔

اب اس بلڈنگ کے وہی شب و روز ہیں۔ وہی زندگی ہے۔ سب اپنی اپنی جگہ اپنے اپنے کام میں مصروف ہیں۔ سڑکیاں پختہ ہونے کے بعد اب اس بات کا بھی امکان نہیں رہا کہ ایسا کوئی اور حادثہ کی اور حامد کے ساتھ پیش آ جائے۔

لوگوں کے درمیان ہونے والا جھگڑا اب ختم ہو چکا تھا۔ اس بلڈنگ کی یونین کے صدر نے ان لوگوں کو سمجھایا تھا۔ ”دیکھو..... اگر ہم لوگ آپس میں اسی طرح جھگڑا کرتے رہے تو کسی کے ہاتھ کچھ نہیں آئے گا۔“

”تو اب کون سا آ رہا ہے۔“

”آ رہا ہے۔“ صدر مسکرا دیا۔ ”میں نے پورا حساب لگایا ہے۔ دیکھو، اگر ہم کیس جیت جاتے ہیں تو چالیس لاکھ سیدھے سیدھے حامد کے ہوجائیں گے۔“

”حامد کو اتنی سی بات کے لیے چالیس لاکھ کچھ زیادہ نہیں ہیں۔“ کسی نے اعتراض کیا۔

”نہیں کیونکہ ان پیسوں پر اسی کا حق ہے۔“ صدر نے کہا۔ ”ہمیں انصاف سے کام لینا چاہیے۔ کیونکہ قیامت کے دن خدا کے سامنے بھی پیش ہوتا ہے۔ ہم نے اگر حساب کتاب میں غلطی کی تو ہمارا احساس کیا جائے گا۔“

سب نے صدر کی اس بات کی تحریف کی کیونکہ سب ہی خدا کے خوف سے لرز اٹھتے تھے۔

”چلیں۔ مان لیا حامد کو چالیس لاکھ مل گئے۔ اس کے بعد کیا حساب ہوگا۔“

”بقیہ چالیس میں سے پانچ وکیل صاحب کو ملے جائیں گے۔“ صدر نے بتایا۔ ”کیونکہ ساری محنت وکیل صاحب کی ہوگی۔“

”ہاں، یہ بات تو ہے۔“ سب نے تائید کی تھی۔

”اس کے بعد رہ جاتے ہی پینتیس لاکھ..... ہماری بلڈنگ کے دونوں بلاک میں بیس افراد رہتے ہیں اور بیس فیملیوں کو ہر فیملی کو ڈیڑھ لاکھ روپے مل جائیں گے۔ اور یہ بھی کچھ کم نہیں ہے، کیونکہ یہ رقم ہمیں بغیر کسی محنت کے یوں ہی مل رہی ہے۔“

”یہ بات تو ہے۔ انصاف اسی کو کہتے ہیں۔“

ان لوگوں کی باتوں سے بے خبر حامد اور شہلا اپنی پلاننگ میں مصروف تھے۔ شہلا کہہ رہی تھی۔ ”سنو حامد! اب چونکہ مجھ میں اور تم میں کوئی دوری نہیں رہی۔“

”دوری تو ہے۔“ حامد نے اس کی بات کاٹ دی۔

”اوہو، میرا مطلب ہے کہ نہیں رہے گی۔“ شہلا نے کہا۔ ”اس لیے تم میں سے صاف صاف کہہ رہی ہوں کہ تم اپنا سارا حساب کتاب میرے ہاتھ میں دے دو گے۔“

”ظاہر ہے۔“ حامد نے پیار بھری نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

”تو ہم سب سے پہلے اس بلڈنگ کو چھوڑ کر کہیں اور شفٹ ہوجائیں گے کیونکہ اب ہمارا یہاں رہنا مناسب نہیں

بلند ہو رہی تھیں۔

یہ آوازیں رات کے سناٹے میں آسانی کی گئی تھیں۔ وہ بستر سے اتر کر چلی منزل کے ہال میں گئی۔ راستے میں بجلی کے ہر بن کو باہر کرتی جلا دی تھی۔ کرسی نے نیچے بیچ کر بکین کے گل کو کھولا۔ ایک تیز آواز کے ساتھ پانی نے گرنا شروع کر دیا۔ اس نے چلو میں پانی بھر کر اپنے چہرے پر چھڑکا پھر گلاس بھر کے پانی بنا اور سبک کے اوپر جو کھڑکی کے شیشے پر آکھیں، جگا کر باہر کی طرف جھانکا۔ رات صاف تھی۔ درختوں کی قطاروں میں سے باہر کا اسٹور والا شید جو کن کے عقب میں تھا، نظر آ رہا تھا۔ گرنے والی برف اس کی چھت تک پہنچ رہی تھی۔ گہراج کا دروازہ ہوا کے ایک جھونکے سے پر شور آواز میں کھلا اور بند ہو گیا۔ اسے بند کرنے کے لیے کرسی کا باہر نکلتا ضروری تھا جہاں سے کوئی چنچ بھی تو اس کی آواز ہوا کے جھکڑوں میں کم ہو جاتی بڑک کے اس پار کرسی کے قریب ترین بڑی کاکھڑکی فرلانگ کے قاصطے پر تھا۔ ہوا سے کھڑکی کا شیشہ کھڑکیا۔

”خوب! تم جیسے اس قدر ٹھنڈے موسم میں چھوڑ کر چلے گئے۔“ کرسی نے خود کلامی کی۔

کرسی کو لیون کے معاشقے کا طم کا۔ اتوار کی ایک سہر کو اس نے اوپر کی منزل پر دھڑے لون کو اٹھایا تو اسے لیون کی آواز سنا دی تھی۔ وہ چلی منزل پر چکن میں رکے ایک شیش پر پول رہا تھا۔ لیون نے کسی کو میٹھی کہہ کر مخاطب کیا۔ لیون کا لہجہ اس قدر نرمی تھا کہ کرسی کے تن بدن میں آگ سی لگ گئی۔ وہ خاموشی سے فون کان سے لگے ہاتھیں سٹکی رہی۔ بعد میں اس نے اس معاشقے کو لے کر لیون سے کوئی بات نہیں کی۔ اسے انتظار تھا کہ کب یہ معاملہ ختم ہوتا ہے مگر یہ معاملہ خاصا لمبا ہو گیا تھا۔

اسی وقت فون بیچنے لگا۔ کرسی نے گلاس سبک پر رکھا اور مڑی۔

”ہیلو“ فون اٹھاتے ہوئے اس نے کہا۔ اسے کوئی جواب نہیں ملا۔ صرف ایسی آوازیں سنا دیں جیسے کوئی تیز تیز سانس لے رہا ہو۔ ”کون ہے؟“ کرسی نے پھر پوچھا مگر اس بار بھی جواب کے بجائے اسے ہانپ ہی سنا دی۔ اس نے فون بند کر دیا۔ اس نے تیزی سے چلے ہوئے سڑکیاں طے کیں۔ بتیاں چلنے دیں اور اوپر لگے دیوار گیر فون کو منہج دیا۔ پھر اپنے ٹائٹ گاؤن کو کمر کے ساتھ کس کر باندھا اور کبل اوڈھ کر بستر میں گھس گئی۔ گھر سے باہر ہوا کے ساتھ دروازے کی کٹھنٹ برابر ابھر رہی تھی۔ چکی منزل پر بار

بارنوں کی گھنٹی بج رہی تھی۔

کرسی نے خود کو کیکڑ کر گھڑی بنایا اور آنکھیں بند کر لیں۔ دنیا میں جانے کتنے لوگ تھے جو اپنی موت کے خواب دیکھتے تھے مگر پھر بھی سو جاتے تھے اور صبح کو انہیں کچھ بھی یاد نہیں رہتا تھا۔

☆☆☆

پانچ سال قبل وہ اس قصبے میں آئے تھے۔ قصبے کا نام گروڈر ہل تھا۔ کرسی پر کس فارمی میں ڈسپنری کی ٹیکنیشن کی حیثیت سے ملازمت کرتی تھی۔ پر کس ایک مشہور اور چلتا ہوا اسٹور تھا۔ وہاں اس کا وقت پر لگا کر گزارتا تھا مگر اب لیون کے جانے کے بعد یہ ایک مسئلہ تھا کہ وہ وہاں کس طرح دوسروں کا سامنا کرے گی۔ اس نے ”پر کس“ کے مالک جوئے کو فون کیا اور اس سے کہا کہ اس کا ایک عزیز بیمار ہو گیا ہے اور وہ بے چلت جا رہی ہے۔ اسے نہیں معلوم وہ کب واپس آئے گی۔ وہ یہ بھی نہیں چاہتی کہ اس کے لیے جگہ خالی رکھی جائے۔ جوئے نے کہا یہ جراس کے لیے پریشان کن ہے۔ اب شاید یہی کوئی مناسب نعم البدل مل سکے۔ جوئے نے کرسی کی تعریف کی اور کہا کہ وہ ایک بہترین کارکن تھی اور اسے ہر کوئی پسند کرتا تھا۔ کرسی کو آخری بات جمونی محسوس ہوئی۔ اس نے فون بند کر دیا۔ فریج سے چاکلیٹ کیک نکالا۔ یہ بات چھوٹ نہیں تھی کہ کوئی بیمار ہو گیا تھا۔ دراصل وہ خود بیمار ہو گئی تھی۔ گروڈر ہل ایک چھوٹا سا قصبہ تھا۔ لیون نورٹون میں ملازمت کرتا تھا جو یہاں سے چالیس منٹ کی ڈرائیو پر تھا۔ کرسی کو امید نہیں تھی کہ لیون کے جانے کی خبر جلدی پھیلے گی۔ اس نے میز پر بیٹھ کر کیک کھانا شروع کر دیا۔

کرسی کو اندازہ تھا کہ میٹھی کسٹروس میں کام نہیں کر سکتی تھی۔ اس کے بال جو لائے سیاہ تھے، ایک عجیب ترغیب آمیز انداز میں بکھرے رہتے تھے۔ وہ تیز رنگوں کی لب اسٹیک لگا تی تھی جسے کرسی کی بار اپنے شوہر کے کار پر لگی دیکھ چکی تھی۔ میٹھی ایک تیز لہر جیسی عورت تھی۔ عورتیں جس سے چوٹی تھیں اور مرد جس پر جان چڑھتے تھے۔

کیک ختم ہو چکا تھا اور کرسی جس انداز سے بیٹھی فون کی سمت دیکھنے جا رہی تھی۔ لیون کے چلے جانے کے بارے میں ابھی تک کسی کو علم نہیں تھا۔ خود کرسی کے والدین بھی اس سے بے خبر تھے۔ کرسی کے ماں باپ لیون سے اپنے بیٹے کی طرح پیار کرتے تھے کیونکہ وہ ان دونوں کا بڑا خیال رکھا کرتا تھا۔ لیون وجہ بھی تھا ہوشیار بھی۔ اس کا جسم کسی کھلاڑی جیسا تھا۔ وہ ”دنی فار انوسٹ“ نامی فرم میں

معاشیاتی مشیر کے عہدے پر تھا اور اپنے پیشے میں بے حد کامیاب بھی تھا۔

کرسی کا اندازہ تھا کہ میٹھی، لیون کی کمپنی میں بطور کلائنٹ گئی ہوگی۔ وہیں اس کی ملاقات لیون سے ہوئی ہوگی اور پھر لیون پر اس کا چارو چل گیا ہوگا۔ اس کا حسن اور انداز کسی جادو سے کم نہیں تھا۔

صبح کی روشنی میز پر پڑ رہی تھی۔ باہر جنوری کا دن کھلا ہوا تھا مگر بے حد چمک رہا تھا۔ مناسب وقت تھا کہ گہراج کے دروازے کو کھینک کر دیا جاتا۔ اس وقت دروازہ آواز بھی نہیں کر رہا تھا مگر کرسی خود کو اس قدر بھاری محسوس کر رہی تھی کہ وہ کوئی بھی کام نہیں کرنا چاہتی تھی۔

اس نے ہاتھ بڑھا کر فون کا لیگ نکال دیا۔ وہ کسی کی بات نہیں سنتا چاہتی تھی۔ وہ کرسی میں دھنسن کر بیٹھ گئی اور باہر کی سمت دیکھنے لگی۔ برف باری پھر شروع ہو گئی تھی۔

☆☆☆

موسم سرما کی پیش قدمی کے ساتھ برف کے ڈھیر بلند ہو رہے تھے۔ حتیٰ کہ یہ اتنی بلند ہوئی کہ اگر وہ اس میں سے اپنی کار نکالنا چاہتی توئی کھنسنے کھدائی کرنا پڑتی مگر اسے پروا نہیں تھی۔ اسے کہیں جانا بھی نہیں تھا۔ وہ سو گز وقت گزار رہی تھی حالانکہ اس کا خوفناک خواب ساتھ تھا۔ وہ جلدی سونے لیٹ جاتی تھی۔ بتیاں چلنے دیتی اور دوسرے دن دوپہر میں بڑی مشکل سے اٹھتی اور صرف ضروری کام مثلاً منہ دھونا، کپڑے پہننا وغیرہ تک ہی خود کو محدود رکھتی تھی۔ ویلنٹائن ڈے پر رات کو کوئی نو بجے اس نے اپنے قہقی دروازے پر کرسی کی دنگ سنی۔ کرسی اس وقت لیونگ روم میں ایک کتاب لیے صوفے پر دراز تھی۔ وہ اٹھ کر کچن میں گئی، اس نے سوچا یہ کون ہو سکتا ہے؟ کوئی قاتل..... اسے ہر روز خوفناک خواب دکھائی دے رہا تھا۔ بار بار ایک جیسا خواب دیکھنے کی وجہ سے وہ منظر کی جزئیات سے ابھی طرح آگاہ ہو گئی تھی۔ برف تلے اس کا برہنہ جسم..... گھٹنے ٹھوڑے سے سکڑے ہوئے..... اس کی سپید رنگت..... سر پر پیشانی سے اوپر ایک زخم کا نشان اور خون کی ایک خشک لکیر پیشانی تک آتی ہوئی..... کسی کھلے ہوئے منہ جیسی۔

دنگ پھر سنا دی۔ کرسی دروازے کی طرف مئی۔ ”کون ہے؟“ اس نے پوچھا۔

”میں مارکس ہوں۔“ باہر سے آواز آئی۔ ”سڑک کے پار رہتا ہوں۔ تمہارے لیے لکڑیاں لایا ہوں۔“ کرسی نے دروازہ غیر متفعل کیا۔ دوسری طرف مارکس جون کھڑا

تھا۔ وہ اسے دیکھ کر مسکرایا۔ اس کے زرد دانت نظر آنے لگے۔ ”ہائے کرسی! لکڑیاں لایا ہوں۔ بالکل خشک ہیں۔“ وہ دروازے سے اندر آ گیا۔

”انہیں ادھر ہی ڈال دو۔“ کرسی بولی۔

”نہیں..... میں انہیں آتش دان کے پاس رکھ دیتا ہوں۔“ مارکس نے جوتے اتارتے ہوئے کہا۔ وہ کچن سے گزر کر لیونگ روم میں گیا۔ کرسی بیٹے پر ہاتھ باندھے دھمکتی رہی۔ مارکس نے لکڑیاں آتش دان کے پاس قرینے سے رکھ دیں۔ مارکس سڑک کے پار اپنے بوڑھے اکل کے ساتھ رہتا تھا۔ وہ دو بیٹیاں اور متعدد بچے چھوڑ کر ادھر آیا تھا۔ مارکس نے لکڑیاں رکھ کر خود کو سیدھا کیا۔ ہاتھ جھاڑے۔ اس کا چہرہ سرخ ہو رہا تھا اور آنکھیں چمک رہی تھیں۔ کرسی نے سوچا کہیں یہ بچے ہوئے تو نہیں ہے۔ ”مجھے تمہارا خیال آتا رہا ہے۔“ مارکس نے کہا۔ ”تم ادھر بالکل اکیلی رہ رہی ہو اور موسم اتنا سرد ہے۔ کبھی کسی وقت بھی جا سکتی ہے۔ میں نہیں چاہتا تھا تم سردی میں ٹھہرو۔“

”شکریہ۔“ کرسی نے کہا اور پشیمان ہونے لگی کہ مارکس کو اندر لیون آنے دیا پھر وہ کچھ سوچ کر لیون۔ ”لیون تمہارا شکریہ ادا کرے گا۔ مجھے کھانا تیار کرتا ہے۔ اسے کچھ دیر ہو گئی ہے بیچنے میں..... وہ کسی بھی وقت آجائے گا۔“

مارکس نے کرسی کو کچھ نظروں سے دیکھا۔ ”وہ آج رات آ رہا ہے؟ میں اسی کے بارے میں سوچ رہا تھا۔“

بھرے میں نے اسے دیکھا نہیں ہے۔

”وہ ملک سے باہر گیا تھا برس پر۔ آج رات آ رہا ہے۔“ کرسی نے جواب دیا۔

”کمال آ دی ہے لیون۔“ انہیں اکیلا چھوڑ گیا۔

کرسی ہال دے میں چلی آئی۔ ”لکڑیوں کے لیے شکریہ..... میں اب ڈرنے والی ہوں۔“

”کسی اچھی سی عورت کو اس طرح اکیلا چھوڑنا اچھی بات نہیں۔“ مارکس نے کرسی کی طرف توقع کے ساتھ دیکھا۔ کرسی دروازے کی طرف جانے لگی۔ اس نے تصور میں خود کو بھاگتے اور مارکس کو پچھا کرتے دیکھا۔ مارکس نے اپنی من مانی کے بعد اسے مارڈالا اور اس کی لاش پھیل کناڑے لے جا کر دفن کر رہا ہے جہاں برف اسے چھپا سکتی تھی۔ اس کا خواب آنکھوں میں تیر رہا تھا۔

کرسی نے بڑھ کر قہقی دروازہ کھول دیا۔ ہوا کا ایک برقیلا جھونکا اندر گھسا مگر وہ اسے کھولے کھڑی رہی۔ مارکس بھی وہیں آ گیا۔ اس نے اپنے جوتے پہنے اور کرسی کی

طرف بڑھا۔ اس کے جسم سے بُو آ رہی تھی۔ ”ہمیں کچھ پینا چاہیے کرئی۔“
 ”نہیں۔ اس وقت نہیں۔“ مارکس نے لمبی سانس لی پھر ہاتھ بڑھا کر کرئی کے گال چھوئے۔ کرئی بدک کر چیخے۔
 ”تم ہمیشہ کی طرح ضدی ہو، خیر میں خود دیک ہی ہوں۔ جب چاہو بلا سکتی ہو۔“ مارکس نے منہ بنایا اور باہر نکل گیا۔ کرئی نے جلدی سے دروازہ بند کر دیا۔ تمام کھڑکیاں چیک کیں۔ کافی دیر تک اس کا جسم کپکپاتا رہا پھر وہ سونے کے لیے دراز ہو گئی۔

☆☆☆

مارچ کا مہینا آیا تو ساتھ تیز ہواؤں کے جھکڑ اور برف باری لایا۔ برف اتنی اونچی ہوئی کہ گیراج کا دروازہ جام ہو گیا اور اس کا کھٹنا، بند ہونا مشکل ہو گیا۔ البتہ اب چھت پر سے آوازیں آنے لگی تھیں۔ یہ اچھی بات تھی۔ اس برف باری میں کرئی کی طرف کوئی بھی نہیں آتا۔ وہ اس برف سے گھرے گھر میں محفوظ تھی، کسی قیدی کی طرح۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ خود کو برف میں دھنسنے کی تابوت کے اندر پار کیوں دیکھتی ہے اور اسے اپنے قاتل کا چہرہ کیوں نہیں نظر آتا۔ اگلے دن کرئی دیر سے اٹھی۔ دو بج رہے تھے۔ بیڈ روم میں دھڑے پڑوں کے دھیرے سے ایک لباس نکال کر پہنا۔ بن میں جا کر کافی بنائی۔ سنک میں گلدی پلیٹوں اور برتنوں کے دھیرے پڑے ہوئے تھے۔ خوراک کا ذخیرہ بھی ختم ہو رہا تھا۔ پکن کی ونڈو آدمی کے قریب برف سے اٹ گئی تھی۔ کرئی نے گرم کافی کا گم سامنے رکھا اور کھڑکی پر برف سے بننے والے نقوش کو گھورنے لگی۔ اسی لمحے اس نے فرنٹ ڈور پر پکسی کی دسک سنی۔ پہلے اسے گمان ہوا۔ دسک دوبارہ سنائی دی۔ کرئی نے لیوگ روم کی کھڑکی سے باہر جھانکا۔ باہر ایک لمبا شخص نیلے رنگ کے اور کوٹ میں نظر آیا۔ ہوا سے بچنے کے لیے اس نے سر جھکا یا ہوا تھا۔ کرئی کو وہ معقول اور مہذب آدمی محسوس ہوا۔ اس نے دروازہ کھول دیا۔
 ”ہیلو کرئی! میں زلیخہ ہوں۔“ آدمی بولا۔ کرئی کو سڑک پر ایک سرخ کار کھڑی نظر آئی۔
 ”میں زلیخہ ہوں..... میکی کا شوہر۔“
 ”اوہ۔ تم میکی کے شوہر ہو۔“ کرئی نے دھیرے سے کہا۔

”کیا میں اندر آ جاؤں؟“ کرئی نے اسے راست دیا۔ زلیخہ نے اپنے جوتے اتار دیے۔ وہ برف سے اٹنے

ہوئے تھے۔ اندر آ کر اس نے کوٹ اتار کر ایک کرسی کی پشت پر ڈال دیا اور صوفے پر بیٹھ گیا۔
 کرئی صوفے کے دوسرے کنارے پر بیٹھ گئی۔ زلیخہ نے اپنے ہاتھ کی انگلی کو کھمایا۔ ”میں میکی سے ایک مانی۔۔۔ معاملے کو لے کر بات کرنا چاہتا ہوں۔ تمہیں کچھ معلوم ہے؟“
 ”نہیں۔“
 ”جانے سے قبل لیون نے تم سے کیا کہا تھا؟“
 ”نہیں کچھ نہیں کہا۔“ کرئی بولی۔

زلیخہ خاموش ہو کر زمین کو گھورنے لگا۔ کرئی کو حیرت ہوئی کہ میکی جیسی عورت نے آخر اس سے کس طرح شادی کر لی تھی۔ زلیخہ بظاہر تو بے ضرر سا لگ رہا تھا مگر پھر کرئی کو اپنا خیال آیا۔ وہ خود بھی کوئی حسیہ نہیں تھی جبکہ لیون کی ہیرو جیسا آدمی تھا۔ لوگوں کی نگاہیں پہلی بار دونوں کو دیکھ کر حیرت زدہ ہو جاتی تھیں۔ شاید وہ سوچتے ہوں گے کہ لیون جیسے شخص نے ایسی لڑکی سے کیسے شادی کر چالی۔
 ”میکی نے میرے ساتھ بے وفائی کا سلسلہ کافی عرصے قبل ہی شروع کر دیا تھا۔ تمہارا شوہر اس کی زندگی میں کوئی نا نہیں تھا۔“ زلیخہ بولی۔
 ”میں جب گھر آیا اور میکی کے کمرے میں گیا تو مجھے بستر بکھر ہوا ملا تھا۔ غالباً وہ لیون کو گھر پر ہی بلا کر کئی مہینے تک ایک بات میری سمجھ میں نہیں آئی کہ میکی نے گھر سے یا پھر اپنے اکاؤنٹ سے کوئی رقم نہیں نکالی۔“
 ”لیکن لیون کے اکاؤنٹ میں ہزار ڈالر تھے، مجھے بعد میں معلوم ہوا کہ اس نے ساری رقم نکال لی تھی مگر مجھے فرق نہیں پڑتا۔ میرے پاس یہ گھر ہے، کار ہے اور میری اپنی رقم بھی ہے۔“
 کرئی نے رکھائی سے کہا۔

”خوب! تو وہ دونوں دنیا بھر کی سیریں کر رہے ہوں گے۔“ زلیخہ نے بولتے ہوئے اپنی ٹائی ڈھکی کی اور اسے اتار کر جیب میں چھپوٹ لیا۔
 ”اگر میکی کوئی رقم لے کر نہیں گئی تو پھر کون سا مالی معاملہ ہے جس کے لیے تم بات کرنا چاہتے تھے؟“ کرئی کو زلیخہ جھوٹا محسوس ہوا۔ رقم والی بات پر ہی کرئی کے دماغ کو جھکا لگا تھا۔ اسے غلات ہونے لگی۔ زلیخہ اچھا آدمی نہیں تھا۔ اسے دروازہ نہیں کھولنا چاہیے تھا مگر اب تو تیر مکان سے نکل چکا تھا۔

زلیخہ کی آنکھیں کرئی کا جائزہ لے رہی تھیں۔ اس نے کرئی کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔ زلیخہ نے عجیب سی نظروں

سے کرئی کو دیکھتے ہوئے پوچھا۔ ”یہ بتاؤ، میں تمہیں کیسا لگتا ہوں؟“ کرئی نے اس کے سوال کو گول کر دیا اور بولی۔
 ”میکی جیسی تھی۔“

زلیخہ نے حیرت سے اسے دیکھا پھر نگوار ی سے بولا۔ ”وہ..... وہ ایک سر بھری عورت تھی۔“
 کرئی نے سر جھکا لیا اور سوچا کہ زلیخہ لیون نامی یہ شخص عورتوں کو سوزے بازی کی کوئی چیز سمجھتا ہے۔ وہ میکی سے ناخوش تھا اور اب جب وہ اس کی بیٹی سے باہر تھی تو وہ سمجھتا تھا کہ کرئی اس کی جگہ لے سکتی ہے۔ ”میں نے تم سے کچھ پوچھا ہے کرئی؟“ معا سے زلیخہ کی آواز سنائی دی۔ ”تم نے بتایا نہیں۔ میں تمہیں کیسا لگتا ہوں؟“

کرئی نے سر اٹھایا اور جواب سے بولی۔ ”کیا مطلب؟“
 ”جھپٹنے کی ضرورت نہیں۔“ زلیخہ نے کہا۔ ”کرئی! ہم دونوں ایک ہی شے کے سوار ہیں۔ کیا ہمیں حق نہیں کہ ہم بھی اپنی تکلیف کا عداوہ کر سکیں؟“ اس کے بعد سب کچھ اچانک ہوا۔

زلیخہ نے غلٹ میں کرئی کو اپنی ہاتھوں میں بھر لیا۔
 ”جین! چھوڑ دیجئے۔“ کرئی نے زلیخہ کو کھیلایا۔
 ”یہ نخرے ختم کرو۔“ زلیخہ نے ہاتھ ہٹائے ہوئے کہا اور کرئی کو زیادہ مضبوطی سے دبا لیا۔ ”خود کو خود آواز دیت میں مت ڈالو۔“ کرئی کو اپنا خواب یاد آیا۔ میز پر رکھا ہوا لیپ اس کی بیٹی سے دور تھا۔ اس کی ضرب سے زلیخہ کا سر آسانی سے پھوڑا جا سکتا تھا۔ کرئی نے زلیخہ کے ہاتھوں کو محسوس کیا جو اس کا لباس کھولنا چاہتے تھے۔ اسی لمحے کرئی کو لیون پر شدید غصہ آیا۔ وہ شادی کے دنوں میں ایک کتے کی خواہش مندگی مگر لیون کتے کے لیے رضا مند نہیں ہوا۔ اس کا کہنا تھا کہ بچپن میں ایک کتے نے اسے کاٹ لیا تھا تب سے وہ کتوں سے ڈرنے لگا ہے لیکن کرئی نے اکثر دیکھا تھا کہ عام زندگی میں لیون کتوں سے بالکل نہیں ڈرتا تھا۔ جانے کیوں وہ نہیں چاہتا تھا کہ کرئی کوئی کتا مالے۔

یہ دیکھ کر ایک معا تھا جیسا لیون گھر میں کوئی بچہ بھی نہیں چاہتا تھا۔ اس وقت کرئی باگلی ہو رہی تھی، اسے کتے کا نہ ہونا کھل رہا تھا۔ وہ برف کی قبر کی طرف بڑھ رہی تھی اور اس کی مدد کے لیے کوئی بھی نہیں تھا۔ ”اوکے۔“ اس نے جدوجہد ترک کرتے ہوئے زلیخہ سے کہا۔ ”تم ٹھیک کہتے ہو۔ ہمیں اپنے نقصان کی حلافی کا حق ہے۔ میری کلاٹیاں چھوڑ دو۔ مجھے درد ہو رہا ہے۔“ زلیخہ نے کرئی کی کلاٹیاں چھوڑ کر ہولے

اصل خطرہ

بیٹے کی درخواست پر باپ نے اسے خود حقائق کے سارے گرکھا دیے پھر کتے بازی کی بھی ساری مشق کروانے کے بعد باپ بیٹے سے بولا۔
 ”اب تم اسکول میں کسی بچے سے دب کر نہیں رہو گے۔“
 بیٹا۔ ”یہ تو سب ٹھیک ہے لیکن آپ نے جی کی طرح ایک گراپے پاس رکھ لیا ہے۔“
 ”کیا مطلب؟“ باپ نے حیرانی سے پوچھا۔
 ”مجھے ڈر لڑکوں سے نہیں تھا۔ دراصل مجھے تو باپ صاحب سے خطرہ ہے۔“

اسے اس کا بوسہ لیا۔ کرئی نے کوئی مزاحمت نہیں کی مگر آواز ہوتے ہی اپنا ایک ہاتھ پیچھے کیا اور دوسرے ہاتھ کو زلیخہ کے اوپر لیٹھے سے پچھلے حصے کی طرف لے گئی۔
 زلیخہ کے منہ سے فلک کھٹک جھج بلند ہوئی۔ کرئی اچھل کر دروازے کی سمت لپکی جہاں گولف کلب رکھا ہوا تھا۔ وہ چھڑی ہاتھ میں اٹھا کر دراز کرنے کے لیے زلیخہ کی طرف بڑھی مگر اس کی نوبت ہی نہیں آئی۔ زلیخہ ٹھٹھری بنا ہوا فرش پر اوندھا پڑا تھا۔ زلیخہ نے دونوں ہاتھوں سے اپنا نچلا جسم دوبار کھا تھا۔ اس کے منہ سے کراہیں نکل رہی تھیں اور درد کی شدت سے چہرہ تاریک ہو گیا تھا۔
 کئی سال پہلے کرئی نے اخبار میں ایک چھوٹا سا مضمون پڑھا تھا۔ یہ کسی بوڑھی عورت کے بارے میں تھا جسے ایک شخص نے پکڑ لیا اور اپنی ہوس کا نشانہ بنانا چاہتا تھا۔ اس عورت نے بھی یہی کہا اور اس پر کیا تھا۔ وہ کرئی کی یادداشت میں محفوظ تھا اور آج اسی طریقے نے اسے بچا لیا تھا۔
 رات جب کرئی قہقے کے پولیس اسٹیشن میں تھی، بارش نے قہقے کو لایا۔ زلیخہ کو اسپتال میں داخل کر دیا گیا تھا۔ آدھی رات کے وقت ایک پولیس کار نے اسے پہنچایا۔ بے شک یہاں کوئی گواہ نہیں تھا مگر کرئی کا کیس مضبوط تھا۔ زلیخہ اس کے گھر میں پایا گیا تھا۔ کرئی نے زلیخہ پر کیس کر دیا۔ اسپتال سے واپسی پر پولیس آفیسر اس کا مشعر تھا۔ گھر آ کر کرئی نے چند پرانے ٹیک کھائے۔ وہ چکن کی میز

پریشانی ہوئی تھی۔ باہر بارش کا شور جاری تھا۔ ہوا میں کچھ گرمی پیدا ہوئی تھی۔ اس سے برف کے ٹکڑے پگھلنے لگے تھے اور چھت سے نیچے آ رہے تھے۔ اسے معلوم تھا کہ جمیل پر بھی برف پگھلنے والی ہے اور آس پاس کی تمام زمین صاف ہونے والی ہے۔

سونے کے لیے جاتے ہوئے کرستی نے ساری بیٹیاں جلادیں مگر رات بھی اسے اپنا پرانا خواب نظر آیا۔ لگتا تھا اسے موت کے خیال نے مکمل طور پر چکڑ لیا ہے۔ حالانکہ دن کا تجربہ بھی خاصا اثر انگیز تھا لیکن وہ بھی خواب پر اثر نہیں ڈال سکا۔ صبح ہوئی تو کرستی نے محسوس کیا کہ وہ ڈری ہوئی ضرور ہے مگر اس پر قابو پا سکتی ہے۔ باہر فضا بہت شفاف سی تھی۔ ہر طرف برف ہی برف تھی مگر مکمل صاف تھا اور سورج نکل آیا تھا۔ جس وقت کرستی نے برف پر اپنا پہلے مارا اسے احساس ہوا کہ برف سخت نہیں رہی، اس میں نرمی پیدا ہوئی تھی۔ تین گھنٹے کی محنت کے بعد اس نے خاصی برف ہٹائی پھر گیراج میں گئی۔ کار اسٹارٹ کی اور اسے باہر نکالا۔ کار کا انجن سرد تھا مگر کام کر رہا تھا۔ قبے کے مین بازار پہنچ کر کرستی نے کافی تعداد میں پھل اور سبزیاں خریدیں۔ دودھ اور دیگر اشیاء بھی لیں پھر سارا سامان کار میں ڈالا۔

”ارے کرستی! تم یہ ہو۔“ کرستی کو اپنے عقب میں کسی کی آواز سنائی دی۔ اس نے مڑ کر دیکھا۔ سامنے سرینا کھڑی تھی۔ سرینا کے شوہر اور لیون میں شائستگی تھی۔

”ادھر سرینا تم۔“

”کیا حال ہے تمہارا کرستی۔“ سرینا نے پوچھا۔

”میں ٹھیک ہوں۔“ کرستی نے احتیاط سے کہا۔

”لیون کیسا ہے؟“ سرینا نے پوچھا۔ سرینا چھوٹے قد کی خاصی موٹی عورت تھی مگر اس کی ازدواجی زندگی میں کوئی گڑبڑ نہیں تھی۔

کرستی نے قدرے تذبذب کے بعد کہا، ”لیون مجھے چھوڑ کر کہیں چلا گیا ہے۔ ہمارے درمیان تلخی ہو چکی ہے۔“

”ارے..... آئی ایم سوری۔“ سرینا ایک دم سے سنجیدہ ہو گئی۔ کرستی کے لیے آسانی ہو گئی پھر آرام سے سرینا کے دوسرے سوالات کو جھٹکا دیا۔ چلتے چلتے کرستی نے سرینا سے کہا کہ لیون کسی عورت کے ساتھ نہیں فرار ہو گیا ہے۔ اب یہ بات کوئی راز نہیں۔ تم اسے دوسروں کو بتا سکتی ہو۔ میں یہیں رہوں گی۔ فی الحال کام نہیں کر رہی مگر جلد دوبارہ اسٹور پر چلی جاؤں گی۔

گھر پہنچ کر کرستی نے گھر کی صفائی شروع کر دی۔ وہ

آدمی رات تک لگی رہی اور.... بالآخر اس نے گھر کو اچھی حالت میں کر لیا۔ اس کے بعد کرستی نے غسل کیا اور کھانا کھایا۔ پھر اپنے صاف تھرے بستر پر لیٹ گئی۔

آنے والے ہفتے میں کرستی نے لیون کی تمام چیزیں، لباس اور جوئے وغیرہ جمع کیے اور ضرورت مندوں کو تحیرات کر دیے پھر تمام الماریاں اور کھڑکیاں صاف کیں۔ لیون کی تمام تصویروں کو جمع کیا اور ہنڈل بنا کر کبکس میں بند کر کے تھخانے کے ایک کونے میں ڈال دیا۔ تھخانے سے ہی کرستی نے باغبانی اور لکڑی کے کام والے اوزار نکالے اور گھر کی صفائی اور مرمت کے کاموں کی طرف متوجہ ہوئی۔ ایک صبح کرستی فون کے سامنے بیٹھی ہوئی تھی۔ اس نے سوچتے ہوئے ایک لمبی سانس لی اور فون ملایا۔ وہ اپنے ماں باپ سے بات کرنا چاہتی تھی جو کسی اور شہر میں رہتے تھے۔ اسے حیرت ہوئی کیونکہ اس کے اور لیون کے بارے میں ماں نے جان کر کوئی حیرت ظاہر نہیں کی۔ تب کرستی نے پوچھا۔

”مگر ماں! تم تو لیون کو بہت پسند کرتی تھیں۔“

”صرف اس لیے کہ وہ تمہیں پسند تھا۔“ اس کی ماں نے کہا۔ پھر اس کے باپ نے بات کی اور کہا۔

”کیا تم ہمارے پاس آنا چاہتی ہو؟“

”نہیں ڈیڈ۔“ کرستی بولی۔

”میں چالیس سال کی ہوں، کوئی بچہ بھی نہیں ہے، میں ٹھیک ہوں ادھر ہی۔“ فون بند کرنے کے بعد کرستی نے گیراج کا دروازہ درست کیا پھر اپنے گھر کا اچھی طرح جائزہ لیا۔

کرستی نے سوچا کہ یہ ایک اچھا مکان ہے۔ بس اس کو رنگ درون اور چھت کو کچھ مرمت کی ضرورت تھی۔ وہاں مکان کے آس پاس بہت سے درخت لگے ہوئے تھے اور اب سبزہ بکھر رہا تھا۔ اس نے ارادہ کیا کہ وہ یہ گھر نہیں چھوڑے گی۔ وہ یہاں سے بھی نہیں جائے گی۔ میں ایک کتا بھی لوں گی! ان درختوں میں وہ دوڑتا ہوا بہت اچھا لگے گا۔ کرستی سوچ بھرے انداز میں چلی اور گیراج کا دروازہ بند کر دیا۔ جب وہ مڑی تو اس کا دل دھک سے رہ گیا۔ اس نے اپنی طرف مارکس کو بڑھتے دیکھا۔

”ہائے کرستی۔“ اس نے اپنے زرد دانت نکالتے ہوئے اسے پکارا۔ ”تم نے اپنا مکان صاف کر لیا ہے مجھے بلا تئیں میں مدد کر دیتا۔“ مارکس نے زمین لباس پہن رکھا تھا۔ اس کے جسم سے کسی سے سے پر لیم کی خوشبو اٹھ رہی تھی اور ہاتھ میں کوئی ہنڈل دبکا تھا۔ ”آج تو اری کی رات ہے۔“ مارکس بولا۔ ”میں نے سوچا تم تہا ہوگی۔ تمہیں کوئی دواں

گا۔ کچھ پینے پلانے کی چیزیں لایا ہوں۔“ مارکس نے پیکٹ کی طرف اشارہ کیا۔

”مجھے کی کمی نہیں چاہیے مارکس۔“ کرستی کا لہجہ خشک ہو گیا۔ ”اور سنو، میں نہیں چاہتی کہ تم میرے گھر آؤ۔“ سمجھے۔“

مارکس نے حیرت سے اسے دیکھا۔ ”کیا بات ہے تم ٹھیک تو ہو؟“

”میں بالکل ٹھیک ہوں۔“ کرستی نے اسی درشتی سے کہا۔ ”سردیاں سخت تھیں مگر گزر چکی ہیں اور تم مارکس..... اب میرے گھر مت آنا۔ درنہ میں پولیس کو مطلع کر دوں گی۔ بس اب چلے جاؤ۔“ مارکس نے اسے گھور کر دیکھا، مڑا اور منہ ہی منہ میں کچھ بڑبڑاتا ہوا چلا گیا۔

”لعنت ہو۔“ کرستی نے آہستہ سے کہا۔

☆☆☆

وہ خواب کی گرفت میں تھی اور خود اپنی لاش کو دیکھ رہی تھی۔ برف کے نیچے دبی ہوئی آنکھیں جن کا رنگ نیلا تھا، اب سرمئی ہو گئی تھیں۔ چہرے کے زاویے اور گوشت سیاہ ہو گئے اور پھول چکے تھے۔ کرستی اپنی برف میں دبی ہوئی لاش کے ساتھ تھی اور قاتل کا کہیں پتا نہیں تھا۔ کرستی نے سوچا آخر مجھے کہاں ڈالا گیا ہے؟ میں کہاں مدفون ہوں؟ خواب میں کرستی کو بس اس قدر ہی پتا چلتا تھا کہ اسے جمیل کے آس پاس کہیں دفن کیا گیا ہے۔ وہ خواب کو قائم رکھنے کی کوشش کرتے ہوئے آنکھیں سے چل رہی تھی کہ اس کا سر کی چیز سے ٹکرایا۔ اسے لگا جیسے ہر مشرور دھندلا ہو کر ایک سیاہ دیوار بن گیا ہو۔ کرستی نے خود کو کھینچا۔ اس نے اپنی رفتار بڑھا دی۔ وہ سلیب غائب ہونے لگی۔ اب اسے ایک چھت نظر آ رہی تھی۔ اسے احساس ہوا کہ وہ بلند ہو رہی ہے، فضا میں اٹھ رہی ہے۔ کرستی نے نیچے چھت کو دیکھا پھر یہ چھت بھی چھوٹی ہوئی۔ وہ بہت اوپر اٹھ گئی تھی۔ اب نیچے کچھ نظر نہیں آ رہا تھا۔

☆☆☆

دوسری صبح گرم تھی۔ برف نے اب تیزی سے پگھلنا شروع کر دیا تھا۔ پانی چلنے کی نرم آوازوں سے فضا سنسنی آ رہی تھی۔ کرستی نے ایک پہلے سنہنالا اور ٹول بس بغل میں دیا اور صحن کے عقبی حصے کی سمت چل پڑی۔ یہاں کا شید پتلی دیواروں کا تھا۔ اس کی چھت بھی پتلی تھی۔ یہاں انہوں نے اپنے گھر کا کٹھن کٹا ڈال رکھا تھا۔ کرستی نے برف صاف کی اور کچھ کراس کا دروازہ کھول دیا۔ اندر کوئی کھڑکی نہیں تھی۔ یہاں نمی اور خشک تھی۔ عجیب سی بو ہر طرف پھیلی ہوئی تھی۔ دیواروں کی درزوں سے سورج کی

روشنی اندر آ رہی تھی اور نقش و نگار بنا رہی تھی۔ اسے سمجھے میں در نہیں لگی کہ یہی وہ جگہ ہے جو اسے خواب میں ٹھیک سے نظر نہیں آتی تھی۔ یہی اس کا مدفن ہے۔ اس کی لاش یہیں دفن ہے۔ کرستی نے لمبی سانس لی اور سوچا کہ انسانی ذہن کیسا کرشمہ ساز ہوتا ہے۔ پھر رک کر فرش کے ایک کونے کی طرف دیکھا اور اپنا ٹول بس کھولنے لگی۔ وہ کونے کے نیچے اکھاڑ رہی تھی۔ یکے بعد دیگرے اس نے جب کئی تختے اکھاڑ دیے تو پہلے سنہنالا اور زمین کھودنے لگی۔ ذرا ہی دیر بعد اسے وہ سلیب دکھائی دے گئی۔ اس پر برف کی چھانچ موٹی تھی جی ہوئی تھی۔ کرستی نے سلیب ہٹا کر نیچے نگاہ ڈالی۔ نیچے زلیخہ..... اب اتنی حسین نہیں نظر آ رہی تھی جیسی وہ ہوئی تھی..... اور اس کے پاس لیون بھی پڑا ہوا تھا۔ اب وہ بھی اتنا خوب صورت نہیں رہا تھا۔ کرستی ان دونوں کو دیکھتی رہی..... بالکل غیر جذباتی انداز میں۔ ”تم لوگ ابھی تک گلے سڑے نہیں؟“ کرستی نے خود کلائی کی۔ اس کے دماغ میں کچھ عرصہ پہلے کی باتیں گھومیں۔ جب وہ آفس سے لوٹی تھی تو اس نے دروازے پر دو عدد سوٹ کس دیکھے۔ لیون گھر میں میکی کی لاش کے ساتھ اس کا منتظر تھا۔

لیون نے اعتراف کیا کہ اس کا میکی سے معاشرہ تھا مگر میکی عیاش عورت تھی۔ جب اس کا دل بھر گیا تو اس نے نیا عاشق ڈھونڈ لیا اور لیون کو چھوڑ دیا۔ اسی بات پر لڑائی ہوئی اور غصے میں آ کر لیون نے میکی کا گھار دبا دیا جس کے باعث وہ مر گئی۔ لیون گرفتاری کے ڈر سے میکی کی لاش کو بچھا کر امریکا جا رہا تھا۔ اس نے اکاؤنٹ سے تمام رقم نکال لی تھی اور کرستی سے کہا کہ وہ بعد میں اسے بھی بلا لے گا اور پھر جب وہ لاش کو یہاں دفن کر رہا تھا تو بیٹے کی ایک ضرب سے اس نے لیون کو بھی میکی کے پاس پہنچا دیا۔ باقی کام کرستی نے خود کیا تھا مگر اس سے ایک غلطی ہو گئی تھی۔ اس نے سلیب کے پانی کو رہنے دیا جو برف بن گیا تھا اور اسی وجہ سے یہ لاشیں ابھی تک جگہ نہیں تھیں۔ کرستی نے اوزار پیچیدہ دیے۔ ہاتھ جھڑے اور بولی۔

”اگلی سردیوں تک تمہاری ٹھکان میں مٹ ہو چکی ہوں گی اور پھر تمہیں جھیل کنارے پہنچانے میں مجھے کوئی دقت نہیں ہوگی۔“ اس کے بعد کرستی نے سامان اٹھایا۔ شید کے دروازے تک آئی اور مڑ کر غلا میں دیکھا اور بڑبڑائی۔

”گڈ بائی..... ایڈ گڈ لک۔“

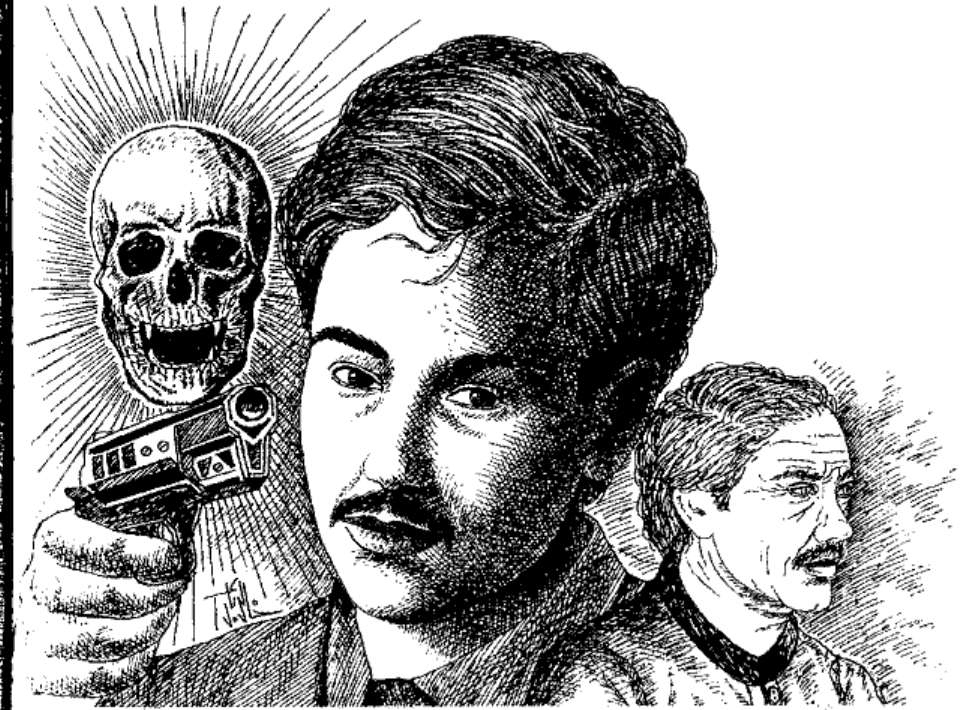


حریف

نثر ہادی

”تیرا عشق نچائے گلی گلی“ کی عملی تفسیر بنی وہ بھی پھر سے بچنے کے لیے پجرتوں پر مجبور تھی کیونکہ... چاہتوں بھرا ساتھ پانے کے لیے اسے زندگی کی ضرورت تھی۔ یہ حقیقت ہے کہ انسان غیروں سے تو جنگ کر سکتا ہے مگر اپنی ذات اور اپنے رشتوں سے لڑنا آسان نہیں ہوتا اور اسے بھی یہی کٹھن مرحلہ درپیش تھا کہ اس کے مدمقابل غیر نہیں اپنے تھے، جن کی دسترس سے دور وہ درد بھٹکتی روح بن گئی تھی اور اس سفر نے اسے یہ باور کرا دیا تھا کہ انسان کا ذرہ برابر عمل بھی جزا یا سزا بن کر مکافات کی صورت اس کے سامنے آجاتا ہے... اس نے بھی بے خیالی میں ایک انسان کی محض ہمدردی کی بنیاد پر مدد کی تھی لیکن اس کا صلہ اسے کب اور کیسے ملنے والا تھا اس کا اندراک اگر اسے قبل از وقت پوجاتا تو جی جان سے وہ اسی محاذ پر ڈٹی رہتی۔ بہر حال ایک روز اس مکافاتی عمل نے اس کی آنکھوں پر پڑا پردہ ہٹا دیا اور دھندلکے میں چھپے منظر کو واضح کر دیا مگر... اس پر یقین کرنا اس کے بس کی بات نہ تھی۔

عاقبت کی چادر میں چھپے لوگے خردوں کی اذیت اور... بے اعتبار رشتوں کی دلہراش داستان



”یہ کام جلد از جلد ہو جانا چاہیے۔“ اشرف خاں نے کہا اور رابطہ منقطع کر دیا۔

☆☆☆

سالگرہ کی تقریب سے صدف اسی وقت لوٹی تھی جب اشرف خاں اس کے کمرے میں آیا تھا۔ وہ شب خوابی کا لباس بھی نہیں پہن کر تھی پھر اشرف خاں کے جانے کے بعد تو اس کا ذہن اتنا منتظر ہوا کہ اسے کپڑے تبدیل کرنے کا خیال ہی نہیں آیا۔ وہ صرف سینڈل اتار کر بستر پر لیٹ گئی۔ اس کے دماغ میں اشرف خاں کی نہ صرف اس وقت کی باتیں پھر اسی شخص بلکہ وہ گفتگو بھی جو اس نے گزشتہ رات چھپ کر سن لی تھی جب اشرف خاں اپنے بڑے بھائی پرنس صدیق وڑائچ سے کوئی خاص بات کر رہا تھا۔

ان سب باتوں کی وجہ سے صدف کی نیند اس کی آنکھوں سے بہت دیر تک اڑی رہی۔ رات اپنے تیسرے پہر میں داخل ہو رہی تھی جب اس کی آنکھ کھلی اور اس رات اس نے ایک حیرت انگیز خواب دیکھا۔

وہ ایک چمک دار انسانی کھوپڑی تھی جس کے چار دانت بھی تھے۔ کسی ایسی چمک دار دھات کے دانت جو کھوپڑی سے زیادہ چمک رہے تھے۔

”صدف!“ ایک بھاری بھر کم آواز اس طرح آئی جیسے وہی کھوپڑی بول رہی ہو۔ ”غور سے سنو اور یقین کرو۔ تم خوب جانتی ہو گی کہ میں تم سے جھوٹ نہیں بول سکتا۔ تم شدید خطرے میں ہو صدف!..... تمہیں قتل کرنے کا حکم صادر کیا جا چکا ہے۔ فوراً میرے پاس آ جاؤ۔ کسی اور جگہ جا کر تم اپنی جان نہیں بچا سکو گی۔“

پھر وہ کھوپڑی ٹھیکل ہوتی چلی گئی، اندھیرے میں مدغم ہو گئی۔

خواب ختم ہوتے ہی صدف کی آنکھ کھل گئی۔ اس نے محسوس کیا کہ وہ سینے میں ڈوبی ہوئی تھی۔ دل بے طرح دھڑک رہا تھا۔ جو آواز اس نے خواب میں سنی تھی، وہ اس کے لیے اجنبی نہیں تھی۔ وہ آواز کالا شیوں کے کافر قبیلے کے مذہبی پیشوا کی تھی۔ وہ مذہبی پیشوا کالا شی قبیلے کی زبان میں ”بنیان“ کہلاتے تھے۔

بنیان کو صدف ”خیلاری“ کے نام سے جانتی تھی۔ دو سال پہلے صدف تقریباً کافرستان جا چکی تھی جہاں بنیان خیلاری ایک معاملے میں اس کا احسان مند ہوا تھا۔ اسی لیے جب صدف کافرستان سے رخصت ہونے لگی تھی تو پراسرار قوتوں کے مالک خیلاری نے اس سے کہا تھا۔

”پریشانی کا سبب؟“

”وہی باتیں۔“ صدف نے جواب دیا اور پھر غالباً ہمت کر کے بولی۔ ”آپ اچھا نہیں کر رہے ہیں بابا!“

”اسی کی وجہ سے تمہیں وعشرت کی زندگی گزار رہی ہو۔“

”قوم کے ساتھ وہ سب کچھ کرنے سے بہتر ہوتا کہ میں غربت کی زندگی گزارتی۔“ صدف کی آواز بھرا گئی۔

اشرف خاں چند لمحوں خاموشی سے اسے گھورتا رہا، پھر بولا۔ ”ابھی تم کسی دوست کی سالگرہ سے آئی ہو۔ امید ہے کہ تم نے وہاں کی قریبی دوست سے بھی اس کا ذکر نہیں کیا ہوگا۔“

”ظاہر ہے بابا!“ صدف کی نظریں پھر جھک گئیں۔

”کسی کو یہ باتیں بتانے کا مطلب تو یہی ہوتا جیسے میں اپنے ہی جرم کا اعتراف کر رہی ہوں۔“

”اپنی ماں کو بھی نہیں بتایا؟“

”جی نہیں لیکن.....“ وہ چپ ہو گئی۔

”لیکن..... لیکن کیا؟“

اس مرتبہ صدف نے کچھ جرأت کی۔ ”اگر آپ نے یہ سب کچھ بند نہ کیا تو.....“ وہ پھر چپ ہو گئی۔

”تو؟“

”تو نہ جانے کیا ہوا“ صدف نے کہا۔ ”کل سے ایک طوفان آیا ہوا ہے میرے دماغ میں..... ممانے میری تربیت کچھ ایسی ہی کی ہے کہ میں سب کچھ دیکھ کر خاموش نہیں رہ سکتی۔“

”بتاؤ گی کسی کو؟“ اشرف خاں غرایا۔

صدف خاموش رہی۔ اس نے پھر نظریں جھکا لی تھیں۔

اشرف خاں اسے ایک منٹ تک گھورتا رہا، پھر تیزی سے چلتا ہوا کمرے سے نکل آیا۔ وہاں سے وہ اپنی خواب گاہ میں لوٹا۔ دل شاد خانم بے خبر سو رہی تھی۔ اشرف خاں نے اپنا موبائل فون اٹھایا اور کمرے سے نکل کر بیٹل کے میسر پر پہنچا۔ وہاں سے اس نے موبائل پر کسی سے رابطہ کیا۔

”میں باس!“ دوسری طرف سے آواز آئی۔

”میری بیٹی صدف کو جانئے ہو؟“

”کیوں نہیں باس! ہم میں سے کون نہیں جانتا ہوگا آپ کی بیٹی کو۔“

”ختم کر دو اس کو۔“

”جی!“ بہت چوکی ہوئی آواز تھی۔

اشرف خاں نے کہا۔ ”کوئی ایسا طریقہ اختیار کرنا کہ موت حادثاتی معلوم ہو۔“

”دل..... لیکن..... باس.....“

ہوئے دروازے کی طرف بڑھا۔

”ڈانٹا نہیں اسے۔ اجازت لے کر گئی تھی مجھ سے!“

اشرف خاں جواب میں کچھ کہے بغیر دروازے تک پہنچ چکا تھا۔ دل شاد خانم نے منہ بنایا اور لیٹ کر آنکھیں بند کر لیں۔ اس پر نیند شدت سے سوار ہو گئی۔

اشرف خاں اپنے کمرے سے نکل کر صدف کے کمرے کے دروازے پر پہنچا اور دروازے پر دستک دی۔

”کون؟“ اندر سے صدف کی آواز آئی۔ چونکا ہوا انداز تھا کیونکہ گیارہ سے زیادہ کا وقت ہو چکا تھا۔

”میں ہوں۔“ اشرف خاں نے بلند آواز میں کہا۔

فوراً ہی قدموں کی آواز سنائی دی جو دروازے کی طرف آ رہی تھی پھر دروازہ کھول دیا گیا۔ صدف غالباً اسی وقت آئی تھی۔ اس نے کپڑے تبدیل نہیں کیے تھے۔

”بابا!“ وہ تنہید کی سے بولی۔

”ہوں۔“ اشرف خاں تیزی سے کمرے میں داخل ہو گیا۔

”کیا بات ہے بابا؟“ صدف نے سوالیہ انداز میں باپ کو دیکھا۔

اشرف خاں نے گاؤں کی جیب سے وہی تصویر نکالی جس نے اسے چونکا یا تھا۔ وہ اس نے صدف کے سامنے کر دی۔

”یہ تمہاری ہی تصویر ہے نا؟“ اشرف خاں کی آواز میں غصہ تھا۔

”جی۔“ صدف کی آواز بہت دھیمی تھی۔ اس کے چہرے کا رنگ پیکا پڑ گیا تھا۔

”اور.....“ اشرف خاں بولا۔ ”تصویر سے صاف ظاہر ہو رہا ہے کہ تم کان لگا کر کچھ سننے کی کوشش کر رہی ہو!“

صدف نے نظریں جھکا لیں۔

”کیا سنا تھا تم نے؟“ اشرف خاں نے تیز آواز میں پوچھا۔

صدف خاموش رہی۔ نظریں اب بھی جھکی ہوئی تھیں۔

”جواب دو!“ اشرف خاں نے کہہ کر اپنی زور سے دانت پر دانت بجائے کہ اس کے جڑے کی ہڈیاں ابھریں۔

صدف نے نظریں اٹھائیں اور آہستگی سے بولی۔

”یہ اتفاق تھا بابا کہ میں کل رات اس طرف نکل گئی تھی۔ میں نے باتوں کی آواز سنی۔ میں وہ سنتی ہوئی آگے نکل جاتی لیکن ایک ایسا لفظ میرے کان میں پڑا کہ میں شگ کرک کئی پھر میں نے جو باتیں سنیں، انہی کی وجہ سے میں کل سے اب تک پریشان ہوں۔“

اشرف خاں نے سی سی فونج دیکھیں اور چونک گیا۔ وہ اپنے کمرے کے جس ڈرائنگ روم میں چند افراد سے جو خاص قسم کی میٹنگ کیا کرتا تھا، انہیں ہر صورت میں راز رکھنا چاہتا تھا۔ اسی لیے اس نے کمرے کے ان بیرونی حصوں پر کیمیرے لگوائے تھے جہاں سے کوئی چھپ کر میٹنگ کی باتیں سن سکتا تھا۔ ایسی ہی ایک جگہ کی وہ تصویر تھی جس میں ایک لڑکی نظر آ رہی تھی جس کی عمر بیس اکیس سال کے قریب تھی۔

اس وقت رات کے گیارہ بجے تھے۔ اشرف خاں وہ تصویر دیکھ کر نہ صرف چونکا بلکہ لینے لینے اٹھ بیٹھا۔ اس نے پہلو میں لیٹی ہوئی اپنی بیوی دل شاد خانم پر نظر ڈالی جو سوچتی تھی۔ اشرف خاں نے اسے منہ جوڑ ڈالا۔

”دل شادا!“ اس کی آواز بھی خاصی تیز تھی۔

دل شاد خانم بڑبڑا کر اٹھ بیٹھی۔ ”کیا ہوا..... خیریت؟“

”صدف.....“ اشرف خاں نے بیوی کو گھورتے ہوئے پوچھا۔ ”واپس آ گئی ہے؟“

دل شاد خانم نے مگڑی پر نظر ڈالی۔

”اس وقت کیسے خیال آ گیا آپ کو؟“

”میری بات کا جواب دو!“ اشرف خاں کا لہجہ خاصا تیز تھا۔

”اب تک تو شاید ابھی نہیں ہو۔“ دل شاد خانم نے جواب دیا۔ ”بتاؤ چکی ہوں آپ کو!..... اس کی کسی دوست کی سالگرہ تھی آج، کہہ رہی تھی کہ وہاں سے کھانا کھا کر ہی آئے گی، ہم لوگ کھانے پر اس کا انتظار نہ کریں۔ میں اسے زیادہ دیر تک، رات کے وقت باہر رہنے کی اجازت نہ دیتی لیکن اس خیالی سے دے دی کہ وہ کل سے بہت کم صدم اور چپ چاپ سی گئی۔ میں نے سوچا تھا کہ سالگرہ میں جا کر اس کا دل پھٹ جائے گا۔“

”دوبارہ یہ کہانی سنانے کی کیا ضرورت تھی!“ اشرف خاں پھر بھنبلا گیا۔ ”میں نے پوچھا تھا کہ وہ واپس آ گئی یا نہیں۔“

”میں بھی جواب تو دے چکی ہوں۔“ دل شاد خانم نے منہ بنایا۔ ”گیارہ بج چکے ہیں۔ آ ہی گئی ہوگی۔ میں تو آج جلدی سو گئی تھی۔“

اشرف خاں بستر سے اٹھا اور شب خوابی کے لباس پر گاؤں پہننے لگا۔

”کیا صدف کو دیکھنے جا رہے ہیں؟“ دل شاد خانم نے پوچھا۔

”ہاں۔“ اشرف خاں گاؤں کی دوری باندھے



جاسوس ڈائجسٹ سیلی کیشنز

ایک ادارہ، چار ماہانہ مطبوعات

دنیا بھر میں

خبریت

اور معلومات

کی مشہور نشریات کے لیے

جاسوس ڈائجسٹ سبس ڈائجسٹ ماہنامہ پاکیزہ ماہنامہ سرگزشت

ماہنامہ سب سے زیادہ پڑھنے والی اور سب سے زیادہ مایوس کن اور دلچسپ
ہفت روزہ ہے اس کی تمام کہانیاں اور معلومات اس کے پڑھنے والوں



جہاں جہاں لکھی جاتی ہے وہاں یہ رسائل ہاتھ لگنے سے پہنچتے ہیں

63-C فیروز ایکسپریس ڈیفنس ہاؤسنگ اتھارٹی مین کورنگی روڈ کراچی

فون نمبر: 35804200, 35802552 (92-21) 35802551 (92-21) ای میل: group@hotmail.com



اشرف خاں نے کہا اور ناشتے میں مصروف رہا۔
”آپ کے سامنے تو یہ نہیں بتائے گی۔“ دل شاد خانم نے کہا۔

”تو بعد میں پوچھ لیتا۔“ اشرف خاں نے کہا۔ ”ناشتا کر کے میں جا ہی رہا ہوں دفتر..... آج شاید واپسی میں بھی کچھ دیر ہو۔ کام زیادہ ہے۔“
جب اشرف خاں چلا گیا تو دل شاد نے اپنا سوال صدف سے دہرایا۔

”کچھ خاص نہیں ماما!“ صدف نے جواب دیا، پھر فوراً ہی بولی۔ ”اس وقت بھی میں اپنی دوست کے گھر جا رہی ہوں۔ کل سالگرہ کی تقریب کے دوران ہی اس کی طبیعت کچھ خراب ہو گئی تھی۔ اسے دیکھنے جاؤں گی۔ فون پر خیریت دریافت کرنا تو رکسی سی بات ہو گی نا۔“

لیکن صدف تو گزشتہ رات کسی دوست کی سالگرہ پر گئی تھی، نہ اس وقت اس نے سچ بولا تھا۔ وہ گزشتہ رات بھی شیراز کے ساتھ لانگ ڈرائیو پر نکل گئی تھی اور اس وقت بھی شیراز ہی سے ملے جانا چاہتی تھی۔

شیراز سے اس کی محبت پروان چڑھتے ہوئے چار سال گزر چکے تھے۔ ان دنوں نے ایک ہی کالج میں پڑھا تھا۔ صدف کرسٹ انیر میں داخل ہوئی تھی۔ شیراز اس وقت تھرڈ ایئر میں تھا۔ دو سال بعد گریجویشن کرنے کے بعد اسے ایک کمپنی میں اچھی ملازمت مل گئی تھی۔ صدف نے اسی سال فائنل انیر کا امتحان دیا تھا اور نتیجہ کی انتظار تھی۔ شیراز نے اس سے وعدہ کیا تھا کہ جیسے ہی اس کا نتیجہ آئے گا، وہ اپنے والدین کو اس کا رشتہ لینے کے لیے بھیج دے گا۔

ان دنوں شیراز اپنے گھر میں اکیلا رہ رہا تھا۔ اس کے والدین اور اس کی چھوٹی بہن خینی ریاست ایونٹس گئے ہوئے تھے جہاں شیراز کی بڑی بہن بیباہ کر گئی تھی۔ ان دنوں اس کی طبیعت کچھ خراب تھی۔ سب اسے ہی دیکھنے گئے تھے۔ شیراز کمپنی کی مصروفیت کے بہانے وہیں رک گیا تھا مگر ان کے جاتے ہی اس نے پندرہ دن کی چھٹی لے لی تھی تاکہ صدف کے ساتھ زیادہ سے زیادہ وقت گزرا سکے۔

گزشتہ روز اس کی چھٹی کا پہلا دن تھا۔ صدف نے اس کے ساتھ چار گھنٹے گزارے تھے لیکن اب دوسرے دن صبح ہی صبح وہ اس لیے ملنا چاہتی تھی تاکہ اسے اپنی موجودہ صورت حال کی سبب سے آگاہ کر سکے۔

جب وہ اپنی کار میں شیراز کے گھر کی طرف روانہ ہوئی تو راستے میں ہی اسے موبائل فون پر اطلاع دے دی کہ وہ

”اچھی لڑکی!..... میں تمہارے بارے میں سب کچھ جان سکتا ہوں کرنی الحال میں نے تمہارے مستقبل میں ٹھوڑا سا جھانکا ہے۔ جب تم تیس سال کی ہو جاؤ گی تو ایک خطرہ تمہارے سر پر منڈلائے گا۔ جب بھی ایسا ہوا، میں تمہیں اس خطرے سے آگاہ ضرور کروں گا۔ کیونکہ میں تمہاری زندگی میں محبت بھی دیکھ رہا ہوں اس لیے جب بھی تمہیں کسی خطرے سے آگاہ کرنا چاہوں گا تو تمہارے خواب میں دانکائی کی کھوپڑی بھیجوں گا جو یہاں رہنے والوں کے لیے محبت کی علامت ہے۔ تم نے یہاں اس کے بارے میں سنا تو ہوگا!“

کافرستان میں صدف دانکائی کی لازوال محبت کا قصہ سن چکی تھی۔

وہ سب باتیں اس وقت بھی صدف کو یاد آ گئیں۔ اسے یہ بھی یقین تھا کہ اس کا خواب بٹیان ظیلاری ہی کی پر اسرار قوتوں کا کرشمہ تھا۔ اس نے جو وعدہ کیا تھا، وہ کر بھی دکھایا۔ صدف کو یہ بھی یقین تھا کہ اس سے کوئی بات بھی غلط نہیں لگتی ہوگی۔

اسی یقین کے باعث اس کے دماغ میں یہ سوال ابھرا کہ کیا اس کا باپ اشرف خاں اس کی زندگی کا دشمن بن سکتا ہے؟ یہ تو بہر حال ملے تھا کہ صدف اس کے ایک نہایت سنگین راز سے واقف ہو گئی تھی لیکن کیا کوئی باپ ایسی کسی وجہ سے اپنی بیٹی کو قتل بھی کروا سکتا ہے؟

ان خیالات کی وجہ سے صدف باقی رات جاگتی رہی۔ ”کیا رات کو سو نہیں سکیں؟“ صبح ناشتے کی میز پر دل شاد خانم نے اس سے پوچھا۔ ”تمہاری آنکھیں سرخ ہو رہی ہیں۔“

”جی ماما!“ صدف نے دھیمی آواز میں جواب دیا۔ ”نید نہیں آئی رات کو۔“

”کیا باپ نے بہت زیادہ ڈانٹا تھا۔“
صدف جواب میں کچھ نہیں کہہ سکی کیونکہ اسی وقت اشرف خاں ڈانٹنگ روم میں داخل ہوا تھا۔

لیکن جلد ہی دل شاد خانم نے اشرف خاں سے کہا۔ ”میں نے آپ کو بتا دیا تھا کہ یہ مجھ سے اجازت لے کر گئی ہے، پھر بھی آپ نے اسے اتنا ڈانٹا کہ یہ رات بھر سو نہیں سکی۔ دیکھ رہے ہیں آپ کی آنکھیں سرخ ہو رہی ہیں۔“

اشرف خاں نے ایک اپنی سی نظر صدف پر ڈالی جو نظریں جھکائے خاموشی سے ایک ٹوسٹ پر کھنکھار رہی تھی۔ ”میں نے اسے کتنا ڈانٹا ہے، یہ اسی سے پوچھو!“

میں منٹ میں اس کے گھر پہنچ رہی ہے۔
 "انتیج؟" شیراز نے حیرت سے کہا تھا۔ "کل تو یہ
 طے ہوا تھا کہ....."
 "کل کی بات چھوڑو۔ میں اس وقت کسی اور وجہ سے
 آ رہی ہوں اور گھر پہنچ کر ہی بتاؤں گی۔ راستے میں نہیں
 بتا سکتی۔ تم جانتے ہو کہ میں تیز ڈرائیونگ کرتی ہوں اور اس
 وقت تو کچھ زیادہ ہی تیز کر رہی ہوں۔ ایک ہاتھ سے
 اسٹیرنگ سنبھال کر سبواکل پر زیادہ بات نہیں کر سکتی۔"
 پھر اس نے جواب کا انتظار کیے بغیر سلسلہ منقطع کر دیا تھا۔
 شیراز کے والد بھی ایک بڑی پوسٹ پر کام کرتے
 تھے، اس لیے گھر میں کئی ملازم تھے لیکن والدین وغیرہ کے
 جانے کے بعد اس نے خانا ماں اور چوکیدار کے علاوہ سب
 کو اس وقت تک کے لیے چھٹی دے دی تھی جب تک اس
 کے والدین واپس نہ آ جاتے.....
 صدف کی باتوں کی وجہ سے شیراز بے چینی سے اس کا
 منتظر تھا۔
 "میں ناشا کر چکا ہوں۔" اس نے صدف سے کہا۔
 "خانا ماں سے چائے بنانے کے لیے کہہ دیا ہے۔
 تمہارے ساتھ چائے پی لوں گا۔"
 صدف نے اس کی بات پر دھیان دیے بغیر کہا۔ "میں
 اس وقت تھیں یہ بتانے آئی ہوں کہ اب کچھ دن تک ہماری
 ملاقات نہیں ہو سکے گی۔ میں کالاں وادی جا رہی ہوں۔"
 "ابھی کیا پند آگئی کالاں وادی؟ دو سال پہلے بھی تم
 کالج کی چٹنیوں میں وہاں کی تھیں۔ وہاں کے عجیب عجیب
 قصے بھی سنائے تھے مجھے!"
 "آج میں ایک خاص وجہ سے جا رہی ہوں۔ یہاں
 میری زندگی خطرے میں ہے۔"
 "کیا؟" شیراز چونک گیا۔
 "مجھے قتل کیا جاسکتا ہے۔" صدف نے اسے اور
 زیادہ چونکا دیا۔
 "کیا کہہ رہی ہو؟" وہ تیز لہجے میں بولا۔
 "رات خواب میں مجھے بیٹان غیلاری نے بتایا ہے۔"
 "کیا بیکو اس ہے؟" شیراز نے منہ بتایا۔ "تم مجھے
 بتا چکی ہو غیلاری کے بارے میں اور میں نے بھی یقین نہیں
 کیا کہ وہ پراسرار قوتوں کا مالک ہے۔ یہ ایک سو صدی ہے
 صدف! اب ان باتوں پر کوئی یقین نہیں کرتا۔"
 "پہلے میں بھی یقین نہیں کرتی تھی اور وہی لوگ اب
 بھی یقین نہیں کرتے جن کا ایسی باتوں سے سابقہ نہیں پڑا۔

مجھ سے بیٹان غیلاری نے چلتے وقت جو کچھ کہا تھا، بالکل دیا
 ہی ہوا ہے۔"
 "یعنی تم نے خواب میں وہ کھو پڑی دیکھی ہے جس
 کے بارے میں غیلاری نے بتایا تھا؟"
 "ہاں۔" صدف نے جواب دیا۔ "اور آواز میں
 نے پہچان لی تھی۔ وہ بیٹان غیلاری ہی کی آواز تھی۔" پھر اس
 نے وہ سب کچھ بتا دیا جو اس نے خواب میں سنا تھا۔
 "سب وہم ہے تمہارا۔" شیراز نے پھر منہ بتایا۔
 "بیٹان غیلاری تمہارے اعصاب پر سوار ہو گیا ہے۔ خواب
 میں تم نے وہی سب کچھ دیکھا جو تم شاید سوچتی رہتی ہو۔
 یہاں کون تمہاری جان کا دشمن ہو سکتا ہے؟"
 "کوئی ضرور ہے۔ مجھے اپنے خواب پر یقین ہے۔"
 صدف نے جواب دیا۔ اس نے یہ نہیں بتایا تھا کہ اسے
 اپنے باپ پر شبہ ہے۔ اس صورت میں شیراز اس کا اور مذاق
 اڑاتا۔ کوئی بھی اس بات پر یقین نہیں کر سکتا تھا کہ کوئی شخص
 اپنی بیٹی کو قتل کرانے کے بارے میں بھی سوچ سکتا ہے۔
 صدف نے اشرف خاں اور اس کے برنس پارٹنر
 صدیق وڈاچ کی وہ گفتگو بھی نہیں دہرائی جس سے اس پر
 ایک راز کا انکشاف ہوا تھا۔ یہ بتاتے ہوئے اسے شرم محسوس
 ہوئی کہ اس کا باپ ایسا آدمی ہے۔
 "اچھا!" شیراز نے طویل سانس لے کر کہا۔ "کیا
 گھر پر ماما اور بابا کو بتاؤ گی کہ وہاں جا رہی ہو؟"
 "ہاں۔" بتا آئی ہوں۔" صدف نے جھوٹ بولا
 کیونکہ اسے اپنے باپ پر ہی شبہ تھا.....
 "اچھا تو....." شیراز نے سوچتے ہوئے کہا۔ "میں
 بھی ان دنوں چھٹی پر ہوں۔ میں بھی چلتا ہوں تمہارے
 ساتھ۔ تمہاری باتوں کی وجہ سے کالاں وادی دیکھنے کی
 خواہش مجھے بھی ہے۔"
 "مجھے اچھا لگے گا اگر تم میرے ساتھ چلو گے۔ ایسی
 صورت میں یہ بھی مناسب رہے گا کہ میں اپنی کار تمہارے
 گیراج میں بند کر دوں۔ یہاں سے تمہاری گاڑی پر روانہ
 ہوا جائے۔ یہ میں اس لیے کہہ رہی ہوں کہ جو لوگ مجھے ختم
 کرنا چاہتے ہیں، وہ میری کار تو پہچانتے ہیں لیکن تمہاری کار
 نظر انداز کر دوس گے۔"
 اس گفتگو کے درمیان چائے بھی آچکی تھی اور باتوں
 کے دوران ہی بی بی گئی تھی۔ اب صدف جلد از جلد یہ شہر
 چھوڑ دینا چاہتی تھی جہاں اس کے یقین کے مطابق اس کی
 زندگی خطرے میں تھی۔

حریف
 "بس جلدی نکس چلو!" صدف نے کہا۔
 "وہاں کتنے دن رکتا ہو سکتا ہے؟"
 "کچھ کہہ نہیں سکتی۔"
 "کپڑے وغیرہ لے کر آؤ؟"
 "نہیں۔" صدف نے جواب دیا۔ "عجلت کی وجہ
 سے کچھ ساتھ نہیں لیا۔ راستے میں کسی جگہ سے دیکھنا پڑے
 گا۔ کسی مارکیٹ سے ضرورت کی کچھ چیزیں خرید لوں گی۔"
 "ایک اچھی کیس میں کہیں جانے کے لیے تیار رکھنا
 ہوں۔ وہ لے لیتا ہوں۔ خانا ماں کو بھی چھٹی دے دوں گا۔
 گھر کو بھی لاک کر دیتے ہیں۔"
 دس منٹ بعد شیراز کی کار وہاں سے روانہ ہو رہی
 تھی۔ ڈرائیونگ وہ خود کر رہا تھا۔ صدف پچھلی نشست پر
 لیٹ گئی تھی تاکہ باہر سے کسی کی بھی نظر اس پر نہ پڑ سکے.....
 جب کار پشاور کی حدود سے نکل گئی تو صدف اٹھ بیٹھی
 اور اس نے کہا۔ "اب ڈرائیونگ میں کروں گی۔"
 "تم تیز رفتاری سے چلاؤ گی۔ مجھے تمہاری
 ڈرائیونگ سے ڈر لگتا ہے۔ ویسے کچھ آگے جانے کے بعد
 راستہ بھی خطرناک ہو جائے گا۔"
 "میں اس راستے سے واقف ہو چکی ہوں۔"
 شیراز نے کار روک دی اور صدف نے ڈرائیونگ
 سیٹ سنبھال لی۔
 "وہاں پہنچ کر تمہیں اپنے آپ پر غصہ آئے گا۔"
 شیراز نے مسکراتے ہوئے کہا۔
 "کیوں؟"
 "وہ غیلاری تمہیں بتائے گا کہ اس نے تمہیں کسی
 خطرے سے آگاہ نہیں کیا۔"
 "اس کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔" صدف نے یقین
 سے کہا۔
 شیراز نے موضوع بدلا۔ "یہاں سے فاصلہ شاید
 ساڑھے چار سو کلومیٹر ہے!"
 "ہاں۔" صدف نے کہا۔ "ہم سہ پہر تک پہنچ
 جائیں گے۔"
 "یہ کالاں وادی کا فرستان ہی کا ایک حصہ ہے نا؟"
 "ہاں۔"
 "چراغ سے کتنا فاصلہ ہے؟"
 "وہ قریب ہی ہے۔ کالاں وادی سے پہلے میں
 چراغ ہی گئی تھی۔ وہاں سے کالاں وادی کا رخ کیا تھا۔
 ابھی چراغ کے نام پر مجھے بیٹان غیلاری کی ایک بات اور

یاد آئی ہے۔ اس نے کہا تھا کہ بعض اوقات مذہبی رسومات کا
 کچھ سامان خریدنے کے چراغ جانا پڑتا ہے اسے لہذا اگر کسی
 میں اس سے ملنے آؤں اور وہ کالاں وادی میں نہ ملے تو مجھ
 لینا کہ وہ چراغ لے گیا ہوا ہوگا۔"
 "ابھی تم چراغ لے جانا چاہتی ہو یا کالاں وادی؟"
 "ابھی تو کالاں وادی ہی جاتا ہے۔"
 "ہوں۔" اچھا اب میں پچھلی سیٹ پر جا کر لیٹا
 ہوں۔ تمہاری ڈرائیونگ سے گھبراہٹ ہونے لگی ہے مجھے۔
 میں دیکھ رہا ہوں کہ تم ضرورت سے زیادہ تیز چلا رہی ہو جبکہ
 یہ راستہ اس رفتار کے لیے مناسب نہیں ہے۔"
 وہ صدف کے جواب کا انتظار کیے بغیر پچھلی سیٹ پر
 جانے لگا۔
 "یہ ایک عام سی بات ہے۔" صدف نے سنجیدگی
 سے کہا۔ "جو لوگ خود ڈرائیونگ کرتے ہیں، انہیں کسی دوسرے
 کی ڈرائیونگ پر بھروسہ نہیں ہوتا۔"
 اس کے جواب میں شیراز کچھ کہنے کے بجائے پچھلی
 سیٹ پر لیٹ گیا اور آٹھ گھنٹیں بند کرتے ہوئے بولا۔ "میں
 اب کچھ دیر آرام کرنا چاہتا ہوں۔ جب تم تھک جاؤ گی تو
 ڈرائیونگ سیٹ میں سنبھال لوں گا۔ بتا دینا مجھے۔"
 صدف "ہوں" کر کے رہ گئی۔ وہ خود بھی یہی چاہتی
 تھی کہ کچھ دیر ان دونوں میں کسی قسم کی گفتگو نہ ہو۔ وہ اپنے
 مسئلے پر کچھ سوچنا چاہتی تھی۔ کیا ہی اس کے دماغ میں
 یہ خیال آیا کہ اسے قتل کرنے یا کروانے کا خواہاں نہیں اس
 کے باپ کا برنس پارٹنر صدیق وڈاچ تو نہیں! کوئی باپ اپنی
 بیٹی کو قتل کرانے کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔
 اسی بات کی روشنی میں صدف سوچنے لگی تھی کہ ممکن
 ہے اس کے باپ نے صدیق وڈاچ کو بتا دیا ہو کہ ان
 دونوں کی میننگ کی باتیں اس کی بیٹی نے سن لی تھیں جو ایک
 خطرناک بات ہے۔ اور اسی لیے صدیق وڈاچ نے فیصلہ کیا
 ہو کہ صدف کا قصہ ختم کر دیا جائے۔
 ☆☆☆
 دو بجتے والے تھے جب صدیق وڈاچ اشرف خاں
 کے دفتر میں داخل ہوا۔ اسی وقت اشرف خاں کی میز پر
 رکھے ہوئے موبائل فون کی گھنٹی بجی۔ اشرف خاں نے
 صدیق وڈاچ کو کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے موبائل
 پر آنے والی کال ریسیو کی۔
 کال "بولی" کی تھی جسے اشرف خاں نے صدف کو ختم
 کرنے کی ہدایت کی تھی۔

”کام ہو گیا؟“ اشرف خاں نے پوچھا۔

”نہیں ہاں!..... ہمارے آدمیوں نے سارا پشاور چھان مارا ہے۔ وہ نہیں نظر آئیں۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ وہ پشاور سے کہیں اور چلی گئی ہوں۔“

”یہ تو اسی صورت میں ممکن ہے جب اسے یہ معلوم ہو جائے کہ وہ پشاور میں رکی تو قتل ہو جائے گی اور اس کا امکان نہیں ہے کہ اسے یہ معلوم ہو جائے۔“

”میں نے کہا تھا کہ اس کا ہم نے سارا پشاور چھان لیا ہے۔ ان کے دوست شیراز کو بھی چیک کیا تھا۔ اس کے گھر پر تالا لڑا ہوا ہے۔ چوکیدار سے معلوم ہوا کہ صدف بی بی کو ساڑھے نو بجے کے قریب وہاں پہنچی تھیں۔ شیراز اس وقت گھر پر ہی تھا۔ دونوں میں کچھ دیر باتیں ہوئیں، پھر صدف بی بی شیراز کے ساتھ اس کی کار میں کہیں چلی گئیں۔ اپنی کار انہوں نے شیراز ہی کے گیراج میں چھوڑ دی ہے۔“

”ہوں۔“ اشرف خاں کے چہرے پر فکر مندی کے آثار نمایاں ہوئے۔ کچھ دیر سوچ کر اس نے کہا۔ ”تو پھر ایک امکان یہ ہے کہ وہ چترال یا کالاں وادی کی طرف چلے چار آدمیوں کو بڑے بڑے طیارہ چترال بھیجے۔ دو آدمی اسے چترال ہی میں تلاش کریں اور وہ کالاں وادی کی طرف چلے جائیں۔ یہ ضروری ہے کہ وہ چاروں آدمی صدف کو بھی جانتے ہوں اور شیراز کو بھی۔ قوی امکان ہے کہ اگر اس نے وہاں کار رخ کیا ہے تو ابھی راستے ہی میں ہوئی۔ وہ وہاں کار سے ہی جائے گی۔ اور آخری بات یہ کہ اسے پشاور میں بھی تلاش کرتے رہو۔ ضروری نہیں کہ تمہارے کہنے کے مطابق وہ پشاور چھوڑ گئی ہو۔“

”ٹھیک ہے ہاں!“ جواب ملا۔ ”فوری طور پر جو بھی فلاحی لی، اس سے چار آدمی روانہ کر دیے جائیں گے۔“ ”ایک آخری بات اور سنو!“ اس مرتبہ اشرف خاں اس طرح بولا تھا جیسے غرایا ہو۔ ”مجھے زیادہ سے زیادہ کل رات تک تمہاری کامیابی کی رپورٹ مل جانی چاہیے۔“

”لیکن..... وہ.....“ قدرے تذبذب کے ساتھ کہا گیا۔ ”معلوم تو ہو جائے..... کروہ..... کہاں ہیں!“

”نالائق ہوئی تمہاری اگر معلوم نہ ہوا!“ اشرف خاں نے غصے میں دہانے کے انداز میں کہا اور رابطہ منقطع کر کے موبائل میز پر بیٹھ دیا۔

یہ خیال تمہیں کیوں آیا کہ اگر وہ پشاور میں نہیں تو چترال یا کالاں وادی کی طرف چلی ہوگی۔“

”وہ ایک مرتبہ جا چکی ہے وہاں۔ قصے سناتی رہی ہے کافرستان کے۔ یہ بھی بتایا تھا اس نے کہ وہاں اس کے کئی اچھے دوست بن گئے ہیں جن میں عورتیں بھی ہیں اور مرد بھی۔ وہ ہمیشہ وہاں کے لوگوں کی تعریف بھی کرتی رہی ہے۔“

”خیر! میں تمہیں یہ مشورہ دینے آیا تھا کہ اپنا فیصلہ بدل دو۔ صدف کو کسی طرح سمجھا بھجا دو کہ وہ اس بارے میں اپنی زبان ہمیشہ بند رکھے۔ دل شاد بھائی کو بھی اعتماد میں لو۔ وہ تم سے زیادہ بہتر انداز میں صدف سے بات کر سکتی ہیں۔ وقتی طور پر یہ کہنے میں بھی کوئی حرج نہیں کہ تم جلد ہی یہ سارا کام ختم کر دو گے۔“

”میں جانتا ہوں اس کا مزاج۔ وہ یقین نہیں کرے گی۔ خطرہ ہم دونوں ہی کے سر پر منڈلاتا رہے گا۔“ ”تمہیں یہ خیال نہیں کہ وہ تمہاری بیٹی ہے؟“ ”اگر یہ خیال رکھوں تو پھر دوسرا راستہ ہم دونوں ہی کو جیل پہنچا سکتا ہے۔“

”میں بہر حال اصرار کروں گا کہ اپنا فیصلہ تبدیل کرو۔ اپنے آدمیوں سے کہو کہ صدف جہاں بھی لے، اسے یہ حفاظت گھر پہنچا دیا جائے اور پھر اسے سمجھانے کے لیے.....“ ”آج موسم عجیب ہو رہا ہے!“ اشرف خاں نے منہ بناتے ہوئے صدف وڈرائیج کی بات کاٹ دی۔

”ہاں۔“ ”صدیق! تم جانتے ہو کہ میں جب کوئی فیصلہ کرتا ہوں تو سوچ کچھ کر ہی کرتا ہوں اور پھر اپنا وہ فیصلہ بھی نہیں بدلتا۔ مجھے ایسا محسوس ہو رہا ہے جیسے صدف کے سلسلے میں مجھ سے زیادہ ہمدردی ہو!“

”ہاں۔“ اس مرتبہ صدف وڈرائیج نے ایک طویل سانس بھی لی۔ ”میرا پیشہ اپنی جگہ لیکن معصوم لڑکیوں کے لیے میرے دل میں ہمدردی ہی ہوتی ہے۔“ ”اس کی وجہ شاید یہ ہو کہ تم لوکی کے باپ نہیں بن سکے۔ بیٹا ہے ایک تمہارا اور تمہاری خواہش ہوئی کہ تمہاری بیٹی بھی ہو۔“

اس بار صدف وڈرائیج نے جواب میں کچھ نہیں کہا۔ ایسا معلوم ہوا تھا جیسے جھجلا گیا ہو۔ وہ ایک جھٹکے سے کھڑا ہو گیا۔

”اچھا میں اب چلتا ہوں۔ کچھ ضروری کام ہے۔“ اس نے اشرف خاں کے جواب کا انتظار بھی نہیں کیا

حریف

اور تیزی سے دروازے کی طرف بڑھتا چلا گیا۔

دکتر سے نکل کر وہ اپنی کار میں بیٹھا اور اسے ڈرائیو کرتا ہوا ایک ڈیڑھ میل تک نکل گیا۔ اس مختصر دورانیے میں صرف ایک ہی خیال اس کے ذہن میں پکڑا رہا تھا۔ آخر اس نے کار سڑک کے کنارے روکی اور موبائل فون پر کوئی نمبر ملانے لگا۔

”ہیلو!“ دوسری طرف سے سنوائی آواز آئی۔ ”کون؟ کس سے بات کرنی ہے آپ کو؟“

”تم ہی سے کرنی ہے دل شاد!“ صدف وڈرائیج نے کہا۔ ”میں نے تمہاری آواز پہچان لی، تم نے نہیں پہچانی۔“ ”اوہ! صدیق؟“

”ہاں۔“ دوسری طرف ایک طویل سانس لی گئی، پھر کہا گیا۔ ”کیا بات ہے؟“

”صدف کہاں ہے؟“ ”صبح سے ہی غائب ہے۔ کہہ کر تو گئی تھی کہ اپنی کسی دوست کو دیکھنے جا رہی ہے لیکن ابھی تک نہیں لوٹی۔ اتنی دیر ہوئی تو نہیں چاہیے تھی۔“

”ہوں۔“ صدف وڈرائیج نے سر ہلایا۔ ”بس اسی کی خیریت پوچھنی تھی۔“ ”پہلے تو بھی نہیں پوچھی!“

”اشرف سے معلوم ہوتی رہتی تھی۔ آج اس سے بات ہوئی تو احساس ہوا کہ وہ صدف سے کچھ ناراض ہے۔“ ”وہ اس کے خلاف ہیں کہ صدف رات کے وقت زیادہ دیر تک گھر سے باہر رہے۔ کل اس کی کسی دوست کی سالگرہ تھی۔ مجھ سے اجازت لے کر گئی تھی۔ میں نے سوچا تھا کہ ایسا بھی ہو تا ہے۔ اس قسم کی تقریبات میں کچھ دیر تو ہو جاتی ہے۔ اسی خیال سے اجازت دے دی تھی۔ اشرف اسی بات پر ناراض ہیں۔“

”آج اسے دیر ہوئی ہے۔ اس کا خیال نہیں ہے تمہیں؟“ ”خیال تو ہے۔ کچھ پریشان ہوئی ہوں۔ اشرف کو اس لیے اطلاع نہیں دی کہ وہ پہلے ہی اس سے ناراض ہیں۔“

”خیر! آجائے گی۔“ صدف وڈرائیج نے یہ ظاہر سرسری انداز میں کہا۔ ”بس اسی کی خیریت پوچھنے کے لیے فون کیا تھا۔ اور کوئی بات نہیں۔“

صدیق وڈرائیج نے اسے اشرف خاں کے ارادے سے آگاہ نہیں کیا۔ بات ختم کرنے کے بعد اس کے چہرے پر سوچ بچار کے آثار بدستور قائم رہے۔

دو گھنٹے بعد اس نے دل شاد خانم کی کال ریسیو کی۔

”وہ ابھی تک نہیں لوٹی ہے صدیق!“ دل شاد خانم نے کہا۔ ”اب میں پریشان ہو گئی ہوں۔ اس کی جن دو چار دوستوں کو جانتی ہوں، انہیں بھی فون کر چکی ہوں۔ انہی سے معلوم ہوا کہ گزشتہ رات ان کی کسی دوست کی سالگرہ نہیں تھی۔ اس سے اور ابھمن ہو گئی ہے۔ اشرف اس سے ناراض ہیں لیکن میں نے انہیں بھی فون پر اطلاع دی تھی۔ اصل پریشانی کی وجہ یہ ہے کہ صدف کا فون بھی بندل رہا ہے۔“ وہ بولتی ہی چلی گئی تھی۔

”اشرف خاں نے کیا کہا؟“ صدف وڈرائیج نے پوچھا۔ ”مجھ پر ہی طنز کرنے لگے تھے کہ اور آزادی دو بیٹی کو..... میں نے ان کے طنز کو نظر انداز کرتے ہوئے کہا کہ پولیس میں رپورٹ کریں۔ اس پردہ کہنے لگے کہ کسی کی گمشدگی کی رپورٹ چوبیس گھنٹے سے پہلے پولیس نہیں لگھتی۔ میں نہیں جانتی کہ ایسا کوئی قانون ہے لیکن اشرف خاں اپنے رسوخ سے بھی کام لے سکتے ہیں۔ ہر جگہ تو تعلقات ہیں ان کے۔“

”لڑکی کا معاملہ ہے۔“ صدف وڈرائیج نے کہا۔ ”باپ کی بدنامی کا بھی خیال کرنا پڑتا ہے۔ شیراز کو جانتی ہو؟“ ”ہاں۔ وہ اور شیراز ایک دوسرے کو پسند کرتے ہیں۔ صدف کا زلزلہ آنے کے بعد ان دونوں کی شادی کر دی جاتی۔“

”وہ پھر کو تمہیں فون کرنے کے بعد میں نے چھان بین کی تھی۔ شیراز کے گھر بھی گیا تھا۔“ صدف وڈرائیج نے جھوٹ بولا۔ ”وہاں کے ایک ملازم سے معلوم ہوا کہ صدف وہاں پہنچی تھی، پھر اس کے ساتھ ہی کہیں چلی گئی۔“ ”یہ تو سوچنا چاہیے کہ وہ اس کے ساتھ کہیں بھاگ جائے گی۔ ایسا تو اسی صورت میں ہوتا ہے جب گھر والے ان کی شادی کے لیے تیار نہ ہوں۔“

”ٹھیک کہہ رہی ہو؟“ میں معلوم کرنے کی کوشش کر رہا ہوں کہ وہ دونوں کہاں چلے گئے ہیں اور کیوں گئے ہیں۔“ ”معلوم ہوتے ہی مجھے اطلاع دینا۔ اگر اس نے اپنا فون بند نہ رکھا ہوتا تو میں اتنی پریشان نہیں ہوتی۔“

”سمجھ رہا ہوں میں۔“ صدف وڈرائیج نے کہا۔ ”جیسے ہی کچھ معلوم ہوگا، میں تمہیں اطلاع دوں گا۔“ ”میں بے چینی سے انتظار کروں گی۔“

صدیق وڈرائیج نے صرف ”ہوں“ کہا اور رابطہ منقطع کر دیا۔ فکر مندی اس کے چہرے سے اب بھی ظاہر ہو رہی تھی۔

خاصہ راستہ ملے ہو چکا تھا جب صدف نے شیراز سے کہا۔ "میں تو سیدھی کالاش وادی میں جاؤں گی لیکن تم چترال چلے جاؤ۔"

"کیوں؟"

"میں نے بتایا تھا کہ بیٹان غیلاری کسی وقت چترال بھی چلا جاتا ہے اس لیے اگر وہاں ہو تو اسے اطلاع دے دینا کہ میں کالاش وادی پہنچ چکی ہوں۔ وہ فوراً اپنا سارا کام چھوڑ کر مجھ سے ملنے پہنچ جائے گا۔"

"لیکن میں اسے کہاں ڈھونڈتا پھر دوں گا؟ اسے جانتا بھی نہیں ہوں۔"

"یہ کوئی مسئلہ نہیں۔ تم جس ہوٹل میں ٹھہرو، اسی کے کسی بھی منتظم سے پوچھ لیتا۔ چترال میں بھی بیٹان غیلاری بہت مشہور ہے۔ وہ کسی دوسرے ہوٹل میں ٹھہرا ہوگا تو بھی اس ہوٹل کے منتظم کو معلوم ہوگا۔ وہ تمہیں بتا دے گا۔ تم جا کر اس سے مل لیتا۔ بتا دینا کہ میں نے ہی تمہیں بھیجا ہے، بلکہ فون پر اس سے میری بات بھی کر دینا۔"

"راستے میں تم نے دوسری سم ڈھالوائی ہے اپنے موبائل میں۔ اس کا نمبر نہیں بتایا تم نے؟"

"ابھی خود مجھے وہ نمبر یاد نہیں ہے۔ میں تمہیں مس کال دیتی ہوں۔ نمبر آ جائے گا تمہارے پاس۔ سیو کر لیتا۔" صدف نے کاری رفتار بہت کم کرتے ہوئے اپنے موبائل سے شیراز کا نمبر ملا یا۔ شیراز کے موبائل کی گھنٹی بجی جو اس نے پہلے ہی جیب سے نکال کر ہاتھ میں لے لیا تھا۔ اس نے اسکرین پر آ یا ہوا نمبر صدف کے نام سے سیو کر لیا۔ اس دوران میں دل شاد خانم اسے کئی بار رنگ کر چکی تھی لیکن صدف نے اسے کال ریسیو نہیں کرنے دی تھی۔

"خیال نہیں رہا مجھے۔" وہ بولی۔ "بہتر ہوتا کہ فی الحال تمہارا نمبر بھی بدل جائے۔ خیر!..... ابھی راستے سے تم بھی دوسری سم لے لو۔"

"آ خر تم اپنے گھر والوں کو اتنا خبر کیوں رکھنا چاہتی ہو؟"

"دو بار کہتے ہو تم یہ سوال اور میں بتا چکی ہوں کہ فی الحال کسی وجہ سے یہی مناسب ہے۔" صدف نے جواب دیا۔ "زندگی میں یہ پہلا موقع ہے جب تم میرے لیے کسی ناول کا پراسرار کردار بن گئی ہو۔"

صدف کچھ نہیں بولی۔

"تم کہاں سے ملے گی؟" شیراز نے پوچھا۔

"ایک چھوٹا سا شہر ابھی اور ہے ہمارے راستے

میں۔ وہیں سے مل جائے گی۔ اس کے بعد ہمارے راستے بھی تبدیل ہو جائیں گے۔"

"کیا مطلب.....؟"

"میں کار میں ہی کالاش وادی جاؤں گی۔ تم کسی جیب میں چلے جانا۔"

"جیب کہاں ملے گی مجھے؟"

"راستے میں دیکھی نہیں لوگوں کی جیبیں؟"

"لیکن وہ....."

"پوری بات سنو!" صدف نے اس کی بات کاٹی۔

"یہ لوگ سامان لینے کے لیے مختلف بستیوں کے درمیان سفر کرتے رہتے ہیں۔ راستے میں انہیں کوئی سواری مل جائے تو اسے بھی معقول معاوضے کے لیے اپنے ساتھ بٹھالیتے ہیں۔ ہمیں کسی جگہ رک کر ڈرائیور کی ایسی جیب کا انتظار کرنا ہوگا جو چترال جا رہی ہو، یا چترال سے گزر کر آگے جا رہی ہو۔"

"نہ جانے کس قسم کے لوگ مل جائیں۔ مجھے انہیں گھبراہٹ کر لیا تو!" شیراز ہنسا۔

"کوئی خوب صورت لڑکی نہیں ہو تم!" صدف نے منہ بتایا۔

"لڑکی نہ سہی، خوب صورت مرد تو ہوں، اور سنا ہے کہ یہاں کے لوگ....."

"فضول باتیں نہ کرو۔"

"میں چاہتا ہوں کہ تمہارا موڈ ٹھیک ہو۔ آج ایسا محسوس ہو رہا ہے کہ تم شاید ہنسا مسکرانا ہی بھول گئی ہو۔"

"میں نہیں بتا چکی ہوں کہ میری زندگی خطرے میں ہے۔"

"مجھے تمہارے خواب پر یقین نہیں ہے۔ بس چل پڑا ہوں تمہارے ساتھ۔"

لیکن تھوڑی ہی دیر بعد اسے یقین کرنا پڑا جب ایک چھوٹے سے جہز اسٹور کے سامنے گاڑی روک کر دونوں اترے۔

صدف بولی۔ "سم اگر یہاں نہ ملی تو کسی اور جگہ سے مل جائے گی مگر یہاں سے مجھے اپنی ضرورت کی کچھ چیزیں مل جائیں گی۔"

وہ دونوں دکان میں داخل ہوئے۔ دکاندار ایک ہی تھا اور اس وقت ایک گاہک کو کچھ دکھا رہا تھا۔ صدف اس کے فارغ ہونے کے انتظار میں اسٹور میں رہی ہوئی چیزوں کا جائزہ لینے لگی۔ سامنے ہی ایک بڑا سا آئینہ لگا تھا۔ اس میں دکان کے باہر کا منظر دکھائی دے رہا تھا۔ اس منظر نے صدف کو چونکا دیا۔ اس نے دکان کے سامنے رکنے والی ایک گاڑی کی کھڑکی سے داخل کی نال جھانکتے دیکھ لی تھی۔

حریف

راستہ ابھی کافی دور تک ایسا ہے کہ کوئی موڑ نہیں آئے گا۔"

"میں اس راستے پر اس سے زیادہ تیر نہیں چلا سکتا صدف!"

"پھر تو کل جائیں گے وہ۔" صدف نے ہوا سے کہا۔

"نکل جائیں، اچھا ہے۔ مجھے کوئی شوق نہیں ہے ایسے لوگوں سے ٹکرانے کا۔"

"گراؤ تو پھر بھی ہوگا کسی وقت۔ اپنی اس ناکامی کے بعد وہ جج یا عمرہ کرنے نہیں چلے جائیں گے۔"

"وہی آکر انہیں گے تو دوسری بات ہوگی۔"

"اب تو یقین آ گیا ہوگا تمہیں میرے خواب کا!"

"بات تو اب سمجھ میں آ رہی ہے۔" شیراز نے سنجیدگی سے کہا۔ "لیکن اس نے اپنی پراسرار قوتوں سے تمہاری حفاظت کا بندوبست کیوں نہیں کیا؟"

"اس حد تک کام نہیں کرتی ہوگی اس کی مافوق انظرت طاقت۔" صدف نے جواب دیا۔ "اسی لیے اس نے مجھے اپنے پاس بلا یا ہے۔"

"تو کیا تم اب وہیں رہو گی؟"

"وہ کوئی ایسا بندوبست کر دے گا کہ یہ خطرہ میرے لیے خطرہ نہ رہے۔"

"یہ کیسے ہوگا؟"

"یہ تو اس سے مل کر ہی معلوم ہو سکے گا۔" صدف نے کہا اور پھر ایک ٹھنڈی سانس لے کر ریو اور بیگ میں رکھ لیا۔ اسے یقین ہو گیا تھا کہ اب اس کا رنگ نہیں پہنچا جا سکے گا جس سے اس پر قاتل رنگ کی گئی تھی۔

"اب۔" صدف کچھ توقف سے بولی۔ "چند میل کے بعد وہ مقام آئے گا جہاں سے ہمارے راستے تبدیل ہوں گے۔"

"کیوں؟"

"تمہیں چترال جانا ہوگا۔ بتا چکی ہوں تمہیں۔"

"وہ اس وقت کی بات ہے جب تم پر گولیاں نہیں چلائی گئی تھیں۔ اب حالات دوسرے ہیں۔ یہ بات میرے سامنے آ چکی ہے کہ تمہاری زندگی خطرے میں ہے۔ ایسی صورت میں یہ ممکن نہیں کہ تمہیں اکیلا چھوڑ دوں۔ میں تمہارے ساتھ ہی جاؤں گا۔"

"میں اپنی حفاظت کر سکتی ہوں شیراز! ریو اور میرے لیے کھلوٹا ہے۔ تم جانتے ہو کہ میرا نشانہ بہت اچھا ہے۔"

"بیچھے سے چلائی جانے والی گولی کا تم کچھ نہیں بگاڑ سکتیں۔ اس وقت بھی تم نے آئینے میں دیکھ لیا تھا، اس لیے بچت ہو گئی۔"

"بیٹے جاؤ!" صدف نے تیزی سے کہتے ہوئے شیراز کا ہاتھ بھی کھینچا اور دونوں نیچے ہو گئے۔ اس وقت دو گولیاں پٹلیں جن سے وہ دونوں تو محفوظ رہے لیکن ایک گولی نے اسٹور کا کچھ سامان برباد کر دیا تھا اور دوسری گولی دکاندار کے شانے میں لگی تھی۔

"نگلو یہاں سے!" صدف کھڑی ہوتے ہوئے شیراز سے بولی۔

اس نے دیکھ لیا تھا کہ وہ کار بہت تیزی سے آگے نکل گئی تھی۔

"یہ....." شیراز اپنی بات پوری نہ کر سکا۔ اس کے چہرے کا رنگ بدل گیا تھا۔ وہ دونوں کار میں بیٹھے۔ ڈرائیونگ سیٹ اس مرتبہ صدف نے نہیں سنبھالی تھی۔ وہ ڈرائیونگ سیٹ کے برابر کی سیٹ پر بیٹھی تھی اور اس نے اپنے بھی بیگ سے ریو اور نکال لیا تھا۔

"تیزی سے چلو۔" صدف بولی۔ "کار اسی طرف گئی ہے۔ پکڑنا ہے اسے۔ ان لوگوں کو معلوم ہونا چاہیے کہ گولی ان پر بھی چلائی جا سکتی ہے۔"

"گولیاں کسی کار سے چلائی گئی تھیں؟" شیراز نے پوچھا۔

"ہاں، آئینے میں عکس دیکھ لیا تھا میں نے اس کا۔ رائل بھی کھڑکی سے باہر لگی ہوئی دکھائی دے گئی تھی۔ میرے لیے یہ سمجھنا مشکل نہیں تھا کہ نشانہ مجھے ہی بتایا جا سکتا ہے۔"

شیراز نے عقب نما آئینے میں دیکھا کہ جہز اسٹور کے سامنے لوگ جمع ہونے لگے تھے۔

"تیز چلاؤ شیراز!" صدف بولی۔ "ہمیں پکڑنا ہے اس کار کو۔ چیلے رنگ کی کار ہے۔ شاید اوپل ہے پر اسے ماڈل کی۔"

"اب اسے پکڑنے کی ضرورت کیا ہے۔" شیراز نے رفتار کچھ بڑھائی۔ "کیوں ان خطرناک لوگوں سے ٹکرانا چاہتی ہو؟"

"انہیں معلوم تو ہو جائے کہ میں کوئی تر نوالہ نہیں ہوں۔ اور مجھے یہ خبری میں مار لیں تو دوسری بات ہے۔ اس وقت تو اسٹور کا آئینہ میرے لیے سیما کی کر گیا۔"

شیراز کو نہ تو اس کی ان باتوں پر حیرت ہوئی اور نہ وہ اس پر حیران ہوا کہ صدف کے ڈیٹھی بیگ میں ریو اور موجود تھا۔ اس سے بات چھی ہوئی نہیں تھی کہ صدف کا مزاج ہی ایسا تھا۔ اس نے فائننگ کی تربیت بھی لی تھی۔

"اور تیز چلاؤ شیراز!" صدف دانت پر دانت جما کر لی بولی۔ "وہ کار ہماری دسترس سے نکلنا نہیں چاہیے۔"

”ایسی صورت میں تمہاری موجودگی سے بھی کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ ایسا تجربہ ہوا ہے کہ میں اب بہت محتاط رہوں گی۔“ صدف نے کہا۔ ”کیونکہ اب تم بھی ان کی نظر میں آگئے ہو اس لیے خطرہ تمہارے لیے بھی ہو سکتا ہے۔“

”ریوالور میرے پاس بھی ہے تمہاری طرح بہت اچھا نشانے باز نہیں لیکن ریوالور چلانا جانتا ہوں لیکن.....“

”لیکن دیکھ کچھ نہیں۔“ صدف نے اس کی بات کاٹی۔ ”ضروری ہے کہ تم چترال جاؤ۔“

صدف بہ مشکل ہی شیراز کو چترال جانے پر آمادہ کر سکی۔

”میں وہاں تمہارے لیے فکر مند رہوں گا۔“ شیراز نے غصہ سی سانس لی۔

”کیا مجھے تمہاری فکر نہیں رہے گی؟ پھر یہ کہ تمہیں مستقل تو وہاں نہیں رکنا ہوگا۔“ صدف نے کہا۔ ”اگر وہاں بیٹیاں غیلازی نہ ملے تو کالاوش وادی آجانا۔“

شیراز کچھ نہیں بولا لیکن اس کے چہرے سے فکر مندی کا تاثر ختم نہیں ہوا تھا۔

☆☆☆

صدف کے کہنے کے مطابق اسے ایک ایسی جیب مل گئی جس میں اسی علاقے کے لوگ چترال جا رہے تھے۔ معاوضہ ملے کر کے انہوں نے شیراز کو جیب میں بٹھا کر چترال بھی پہنچا دیا اور اسے چترال کے ایک اچھے ہوٹل پر اتارا۔ چونکہ شیراز کے ساتھ ایک سوٹ کس بھی تھا، اس لیے وہ لوگ سمجھ گئے تھے کہ یہ سیاح وہاں قیام کرے گا۔

شیراز خاصا تھک گیا تھا لیکن یہ اس کے لیے آرام کرنے کا موقع نہیں تھا۔ کمرے میں رک کر اس نے صرف چائے پی اور ہوٹل کے استقبالیہ پر پہنچ گیا۔ اس نے ریسپشن سے کہا۔ ”کیا آپ بیٹیاں غیلازی کے بارے میں کچھ بتا سکتے ہیں؟..... شاید وہ آج کل چترال.....“

”جی۔“ چترالی مسکرایا۔ ”وہ ہمارے ہی ہوٹل میں مقیم ہیں۔“

شیراز کو تعجب ہوا کہ چترالی بڑی صاف اردو بولا تھا۔

”مجھے ان سے ملنا ہے۔“ شیراز اس حسین اتفاق پر خوش ہوا تھا کہ بیٹیاں غیلازی سے ملنے کے لیے اب اسے ادھر ادھر کہیں نہیں جانا پڑتا۔

”وہ جانتے ہیں آپ کو؟“ چترالی نے پوچھا۔

”میں تو نہیں جانتا لیکن ان کو جاننے والی ایک ہستی ہی نے مجھ سے کہا تھا کہ میں ان سے ملوں۔“

اسی وقت شیراز نے محسوس کیا کہ وہاں کچھ ہلچل ہوئی تھی۔ ہلچل کا سبب وہ شخصیت تھی جو اسی وقت ہوٹل میں داخل ہوئی تھی۔

شیراز نے چترالی سے پوچھا۔ ”کیا یہی بیٹیاں غیلازی ہیں؟“

”جی نہیں۔ یہ تو شیرازہ خان ہیں۔ کالاوش کے بہت بڑے رئیس۔ مجھے بتایا جا چکا ہے کہ وہ یہاں انہی سے ملنے آرہے ہیں جن سے آپ ملاقات کرنا چاہتے ہیں۔“

”اوہ!“

”لیکن بیٹیاں غیلازی کی بڑی بات ہے جناب!“

چترالی کہتا رہا۔ ”شیرازہ خان کو ہی آنا پڑا غیلازی بابا سے ملنے۔ غیلازی بابا نہیں گئے ان کے گھر۔“

اچانک پیدا ہونے والی ہلچل جلد ہی ختم ہو گئی کیونکہ شیرازہ خان اوپر ہی منزل پر جا چکا تھا۔

”میرا نام وغیرہ تو آپ رجسٹر میں لکھ ہی چکے ہیں۔“ شیراز نے ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔ ”اب مجھے اپنا نام بتانے کی ضرورت نہیں ہے۔ آپ غیلازی بابا کو یہ پیغام پہنچا دیں کہ میں ان سے فوری طور پر ملنا چاہتا ہوں۔ مجھے ان کے پاس صدف نے بھیجا ہے۔“

”فوری طور پر تو ممکن نہیں جناب!“ چترالی نے کہا۔

”غیلازی بابا پہلے ہی ہدایت کر چکے ہیں کہ شیرازہ خان کے آنے کے بعد انہیں بالکل ڈسٹرب نہ کیا جائے۔“

یہ جواب شیراز کے لیے مایوس کن تھا۔ اس نے پوچھا۔ ”تمہی دیر کی ملاقات ہے ان کی؟“

”غیلازی بابا کے کہنے کے مطابق کھٹا بھر تو ضرور لگ جائے گا۔“

”اچھا۔“ شیراز نے سوچتے ہوئے کہا۔ ”جب ان کی ملاقات ختم ہو جائے تو انہیں میرے بارے میں اطلاع دے کر مجھے بھی مطلع کر دیجیے گا۔ میں اپنے کمرے میں جا کر کچھ دیر آرام کر لیتا ہوں۔“

”بہتر ہے۔“

شیراز اپنے کمرے میں آ گیا۔ اب اسے کچھ دیر آرام کرنے کا بہانہ مل گیا تھا۔ بستر پر لیٹتے ہوئے اس نے موبائل پر صدف سے رابطہ کیا اور اسے صورت حال سے آگاہ کیا۔

”ٹھیک ہے۔“ صدف کا جواب آیا۔ ”میرا خیال درست ہی ثابت ہوا نا کہ شاید وہ وہاں ہوں۔ تم ان سے ملاقات کر کے ہی آنا۔ دینے تو غالباً انہیں معلوم ہو چکا ہوگا۔“

حریف

کہ میں کالاوش وادی پہنچ گئی ہوں، پھر بھی انہیں بتا دینا اور پوچھنا کہ میرے لیے کیا ہدایت ہے۔“

”ایک گھنٹے بعد ملاقات ہو سکے گی۔“

”جب بھی ہو..... میں یہاں ایک ہوٹل میں ٹھہری ہوں۔ ابھی ابھی پہنچی ہوں۔ آرام کرنے کے لیے لیٹی ہی تھی کہ تمہاری کال آ گئی۔“

”آرام کرو اور چوکنا رہو۔ میں بھی اب کچھ دیر آرام کروں گا۔“

گفتگو کرنے کے بعد شیراز نے موبائل بند کر کے آنکھیں بند کر لیں۔ پھر وہ خود کی کا تصور تھا یا کوئی خواب کہ شیراز نے ایک کھوپڑی دیکھی۔ ویسی ہی کھوپڑی جیسی صدف نے اسے بتائی تھی۔ کھوپڑی کے چار دانت خاصے چمک دار تھے۔ کھوپڑی کے نظر آتے ہی ایک آواز بھی شیراز کے کانوں سے نکلتی۔

”میں غیلازی ہوں شیراز! تم خطرے میں ہو۔ فوراً یہ ہوٹل چھوڑنا ہے نہیں۔ مجھ سے ملاقات کے لیے انتظار نہ کرو۔ کالاوش وادی پہنچو۔ صدف وہاں پہنچ چکی ہے۔ اس سے کہنا کہ وہ میری عبادت گاہ میں جا کر وہیں میرا انتظار کرے۔ میں آج ہی چند گھنٹے بعد وہاں پہنچ جاؤں گا۔“

آواز ختم ہوتے ہی کھوپڑی اندھیرے میں تحلیل ہو گئی۔ اس کے ساتھ ہی شیراز کی آنکھیں بھی کھل گئیں۔ اس نے محسوس کیا کہ اس کے دل کی دھڑکنیں خاصی تیز تھیں۔ کیونکہ وہ غیلازی سے بھی نہیں ملتا تھا اس لیے جو آواز اس نے سنی تھی، وہ اس کے لیے اجنبی تھی لیکن اس خواب یا تصور کے باعث اسے یقین آ گیا کہ وہ غیلازی ہی کی آواز تھی جس نے اسے کسی انجانے خطرے سے آگاہ کرتے ہوئے ہوٹل چھوڑنے کی ہدایت کی تھی۔

شیراز بستر سے فوراً اُٹھ گیا۔ اس نے یہاں آنے کے بعد اپنا سوٹ کس کھولنے کی ضرورت ہی نہیں محسوس کی تھی وہ پیمپوں والا سوٹ کس گھسیٹا ہوا دروازے کی طرف بڑھا۔ اس نے صدف کی باتوں پر سچ محسوس میں یقین نہیں کیا تھا کہ غیلازی پر اسرار تو توں کا مالک ہے لیکن اب اسے یقین آ چکا تھا کہ اس انکیسوی صدی میں بھی پر اسرار قوتوں کے مالک موجود ہیں۔

اس نے کمرے کا دروازہ کھولا ہی تھا کہ باہر کھڑے ہوئے دو آدمی اس سے ٹکرائے اور اسے دھکیلتے ہوئے کمرے میں لے آئے۔ وہ گرتے گرتے بچا تھا۔ سوٹ کس اس کے ہاتھ سے چھوٹ ہی گیا تھا۔

ان دونوں میں سے ایک نے دروازہ اندر سے بند کر لیا۔

”صدف کہاں ہے؟“ دوسرے آدمی نے شیراز کو گھورتے ہوئے اس طرح پوچھا کہ اگر جواب نہ ملتا تو شیراز کو کچا ہی چبا جائے گا۔ اس کے ہاتھ میں ریوالور تھا جس کی ٹال شیراز کی طرف اٹھی ہوئی تھی۔

غیلازی نے درست پیغام دیا تھا کہ شیراز خطرے میں تھا۔

”کون صدف؟“ اس نے انجان بننے کی کوشش کی۔

”جس کے ساتھ تم پشاور سے آرہے تھے!“ ریوالور والے نے کہا۔

”میں نے اس لڑکی کا نام نہیں پوچھا تھا۔“ شیراز نے بدستور انجان بننے کی کوشش کی۔ ”وہ راستے میں مل گئی تھی۔ میری گاڑی خراب ہو گئی۔ اس نے مجھے لفٹ دی تو میں یہاں پہنچا۔ وہ کسی اور طرف چلی گئی۔ مجھے چترال آنے کے لیے کرائے کی جیب.....“

”بکومت!“ وہ بولا جس نے دروازہ بند کیا تھا، پھر اس نے اپنے ساتھی سے کہا۔ ”یہاں زیادہ دیر تک رکتا ہمارے لیے نقصان دہ ثابت ہو سکتا ہے۔ کسی وقت ہوٹل ہی کا کوئی آدمی شاید نکل آئے ادھر!“

”لیکن اس سے معلوم کرنا تو ضروری ہے۔“

”معلوم کر لیں گے۔“ وہ آدمی تیزی سے شیراز کے قریب آیا۔ شیراز نے محسوس کیا کہ وہ اسے دبوچنا چاہتا تھا۔ اس نے چاہا کہ جھکا کر اس کے رخو کو بچائے اور جیب سے اپنا ریوالور بھی نکالنے کی کوشش کرے لیکن فوراً ہی وہ سانپ کی طرح پھٹکارا۔

”خبردار! بالکل ساکت رہو۔ میں گولی چلاتے ہوئے ذرا بھی دیر نہیں گاؤں گا۔ گولی چلنے کی آواز سے لوگ اس طرف متوجہ تو ہوں گے لیکن ہمیں پکڑنا کسی کے بس کی بات نہیں۔“

اس دھمکی کے بعد شیراز ساکت رہ گیا۔ اس نے یقین کر لیا تھا کہ ریوالور والے کی بات محض دھمکی نہیں تھی۔

جو آدمی چھپتے ہوئے اس کی طرف آیا تھا، وہ اس کی پشت پر چلا گیا۔ پھر شیراز کو ایسا لگا جیسے اس کے سر پر قیامت ٹوٹ گئی ہو۔ وہ کسی بھاری چیز کا اس کے سر سے ٹکرا رہا تھا۔

جب اسے ہوش آیا تو وہ ہوٹل کے کمرے میں نہیں تھا۔ اس نے خود کو پہاڑی علاقے کے ایک ویران حصے میں پایا۔ اسے ایک درخت سے ہانده دیا گیا تھا۔ وہ یہ جاننے

سے قاصر تھا کہ اسے ہوٹل سے نکال کر یہاں کس طرح لایا گیا ہوگا۔ اس وقت اس کے سامنے تین آدمی تھے۔ ان میں سے دو وہی تھے جو ہوٹل میں اس کے کمرے میں آئے تھے۔ تیسرا اس کے لیے اجنبی تھا۔

”اب“ وہی ریو اور والا شیراز سے بولا۔ ”میرے سوال کا جواب دور در دور تمہاری کھال اوجھڑی جائے گی۔“

”میں جواب دے چکا ہوں۔“ شیراز نے کہا۔ ”تم کو میری بات پر یقین کرنا چاہیے۔“

”بکواس کی بھی تم نے..... وہ تمہاری ہی کار میں آئی تھی لیکن چڑال تم جیب میں ہی آئے تھے۔“

اتنا کچھ جانتے ہیں یہ لوگ، شیراز کے دماغ میں خیال آیا۔ اب ان سے کوئی اور جھوٹ بولنا بے کار تھا لیکن وہ سچ بھی نہیں بولنا چاہتا تھا۔ صرف کی زندگی اسے اپنی زندگی سے زیادہ پیاری تھی۔

”تم جیب میں چڑال آئے ہوا“ وہی آدمی پھر بولا۔ ”یہ تو ہم معلوم کر چکے ہیں لیکن صدف کہاں گئی؟ کیا وہ تمہاری کار میں کالاش وادی گئی ہے؟“

”تم اب جو چاہو، کرو۔“ شیراز نے کہا۔ ”میری زبان اب بند رہے گی۔“

”تم تو طوطے کی طرح بولو گے۔“ دانت پیتے ہوئے کہا گیا، پھر اس نے ایک ساکھی سے کہا۔ ”شروع ہو جاؤ۔“

زبان تو کھلوانی ہے اس کی۔“

شیراز نے دیکھا کہ جس آدمی کو مخاطب کیا گیا تھا، وہ ایک چابک سنبھالے ہوئے اس کی طرف بڑھا۔

”اگر تم نہیں بولو گے تو میں تمہاری کھال اس وقت تک اوجھڑوں گا جب تک تم جواب نہیں دو گے یا مر نہیں جاؤ گے۔ تم صرف سچ جواب دے کر ہی ہم سے چھٹکارا حاصل کر سکتے ہو۔“

شیراز نے کچھ کہنے کے بجائے اپنے ہونٹ اس طرح مضبوطی سے بند کر لیے جیسے مرنے کے لیے تیار ہو۔

قریب آ کر اس شخص نے چابک سنبھالنے کے لیے ہاتھ اٹھایا یہی تھا کہ کہیں سے ایک گولی چلی جو اس کا بازو زخمی کر گئی۔ اس کے منہ سے کراہ نکلی، چابک اس کے ہاتھ سے گر چکا تھا۔

سبکی نے چونک کر دیکھا کہ دو آدمی قریب ہی موجود تھے جن کے چہروں پر ہاتھیں تھیں۔ ان میں سے ایک کے ہاتھ میں ریو اور تھا۔ گولی یقیناً اسی سے چلائی گئی ہوگی۔

شیراز کو قید کر کے لانے والوں نے جلدی سے اپنے

ہاتھ اور ہاتھ دیے تاکہ ان پر گولی نہ چلائی جائے۔ ان میں سے کسی کے بھی ہاتھ میں ریو اور نہیں تھا۔ انہیں اس کی ضرورت اس لیے نہیں تھی کہ شیراز کو انہوں نے درخت سے باندھ دیا تھا۔

نو وارد افراد میں سے ایک نے کسی قدر بلندی کی طرف اشارہ کیا۔ شیراز نے بھی ادھر دیکھا۔ اس بلندی پر ایک مشین گن نظر آئی۔ اس کے ساتھ بیٹھا ہوا شخص بھی چہرے پر نقاب لگائے ہوئے تھا۔

”کوئی بھی غلط حرکت ہوئی تو.....“ ریو اور والا بولا۔

”تم سب کے جسم میں سوراج ہی سوراج ہوں گے۔“ چھٹی ہو جاؤ گے۔“

شیراز نے محسوس کیا کہ اس شخص نے اپنی آواز بدلنے کی کوشش کی تھی۔ یہ احساس ان تینوں کو بھی ہو گیا ہوگا جنہوں نے شیراز کو اپنا قیدی بنا لیا تھا۔

”تم..... کون ہو؟“ نو وارد نقاب پوش نے پوچھا گیا۔

”ہم تمہارے قیدی کو لینے آئے ہیں۔“ نقاب پوش نے جواب دیا۔

اس کا ساتھی شیراز کے قریب آیا اور وہ رسیاں کھولنے لگا جس سے اسے باندھا گیا تھا۔

”تم اپنی آواز بدلنے کی کوشش کر رہے ہو؟“ نقاب پوش نے پھر کہا گیا۔ ”کیا ہم تمہیں جانتے ہیں؟ آواز اس لیے بدلی ہے کہ ہم تمہیں پہچان سکیں؟“

”کوئی سوال نہیں، کوئی جواب نہیں۔“ ریو اور والے نے سر دھچکے۔

شیراز کو درخت سے آزاد کرانے کے بعد اس آدمی نے پوچھا۔ ”تمہاری جیبوں سے تو کچھ نہیں نکالا گیا؟“

سوال دوستانہ انداز میں کیا گیا تھا لیکن شیراز کے دماغ میں خیال آیا تھا کہ وہ آسمان سے گر کر سمجھور میں اٹکنے والا تو نہیں؟

اس نے اپنی جیبوں کی تلاشی لی پھر کہا۔ ”میرا ریو اور کہاں ہے؟“

”میرے پاس ہے۔“ بھرائی ہوئی آواز میں جواب دیا گیا۔

”کالو۔“ اسے حکم ملا۔ ”اور یاد رکھو کہ ذرا سی بھی شرارت کرنے کی کوشش کی تو تم تینوں ہی کے جسم چھلنی کر دیے جائیں گے۔“ یہ کہتے ہوئے اس نے اپنے ساتھی کو اشارہ کیا تھا اور وہ اس کے پاس پہنچ گیا تھا جس نے اعتراف کیا تھا کہ شیراز کا ریو اور اس کے پاس ہے۔

ریو اور نقاب پوش کو دے دیا گیا۔

”تم سے ہماری کوئی ذاتی دشمنی نہیں ہے۔“ ریو اور والا نقاب پوش بولا۔ ”ہم یہاں تمہاری لاشیں پس پھیر رہے ہیں۔“

”بہ اس لیے ضروری ہے کہ تم لوگ فوری طور پر ہمارے پیچھے آنے سے باز رہو۔“

وہ تینوں خاموش رہے۔

شیراز اس دوران میں اس طرح کھڑا رہا جیسے اس کے دماغ نے کام کرنا چھوڑ دیا ہو۔ وہ ان سب کے منہ تک رہا تھا۔

جس نقاب پوش نے اسے رسی سے چھٹکارا دیا تھا، اسی نے رسی کے تین ٹکڑے کیے۔ شیراز کو مضبوطی سے باندھنے کے لیے خاموشی رسی استعمال کی گئی تھی۔ اس کے تین ٹکڑے ان تینوں کو اس طرح باندھنے کے لیے کافی تھے کہ وہ تھوڑی سی جدوجہد کر کے خود کو آزاد کر سکیں۔

جب ان تینوں کو ایک ایک کر کے باندھا جا رہا تھا تو ان میں سے ایک بولا۔ ”میں وعدہ کرتا ہوں کہ فوری طور پر تم لوگوں کے پیچھے نہیں آؤں گا۔“

”بکواس مت کرو!“ ریو اور والے نقاب پوش نے کہا۔ ”تمہاری جگہ میں ہوتا تو میں بھی یہی کہتا لیکن اس پر عمل نہیں کرتا۔“

ان تینوں کو باندھ دیا گیا۔

جس نقاب پوش نے شیراز کو رسی سے آزاد کر لیا تھا، اسی نے شیراز سے پوچھا۔ ”تمہارا سوٹ کیس کہاں ہے؟“

”وہ ہوٹل میں ہونا چاہیے۔“ شیراز نے جواب دیا۔

”اگر یہ لوگ وہ بھی اٹھانے لائے ہوں۔“

”کیوں؟“ ریو اور والے نے اپنا ریو اور جیب میں رکھتے ہوئے ان تینوں کی طرف دیکھا۔

جواب ملا۔ ”ہم سوٹ کیس کا کیا کرتے؟ وہ وہیں ہوگا۔“

نقاب پوش نے جیب سے موبائل نکالا۔ کسی سے رابطہ کیا۔ دھمی آواز میں مختصر سی بات کی اور موبائل بند کر کے جیب میں رکھ لیا۔

”پلو۔“ شیراز سے کہا گیا۔ ”تم جہاں کہو گے، جہیں وہاں پہنچا دیا جائے گا۔“

شیراز نے دیکھا کہ کچھ بلندی پر نظر آنے والا نقاب پوش مشین گن کے ساتھ غائب ہو چکا تھا۔ شیراز ان دونوں

نقاب پوشوں کے ساتھ چل پڑا۔

”یہ لوگ تم سے کیا پوچھنا چاہتے تھے؟“ شیراز سے سوال کیا گیا۔

”اگر میں اس کا جواب نہ دوں تو؟“ شیراز نے ہمت کر کے کہا۔

”تو جواب کے لیے تم پر زور نہیں دیا جائے گا۔“

میرے انداز سے کے مطابق وہ تم سے صدف کے بارے میں پوچھ رہے ہوں گے۔ تم دونوں ساتھ ہی چلے گئے لیکن چڑال صرف تم پہنچے مگر انہیں اصل فکر تو صدف کی ہوگی۔“

سبکی کچھ جانتے ہیں یہ لوگ، شیراز کو خیال آیا۔

”کہاں ہے صدف؟“ شیراز سے پوچھا گیا۔

”اس کا جواب تو میں اس صورت میں بھی نہیں دیتا جب وہ لوگ میری کال اوجھڑ دیتے۔“

نقاب پوش ہنسا۔ ”اپنی محبت کرتے ہو صدف سے؟“

خیر! میں اپنا سوال نہیں دہراؤں گا۔ وہ یقیناً کالاش وادی گئی ہوگی۔ یہ ہماری سمجھ میں نہیں آیا کہ تم چڑال کیوں آئے تھے لیکن اس بارے میں بھی تم سے کوئی سوال نہیں کیا جائے گا۔“

شیراز خاموش رہا۔

”ہم تمہیں واپس ہوٹل پہنچا سکتے ہیں لیکن یہ مناسب نہیں ہوگا۔ تمہیں نہیں اور جانا چاہیے۔ غالباً تم کالاش وادی جانا پسند کرو گے۔“

”میں اس سوال کا جواب بھی نہیں دوں گا۔ تم لوگ میرے ہمدرد ہو؟“

”اگر نہ ہوتے تو تمہیں ان لوگوں سے کیوں چھڑاتے؟“

”تو مجھے چڑال کے بس اڑے پر چھوڑ دو۔ مجھے جہاں جانا ہوگا، چلا جاؤں گا۔“

”بس میں تمہارے لیے پھر خطرہ بن سکتا ہے۔“

”میرے لیے کوئی اور جانا کا نہیں ہے۔“

وہ نقاب پوش اپنی جیب سے موبائل نکالتے ہوئے تیزی سے چند قدم بڑے گڑھا گیا۔ وہ چاہتا ہوگا کہ موبائل پر اس کی باتیں شیراز کے علم میں نہ آسکیں۔

ایک ڈیڑھ منٹ بعد ہی وہ پھر شیراز کے قریب تھا۔ ”تمہیں جہاں جانا ہے، وہاں کے راستوں سے واقف ہو؟“

”یہ پوچھنے کا سبب؟“

”ہم نہیں ایک جیب دے دیں گے۔“

دنیا کے کسی بھی گوشے میں اور ملک بھر میں

گھر بیٹھے

جاسوسی ڈائجسٹ سسپنس ڈائجسٹ
ماہنامہ پاکیزہ ماہنامہ سرگزشت

باقاعدگی سے ہر ماہ حاصل کریں اپنے دروازے پر

ایک رسالے کے لیے 12 ماہ کا رسالہ
(بشمول رجسٹرڈ ڈاک خرچ)

پاکستان کے کسی بھی شہر یا گاؤں کے لیے 900 روپے

امریکا، نیپال، آسٹریلیا اور نیوزی لینڈ کے لیے 10,000 روپے

بقیمت ایک کے لیے 9,000 روپے

آپ ایک وقت میں کئی سال کے لیے ایک سے زائد

رسالے کے خریدار بن سکتے ہیں۔ رقم اسی حساب سے

ارسال کریں۔ ہم فوراً آپ کے دیے ہوئے پتے پر

رجسٹرڈ ڈاک سے رسائل بھیجنا شروع کر دیں گے۔

تک پہلے طرف سے پتے پر یا کسی بھی دوسرے پتے پر

بیرون ملک سے قارئین صرف ویسٹرن یونین یا مٹی گرام کے

ذریعے رقم ارسال کریں۔ کسی اور ذریعے سے رقم بھیجے پر

بھاری پینک فیس عائد ہوتی ہے۔ اس سے گریز فرمائیں۔

رابطہ: شرم عیاس فون نمبر: 0301-2454188

سروسز منیجر سید میمن حسین 0333-3285269

جاسوسی ڈائجسٹ پبلی کیشنز
C-63/2 ایڈیشن ڈیس ہاؤسنگ اتھارٹی مین کوئی روڈ کراچی
فون: 35804200-35804300

تینوں ہی نے صدف کی مددگار عورت کو سیلوٹ کیا جس پر صدف کو حیرت ہوئی ہی چاہے تھی۔ اسی عورت نے ان سے کچھ کہا جس پر انہوں نے وہاں جمع ہونے والے لوگوں کو منتشر کر دیا۔ سب اپنی اپنی نشستوں پر چلے گئے۔ ہوئی کی انتظامیہ کے لوگ دیکر کہیں لے گئے جس کے ہاتھ میں موجود رے گولی کا نشانہ بنی تھی۔ ویٹر کا ہاتھ بھی زخمی ہوا تھا۔ مددگار عورت نے مسکرا کر صدف سے کہا۔ ”میرا نام نتاشا ہے۔ کیا آپ مجھ سے چند منٹ بات کرنا پسند کریں گی؟“

”تو آئیے، اس طرف بیٹھنے ہیں۔“ اس نے ایک خالی میز کی طرف اشارہ کیا۔ صدف اس کے ساتھ اس کی میز پر جا بیٹھی۔

”میرا تعلق یہاں کی پولیس سے ہے۔“ نتاشا نے کہا۔

”پولیس والوں نے آپ کو سلام کیا تھا؟“

”جی ہاں۔ میں ان کی آفیسر ہوں۔“

”اوہ!..... لیکن میں نے تو سنا تھا کہ مقامی پولیس کے افسران کا تعلق حکومت سے ہوتا ہے۔ پولیس کے مقامی لوگ کانسٹیبل کی سطح سے زیادہ کے نہیں ہیں۔“

”یہ کچھ پرانی بات ہوگی۔ اب ہمارے یہاں تعلیم بڑھ گئی ہے۔“

”یقیناً مجھے اس کا علم نہیں۔“ صدف نے کہا۔ ”لیکن..... آپ مجھ سے کیا خاص بات کرنا چاہتی ہیں؟“

”جی ہاں۔“ نتاشا نے کہا۔ ”آپ کو اندازہ ہوا تھا کہ میں نے جان بوجھ کر آپ کو دھکا دیا تھا؟“

”ہاں کچھ شبہ تو ہوا تھا۔ مجھے اس پر بھی حیرت ہے کہ آپ میرے ساتھ ساتھ کیوں چل رہی تھیں؟“

”میری ڈیوٹی لگائی گئی تھی کہ آپ کا خیال رکھوں کیونکہ پشاور ہی سے آپ کے کچھ دشمن آپ کے پیچھے لگے ہوئے ہیں اور آپ کو شاید قتل کر دینا چاہتے ہیں۔ آپ پشاور ہی سے آئی ہیں نا؟“

”جی ہاں اور اس پر مجھے مزید حیرت ہوئی۔ یہاں کی پولیس کو کسے معلوم ہوا کہ میں کسی خطرے میں پڑ سکتی ہوں؟“

”یہ تفصیل مجھے نہیں بتانی گئی لیکن دو ایک باتوں سے مجھے ایک شبہ ضرور ہوا ہے۔“

”کس بات کا شبہ؟“

”جی ہاں اور اس پر مجھے مزید حیرت ہوئی۔ یہاں کی پولیس کو کسے معلوم ہوا کہ میں کسی خطرے میں پڑ سکتی ہوں؟“

”یہ تفصیل مجھے نہیں بتانی گئی لیکن دو ایک باتوں سے مجھے ایک شبہ ضرور ہوا ہے۔“

”کس بات کا شبہ؟“

”پولیس افسران کی آپس کی دھیمی گفتگو میں سے چند لفظ میرے کان میں پڑ گئے تھے۔ ان میں ہمارے ایک رئیس شہزادہ خان کے علاوہ ہمارے قبیلے کے سردار سیف

دماغ و سوسوں کی آماجگاہ بن گیا۔ کچھ ایسے سوالات جنم لینے لگے جو اس کے لیے پریشان کن تھے۔

اسی عالم میں اس نے آدھا گھٹنا اور گزرا۔ اس آدھے گھٹنے میں شیراز سے رابطہ کرنے کی دوبارہ کوشش کی لیکن شیراز کا موبائل بند ہی ملا۔ وہ پریشانی کے عالم میں کمرے سے نکل کر ہال میں آگئی۔

ہال میں بیٹھ کر صدف نے کافی پی اور پھر اچانک یہ فیصلہ کر کے اٹھ کھڑی ہوئی کہ اسے چڑا ل جانا چاہیے۔ وہ تیزی سے دروازے کی طرف بڑھی۔ عین اس وقت جب وہ باہر نکلنے کے لیے پہلا قدم اٹھا چکی تھی، گولی چلنے کی آواز سنائی دی اور ساتھ ہی کسی نے صدف کو اتنی زور کا دھکا دیا کہ وہ خود کو گرنے سے نہیں بچا سکی۔

جس نے دھکا دیا تھا، وہ بھی ایک عورت تھی اور وہ بھی صدف کے قریب ہی گری تھی۔

گولی کی آواز نے وہاں ہچکل پیدا کر دی۔ وہ گولی ہوئی کے باہر سے چلائی گئی تھی جو ہوئی کے ایک ویٹر کے ہاتھ میں موجود رے سے لگرائی تھی۔ ویٹر کی طرح بولکھلا تھا۔

صدف اپنا لباس درست کرتی ہوئی آگئی تو اس کے ذہن میں یہ خیال موجود تھا کہ وہ گولی اسی پر چلائی گئی ہوگی۔

اسے دھکا دینے والی عورت بھی کھڑی ہو چکی تھی۔

”معاف کیجیے گا۔“ وہ بولی۔ ”میں اتنی جلدی میں تھی کہ آپ سے ٹکرائی۔“

صدف نے خود کو دروازے کے سامنے سے ہٹاتے ہوئے اس عورت کو غور سے دیکھا جو مقامی ہی معلوم ہوتی تھی لیکن اردو اس نے بڑی حد تک صاف لہجے میں بولی تھی۔

صدف کو اس کے جواب پر یقین نہیں آیا تھا۔ اس کے خیال کے مطابق عورت نے فائر کرنے والے کو دیکھ لیا تھا اور یہ بھی سمجھ گئی تھی کہ اس گولی کا نشانہ کون ہے۔ اسی لیے اس نے اسے دھکا دے کر گولی کا نشانہ بننے سے بچا تھا۔

تھرکیوں؟ یہ عورت کون ہے؟

پے در پے کئی سوال صدف کے دماغ میں ابھرے۔ دو عورتوں کو گرتے دیکھ کر خاصے لوگ ان کے گرد جمع ہونے لگے تھے جن میں ہوئی کی انتظامیہ بھی تھی۔ انہوں نے سوالات کی بھرمار کر دی تھی۔

جواب میں صدف کی مددگار عورت نے انہیں مقامی زبان میں دو ایک ہی جواب دیے تھے کہ پولیس آگئی، مقامی پولیس جنہیں صدف نے ان کے مخصوص لباس سے پہچانا۔ وہ تین تھے جن میں سے ایک عورت بھی تھی۔ ان

”مگر ان مہربانیوں کا مطلب.....؟“

”مناسب وقت آنے پر تم جان لو گے۔ میرے سوال کا جواب دو۔ تم یہاں کے سب راستوں سے واقف ہو؟“

”واقف نہیں بھی ہوں گا تو لوگوں سے پوچھتا ہوں چلا جاؤں گا۔“

”تم یقیناً کالا لاش وادی جاؤ گے۔“ نقاب پوش بولا۔

”ہم تمہیں لوہا بٹ چیک پوسٹ تک پہنچا دیں گے۔ وہاں تمہیں جیب دے دی جائے گی۔ وہاں سے جبریت بارہ میل اور بجوریت وکیل سبیل دور ہے۔ کالا لاش وادی بھی وہیں نہیں ہوگی۔

دو گھنٹے کا سفر ہے تم جہاں بھی جاؤ گے، ہمیں معلوم ہو جائے گا، تمہارا سوت کس وہیں پہنچا دیا جائے گا۔ ٹھیک ہے؟“

شیراز نے سر ہلانے پر اکتفا۔

اب وہ اس جگہ تک پہنچے تھے جہاں ایک جیب کھڑی تھی۔ مشین کن والا بھی جیب میں موجود تھا۔

”بیٹھو!“ شیراز سے کہا گیا۔

شیراز جیب میں بیٹھ گیا۔ مشین کن والا ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھا تھا۔

”لوہا بٹ چیک پوسٹ۔“ اس سے کہا گیا۔

اس نے سر ہلایا اور انجن اسٹارٹ کر دیا۔

☆☆☆

کافرستان میں تین علاقے ہیں۔ بجزیرت، بیجوریت اور کالا لاش اعتقیدوں کے اختلاف کے باوجود یہاں بہرامن لوگ

ہیں۔ جن میں پانی جانے والی روایات کافی دلچسپ ہیں، لیکن صدف جب کالا لاش وادی پہنچی تھی تو یہ سب باتیں اس کے ذہن میں نہیں تھیں۔ وہ غیلاری.... کی عبادت گاہ پر پہنچی تھی جہاں سے معلوم ہوا تھا کہ غیلاری چڑا ل گیا ہوا تھا۔ پھر صدف ایک ہوئی میں قیام پذیر ہو گئی تھی اور سوچ رہی تھی کہ شیراز کو چڑا ل بھیج کر اس سے بہت جلد قدم اٹھا لیا تھا۔ اسے شیراز کی کال بھی رہی ہوگی تھی کہ غیلاری سے اس کی ملاقات ایک گھنٹے بعد ہو سکے گی، لیکن جب ڈیڑھ گھنٹے بعد شیراز کی دوسری کال نہیں آئی تو اسے تشویش ہوئی۔

غیلاری سے ملاقات میں شیراز کو اتنی دیر تو نہیں لگنی چاہیے تھی۔ اسے غیلاری کو بس صدف کا پیغام پہنچانا تھا جس کے بعد صدف کی داستان میں غیلاری جلد از جلد کالا لاش وادی واپس لوٹا۔

ایک گھنٹہ بیٹھتیں منٹ کے بعد صدف نے شیراز کو فون کیا تو اس کا موبائل بند ملا۔ یہ اس کے لیے اور زیادہ تشویش کی بات تھی۔ وہ اپنے کمرے میں بیٹھ گئی۔ اس کا

جان کا نام بھی آیا تھا۔ شاید انہی میں سے کسی کے کہنے پر پولیس نے آپ کی حفاظت کا بندوبست کیا ہے۔ کیا آپ سیف جان سے واقف ہیں؟

”جی نہیں۔“

”شہزادہ خان سے؟“

”ان کو بھی نہیں جانتی۔ اگر آپ کے خیال میں انہیں میرے بارے میں کچھ معلوم ہے تو ان سے ملنا ہوگا۔“

”سیف جان سے آپ کی ملاقات کرنا میرے اختیار میں نہیں ہے البتہ شہزادہ خان سے ملاقات کر سکتی ہوں اگر وہ چترال سے جلد واپس آ گئے۔“

”وہ چترال گئے ہوئے ہیں؟“

”جی ہاں۔ آج ہی گئے ہیں۔ میرے علم کے مطابق انہیں کوئی خاص کام تھا جس کے لیے انہیں ہمارے ایک روحانی پیشوا کی مدد درکار تھی۔ اتفاق ہے کہ ہمارے وہ روحانی پیشوا بھی آج صبح چترال گئے تھے۔ شہزادہ خان انہی سے ملنے گئے ہوں گے۔“

”روحانی پیشوا؟“ صدف نے جلدی سے پوچھا۔

”کیا آپ کا اشارہ غیلاری بابا کی طرف ہے؟“

”اوہ! کیا آپ انہیں جانتی ہیں؟“

”میں انہی سے ملنے یہاں آئی ہوں۔“

”خوب!“ وہ ہنسی کے کچھ سوچنے لگی۔

”اور کوئی بات؟“ صدف نے کرسی پر پہلو بدلا۔

”دراصل مجھے نہیں جانتا ہے۔“

”خطرے کی وجہ سے آپ کو ہوئی تک محدود رہنا چاہیے۔ یہ تو محض اتفاق ہے کہ میں نے ایک شخص کو دیکھ لیا تھا جو آپ کو روپ اور سے نشانہ بنانا چاہتا تھا۔“

”کوئی مقامی؟“

”جی نہیں۔ کسی مقامی کو آپ سے کیا دشمنی ہو سکتی ہے؟ وہ لوگ تو شہزادہ خان سے آپ کے پیچھے آئے ہیں۔“

”کیا یہاں فائرنگ کرنے والے کو پکڑنے کی کوشش نہیں کی جاتی؟“

”روپ اور والا فوراً ہمارا نکلا تھا لیکن میرا خیال ہے کہ باہر موجود ہمارے کچھ لوگ اس کے پیچھے دوڑے تو ہوں گے۔ میں نیچے سے اُپ سے خبر ہوں۔“

”اسی وقت صدف کے موبائل کی کھنٹی بج اُٹھی۔ اس نے جلدی سے موبائل نکالا۔ اسکرین پر اسے شیراز کا نام دکھائی دیا۔

”کہاں ہو؟“ وہ کال ریسید کرتے ہی بولی۔ ”تم

نے اپنا موبائل بھی بند کر رکھا تھا۔ میں بہت پریشان ہو کر چترال آئے ہی والی تھی کہ یہاں ایک واقعہ پیش آ گیا۔“

”میں ایک مصیبت میں پڑ گیا تھا۔ ہوئی میں مجھے۔“

شیراز نے اپنی آپ بیتی سنائی شروع کی۔

صدف خاموشی سے سب کچھ سنتی رہی۔ اس نے دو ایک سوال کرنے چاہے لیکن متانت کی موجودگی میں مناسب نہیں تھا۔

جب شیراز خاموش ہو گیا تو صدف نے پوچھا۔

”لیکن یہ بات تو خاصی دیر پہلے کی ہے۔ اس کے بعد تم نے اپنا موبائل کیوں بند کر رکھا تھا؟“

”ان لوگوں نے میرا روپ اور اور موبائل مجھے دے دیا تھا موبائل بند تھا۔ مجھے ذہنی اذیت کی وجہ سے اسے کھولنے کا خیال ہی نہیں آیا۔ ابھی میں نے دیکھا کہ موبائل بند پڑا ہے تو میں نے اسے کھولا۔ پھر خیال آیا کہ تمہیں فون پر ہی سب کچھ بتا دوں گا۔“

”اچھا خیر! تفصیلی بات تو یہاں آ جاؤ گے، جی ہوگی۔ کب تک کچھ رہے ہو؟“

”شاید یوں گھنٹا اور گھنٹے گا۔“

”میں ایک ہوٹل میں ہوں لیکن اب جیسا کہ غیلاری بابا نے ہدایت کی ہے، میں یہاں سے ان کے معبد چلی جاؤں گی۔“

متانت جو خاموشی سے صدف کی طرف دیکھ رہی تھی، غیلاری کا نام سن کر چوکی۔

صدف کہہ رہی تھی۔ ”تم بھی وہیں چلے آنا۔ کسی سے بھی پوچھو گے، وہ تمہیں معبد تک پہنچا دے گا۔“

گفتگو ختم کر کے صدف نے موبائل بند کیا۔

متانت فوراً بولی۔ ”آپ نے ابھی بتایا تھا کہ آپ غیلاری بابا ہی سے ملنے آئی تھیں۔ کیا آپ کے ساتھ کوئی اور بھی ہے جو چترال سے آ رہا ہے؟“

”جی ہاں۔ میں اور وہ ساتھ ہی آ رہے تھے۔ مجھے خیال آیا کہ غیلاری بابا انہیں چترال نہ گئے ہوئے ہوں اس لیے اسے وہاں بھیج دیا تھا اور یہ خیال درست بھی ثابت ہوا۔ میرے دوست کی ملاقات غیلاری بابا سے ہو چکی ہے اور انہوں نے ہدایت کی ہے کہ میں ان کے معبد چلی جاؤں اور وہیں قیام کروں۔“

”غیلاری بابا۔۔۔۔۔۔“ متانت کا انداز بڑبڑانے کا سا تھا۔ ”وہیں شہزادہ خان بھی ان سے ملا ہوگا۔ غیلاری بابا جان چکے ہوں گے کہ یہاں آپ کسی خطرے سے دوچار

حریف

ہو سکتی ہیں اس لیے انہوں نے شہزادہ خان سے ہی اس بارے میں کچھ کہا ہو۔ شہزادہ خان نے فون پر سیف جان سے بات کی ہوگی۔ سیف جان نے یہاں کے پولیس آفیسر سے کچھ کہا ہوگا جس کی وجہ سے مجھے آپ کی حفاظت پر مامور کیا گیا۔“

”شاید۔“ صدف نے کہا لیکن اسے متانت کی بات پر یقین آ گیا تھا۔ اس نے کہا۔ ”مجھے اب یہاں سے اپنا سامان لے کر معبد منتقل ہو جانا چاہیے۔“

”آپ کو ہوٹل آنا ہی نہیں چاہیے تھا۔ معبد ہی میں قیام کرتیں۔“

”پہلے میں وہیں گئی تھی لیکن وہاں کے لوگ مجھے بابا کی اجازت کے بغیر وہاں نہیں روک سکتے تھے لیکن اب انہیں فون پر بابا سے اجازت مل گئی ہوگی۔“ صدف کھڑی ہو گئی۔

”مجھے معلوم ہے کہ آپ کے پاس کار ہے۔ میں اپنی کار میں آپ کے پیچھے پیچھے چلوں گی۔ یہ میری ذیولٹی ہے۔“

”مجھے کیا اعتراض ہو سکتا ہے۔ ظاہر ہے کہ آپ سرکاری ذیولٹی پر ہیں۔“

☆☆☆

صدف ہوٹل سے معبد منتقل ہو گئی۔ اس مرتبہ بنیان غیلاری کے تائین نے اس کا استقبال بڑی عزت سے کیا۔ اس کے لیے ایک کمرہ پہلے ہی شیک کر دیا تھے۔ انہیں یقیناً غیلاری بابا سے ہدایات مل چکی ہوں گی۔

شیراز سے موبائل پر ہونے والی گفتگو کے باعث صدف کا دماغ اس سوال میں الجھا ہوا تھا کہ وہ لوگ کون ہو سکتے ہیں جنہوں نے شیراز کی مدد کی۔ شیراز نے یہ بھی بتایا تھا کہ اس کے مددگار مقامی لوگ نہیں تھے۔ غالباً وہ بھی پشاور سے آئے ہوں گے مگر کون؟

اس سوال کا جواب اس کا دماغ نہیں دے سکا۔ وہ بے چینی سے شیراز کا انتظار کرتی رہی جو زیادہ طویل ثابت نہیں ہوا۔ شیراز اپنے سامان سمیت وہاں پہنچ گیا۔ اس کی آمد کے بارے میں صدف نے بنیان غیلاری کے تائین کو بتا دیا تھا اس لیے اسے فوراً صدف کے کمرے میں پہنچا دیا گیا تھا۔

”تم نے فون پر بڑے غیر معمولی حالات بیان کیے تھے لیکن مختصر طور پر، میں کئی سوال اس لیے نہیں کر سکتی کہ میرے ساتھ کوئی تھا۔“

”کون؟“

”یہ بعد میں بتاؤں گی۔ پہلے تم مجھے ان لوگوں کے بارے میں بتاؤ جنہوں نے تمہاری مدد کی تھی۔ فاب پوش تو وہ اس لیے ہوں گے کہ تم سے اور تمہارے دشمنوں سے، بلکہ میرے دشمنوں سے اپنے چہرے چھپا سکیں لیکن تم نے بتایا تھا کہ آواز بدلنے کی کوشش بھی کی تھی۔ یہ بات تو ممکن نہیں معلوم ہوئی کہ تم ان سے واقف ہو اس لیے انہوں نے آواز بدلی۔ صرف یہ ممکن ہے کہ وہ میرے دشمنوں سے خود کو چھپانا چاہتے ہوں۔“

”یہی بات ہو سکتی ہے۔“

”لیکن یہ ایک معما ہے۔“

”جو کچھ نہ بھی حل تو ہوگا۔“

”بنیان غیلاری سے تمہاری اور کوئی بات نہیں ہوئی؟“

”میری اس سے کوئی بات ہی نہیں ہوئی۔“

”کیا؟“ صدف حیرت سے بولی۔ ”تو بھروسہ کی ہدایت؟“

”وہ۔۔۔“ شیراز نے طویل سانس لی۔ ”وہ مجھے کھوپڑی کے ذریعے دی گئی تھی۔ فون پر میں وہ تفصیل نہیں بتا سکتا تھا۔ اختصار سے کام لیتا تھا میں نے۔“

”تو وہ کھوپڑی تم نے بھی خواب میں دیکھی تھی؟“

”خواب میں یا فٹوڈی میں، اس کا اندازہ نہیں مجھے۔“

”اب تو تمہیں میری باتوں پر مکمل یقین آ گیا ہوگا کہ بنیان غیلاری۔۔۔۔۔۔“

”یقین تو اسی وقت آ گیا تھا جب تم پر حملہ ہوا تھا۔“

”دوسرا حملہ بھی ہو چکا ہے۔“

”کب؟“ شیراز چونکا۔

صدف نے بھی وہ سب کچھ بیان کر دیا جو اس پر گزری تھی۔

شیراز بولا۔ ”اس کا مطلب ہے کہ مسلسل پیچھا کیا جا رہا ہے تمہارا!“

”اس حملے کے بعد تو بات بالکل واضح ہو گئی۔“

”ابھی ابھی ایک اور خیال آیا ہے مجھے۔ غیلاری نے جو ہدایات مجھے کھوپڑی کے ذریعے دی تھیں، وہ براہ راست تمہیں کیوں نہیں دیں؟“

”اس لیے کہ میں یہاں آنے کے بعد نہ تو سوئی ہوں اور نہ مجھ پر غنودگی طاری ہوئی ہے۔ وہ کھوپڑی غالباً بیداری میں نظر نہیں آ سکتی۔“

”ہوں۔“ شیراز نے سوچتے ہوئے سر ہلایا۔ ”اب کیا ارادہ ہے؟“

”بنیان غیلاری کا انتظار۔“

”وہ کب تک آ رہا ہے؟ پوچھا تھا یہاں کسی سے؟“
 ”ہاں۔ اس کے ایک نائب نے بتایا تھا کہ وہ کل صبح آئے گا۔“

”توئی اچال ہمیں ہمیں قید رہتا ہے؟“
 ”قید ہی سمجھو۔ باہر نکلنے میں تو خطرہ ہے۔“
 ”غیلاری تمہیں اس خطرے سے کس طرح بچائے گا؟“
 ”یہ تو اسی وقت معلوم ہوگا جب اس سے ملاقات ہو جائے۔“

شیراز نے اپنا پیٹ سہلایا۔ ”مجھے سخت بھوک لگ رہی ہے۔“
 ”رات ہو چکی ہے۔ بھوک تو لگے گی۔“

”یہاں کھانا تو ملے گا؟“
 ”کیوں نہیں ملے گا۔ میں ابھی کسی کو لاکر بات کرتی ہوں۔“
 ”نہ جانے کیا کھانا ہوتا ہوگا یہاں!“
 ”اب یہاں سب کچھ مل جاتا ہے، جو بھی کھانا چاہو۔ اب یہ سوچنا اس سال پہلے کا کافرستان نہیں ہے۔ اچھے خاصے ہوٹل کھل چکے ہیں یہاں۔“
 اسی دوران معبد کے ایک آدمی نے آ کر ان سے کھانے کے بارے میں پوچھا۔ صدف نے اسے ہدایت دیں اور وہ سر ہلا کر رخصت ہو گیا۔

☆☆☆

صبح وہ دونوں اٹھے ہی تھے جب انہیں معلوم ہوا کہ غیلاری آ گیا تھا۔
 ”آپ لوگ ناشا کر لیں پھر وہ آپ سے ملاقات کرنے خود آئیں گے۔“ انہیں ناشا پہنچانے والے نے بتایا۔
 وہ دونوں بڑی بے چینی سے غیلاری کے منتظر تھے۔ انہوں نے جیسے جیسے ناشا کیا اور انتظار کرنے لگے۔

”یہ تمہارا بیٹا آدمی کیسا ہے؟“ شیراز نے پوچھا۔
 ”نہایت شفیق، نہایت شریف۔“ صدف نے جواب دیا۔ ”اس نے اپنی پراسرار قوتوں سے کبھی کسی کو نقصان نہیں پہنچایا، اپنے کسی مخالف یا دشمن کو بھی نہیں۔“
 ”تمہیں اس کا یقین کیوں ہے؟“

”بیٹا غیلاری کی باتوں سے سمجھا ہے میں نے اور میں اسے سمجھتا انسان بھی نہیں سمجھتی۔“

وہ دونوں یہ باتیں کر رہے تھے کہ ایک معترض ان کے کمرے میں آیا۔ صدف اس کے احترام میں کھڑی ہوئی تو شیراز کو بھی کھڑا ہونا پڑا اور اس نے سمجھ لیا کہ وہ غیلاری ہی ہوگا۔

اس کے بال سفید تھے لیکن عمر اتنی زیادہ معلوم نہیں ہوتی تھی۔ کسی موقع پر صدف نے اسے بتایا تھا کہ بیٹا غیلاری کی عمر نوے سال ہے لیکن وہ ساٹھ بیسٹھ سال کے تن درست شخص کی طرح چاق و چوبند تھا۔

اس کی شفقت کا مظاہرہ شیراز نے اسی وقت دیکھ لیا جب اس نے پہلے صدف اور پھر شیراز کے سر پر بزرگانہ انداز میں ہاتھ رکھا۔

”میں تمہارا منتظر رہتا لیکن کل ایک بہت ضروری مسئلے کے باعث چترال جانا پڑ گیا۔“
 ”شیراز نے مجھے بتایا تھا کہ وہاں شہزادہ خان آپ سے ملنے پہنچا تھا۔“

”ہاں۔ وہ اس وقت وہیں تھا اور ایک ایسے معاملے میں بھٹس گیا تھا کہ اسے میری مدد کی ضرورت تھی۔ وہ خود نہیں آ سکتا تھا اس لیے مجھے چترال جانا پڑا اور یہ اچھا ہی ہوا۔ میں جان چکا تھا کہ تم شیراز کے ساتھ یہاں پہنچ چکے ہو۔ مجھے یہ علم بھی ہو گیا تھا کہ تمہارے دشمن تمہاری تاک میں یہاں تک پہنچ گئے ہیں اور چترال میں شیراز کے پیچھے لگ گئے ہیں۔ اس وقت تک انہیں علم نہیں تھا کہ تم کالاش وادی پہنچ چکے ہو۔ وہ شیراز سے تمہارے بارے میں جاننا چاہتے تھے۔ اسی لیے میں نے شیراز کو خبردار کیا تھا اور اسے تمہارے لیے پیغام دیا تھا لیکن اس سے پہلے کہ یہ چترال سے یہاں کے لیے روانہ ہوتا، دشمنوں نے اس کو اغوا کر لیا۔“

”اور کچھ لوگوں نے اسے میرے دشمنوں سے بچایا۔“
 ”یہ بھی میرے علم میں آ چکا ہے۔ پشاور ہی سے تمہارے کچھ ہمدرد بھی یہاں پہنچے ہیں جو تمہیں ہر قیمت پر دشمنوں سے بچانا چاہتے ہیں۔“

”وہ کون ہیں..... کون ہیں بابا؟“ صدف نے بے چینی سے پوچھا۔

”میں دونوں ہی کے بارے میں جان چکا ہوں لیکن ابھی تمہیں بتا کر ذہنی اشتعال میں نہیں ڈالنا چاہتا لیکن میں جانتا ہوں کہ ایک دن تم خود ہی سب کچھ جان لو گی۔ اس وقت کا انتظار کرو۔“

”ابھی آپ نے کہا تھا کہ شہزادہ خان کا آپ کے پاس پہنچنا اچھا ہی ہوا۔“

”ہاں۔“ غیلاری نے جواب دیا۔ ”مجھے علم ہو گیا تھا کہ تمہارے دشمن یہاں بھی پہنچ چکے ہیں۔ ہوئی میں قیام کی وجہ سے تم کسی وقت بھی خطرے میں پرستی نہیں اس لیے میں نے شہزادہ خان سے کہا کہ وہ سیف جان سے رابطہ

حریف

کر کے تمہاری حفاظت کا بندوبست کر دے۔ اس نے یہ کام فوراً کیا تھا۔ پولیس کے لوگ تمہاری حفاظت کے لیے مامور کر دیے گئے تھے۔ تم پر جو کوئی چلائی گئی تھی، اس سے تمہیں بچانے والی پولیس ہی سے تعلق رکھتی ہے۔“
 ”ناشناختا بتایا تھا اس نے مجھے۔“

”میں جانتا ہوں۔“
 ”آپ کیا نہیں جانتے بابا!“ اب شیراز بھی اس کا معتقد ہو چکا تھا۔

”ہاں۔“ غیلاری مسکرایا۔ ”میں سب جانتا ہوں لیکن ہر بات کا انکشاف کرنے کا کوئی موقع ہوتا ہے۔“
 ”اب میرا بیٹا دی مسئلہ تو یہ ہے بابا کہ مجھے کیا کرنا چاہیے؟“ صدف بولی۔ ”آپ نے مجھے یہاں بلایا تھا اور میں یہاں آ گئی ہوں۔“

”فوری طور پر میرے دماغ میں ایک بات آئی تھی اور میں نے سوچا تھا کہ محبت کی وہ کھوپڑی ہی تمہاری حفاظت کرے گی۔“
 ”محبت کی کھوپڑی؟“ شیراز پوچھ بیٹھا۔

”ہاں۔“ غیلاری مسکرایا۔ ”یہ بہت پرانی بات ہے۔ یہاں کے ایک بہت خوب صورت اور بہادر شخص کو ایک لڑکی سے محبت ہو گئی تھی۔ اس کا نام داگنائی تھا۔ لڑکی بھی اس سے محبت کرتی تھی۔ بعض لوگ ان دونوں کی محبت کو ایک روایتی قصہ سمجھتے ہیں لیکن میں جو کچھ بتا رہا ہوں، وہ کوئی قصہ نہیں، حقیقت ہے۔ اس زمانے میں یہاں بہار کے موسم میں بکریوں کو چرانے کے لیے دور ایک چراگاہ میں جانا پڑتا تھا۔ داگنائی جب موسم بہار میں بکریاں چرانے جاتا تھا تو اس کی محبوبہ ایک پہاڑی ٹیلے پر اپنی آگ چلا کر بیٹھ جاتی کہ وہ چراگاہ سے دیکھی جاسکے۔ چراگاہ میں داگنائی آگ روشن کرتا تھا۔ اس طرح ان دونوں میں پیام و سلام ہو جاتا تھا۔ یہ سلسلہ جاری ہی تھا کہ جب خزاں کے موسم میں داگنائی واپس آنے والا تھا تو اس نے دیکھا کہ لڑکی کی طرف سے آگ نہیں چلائی گئی تھی۔ داگنائی اسی وقت بے تاب ہو کر اپنا گھوڑا دوڑاتا ہوا یہاں پہنچا۔“
 ”اور اسے معلوم ہوا کہ لڑکی کی شادی کسی اور سے ہو گئی۔“ شیراز بول پڑا۔

”جہنم۔“ غیلاری نے جواب دیا۔ ”وہ لڑکی اچانک کسی وجہ سے مر گئی تھی، داگنائی کو جب یہ معلوم ہوا تو اس نے اپنے سینے میں پھری مار کر خود کو ہلاک کر لیا۔“
 ”میں ایک مرتبہ یہ سب کچھ سن چکی ہوں۔“ صدف بولی۔ ”یہاں کی لڑکیاں اب بھی رقص کر کے اور گارگراگنائی

کی محبت کو خراج عقیدت پیش کرتی ہیں۔“
 غیلاری نے اپنا بیان جاری رکھا۔ ”اس زمانے میں میرے جد امجد اس معبد کے بڑے بچاری تھے۔ چند سال بعد انہیں خواب میں بشارت ہوئی۔“

”بشارت؟“ شیراز بول پڑا۔ ”کس کی طرف سے؟“
 ”یہ سوال مت کرو میرے بچے!“ غیلاری مسکرایا۔ ”شہروں کی بڑی بڑی درس گاہوں میں پڑے ہوئے لوگ ان باتوں پر یقین نہیں کر سکتے۔“

”بابا کو اپنی بات کرنے دو شیراز!“ صدف بول پڑی۔ ”ہاں۔“ غیلاری نے اپنی بات جاری رکھی۔ ”انہیں بشارت یہ ہوئی کہ ہمارے بڑے دوہانے محبت کے لیے داگنائی کی قربانی اس حد تک پسند کی ہے کہ اس کی کھوپڑی کو غیر معمولی طاقتیں بخش دی ہیں لہذا اس کھوپڑی کو اب مندر میں ہونا چاہیے چنانچہ میرے جد امجد قبرستان گئے اور صندوق سے داگنائی کی کھوپڑی نکال لائے۔ اسے صاف ستھرا کیا تو دیکھا کہ اس میں غیر معمولی چمک تھی۔ وہ چمک اس قوت کی تھی جو ہمارے بڑے دوہانے اسے دی تھی اور اسے محبت کی کھوپڑی قرار دیا تھا۔ میرے جد امجد نے وہ کھوپڑی محبت کی دیوی وینا کے مجسمے کے قدموں میں رکھ دی۔“

”وینا۔“ شیراز پھر بول پڑا۔ ”سوا دو ہزار سال پہلے یونان کا سکندر اس علاقے سے گزرا تھا۔ اس کے خاصے فوجی نہیں رہ گئے تھے۔ غالباً اس کے اثرات یہاں اب تک ہیں۔ یونانی نامیخا لومنی میں ان کی ایک دیوی ویش ہے جس کو حسن و محبت سے نسبت دی جاتی ہے۔ یہ نام ”وینا“ کیا ویش ہی کی وجہ سے رکھا گیا ہے؟“

غیلاری نے اس کی بات پر دھیان دے بغیر اپنی بات جاری رکھی۔ ”ہمارا عقیدہ یہ رہا ہے کہ اگر کوئی محبت کرنے والا کسی پریشانی میں پڑ جائے تو داگنائی کی کھوپڑی اس کی مدد کر سکتی ہے، بشرطیکہ وہ کھوپڑی میں دنیا کی سب سے قیمتی دھات کا ایک دانت لگوا دے۔“

”سب سے قیمتی دھات تو غالباً ٹیٹیم ہے۔“ شیراز پھر بول پڑا۔

غیلاری نے اپنی بات جاری رکھی۔ ”اس طویل عرصے میں چار بار ایسا ہو چکا ہے کہ یہاں کے چار دولت مندوں نے اس کھوپڑی کے دانت لگوائے ہیں، مختلف ادوار میں۔ وہی دانت اب بھی داگنائی کی کھوپڑی میں ہیں۔ جن لوگوں نے دانت لگوائے تھے، داگنائی کی قوت

مذہب

ہیں غور و فکر کی لت لگانے کے بعد انہوں نے آنا جانا موقوف کر دیا جو اس بات کی علامت تھی کہ وہ واقعی تائب ہو گئے ہیں اور کسی سے ملنا چلنا پسند نہیں کرتے، بالخصوص سگریٹ پینے والوں سے۔ (انہی کا قول ہے کہ بڑھیا سگریٹ پیتی ہے ہر شخص کو معاف کر دینے کو جی چاہتا ہے۔ خواہ وہ رشتے دار ہی کیوں نہ ہو) میں گیا بھی تو کچھ کچھ کہے رہے اور چند دن بعد ایک مشترکہ دوست کے ذریعے کہلوا کیا کہ ”اگر میں نے برائے مجبوری سگریٹ پینے کی قسم کھالی تھی تو آپ سے انتہائی نہ ہوا کہ زبردستی پلا دیتے۔ میں ہوں مجبور مگر آپ تو مجبور نہیں۔“ سات مہینے تک سگریٹ اور سوسائٹی سے اجتناب کیا لیکن خدا بڑا مسیب الاسباب ہے، آخر ایک دن جب وہ وعظ کر خوش خوش گھر لوٹ رہے تھے تو انہیں بس میں ایک سگریٹ لائٹر پڑا مل گیا چنانچہ پہلے ہی بس اسٹاپ پر اتر پڑے اور ایک سگریٹ کا ڈبا خرید لیا (میں اس واقعے پر قطعاً تعجب نہیں ہوا اس لیے کہ گزشتہ کرسکس پر انہیں بس سے ناکون کے موزے چار آنے رعایت سے مل گئے تھے جن کو ”پچھ“ کرنے کے لیے انہیں ایک دوست سے قرض لے کر پورا سوٹ سلوانا پڑا) سگریٹ اپنے جلتے ہوئے ہونٹوں میں دبا کر لائٹر جلا نا چاہا تو معلوم ہوا کہ اندر کے تمام بڑے غائب ہیں۔ اب ماچس خریدنے کے علاوہ کوئی چارہ نہ رہا۔ ہم نے اکثر یہی دیکھا کہ مرزا بیبر کی لینے کو گئے اور آگ لے کر لوٹے! اور دوسرے دن اچانک غریب خانے پر گاڑھے گاڑھے دھوئیں کے بادل چھا گئے جن میں سے مرزا کا سکرانا ہوا چہرہ رفتہ رفتہ ظور ہوا۔ گلے گلوے تمام ہوئے تو نشتوں سے دھواں خارج کرتے ہوئے بشارت دی کہ سگریٹ میرے لیے موجب نشاط نہیں، ذریعہ نجات ہے۔

مشتاق احمد یوسفی کی کتاب
”چراغ تلتے“ سے اقتباس
عاصم خان، حیدر آباد کا منگالہ

ہو۔ تمہیں آغا کیا جاسکتا ہے۔ ایک بار کیا بھی جا چکا ہے لیکن تم بھی نازل نظر آرہے ہو۔“

شیراز نے طویل سانس لی۔ ”تمہارا سا یہ جو پڑ گیا ہے مجھ پر..... اور اب ایک اطمینان یہ ہو گیا ہے کہ ہماری حفاظت کے لیے بھی کچھ نامعلوم لوگ ہیں۔“

”اس بات نے مجھے اور امین میں ڈال دیا ہے۔“

صدف سنجیدہ ہوئی۔ ”اور جب سب کچھ سامنے آ جائے گا تو نہ جانے کیا ہو۔ غیلاری بابا کے الفاظ یاد ہیں مجھے۔“

”واپس شہر پہنچنے کے بعد ہی یہ معاملہ ہوگا۔“ شیراز نے کہا، پھر سکرانا بولا۔ ”بڑے ٹیکہ ہم کج سلامت شہر پہنچ جائیں۔“

☆☆☆

سہ پہر کو وہ دونوں کافرستان سے روانہ ہوئے۔

”پہلے تو تمہیں میرے ہی گھر چلنا ہوگا۔“ راستے میں شیراز نے کہا۔ ”تمہاری کاررواہیں ہے۔“

”وہاں سے مجھے اپنی کارلے کر آئی جی کے پاس جانا ہے۔“

”کیا مطلب؟“

”تم اس وقت سامان ٹھیک کرنے میں مصروف تھے جب غیلاری بابا نے مجھے یہ ہدایت کی تھی۔“ صدف نے جواب دیا۔ ”یہاں کے سردار سیف جان نے میرے بارے میں آئی جی کی بات کی ہے، اسے بتایا ہے کہ میری زندگی خطرے میں ہے۔ دوسرے مجھے قتل کرنے کی کوشش کی جا چکی ہے۔“

”ہم رات گئے پنجپنچ کے پشاور۔“ شیراز نے کہا۔

”اس وقت آئی جی پولیس ہیڈ کوارٹر میں تو نہیں ہوگا، اپنے گھر پر پڑا سو رہا ہوگا۔“

”میں اس کے گھر ہی جاؤں گی۔ غیلاری بابا نے بتایا ہے کہ اس وقت آئی جی اپنے گھر پر میرا منتظر ہوگا۔ اسے بتایا جا چکا ہے کہ میں وہاں کس وقت پہنچوں گی۔ ان سب باتوں سے مجھے ایسا لگ رہا ہے کہ آئی جی سے سیف جان کے تعلقات ذاتی نوعیت کے ہیں۔“

”جب ٹھیک ہے، ورنہ اتنی رات کو کسی کے گھر جانا مناسب نہیں ہوتا۔ میں بھی چلا جاؤں گا تمہارے ساتھ۔“

”نہیں۔“ صدف نے کہا۔ ”میں اکیلی ہی جاؤں گی آئی جی کے پاس۔“

”تم خطرے میں ہو، کسی کو تمہارے ساتھ ہونا چاہیے۔“

”کار جیسے ہی پشاور کی حدود میں داخل ہوئی، پولیس خفیہ طور پر مجھے نظر میں رکھے گی۔ یعنی اس طرح میری

انجمن میں ضرور ہوں کہ میری زندگی کا دشمن کون ہے اور کیوں ہے۔“

غیلاری نے طویل سانس لی۔ ”جب تم پر یہ راز کھلے گا تو..... وہ کچھ کہتے کہتے رک گیا۔“

”تو؟“ صدف کا انداز سوالیہ تھا۔

”بس تم واپسی کے بارے میں سوچو۔“ غیلاری نے جواب دینے سے پہلو ہچکایا۔

”آپ نے بتایا نہیں کہ میں کب واپس جاؤں؟“

”ستاروں کے حساب سے تمہیں آج سہ پہر تک یہاں سے روانہ ہونا چاہیے۔“

”یعنی رات کا سفر؟“ شیراز بولا۔

”ہاں۔“ غیلاری نے کہا۔

اسی وقت ایک آدمی ناشتے کا سامان لے کر آ گیا۔

”ہم ناشتا کر چکے ہیں۔“ صدف نے بتایا۔

”میں نے نہیں کیا۔“ غیلاری نے جواب دیا۔

”رات کو درہم جا جاؤ۔ ابھی آٹھ بجی تو فوراً تم سے ملنے آ گیا۔ تم لوگ یہ اخروٹ اور شہوت کھاؤ۔“ ناشتے میں یہ دونوں چیزیں بھی تھیں۔ اتنے مزے دار شہوت اور اخروٹ تمہیں ہمارے علاقے کے علاوہ کہیں نہیں مل سکتے۔“

”بابا بچ کھدے ہیں شیراز! صدف بولی۔“ میں جب مکئی بار یہاں آئی تھی تو میں نے اخروٹ اور شہوت بہت کھائے تھے۔“

ناشتے کے بعد غیلاری دو ایک باتیں کر کے رخصت ہو گیا۔

”میری خواہش تھی کہ میں یہاں کچھ دن اور گزاروں۔“ شیراز بولا۔ ”یہ علاقہ اور یہاں کے رہنے والے مجھے بہت پیار سے لگے ہیں۔ ایک الگ ہی کچھ ہے ان کا لباس و دیکھو تو کھانا۔ ہرے نیلے رنگ کے کپڑے اور ان پر سپیاں، ٹوپی بھی خوب ہوتی ہے۔ علاقہ بھی سرسبز ہے بے حد۔ صنوبر کے درخت ہی درخت۔“

”چلو..... حالات ٹھیک ہونے کے بعد یہاں آتے رہنا۔“ صدف ہنس کر بولی۔

شیراز اسے غور سے دیکھنے لگا۔

”کیا دیکھ رہے ہو؟“ وہ پھر ہنسی۔

”تمہاری زندگی خطرے میں ہے اور تم اس طرح ہنس بول رہی ہو جیسے یہ عام حالات ہوں۔“

”تو کیا آدمی کو مرنے سے پہلے مر جانا چاہیے؟“

صدف مسکرائی۔ ”اور پھر میری وجہ سے تم بھی خطرے میں

رہنا۔“

”میرے خواہش تھی کہ میں یہاں کچھ دن اور گزاروں۔“ شیراز بولا۔ ”یہ علاقہ اور یہاں کے رہنے والے مجھے بہت پیار سے لگے ہیں۔ ایک الگ ہی کچھ ہے ان کا لباس و دیکھو تو کھانا۔ ہرے نیلے رنگ کے کپڑے اور ان پر سپیاں، ٹوپی بھی خوب ہوتی ہے۔ علاقہ بھی سرسبز ہے بے حد۔ صنوبر کے درخت ہی درخت۔“

”چلو..... حالات ٹھیک ہونے کے بعد یہاں آتے رہنا۔“ صدف ہنس کر بولی۔

شیراز اسے غور سے دیکھنے لگا۔

”کیا دیکھ رہے ہو؟“ وہ پھر ہنسی۔

”تمہاری زندگی خطرے میں ہے اور تم اس طرح ہنس بول رہی ہو جیسے یہ عام حالات ہوں۔“

”تو کیا آدمی کو مرنے سے پہلے مر جانا چاہیے؟“

صدف مسکرائی۔ ”اور پھر میری وجہ سے تم بھی خطرے میں

نے ان کی پریشانی دور کر دی۔“

”یہاں ایسے کارکن ہیں جو کھوپڑی میں دھات کے دانت فٹ کر سکیں؟“

”نہیں۔“ اس مرتبہ غیلاری نے اسے جواب دیا۔ ”اس کے لیے کھوپڑی تمہاری دینا کے کی ترقی یافتہ ملک میں لے جانی پڑتی ہے۔ ہمارے کئی بزرگ دامنائی کی کھوپڑی لے کر وہاں جا چکے ہیں۔ مجھے یہ اعزاز اب تک حاصل نہیں ہوا۔“

”اسی لیے آپ نے مجھے یہاں بلا یا تھا۔“ صدف مسکرائی۔ ”آپ چاہتے تھے کہ میں دامنائی کی کھوپڑی میں پانچواں دانت لگاؤں اپنی پریشانی سے نجات حاصل کر لوں؟“

”ہاں۔“ غیلاری نے کہا۔ ”فوری طور پر میرے دماغ میں یہی خیال آیا تھا لیکن پھر یہاں حالات کچھ بدل گئے۔ میرے لیے ممکن نہیں رہا کہ میں ہفتے بھر کے لیے بھی معبد سے غیر حاضر رہ سکوں اور دامنائی کی کھوپڑی صرف میں ہی یہاں سے لے جاسکتا ہوں۔“

”تو پھر آپ نے میرے بارے میں کیا سوچا ہے؟“

”تمہیں واپس جانا ہوگا۔“ غیلاری نے کہا۔ ”سیف جان کے ذریعے تمہاری حکومت کو آگاہ کر دیا جائے گا کہ تمہاری زندگی خطرے میں ہے۔ اس طرح سرکاری طور پر تمہاری حفاظت کا بندوبست بھی ہو جائے گا اور وہ لوگ تمہارے دشمنوں کا بھی سراغ لگائیں گے۔ اس کے علاوہ میں بھی بہر حال تمہاری طرف سے غافل نہیں رہوں گا۔“

”یہ زیادہ مناسب طریقہ ہے۔“ شیراز نے سر ہلایا۔

”ابتداء میں ہی یہ قدم اٹھایا جانا چاہیے تھا۔“

”میری خواہش تھی کہ مجھے دامنائی کی کھوپڑی میں پانچواں دانت لگوانے کا اعزاز حاصل ہو جائے۔“

”آپ نے وہ کھوپڑی میرے خیالوں میں کیسے پہنچا دی تھی؟“

”وہ دامنائی کی کھوپڑی نہیں، اس کا ٹکس ہوتا ہے۔ میں نے ایک عمل کے ذریعے یہ طاقت حاصل کی ہے کہ دامنائی کی کھوپڑی کے ٹکس کے ذریعے کسی سے بھی بات کر سکوں۔“

”مجھے اپنی بات کرنے کا دھیراز! صدف بولی اور پھر غیلاری سے مخاطب ہوئی۔ ”مجھے کب واپس جانا چاہیے؟“

”پیاری لڑکی! غیلاری مسکرایا۔ ”میں دیکھ رہا ہوں کہ تم کچھ زیادہ پریشان نہیں ہو اس بات سے کہ کچھ لوگ تمہاری جان کے دشمن ہو گئے ہیں۔“

”ہاں بابا! مجھے کسی بات سے خوف نہیں آتا۔ بس

حقانیت کا بندوبست کیا گیا ہے۔ آئی جی کو تمہاری کار کا نمبر بتا دیا گیا ہے۔

”تب ٹھیک ہے ورنہ میں تمہاری تنہائی کی وجہ سے پریشان رہتا۔“ شیراز نے کہا پھر یوں۔ ”جب تم ٹھیک جاؤ تو بتا دینا۔ ڈرائیونگ سیٹ میں سنبھال لوں گا۔“

صدف نے سر ہلانے پر اٹھنا چاہا۔

تمن کھٹے بعد ڈرائیونگ سیٹ شیراز نے سنبھال لی۔

صدف اس کے برابر بیٹھ گئی۔

”پچھلی سیٹ پر جا کے لیٹ جاؤ۔“ شیراز نے کہا۔

”اتنی صحت بھی نہیں ہوتی ہے۔“

”جب دماغ کسی الجھن کا شکار ہو تو تھکن کا احساس نہیں ہوتا۔“ شیراز نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ”تم کافی الجھی ہوئی ہو۔“

”یہ بات مجھے زیادہ الجھاری ہے کہ کوئی ایک مجھے ختم کرنا چاہتا ہے اور کوئی دوسرا مجھے بچانے کے لیے مستعد ہے۔“

شیراز نے سر ہلادیا۔

رات ہو چکی تھی۔ اندھیرے میں اوپر سے نیچے یا نیچے سے اوپر جاتا ہوا راستہ پہاڑ کے گرد گردش میں نظر آتا ہے۔ گاڑیوں کی روشنیوں اور بھی دکھائی دیتی ہیں اور نیچے بھی لیکن دن کی بہ نسبت رات کے وقت ٹریفک کم ہو جاتا ہے۔ اس خیال کا اظہار شیراز نے بھی کیا۔

”ہاں۔“ صدف نے کہا۔ ”لوگ احتیاطاً رات کے وقت کم سفر کرتے ہیں۔ خصوصاً برف باری کے موسم میں تو بہت احتیاطاً ضرورت ہوتی ہے۔ الجھی ہم برف باری کے موسم سے دور ہیں۔“

”یہ اچھا ہی ہے، کسی پریشانی میں نہیں پڑے۔ رات کے وقت یہاں لگتا بہت اچھا ہے۔ دن میں تو دکھائی نہیں دیتا لیکن رات کے وقت ہیڈ لائٹس کی وجہ سے پتا چلتا رہتا ہے کہ ہمارے اوپر کے راستے پر کتنی گاڑیاں رواں دواں ہیں اور نیچے کتنی ہیں۔ اس وقت دو گاڑیاں اوپر دکھائی دے رہی ہیں۔ تین گاڑیاں نیچے ہیں۔ نیچے والی دو گاڑیاں نیچے جا رہی ہیں۔ ایک اوپر آ رہی ہے۔ جو گاڑیاں اوپر ہیں، اگر ان کی رفتار ہم سے زیادہ تیز ہوئی تو وہ جلد ہی ہمیں اپنے پیچھے نظر آئیں گی۔“

”اور جو اوپر آ رہی ہے، وہ ہمارے سامنے آ جائے گی۔ اس وقت بہت محتاط رہنا ڈرائیونگ میں۔ بعض جگہ راستہ بہت تنگ ہوتا ہے۔“

”دیکھ چکا ہوں میں۔“

اسی وقت انہیں فائرنگ کی آوازیں سنائی دیں۔ وہ دونوں چونک گئے۔ پھر انہوں نے ایسی آواز بھی سنی جیسے کوئی بہت بڑا پتھر لڑھکتا ہوا نیچے آ رہا ہو۔

چاندنی رات ہونے کی وجہ سے شیراز اور صدف نے پتھر دیکھ لیا۔ وہ خاصا بڑا پتھر تھا جو ان کی گاڑیاں کو کچل بھی سکتا تھا۔

”بریک لگاؤ۔“ صدف تیزی سے بولی۔

شیراز اس کا جملہ پورا ہونے سے پہلے ہی بریک لگا چکا تھا لیکن نیچے جاتی ہوئی گاڑی میں فل بریک لگا گاڑی کے لیے نقصان دہ ثابت ہوتا ہے۔ اسی لیے شیراز نے اس طرح بریک لگا یا تھا کہ گاڑی کی رفتار کم ہوئی چلی گئی۔

گولیاں چلنے کی آوازیں اب بھی آ رہی تھیں۔

پہاڑ پر ایسی آوازوں کی گونج ایسی ہوتی ہے کہ فائرنگ کی سمت کا اندازہ لگانا ممکن نہیں ہوتا لیکن گولیاں چلنے سے جو شعلے چمک رہے تھے، وہ اوپر دکھائی دے رہے تھے۔

جو دو گاڑیاں اوپر تھیں، وہ اب دکھائی نہیں دے رہی تھیں۔ غالباً ان کی ہیڈ لائٹس بجھا دی گئی تھیں۔ لیکن ممکن تھا کہ انہی گاڑیوں میں سے لوگوں نے ایک دوسرے پر گولیاں چلائی شروع کی ہوں۔

جو پتھر اوپر سے لڑھکتا ہوا نیچے آ رہا تھا، وہ ان کی گاڑی سے خاصا آگے راستے پر گرنا۔ اب شیراز، گاڑی روک چکا تھا۔ اس کے دل کی دھڑکنیں تیز ہو چکی تھیں۔

”کیا یہ پتھر ہماری گاڑی کو کچلنے کے لیے لڑھکا یا گیا ہوگا؟“ وہ بولا۔

”اس امکان کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔“ صدف نے کہا۔ ”شاید یہ مجھے ختم کرنے کی تیسری کوشش تھی۔“

شیراز نے اس وقت دیکھا کہ صدف نے اپنا ریو لوئر نکال لیا تھا اور بہت چوکنا نظر آ رہی تھی۔

”یہ جو فائرنگ ہے۔“ وہ پھر بولی۔ ”یہ شاید وہ لوگ ہوں گے جن میں سے ایک مجھے ختم کرنا اور دوسرا مجھے بچانا چاہتا ہے۔ اس پتھر کا مقصد یہ بھی ہو سکتا ہے کہ یہاں ہمیں گاڑی روکنا پڑے۔ آگے بڑھو شیراز! ہمیں یہاں رکتا نہیں چاہیے۔“

اس وقت فائرنگ کی آوازیں آتی بند ہو چکی تھیں۔

شیراز گاڑی کو پھر حرکت میں لے آیا۔ پتھر.....

راستے کے کنارے پر تھا۔ اگرچہ میں ہوتا تو گاڑی آگے نکالنا مشکل ہو جاتا۔

”یہ صورت حال تو بڑی سستی خیز ثابت ہوئی ہے۔“

اس مرتبہ شیراز کی آواز بھرائی ہوئی تھی۔

”ممکن ہے کہ اوپر اب دو ایک لائٹس بھی پڑی ہوئی ہوں۔“ صدف بولی۔ ”اتنی شدید فائرنگ ہوئی تھی۔“

”اور ہلاک ہونے والے دونوں ہی طرف کے لوگ ہو سکتے ہیں۔“

اسی وقت شیراز کے موبائل کی کھنٹی بجنے لگی۔

صدف جلدی سے بولی۔ ”تم اسٹیرنگ دونوں ہاتھوں سے سنبھالے رکھو۔ میں دیکھتی ہوں۔“ صدف نے اس کی جیب میں ہاتھ ڈال کر موبائل نکال لیا۔

”اچھی نمبر۔“ صدف اسکرین پر نظر ڈالتے ہوئے بڑبڑائی۔

”دیکھو تو، کون ہے۔“

صدف نے کال ریسپونڈ کی لیکن خاموش رہی۔ وہ پہلے دوسری طرف سے بولنے والے کی آواز سننا چاہتی تھی۔

”ہیلو“ ایک بھرائی ہوئی آواز سنائی دی۔

”شیراز..... ہیلو“

”کون ہیں آپ؟“ صدف نے پوچھا۔

دوسری طرف چند لمبے سکوت رہا پھر آواز آئی۔

”آپ صدف بول رہی ہیں؟“

”آپ کون ہیں؟ مجھے کیسے جانتے ہیں؟“ صدف نے پوچھا۔ اس نے موبائل کا انٹریکٹوئل دیا تھا تا کہ شیراز بھی وہ باتیں سن سکے۔

موبائل پر آواز آئی۔ ”میں وہی ہوں صدف بی بی جس نے آپ کے دوست کو آپ کے دشمنوں سے چھڑایا تھا۔ ان کا موبائل ہم نے آپ کے دشمنوں سے واپس لیا تھا تو دیکھ لیا تھا کہ اس کا نمبر کیا ہے۔ میں آپ کے پیچھے آ رہا ہوں۔ جو پتھر آپ کے راستے میں آ کر گر رہا ہے، وہ انہی لوگوں نے گرایا تھا جو آپ کے لیے خطرہ بنے ہوئے ہیں۔ میں نے اور میرے ساتھیوں نے انہی لوگوں پر فائرنگ کی تھی۔ پھر ان لوگوں نے بھی گولیاں چلائی شروع کر دیں لیکن ہمیں کوئی نقصان نہیں پہنچا ہے البتہ ان میں سے دو مارے جا چکے ہیں۔ باقی دو اپنی گاڑی چھوڑ کر کسی طرف بھاگ چکے ہیں۔ میں نے فون پر کہنے کے لیے کیا ہے کہ آپ دونوں تیزی سے نکل جانے کی کوشش کیجیے۔ لیکن ہے کہ آپ کے دشمن دوسرا ناگہانے بیٹھے ہوں۔“

”ہم آگے نکل چکے ہیں اور نکل رہے ہیں لیکن آپ کون ہیں؟ آپ کو اس سے کیا دلچسپی ہے کہ میں خطرے میں

حریف

ہوں یا نہیں؟“

صدف کو اپنی اس بات کا جواب نہیں ملا۔ دوسری طرف سے رابطہ منقطع کر دیا گیا تھا۔

صدف نے موبائل بند کرتے ہوئے سوالیہ نظروں سے شیراز کی طرف دیکھا۔ ”یہ آواز۔“ شیراز سوچتے ہوئے بولا۔ ”میرا خیال ہے اسی آدمی کی جی جی لوگوں نے مجھے بچایا تھا، زیادہ تر یہی بول رہا تھا اس وقت۔ اس نے اپنی آواز بھی بدلی تھی۔ فون پر اور زیادہ بدلی ہوئی تھی لیکن مجھے بڑی حد تک یقین ہے کہ یہ وہی تھا۔“

”اس کا نمبر تو آ گیا ہے تمہارے موبائل پر۔ کسی وقت اس سے دوبارہ بات کی جاسکتی ہے۔“ صدف نے سوچتے ہوئے کہا۔ ”کسی طرح معلوم ہو کہ یہ کون ہے۔“

”تم اس صورت حال سے نکل آنے کے بعد بھی پرسکون نظر آ رہی ہو۔“ صدف جھنجھکیاں مگنی۔

”کتنی بار کرو گے اس قسم کی باتیں؟..... تمہیں کبھی اندازہ نہیں ہو سکا کہ خوف مجھ سے ہمیشہ دور رہتا ہے۔“

”تو اس میں بگڑنے کی کیا بات ہے یارا۔“

”یار باریہ باتیں مت کیا کرو۔“

”اچھا سہ کار۔“

صدف نے موبائل اس کی جیب میں واپس رکھنے سے پہلے کال کرنے والے کا نمبر اپنے موبائل میں ”فیڈ“ کر لیا۔

پشاور پہنچنے تک ان دونوں کا موضوع، صدف کی زندگی کو خطرات اور اس کے ”نامعلوم“ دشمن اور دوست ہی رہے۔

پشاور کی حدود میں داخل ہونے کے بعد انہیں یہ احساس بھی ہو گیا کہ ان کے پاس سے آتی جاتی ہوئی گاڑیوں میں پولیس کے سادہ لباس والے ہو سکتے تھے۔

شیراز کے گھر پہنچنے کے بعد صدف وہاں سے اپنی کار لے کر فوراً ہی روانہ ہو جاتا چاہتی تھی لیکن شیراز نے اصرار کر کے اسے چائے کے لیے روک لیا۔ رات کا کھانا وہ راستے ہی میں کھا چکے تھے۔

چائے پیتے ہوئے شیراز نے پوچھا۔ ”تم آئی جی کے گھر پہنچو کیسے؟ کیا پتا بھی بتا دیا گیا ہے؟“

”ہاں، اور بہت آسان پتہ ہے۔ آسانی سے پہنچ جاؤں گی۔“

☆☆☆

صدف کا خیال درست بھی ثابت ہوا۔ چائے پینے کے بعد وہ شیراز کے گھر سے اپنی کار میں روانہ ہوئی تو

1987ء سے خدمت میں مصروف

LEUCODERMA-VITILIGO

پھلہری
قابل علاج مرض ہے

تجربہ کاروں کا مشورہ ہے ضرور علاج

STERIODS FREE MOST PROGRESSIVE TREATMENT

ایسٹریڈس فری ماسٹ پروگریسیو ٹریٹمنٹ



ASIAN EXCELLENCE
PERFORMANCE AWARD



AWARD OF
BEST ACHIEVEMENT



AWARD
PILLAR OF LEUCODERMA

اسلام آباد

9-اپریل 30 بجے
9-اگست 30 بجے
9-دسمبر 30 بجے
کانٹریکٹنگ ایجنسی: جی ایم سی
فون: (051) 32331725
موبائل: 0300-8566188
فکس: 2261536

لاہور

14-فروری 27 بجے
14-جون 27 بجے
14-اکتوبر 27 بجے
کلف سینٹر
آفس نمبر: 16
فون: 0300-8566188

پشاور

14-فروری 11 بجے
14-جون 11 بجے
14-اکتوبر 11 بجے
پیشہ ورانہ
فون: (0521) 2218215-8
موبائل: 0300-8566188

ملتان

28-مارچ 6 بجے
28-جولائی 6 بجے
28-نومبر 7 بجے
پیشہ ورانہ سینٹر
فون: (081) 4518061-62
موبائل: 4582803 (0300-8566188)

کراچی

13-مارچ 27 بجے
13-جولائی 27 بجے
13-نومبر 27 بجے
پیشہ ورانہ سینٹر
فون: 021-7012068-9
موبائل: 0300-8566188

E-mail: syedajmalzaidi@hotmail.com - syedajmalzaidi@yahoo.co.uk

آدھے گھنٹے کے اندر اندر بڑی آسانی سے آئی جی کے گھر پہنچ گئی۔
خیلا ری کے کہنے کے مطابق آئی جی اس کا منتظر تھا۔
”میرا خیال تھا بے بی کہ آپ آدھے گھنٹے پہلے آ جائیں گی۔“
”راستے میں کچھ گڑبڑ ہوئی تھی جس کی وجہ سے آپ کا اندازہ غلط ہو گیا۔“
”کیا ہوا؟“
”بچھلی باتیں تو آپ کو سیف جان سے معلوم ہو چکی ہوں گی۔“
”ہاں۔“ آئی جی نے کہا۔ ”مجھے تفصیل سے سب کچھ بتایا چاہیے۔“
”یہاں آتے ہوئے مجھ پر ایک بار پھر حملے کی کوشش کی تھی۔“
”کیسے؟“ آئی جی نے تیزی سے پوچھا۔
”صدف نے وضاحت سے سب کچھ بتایا۔“
آئی جی بولا۔ ”آپ کو بالکل اندازہ نہیں کہ آپ کا مددگار کون ہے؟“
”بالکل نہیں ہے۔“
”اور جو آپ کا دشمن ہو گیا ہے، اس کے بارے میں بھی آپ کسی پر شبہ ظاہر نہیں کرنا چاہئیں!“
”جی۔“
”ایسی صورت میں تحقیق کے بڑھانا خاصا دشوار ہوگا۔ یہ بات تو غالباً آپ کے علم میں نہیں ہوگی کہ آج آپ کے والد اور والدہ نے پولیس میں آپ کی گمشدگی کی رپورٹ درج کرائی ہے؟“
”جی بالکل۔“ مجھے علم کیسے ہو سکتا تھا!“
”آپ نے اپنے والدین کو بھی بتایا تھا کہ آپ کا لاش وادی جاری ہیں۔ اس کی کوئی وجہ؟“
”اچانک فیصلہ کیا تھا میں نے وہاں جانے کا۔“
”صدف نے پہلے ہی سوچ لیا تھا کہ اسے کیا بتانا ہے اور کیا نہیں بتانا۔“
”اس کے باوجود۔“ آئی جی نے کہا۔ ”آپ انہیں فون پر بتا سکتی تھیں۔“
”میں انہیں فون پر اطلاع دینے ہی والی تھی کہ مجھے ایک خیال آ گیا۔ یعنی میرا دشمن کوئی ایسا بارسوخ شخص بھی ہو سکتا ہے جو کتنی سے میری لوکیشن معلوم کر لے۔“
آئی جی نے اس کی بات کا جواب دینے کے بجائے

پریشان کر دیا تم نے۔ آخر کہاں غائب ہو گئی تھیں؟“ آخری فقرہ کہتے ہوئے اشرف خاں کے لہجے میں سختی آگئی تھی۔

”میں کالاں وادی چلی گئی۔“ چانک پر گرام بنایا تھا۔“

”فون بھی نہیں کر سکتی تھیں؟“ دل شاد خانم پھٹ پڑیں۔

”جہیں اتنی آزادی اس لیے تو نہیں دی گئی تھی۔“

”آئی ایم سوری ماما“ صدف نے دھیمی آواز میں کہا۔

”نیند خراب ہو گئی میری۔ صبح بات کروں گا اب تم سے۔“

اشرف خاں نے کہا اور ڈرائنگ روم سے جانے کے لیے کھڑا ہو گیا۔

”نیند۔“ دل شاد خانم نے ترشی سے کہا۔ ”نیند اب کیا خاک آئے گی۔“

”مجھے آپ سے کچھ بات کرنا ہے ماما“ صدف کھڑی ہو گئی۔ ”پلیز! میرے کمرے میں چلیے۔ ناراض ہیں آپ مجھ سے۔ میں آپ کی ناراضگی دور کر دوں گی۔“

دل شاد خانم نے فور سے اس کی طرف دیکھا اور پھر کچھ سوچتی ہوئی کھڑی ہو گئیں۔

صدف انہیں اپنے کمرے میں لے آئی اور انہیں بڑی محبت سے اپنے بستر پر بٹھا کر خود ان کے قدموں میں بیٹھ گئی۔

”خوشامد سے میری ناراضگی ختم نہیں ہو جائے گی۔“

دل شاد خانم رضیں۔

”یہ خوشامد نہیں ہے ماما! میری جگہ آپ کے قدموں ہی میں ہے۔ میں آپ سے پہلے صرف یہ سوال کروں گی کہ کیا آپ چاہتی ہیں کہ آپ کی بیٹی اس دنیا میں نہ رہے؟“

”کیا مطلب؟“

”میری زندگی خطرے میں ہے ماما۔“

دل شاد خانم چونک پڑیں۔ ”یہ کیا بکواس کر رہی ہو؟“

”میں مذاق نہیں کر رہی ہوں ماما! میں اپنی حفاظت ہی کے لیے کالاں وادی چلی گئی۔“

”وہاں کیوں۔۔۔ اور تمہارا دشمن کون ہے؟“

”یہ تو میں نہیں جانتی اور یہی جانتے کے لیے کالاں وادی گئی تھی لیکن غیلا ری بابا نے میرے دشمن کی نشاندہی نہیں کی۔ بس میری حفاظت کا بندوبست کر دیا۔“

”کالاں وادی کے اس بوڑھے سے بارے میں تم پہلے بھی بتا چکی ہو اور مجھے کسی انسان کی ایسی طاقتوں پر یقین نہیں ہے۔“ دل شاد خانم نے کہا۔ ”مجھے یہ بتاؤ کہ تمہاری دشمنی کس سے ہو گئی ہے؟“

”مجھے تو یاد نہیں کہ میں نے کسی کو اپنا دشمن بنایا ہو۔“

”کہیں تم۔۔۔ کسی کے راز سے تو واقف نہیں ہو گئی ہو؟“

صدف نے قدرے چٹپٹا ہٹ کے ساتھ دھیمی آواز میں کہا۔ ”جی۔“

”کس کے؟“ دل شاد خانم نے جلدی سے پوچھا۔

صدف ان کے سوال پر دھیان دینے بغیر بولی۔ ”لیکن میں نہیں مان سکتی کہ وہ شخص میری جان کا دشمن ہو سکتا ہے۔“

”آخر وہ ہے کون؟“

صدف نے پھر چٹپٹا ہٹ کے بعد جواب دیا۔ ”جس شخصیت کے ایک راز سے میں واقف ہو گئی ہوں، اسے آپ بھی جانتی ہیں۔“

”میں بھی جانتی ہوں؟“ دل شاد خانم نے چونک کر کہا، پھر کچھ اس طرح ٹھنڈی سانس لی جسے صدف کا اشارہ سمجھ گئی ہوں، تاہم سپاٹ سے لہجے میں پوچھا۔ ”کون ہے وہ؟“

”بابا۔“ صدف نے اب بھی دھیمی آواز میں کہا۔

”لیکن میں اس معاملے میں شدید الجھن کا شکار ہوں۔ کوئی باپ اس طرح اپنی اولاد کا جانی دشمن کیسے ہو سکتا ہے! پھر وہ تحیر سے بولی۔ ”ماما! میرا خیال تھا کہ آپ بابا کا نام سن کر چونک جائیں گی لیکن۔۔۔ وہ رکی۔“ کیا آپ بھی ان کے اس راز سے واقف ہیں؟“

”ہاں۔“ دل شاد خانم نے ٹھنڈی سانس لی۔

”اور۔۔۔ اور۔۔۔ اور۔۔۔“ صدف فیصلہ نہیں کر سکی کہ اسے کیا کہنا چاہیے۔

”میرے مقدّم میں یہی لکھا ہے۔“ دل شاد خانم نے کھوئے ہوئے انداز میں جواب دیا۔ ”مگر میں صبر کر چکی ہوں۔“

”اوہ!“ صدف ماں کا منہ کھتی رہ گئی۔

دل شاد خانم کچھ توقف سے بولیں۔ ”کالاں وادی تم اسی شخص سے ملنے گئی تھیں جس کے بارے میں تمہارا خیال ہے کہ وہ پراسرار قوتوں کا مالک ہے؟“

”جی۔“

”تمہارا خیال تھا کہ وہ جہیں بچا لے گا۔ یا بچا سکتا ہے؟“

”جی ماما! مجھے خطرے سے بھی انہوں نے ہی آگاہ کیا تھا۔ بعد میں ان کی بات سچ بھی ثابت ہو گئی۔ میری جان لینے کے لیے تین کوششیں کی جا چکی ہیں۔“

صدف نے وہ سب کچھ بھی بیان کر دیا جو کچھ اس کے ساتھ پیش آچکا تھا۔ یہ بھی بتایا کہ غیلا ری نے اسے خطرے سے کس طرح آگاہ کیا تھا پھر بولی۔ ”اب میری دوسری الجھن یہ بھی ہے کہ مجھے بچانے کی کوشش کرنے والے کون لوگ ہیں۔“

حوریف

”اب تو یہ سب کچھ شاید پولیس ہی معلوم کر سکے گی۔“

”مجھے اس پر یقین نہیں ہے ماما کہ بابا میری زندگی ختم کرنا چاہتے ہیں۔ اسی لیے اب مجھے یہ پریشانی بھی ہے کہ پولیس نے بابا کے بارے میں سب کچھ معلوم کر لیا تو انہیں گرفتار کر لیا جائے گا۔ آپ انہیں سمجھائی کیوں نہیں ماما کہ وہ یہ سارے کام چھوڑ دیں۔“

”کر چکی ہوں بات! کوئی فائدہ نہیں ہوا۔ اب میں جا کر سوؤں گی۔ تم بھی سو جاؤ۔ رات بھر کی جاگی ہوئی ہو۔“

صدف کچھ نہیں بولی۔ دل شاد خانم اس کے کمرے سے چلی گئیں۔ ساری رات جاگنے کے باوجود صدف کو کچھ دیر سے ہی نیند آئی۔ دوسری صبح وہ جاگی بھی دیر سے۔

”تمہارے باپ نے تمہارے جاگنے کا انتظار نہیں کیا۔“ دل شاد خانم نے اس سے کہا۔ ”ناشا کر کے دفتر چلے گئے۔“

”مگر رات انہوں نے کہا تھا کہ مجھ سے صبح بات کریں گے!“

”اس کی ضرورت نہیں رہی تھی۔ جو کچھ تم مجھے بتا چکی ہو، وہ سب میں نے انہیں بتا دیا ہے۔“

”پھر کیا بولے؟“

”کچھ نہیں۔ ایک جملہ بھی نہیں کہا۔ دفتر چلے گئے۔“

اسی دوران صدف کے موبائل کی ٹھنڈی بجی۔ اس نے کال ریسیو کی۔ کال کرنے والا انسپکٹر آصف تھا۔ اس نے بتایا کہ وہ آئی جی کی ہدایت کے مطابق صدف سے ملنا چاہتا ہے۔

”میں گھر پر ہی ہوں۔“ صدف نے اس سے کہا۔

”آجائے!“ پھر اس نے جواب کا انتظار کیے بغیر رابطہ منقطع کر دیا۔

”کسے بلایا ہے؟“ دل شاد خانم نے پوچھا۔

صدف نے انہیں انسپکٹر آصف کے بارے میں بتا دیا۔

”کیا بیان دو گی اسے؟“ دل شاد خانم نے پوچھا۔

”جو وہ پوچھنا چاہے گا، وہ بتا دوں گی لیکن یہ بہر حال نہیں بتاؤں گی کہ میں بابا کے کسی راز سے واقف ہوئی ہوں۔ پولیس خود کچھ معلوم کر سکے تو کر لے۔ میں بابا کی گرفتاری میں فرق نہیں بننا چاہتی حالانکہ بابا کو میں نے یہی تاثر دیا تھا کہ میں اس سلسلے میں اپنی زبان بند نہیں رکھ سکتی۔“

دل شاد خانم کا چہرہ سیاہ رہا۔

”میں منٹ بعد ہی انسپکٹر آصف آ گیا۔ صدف سے اس کی گفتگو ڈرائنگ روم میں ہوئی۔ اس کے سوال جواب

میں صدف نے وہی سب کچھ بیان کر دیا جو وہ آئی جی سے کہہ چکی تھی۔

”آپ کسی پر بھی شبہ کا اظہار نہیں کر رہی ہیں۔“ انسپکٹر آصف نے کہا۔ ”میں نہیں کہ کوئی بلا وجہ کسی کی جان لینا چاہے۔“

”میں اس بارے میں کچھ نہیں کہہ سکتی۔“

”آپ اپنے دماغ پر زور دینیے۔ میں کھوپڑی والی بات کی طرف تو نہیں جاؤں گا لیکن آپ اس پر غور کیجیے کہ جب آپ کو کسی بھی وجہ سے خطرے کا احساس ہوا اور آپ نے کالاں وادی جا کر مدد لینے کا فیصلہ کیا، اس سے پہلے چوتھیں گھنٹے کا وقت آپ نے کیسے گزارا تھا۔ اس دوران میں کیا کچھ دیکھا اور کیا کچھ سنا تھا۔ بھی ایسا ہوتا ہے کہ انسان جو کچھ دیکھتا یا سنتا ہے، اس کے خیال میں وہ کوئی خاص بات نہیں ہوتی اس لیے وہ اس کے لاشعور میں چلی جاتی ہے لیکن کسی اور کے لیے یہ خطرناک بات ہو جاتی ہے کہ وہ کچھ کسی کے علم میں آ گیا جو ان کے آنا چاہیے تھا اور جس کی وجہ سے نقصان پہنچ سکتا ہے۔ اسی لیے وہ اس کا دشمن بن جاتا ہے جو اس کے بارے میں کوئی خاص بات جان گیا ہو۔“

ان باتوں سے صدف نے اندازہ لگا لیا کہ انسپکٹر آصف محض عام سا پولیس آفیسر نہیں بلکہ خاصا پڑھا لکھا اور سمجھدار شخص بھی ہے۔

”سمجھ رہی ہیں تات۔۔۔ آپ میری بات؟“ انسپکٹر آصف قدرے توقف سے بولا۔

”جی۔“ صدف نے کہا۔ ”میں سوچوں گی، یاد کرنے کی کوشش کروں گی کہ میرے وہ چوتھیں گھنٹے کس طرح گزرے تھے، میں نے کیا کیا دیکھا تھا یا کیا سنا تھا۔“

”اگر ایسا کوئی معاملہ آپ کو یاد آ گیا تو پولیس کے لیے آسانی پیدا ہو جائے گی۔“ انسپکٹر آصف نے کہا۔ ”کسی اور انداز سے سوچ اور تفتیش میں دیر لگ سکتی ہے۔ خیر!“ اس نے اپنی جیب سے ایک کارڈ نکال کر صدف کی طرف بڑھایا۔ ”آپ کو اگر کچھ یاد آ جائے تو مجھ سے رابطہ کیجیے گا۔ کارڈ پر میرے دفتر اور میرے موبائل کا نمبر موجود ہے۔“ اس کے ساتھ دو کھڑا ہو گیا۔

”بہتر ہے۔“

اسے رخصت کرنے کے بعد صدف اپنے کمرے میں آ گئی۔ اب اس نے شیراز سے رابطہ کیا۔ شیراز نے فوراً کال ریسیو کی۔

”میں رات سے ہی منتظر رہا ہوں تمہاری کال کا۔“

شیراز نے کہا۔ ”میں نے فون اس لیے نہیں کیا کہ تم سو رہی ہو۔ رات بھر کی جاگی ہوئی تھیں۔“

”جائے ہوئے تو تم بھی تھے۔“

”ہاں لیکن میں کچھ دیر کے لیے سو گیا تھا اور میری آنکھ دو گھنٹے بعد کھل گئی تھی۔ خیر، چھوڑو یہ باتیں۔ اپنی سناؤ کیا گزری؟“

”کچھ خاص نہیں۔“ لیکن اس جواب کے باوجود صدف نے بے کم و کاست سب کچھ بیان کر دیا۔

”یہ اچھا ہوا۔“ شیراز نے کہا۔ ”میرا مطلب ہے کہ ایک پولیس موبائل تمہاری حفاظت کے لیے ہر وقت موجود رہے گی۔“

”اس قسم کی حفاظت کو میں اطمینان بخش نہیں سمجھتی۔“ صدف نے کہا۔ ”تم بھی ایسی خیریں سنتے اور پڑھتے رہے ہو کہ پولیس کی موجودگی میں لوگ کل ہوتے رہے ہیں۔“

”وہ تو ہے، تاہم اس تدبیر سے دشمن کے لیے مشکلات بہر حال بڑھ جاتی ہیں اور ساتھ ہی خود بھی محتاط رہنا ضروری ہوتا ہے۔ بہتر ہوگا کہ جب تک تمہارے دشمن کا پتا نہ چل جائے تم خود کو گھر تک محدود رکھو۔“

”اس طرح تو میرا دم گھٹ جائے گا شیراز!“

شیراز نے جلدی سے کہا۔ ”ابھی میں کہہ چکا ہوں کہ خود کو اپنے گھر تک محدود رکھو۔ کچھ تو احتیاط برتو۔“

”اچھا!“ صدف نے طویل سانس لی۔ ”ٹھیک ہے۔ میں خود کو قیدی سمجھ لیتی ہوں۔“

”کچھ بھی سمجھو لیکن یہ ضروری ہے کہ گھر تک محدود رہو۔“

”اچھا بابا!“ صدف نے منہ بتایا اور رابطہ منقطع کر دیا۔ اسے خود پر کچھ تبصرہ ضرور تھا کہ اسے خطرے کی پروا ہی نہیں تھی۔ اس نے اس بارے میں خود بھی سوچا تھا کہ یہ غیر فطری ہی بات تھی۔

شب درود گھر میں رہنے کے خیال ہی سے اسے اپنا دم گھٹتا ہوا محسوس ہونے لگا تھا۔ وہ بستر پر پڑی اس معاملے پر غور کرتی رہی۔ اسے اب بڑی حد تک یقین ہو چکا تھا کہ کوئی باپ اپنی اولاد کی زندگی ختم کرنے کی کوشش نہیں کر سکتا تھا۔ اسے شہید اپنے باپ کے پارٹر صدیق و ذراغ پر تھا لیکن پولیس کو وہ اپنے اس شہیے سے بھی آگاہ نہیں کرنا چاہتی تھی۔ اس کا خیال تھا کہ اس طرح پولیس اس کے باپ کے بارے میں بھی سب کچھ جان لے گی۔ اس صورت میں اشرف خاں کی گرفتاری بھی یقینی ہو جاتی۔

سارا دن اسی الجھن میں گزر گیا۔ شام کو اس نے کچھ

دیر شیراز سے موبائل پر بات کی۔

رات کے کھانے کی میز پر اس کا سامنا اشرف خاں سے ہوا۔ اشرف خاں سر جھکائے کھانا کھاتا رہا۔ اس نے ایک بار بھی ایسے نہ بھینکے کی زحمت نہیں کی۔ دل شاد خانم بھی خاموش رہیں۔ اس میز پر رات کا کھانا اتنی خاموشی سے پہلے کبھی نہیں کھایا گیا تھا۔

کھانے کے بعد اشرف خاں نے اپنے معمول کے مطابق ٹی وی لاؤنچ کارخ کیا۔ اس موقع پر دل شاد خانم اور صدف بھی اس کے ساتھ تھیں۔ اس موقع پر صدف نے فیصلہ کیا کہ اسے اشرف خاں سے بات کر لینی چاہیے۔ دل شاد خانم کی موجودگی سے کوئی فرق نہیں پڑتا تھا۔ صدف انہیں سب کچھ بتا ہی چکی تھی۔

”بابا!“ صدف بولی۔

اشرف خاں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔

”مجھے یقین ہے کہ آپ میری جان کے دشمن نہیں ہو سکتے لیکن مجھے ایک شخص پر شبہ ہے۔ کیا میں آپ سے اس بارے میں بات کر سکتی ہوں؟“

”کس پر شبہ ہے تمہیں؟“ اشرف خاں نے پوچھا۔

”پہلے میں اپنے ایک سوال کا جواب چاہوں گی۔“

”پوچھو۔“

”کیا آپ نے اپنے کاروباری شریک کار کو بتا دیا ہے کہ میں آپ کو لوگوں کے اصل کاروبار سے واقف ہو چکی ہوں؟“

”تمہارا اشارہ صدیق و ذراغ کی طرف ہے؟“

”جی۔“

”یہ سوال کرنے کی ضرورت کیوں محسوس کی تم نے؟“

”اگر آپ نے ان کو اس بارے میں بتا دیا ہے تو وہ میرے دشمن ہو سکتے ہیں۔“

”کیا تم اس بارے میں پولیس کو بتانا چاہتی ہو؟ یعنی صدیق و ذراغ پر شبہ کا اظہار کرنا چاہتی ہو۔“

”میں الجھن کا شکار ہوں۔ میں نے پولیس کو یہ بات بتادی اور وہ حقیقت ثابت ہو گئی تو اس کے بعد آپ بھی پولیس کی نظر میں مشتبہ ہو جائیں گے۔ آپ کی گرفتاری کا بھی امکان پیدا ہو جائے گا۔“

اشرف خاں طنز پر انداز میں بولا۔ ”تمہیں یہ شبہ نہیں ہوا کہ میں ہی تمہیں ختم کرنا چاہتا ہوں؟“

دل شاد خانم اس دوران میں بالکل خاموش رہی تھیں۔ وہ اب بھی خاموش رہیں لیکن اشرف خاں کے سوال پر غور سے صدف کی طرف دیکھنے لگیں۔

حریف

صدف بولی۔ ”میں صاف گوئی سے کہوں گی بابا کہ میں اس بارے میں بھی تذبذب کا شکار ہوں۔“

اشرف خاں کے چہرے پر غصے کے آثار ظاہر ہوئے اور پھر وہ ایک جھٹکے سے اٹھ کر تیزی سے چلتا ہوا لاؤنچ کھل گیا۔

صدف نے نظریں جھکا لیں۔

”یہ کیا کہہ گئیں تم!“ دل شاد خانم پولیس۔ ”تم نے ان سے یہ کہہ دیا کہ تمہیں ان پر شبہ بہر حال رہا ہے۔“

صدف اب بھی خاموش رہی۔

اس رات جب وہ سونے کے لیے بستر پر لیٹی تو اسے خود پر رونے آنے لگا۔ یہ پہلا موقع تھا جب وہ بے بسی محسوس کر رہی تھی۔ اس نے شیراز کو فون کیا۔ وہ اپنا ذہن بنانا چاہتی تھی۔ اگر یہ مقصد نہ ہوتا تو بھی وہ شیراز کو فون کرتی۔ اسے بتانی کہ اشرف خاں سے کیا بات چیت ہو چکی ہے۔

کچھ دیر باتیں کر کے اس نے فون بند کیا اور سونے کی کوشش کرنے لگی۔ خاصی دیر بعد اسے نیند آ ہی گئی۔

نہ جانے کتنا وقت گزرا تھا کہ اس نے خواب میں دامنا کی کی کھوپڑی دیکھی اور اسے بیان غیلاری کی آواز سنائی دینے لگی۔

”مجھے دیر سے معلوم ہوا کہ خطرہ تمہارے سر پر پہنچ چکا ہے۔ جاگ جاؤ!“

وہ فوراً جاگ گئی۔ بے اختیار اس کا ہاتھ ٹکے کے نیچے گیا۔

ان دنوں وہ روپا لور اپنے ٹکے کے نیچے رکھ کر سونے لگی تھی۔

روپا لور اس کے ہاتھ میں بھی آ گیا لیکن اسی وقت کسی نے عقب سے اس کا منہ باندھا دیا۔ منہ باندھے والے ہاتھ میں رد مال یا ایسی ہی کوئی چیز تھی جس سے ایک عجیب سی یو سانس کے ذریعے اس کے جسم میں گئی اور اس کے دماغ پر اندھیرا چھاتا چلا گیا۔

☆☆☆

شیراز کا معمول تھا کہ ناشتا کرنے کے بعد انٹرنیٹ پر کئی اخبارات کی خبروں پر اچھی سی نظریں ضرور ڈالتا تھا۔ اگر کوئی خاص خبر دکھائی دیتی تو توجہ سے پڑھ لیتا تھا۔ اس روز اس کی نظر ایک چھوٹی سی خبر پر پڑی اور اسے یوں لگا جیسے اس کے پیروں سے زمین نکل گئی ہو۔

خبر کے مطابق معروف بزنس مین اشرف خاں کی بیٹی صدف کو گزشتہ رات اس کی خواب گاہ سے اغوا کر لیا گیا تھا۔ پولیس اس معاملے کی تفتیش کر رہی تھی۔

خبر میں اس معاملے کی وضاحت نہیں تھی۔ غالباً اخبار

کی کاپی پر پس جاتے جاتے یہ خبر لی تھی، اسی لیے اسے مناسب جگہ بھی نہیں لگا یا جاسکا تھا۔ صرف اشرف خاں کے نام کی وجہ سے شیراز کی توجہ اس کی طرف مبذول ہوئی۔

جلدی سے کیمپو بند کر کے وہ تقریباً دوڑتا ہوا باہر نکلا اور کار میں بیٹھ کر تیز رفتاری سے صدف کے گھر کی طرف روانہ ہو گیا۔ کار کی رفتار کے ساتھ اس کا دماغ بھی ہوا میں اڑ رہا تھا۔

صدف..... صدف.....! صرف اس نام کی گونج پھیلی ہوئی تھی اس کے دماغ میں اور یہ سوال اسے سانپ کی طرح ڈس رہا تھا کہ کیا صدف کو مار دیا گیا ہوگا؟

نہیں، اس نے خود کو تسلی دی۔ وہ زندہ ہوگی۔ اسے ہلاک تو اس کی خواب گاہ میں بھی کیا جاسکتا تھا۔ اغوا کرنے کا مقصد کچھ اور ہی ہوگا۔

اسی سوچ بچار اور ذہنی انتشار میں وہ صدف کے گھر پہنچ گیا۔ ڈرائنگ روم میں اشرف خاں اور دل شاد خانم، دونوں ہی موجود تھے۔ دل شاد خانم کے چہرے سے صاف ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ دیر تک روتی رہی تھیں۔ اس وقت بھی ان کا چہرہ اترا ہوا تھا۔ اشرف خاں کے چہرے سے ظاہر ہو رہا تھا جیسے وہ کسی گہری سوچ میں ہو۔

”یہ کیا ہوا ہے آنٹی؟ گھر میں یہ کیسے ہو گیا؟“ شیراز دل شاد خانم سے مخاطب ہوا۔ وہ اشرف خاں سے کم ہی بات کرتا تھا اور اس وقت تو اس کو یہ خیال بھی تھا کہ صدف کے اغوا میں اشرف خاں کے علاوہ کسی اور کا ہاتھ نہیں ہو سکتا تھا۔ صدف کی یہ بات اپنی اہمیت کو چھپی تھی کہ کوئی باپ اپنی بیٹی کا دشمن نہیں ہو سکتا۔

دل شاد خانم نے غصی ہوئی سی آواز میں اسے بتایا۔

”وہ کئی تھے بیٹا! سب کے چہروں پر تھا غم۔ انہوں نے مجھے اور تمہارے اٹکل کو مضبوط ڈوروں سے باندھ دیا تھا۔ وہ ہمیں کمرے میں چھوڑ کر چلے گئے تھے۔ وہ اس کے بعد ہی صدف کے کمرے میں گئے ہوں گے۔ نہ جانے کیا گزری ہوگی اس پر.....!“ آخر میں ان کی آواز بھرا گئی۔

”پھر؟“ شیراز نے بے تابی سے پوچھا۔ ”آپ دونوں آزاد کیسے ہوئے؟“

اس مرتبہ دل شاد خانم سے بولا نہیں گیا۔ اشرف خاں نے جواب دیا۔ ”انہیں باندھتے ہوئے وہ لوگ کچھ جلدی کر گئے تھے۔ ڈوری کچھ طور پر نہیں باندھی گئی تھی۔ دس بارہ منٹ کی کوشش سے یہ خود کو آزاد کرانے میں کامیاب ہو گئی تھیں، اس کے بعد انہوں نے مجھے ان ڈوروں سے نجات

دلائی تھی۔ پھر فوراً ہی صدف کے کمرے کی طرف گئے تھے۔ کمرے کا دروازہ کھلا ہوا تھا۔ صدف موجود نہیں تھی۔ ”پھر..... پھر؟“ شیراز جلد از جلد سب کچھ جان لینا چاہتا تھا۔

”پولیس کو فون کیا تھا میں نے!“ اشرف خاں نے ہی جواب دیا۔ ”یہ رات ڈیڑھ بجے کا وقت ہے۔ پولیس نے آکر ہر جگہ انگلیوں کے نشانات تلاش کرنے کی کوشش کی تھی۔ یہ انہوں نے ہمیں نہیں بتایا کہ انہیں کوئی نشان ملا تھا یا نہیں۔ چھ بجے کے قریب گئے تھے وہ لوگ یہاں سے۔“

”باہر ایک پولیس موبائل بھی تو کھڑی ہوئی۔“ شیراز نے کہا۔ ”صدف نے مجھے بتایا تھا کہ.....“

”سب پولیس والوں کو بے ہوش کر دیا گیا تھا۔“ اشرف خاں نے جواب دیا۔ ”ان کی گاڑی میں کسی قسم کی گیس کے دھیل پھینکے گئے تھے اور وہ گیس اتنی تیزی سے خارج ہوئی تھی کہ ان میں سے کسی کو بھی گاڑی سے باہر نکلنے کا موقع نہیں مل سکا تھا۔ گھر کے ملازمین بھی ہمیں بے ہوش ہی ملے تھے۔“

شیراز اپنی پیشانی مسلتے لگا۔ اسے اشرف خاں پر غصہ آ رہا تھا جو اس وقت خود کو بہت پریشان ظاہر کر رہا تھا۔ شیراز کی دانست میں سب کچھ کچلا کر اسی کا تھا۔ شیراز نے اس وقت یہاں تک سوچا کہ وہ پولیس کو بتادے کہ صدف کو اپنے باپ کے ہاتھ میں ایک پگھلی ”را“ سے تعلق کا علم ہو گیا تھا۔ صرف اشرف خاں ہی کا نہیں بلکہ صدیق ڈرائیج بھی ”را“ کے لیے کام کر رہا تھا۔ ان دونوں کی مشترکہ دواساز چینی محض دکھاوا تھی۔ شیراز نے یہ بھی سوچ لیا کہ وہ کتنی جلدی دوائیں بھی تیار کر سکتی تھی۔ ”را“ کے انجینٹ کسی سے کوئی بھی کام لے سکتے تھے۔ انہیں ”فڈنگ“ بھی وہی ملک کرتا ہوگا۔ دل شاد خانم کی نظریں اس وقت اشرف خاں کی طرف تھیں۔

شیراز نے سوچتے ہوئے بولنا شروع کیا۔ ”صدف کو ہلاک کرنے کے بجائے اسے اغوا کیا گیا۔ یعنی اس کے دشمن یا دشمنوں کے منصوبے میں کوئی تبدیلی آ سکتی ہے۔ ابھی تو صدف زندہ ہی ہوئی۔ اگر وہ لوگ اسے مارنا چاہتے تو نہیں مار دیتے، اغوا نہیں کرتے۔“ وہ یکا یک اشرف خاں کی طرف متوجہ ہوا۔ ”آپ کا کیا خیال ہے اگلے؟“

”ہاں۔ یہ بات مجھ میں تو آتی ہے۔“ اشرف خاں نے کہا۔ ”ممکن ہے کہ اب ان کا منصوبہ کچھ اور ہو۔“

”وہ کیا ہو سکتا ہے؟“ شیراز نے اشرف خاں کی

طرف غور سے دیکھا۔ ”کیا تمہیں یہ سوال مجھ سے کرنا چاہیے؟“ اشرف خاں نے تیز لہجے میں کہا۔

شیراز نے دل میں کہا۔ ”کرنا تو آپ ہی سے چاہیے۔“ لیکن وہ یہ الفاظ زبان پر نہیں لاسکا۔ اس کا دل تو چاہ رہا تھا کہ اشرف خاں کو دھمکی دے دے۔ اس سے کہہ دے کہ وہ چاہا کہ سب کچھ بتادے گا۔

لیکن اس نے یہ دھمکی نہیں دی۔ فہم و فراست کا تقاضا یہی تھا کہ وہ کل سے کام لے۔ اشرف خاں کے گھر میں ہی بیٹھ کر اسے یہ دھمکی دینے کا مطلب یہ ہوتا کہ وہ فوری طور پر خود کو خطرات میں ڈال لے۔ اسے اس معاملے میں بہت سوچ سمجھ کر کوئی قدم اٹھانے کی ضرورت تھی۔

”میرا دماغ کچھ ناکارہ ہو گیا ہے۔“ شیراز نے اشرف خاں کو جواب دینے کے بجائے دل شاد خانم کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ”میری سمجھ میں نہیں آ رہا ہے کہ مجھے کیا کہنا اور کیا کرنا چاہیے!“

”ہاں۔“ دل شاد خانم نے غصہ کی سانس لی۔

”معاذ ہی کچھ ایسا ہو گیا ہے۔“

دل شاد..... نس سر ملادیا۔ شیراز نے وہ جملہ کہا انہی سے تھا۔ مگر اس کی نظریں اشرف خاں کی طرف ہی تھیں۔ اپنے گھر آ کر وہ کمرے میں بے چینی سے بیٹھنے لگا۔ صدف کے اغوا کی وجہ سے وہ بے چینی میں مبتلا ہو گیا تھا۔ بار بار اس کا دل چاہ رہا تھا کہ وہ پولیس کے پاس جائے اور اشرف خاں کے بارے میں سب کچھ بتادے۔

لیکن وہ یہ بھی چاہتا تھا کہ ایسا کوئی قدم اٹھانے سے پہلے وہ اس کے نتائج و عواقب پر ابھی طرح غور کر لے۔ جو قدم اٹھانے کا خیال اسے بار بار آ رہا تھا، وہ کسی نہ کسی اعتبار سے اس کے لیے خطرناک ثابت ہو سکتا تھا۔ صرف اس کے بیان کی بنیاد پر پولیس اشرف خاں کو گرفتار نہیں کر سکتی تھی۔ کوئی ٹھوس ثبوت ہونا ضروری تھا اور جتنا وقت پولیس کو ثبوت حاصل کرنے میں لگتا، اس دورانیے میں شیراز کی زندگی کسی بھی خطرے سے دو چار ہو سکتی تھی۔

☆☆☆

دوپہر ہو چکی تھی۔ صدف اس کمرے میں ٹہل رہی تھی جہاں اسے ہوش آیا تھا۔ آرام کی ہر چیز اس کمرے میں موجود تھی۔ بستر بھی آرام دہ تھا لیکن صدف ہوش میں آنے کے بعد سے اب تک ٹھیک سے آرام نہیں کر سکی تھی۔ جب حالات کے

طرف غور سے دیکھا۔

”میرا دماغ کچھ ناکارہ ہو گیا ہے۔“

”میری سمجھ میں نہیں آ رہا ہے کہ مجھے کیا کہنا اور کیا کرنا چاہیے!“

حریف

باعث دماغ منتشر ہو تو انسان کے لیے آرام کرنا مشکل ہی ہوتا ہے۔

اغوا ہونے سے پہلے صورت حال یہ بتا رہی تھی کہ کوئی اس کی زندگی ختم کرنا چاہتا ہے اور اب اغوا سے یہ سمجھ میں آ رہی تھی کہ بعد میں کچھ اور سوچ کر اسے ختم کرنے کا ارادہ ترک کر دیا گیا ہے ورنہ اسے اغوا کرنے کے بجائے اس کی خواب گاہ میں ختم ہی کیا جاسکتا تھا۔ بے ہوش کرنے کے بعد اس کے سینے میں جان بوجھتی اتارا جاسکتا تھا۔

ارادے میں تبدیلی کیوں؟ یہ سوال صدف کے دماغ پر مسلسل ہتھوڑے برسا رہا تھا۔

اس کمرے کے ساز و سامان سے اشارہ ملا تھا کہ وہ جدید طرز کے کسی گھر میں ہوئی لیکن ایک طرف کی دیوار میں روشن دان کی موجودگی سے قدامت ظاہر ہو رہی تھی۔

ہوش میں آنے پر ناشتے کا سامان اسے سرہانے کی تائی پر دکھا نظر آیا تھا۔ اس سامان کے ساتھ گرم چائے اور گرم کافی کے تھرماس بھی تھے۔

اس کا مطلب یہ تھا کہ اسے اغوا کرنے والے اسے کوئی جسمانی تکلیف بھی نہیں دینا چاہتے تھے۔

صدف کو جب ہوش آیا تھا، اس وقت پانچ بج رہے تھے۔ کمرے میں لگے ہوئے دیوار گیر لاک سے یہی بات ظاہر ہو رہی تھی کہ صدف کو وقت کا اندازہ نہیں ہوتا۔

پیشانی میں اس نے ناشتا تو نہیں کیا البتہ کافی پی لی اور کمرے میں چلی رہی۔

سات بج چکے تھے جب روشن دان سے ایک اخبار کمرے میں آگرا۔ اس نے وہ جلدی سے اٹھایا۔ وہ کبھی خبروں پر نظر ڈالتی لیکن اس کی توجہ ایک چھوٹی سی خبر کی طرف اس لیے مبذول ہوئی کہ اس کے گرد سرخ دائرہ بنایا گیا تھا۔

وہ خبر اس کے اغوا ہی کے بارے میں تھی۔ اسی سے اسے معلوم ہوا کہ اسے اغوا کرنے والوں نے پولیس والوں، گھر کے ملازمین کو بے ہوش کرنے کے علاوہ اس کے والدین کو بھی باندھ کر ڈال دیا تھا۔

اس خبر نے صدف کو اور زیادہ الجھا دیا۔ اس کا مطلب تو یہ تھا کہ اسے اغوا کرنے والا اشرف خاں نہیں تھا۔

”تو پھر کون؟“

اس سوال پر غور کرتے ہوئے اچانک اس کے دماغ میں خیال آیا کہ یہ سب ڈراما بھی ہو سکتا ہے۔ پولیس کو یہ باور کرانا مقصود ہوگا کہ صدف کو اغوا کرنے میں اشرف خاں کا

حریف

سپینس ڈائجسٹ

مارچ 2018ء

کوئی ہاتھ نہیں۔ اخبار اسے بھی اس لیے پہنچایا گیا تھا کہ خبر پڑھ کر وہ سمجھے کہ اسے اشرف خاں نے اغوا نہیں کروایا تھا۔ لیکن یہ بات صدف کی سمجھ میں نہیں آ سکی کہ اشرف خاں کم از کم اسے کیوں باور کرانا چاہتا ہے کہ اس کے اغوا میں اس کا ہاتھ نہیں؟

ان خیالات میں بہتے ہوئے صدف پھر چوکی۔ یہ کیا ہو گیا؟ اسے اس کا یقین نہیں آ رہا تھا کہ اس کا باپ اس کا جانی دشمن بن گیا ہے لیکن اس وقت وہ اسی انداز میں سوچ

قارئین متوجہ ہوں

پہچان نہیں ملتا

کچھ عرصے سے بعض مقامات سے یہ شکایات مل رہی ہیں کہ ذرا بھی تاخیر کی صورت میں قارئین کو پرچا نہیں ملتا۔ ایجنٹوں کی کارکردگی بہتر بنانے کے لیے ہماری گزارش ہے کہ پرچا نہ ملنے کی صورت میں ادارے کو خط یا فون کے ذریعے مندرجہ ذیل معلومات ضرور فراہم کریں۔

☆ بک اسٹال کا نام جہاں پر چادستیاب نہ ہو۔

☆ شہر اور علاقے کا نام۔

☆ ممکن ہو تو بک اسٹال کا PTCL یا موبائل نمبر۔

رابطے اور مزید معلومات کے لیے

ٹمر عباس 0301-2454188

جاسوسی ڈائجسٹ پبلیکیشنز

سپینس جاسوسی پیکر، سرگزشت

63-C II ایکٹویشن فٹنس ہاؤسنگ اتھارٹی میں دفتری

مندرجہ ذیل ٹیلی فون نمبروں پر بھی رابطہ کر سکتے ہیں

35802552-35386783-35804200

ای میل: jdpgroup@hotmail.com

مارچ 2018ء

سپینس ڈائجسٹ

مارچ 2018ء

رہی تھی.....

اس نے اپنا سر جھٹکا۔ وہ صدیق وڈا رانچ کے بارے میں سوچنے لگی، لیکن یہ اس کے لیے معافی بنا رہا کہ اسے ختم کرنے کے بجائے اسے اغوا کیوں کیا گیا ہے؟ ارادے کی اس تبدیلی کا سبب کیا ہو سکتا ہے؟

صدف کا دماغ مختلف خیالات کی آماجگاہ بنا ہوا تھا۔ اسے ان لوگوں کا بھی خیال آیا جو ایک سبک اس کی حفاظت کرتے رہے تھے اور شیراز کو اس کے دشمنوں سے بچا چکے تھے۔ مگر انہوں نے اسے اس وقت کیوں نہیں بچایا؟ کیا انہیں یہ اندیشہ نہیں تھا کہ اسے اس کے گھر میں بھی ٹارگٹ کیا جاسکتا ہے؟

پھر صدف کے دماغ میں یہ خیال بھی آیا کہ اسے شاید انجی لوگوں نے اغوا کیا ہو اور مقدمہ چلے ہو کہ وہ خطرات میں نہ پڑے۔ اس کمرے میں وہ ہر خطرے سے محفوظ ہو گئی تھی۔ اخبار بھی اسے اس لیے پہنچایا گیا تھا کہ وہ سمجھ لے کہ اس کے اغوا میں اس کے باپ کا ہاتھ نہیں ہے۔ اس کے والدین کو تو باندھ کر ڈال دیا گیا تھا!

صدف غلطی رہی اور اس کا دماغ الجھتا ہی رہا۔ اسے شیراز کا بھی خیال آیا۔ اس نے یہ بھی سوچا کہ شیراز پولیس سے رابطہ کر کے وہ سب کچھ بیان کر سکتا ہے جو وہ اسے بتا چکی تھی۔

انجی خیالات میں الجھتے ہوئے اس نے کئی گھنٹے گزار دیے۔ جھپٹتے جھپٹتے وہ ٹھک جاتی تو کچھ دیر کے لیے بستر پر لیٹ جاتی اور پھر ٹھٹھکتی۔

اس کا فیئر نہ جانے کہاں سے اٹھا تھا کہ وہ پہلے بھی کسی مرحلے پر خوف زدہ نہیں ہوئی تھی اور اب بھی اسے کوئی خوف نہیں تھا۔

دو پہر بھی وہ چلنے لگی۔ ایک بج چکا تھا جب وہ چوکی۔ اس نے دیکھا کہ ایک مضبوط باسکٹ آہستہ آہستہ روشن دان سے نیچے آ رہی تھی۔ اس باسکٹ میں خاصی بڑی ٹرے تھی۔ باسکٹ فرش پر آ کر ٹک گئی۔ صدف نے اس کے قریب جا کر دیکھا۔ ٹرے میں اس کے لیے کھانا بھیجا گیا تھا۔

اتنی مہمان نوازی؟ صدف کے دماغ میں سوال ابھرا۔ وہ جھوک تو محسوس کر رہی تھی لیکن کچھ کھانے کو دل نہیں چاہ رہا تھا۔

☆☆☆

اس وقت اشرف خاں اپنے دفتر میں بیٹھا تھا اور اپنے سامنے بیٹھے ہوئے صدیق وڈا رانچ سے کہہ رہا تھا۔ "میں نے

تمہیں فون پر بتا دیا تھا کہ اس واقعے کے باعث میں بہت الجھا ہوا ہوں، پھر بھی تم نے اصرار کیا کہ میں دفتر آؤں کیونکہ تم مجھ سے ملاقات کر کے کچھ کہنا چاہتے ہو لیکن تم کچھ کہنے کے بجائے بس گھورے جا رہے ہو مجھے!"

"ہاں۔" صدیق وڈا رانچ نے ایک طویل سانس لے کر کہا۔ "میں تمہارے چہرے سے اندازہ لگانے کی کوشش کر رہا تھا کہ تم نے صدف کو زندہ رہنے دیا ہوگا یا نہیں اور لے جا کر ختم کر دیا ہوگا۔"

"کیا بکواس کر رہے ہو تم صدیق!..... میں فون پر تمہیں سب کچھ بتا چکا ہوں اور اخبار میں آچکا ہے کہ وہ لوگ مجھے اور دل شاد کو باندھ کر چھوڑ گئے تھے۔"

"یہ سب کچھ مجھے تمہارا ڈراما معلوم ہو رہا ہے۔ تم اسے اپنے گھر میں ختم نہیں کرنا چاہتے تھے یا ایک بات اور ہو سکتی ہے۔"

"مزید کوئی بات نہیں ہو سکتی۔" اشرف خاں نے اس کی بات کاٹی۔ "حقیقت صرف یہ ہے کہ میرے فیصلے کے بارے میں تمہاری ناپسندیدگی کی وجہ سے میں نے صدف کو ختم کرانے کا فیصلہ ترک کر دیا تھا، یا یوں سمجھ لو کہ بعد میں باپ کا دل نرم پڑ گیا تھا۔ میں اسے کسی نہ کسی طرح سمجھانے ہی کی کوشش کرتا۔"

"جھوٹ بول رہے ہو تم اشرف خاں!..... تم نے میری بات پوری نہیں ہونے دی۔ ایک بات اور ابھی ہو سکتی ہے۔ یہ ڈراما کہ تم مجھے یہ باور کرانا چاہتے ہو کہ صدف کے اغوا میں تمہارا ہاتھ نہیں۔"

"تم بے شک انداز میں سوچ رہے ہو!" "اگر یہ بے شک انداز ہے تو بتاؤ کہ صدف کو اغوا کرنے یا کرانے والا اور کون ہو سکتا ہے..... کس میں اتنی ہمت آ سکتی ہے کہ وہ تمہاری یعنی اشرف خاں کی بیٹی کو اغوا کر سکے؟"

"یہ تو پولیس ہی معلوم کر سکے گی۔" "نہیں اشرف خاں!..... صدف خطرہ تھی تو صرف تمہارے لیے یا میرے لیے۔ اس کے دشمن ہم دونوں ہی ہو سکتے ہیں۔ کیا تم یہ کہہ سکتے ہو کہ اسے میں نے اغوا کر دیا ہے؟"

"ہرگز نہیں۔ میں یہ نہیں کہنا چاہتا۔" "تو کوئی تیسرا دشمن کون ہو سکتا ہے صدف کا؟"

"میں ابھی کہہ چکا ہوں کہ یہ تو پولیس ہی معلوم کر سکے گی۔"

"ان فضول باتوں سے کوئی فائدہ نہیں اشرف خاں

حریف

..... تم مجھے صاف بتاؤ کہ ابھی اسے زندہ رکھا ہے یا ختم کر دیا ہے۔"

"شاید میں تمہاری غلط فہمی دور نہیں کر سکتا۔"

"سنو اشرف خاں!" صدیق وڈا رانچ نے مضبوط لہجے میں کہا۔ "میں صرف سچ سننا چاہتا ہوں۔ اگر وہ زندہ ہے تو مجھے ابھی بتاؤ کہ وہ کہاں ہے ورنہ دوسری صورت یہ ہے کہ میں تم سے اپنا کاروباری اشتراک ختم کر لوں۔ میں کسی ایسے شخص کا شریک کاروبار نہیں رہنا چاہتا جو جیسا سفاک ہو۔ اتنا سفاک کہ اپنی بیٹی کو بھی....."

اشرف خاں نے پھر اس کی بات کاٹی۔ "تم اپنی سوچ کا انداز بدل دو صدیق!"

"میں فیصلہ کر کے آیا ہوں اشرف خاں!" صدیق وڈا رانچ نے کہا۔ "تمہیں دونوں میں سے کوئی ایک بات اپنا ہوگی۔ تم مجھے صدف کے بارے میں کچھ نہیں بتانا چاہتے تو ہماری شرارت فوراً ختم ہو جانی چاہیے۔ میں اپنے لیگل ایڈوائزر کو ہدایات بھی دے آیا ہوں۔ مجھے یقین تھا کہ تم جھوٹ بولنے سے باز نہیں آؤ گے۔ وہ کاغذات تیار ہو چکے ہوں گے جن کی رو سے ہمارا پچھلا اشتراک نامہ منسوخ ہو جائے گا۔ میں کوئی میں نصف کا حصہ دار ہوں۔ میرا سرمایہ تم مجھے لوٹا دو۔"

"ہوں۔" اشرف خاں کچھ سوچنے لگا پھر بولا۔ "کیا اس طرح ہمارا تعلق ختم ہو جائے گا؟"

"ظاہر ہے۔"

"راے کے لیے ہم دونوں ہی کام کرتے ہیں۔" "وہ کوئی شرارت داری نہیں ہے، وہ ایک الگ معاملہ ہے۔ میں آج ہی شاستری سے بات کر لوں گا۔"

شاستری وہ ایجنٹ تھا جس کی ہدایات کے مطابق وہ دونوں کام کرتے تھے۔

"کیا بات کرو گے شاستری سے؟" اشرف خاں نے پوچھا۔ "یہی کہ اسے مجھ سے جو کام لینا ہے، وہ مجھ سے لے اور جو کام تم سے لینا ہے، وہ تم سے لے۔ کوئی بھی کام ہم دونوں کو بیک وقت نہ دیا جائے گا!"

"اچھا!" اشرف خاں نے طویل سانس لی۔ "میری اس پریشانی کی حالت میں بھی تم مجھے چھوڑنے کا فیصلہ کر ہی چکے ہو تو میں کیا کر سکتا ہوں۔"

"ہماری ٹیلیفوننگی اسی وقت ہونا ہے۔"

"جیسا چاہو۔" اشرف خاں نے کہا۔ "کیا تمہارے لیگل ایڈوائزر نے کاغذات تیار کر لیے ہوں گے؟"

"ابھی معلوم ہو جائے گا۔" صدیق وڈا رانچ نے کہا اور اپنا موبائل نکال کر اس پر اپنے لیگل ایڈوائزر سے رابطہ کرنے لگا۔

اشرف خاں اٹھ کر ٹھٹھکتے لگا۔ اس کے چہرے سے گہری سوچ بچا کر اظہار ہو رہا تھا۔

☆☆☆

ذہنی پراگندگی کا یہ عالم تھا کہ صدف کو وقت کے گزرنے کا احساس ہی نہیں رہا تھا۔ اسے وقت کا علم بھی نہ ہوا یا تا اگر کمرے میں دیوار گیر کلاک نہ ہوتا۔ اس وقت کلاک میں رات کے نو بجنے والے تھے۔ وہ بستر پر بیٹھی خیالات میں ڈوب ابھر رہی تھی.... کہ دروازے کے قریب ہونے والی آہٹ نے اسے چو لگا دیا۔

وہ ایک مرتبہ دروازے کے قریب جا کر اسے کھولنے کی کوشش کر چکی تھی اور خود اس کے خیال کے مطابق بھی دروازہ باہر سے بند ہونا چاہیے تھا اور وہ بند ہی تھا۔ صدف نے اس کمرے کی قیدی بننے کے بعد پہلی مرتبہ دروازے پر قدموں کی آہٹ سن لی۔ وہ بستر سے کھڑی ہو گئی۔

دروازہ کھول کر اندر آنے والے اس شخص کو دیکھ کر اسے کچھ زیادہ حیرت نہیں ہوئی۔ وہ صدیق وڈا رانچ تھا۔ اس نے دروازہ صرف بھینٹنے پر اکتفا کیا اور صدف کی طرف چلا آیا۔

"کچھ فیصلہ کر لیا تم نے؟" صدف بے خوفی سے بولی۔ "مجھے اب کوئی مارو گے یا ذبح کر دو گے؟ زہر تو تم میرے منہ میں اس وقت بھی چکا سکتے تھے جب مجھے میری خواب گاہ میں بے ہوش کیا گیا تھا۔"

"بہت بہادر لڑکی ہو تم! میں تمہارے چہرے پر خوف کا سایہ بھی نہیں دیکھ رہا ہوں۔" صدیق وڈا رانچ اس کے قریب آ گیا۔ صدف ایک قدم بھی پیچھے نہیں ہٹی اور صدیق وڈا رانچ کو گھورتی رہی۔

"بیٹھ جاؤ!" صدیق وڈا رانچ نے تنبیہ کی سے کہا۔ "میں تم سے کچھ باتیں کرنا چاہتا ہوں۔"

"یہی پوچھو گے کہ میں نے تمہارے اور اپنے باپ کے بارے میں کس کس کو وہ سب کچھ بتا دیا ہے جو میں جان چکی ہوں۔ مجھے ختم کرنے کے بعد تم ان لوگوں کو بھی ختم کرنا چاہو گے۔"

"بیٹھ جاؤ بے بی! میرا خیال ہے کہ تم نے وہ باتیں شیراز کے علاوہ کسی کو نہیں بتائی ہوں گی۔" صدیق وڈا رانچ نے کہا۔ "اور مجھے اپنے ذریعے سے معلوم ہو گیا تھا کہ شیراز

کو پولیس ہیڈ کوارٹر کی طرف جاتے ہوئے دیکھا گیا تھا۔ اس کے وہاں جانے کا مطلب تھا کہ میری سبھی سکتی ہو اور میں نے بھی سمجھ لیا تھا۔“

صدف چوکی۔ ”شیراز کے ساتھ تم نے کیا کیا؟“
”کچھ نہیں۔ وہ اپنے گھر پر ہوگا۔ اشرف خاں پر پولیس نے ابھی ہاتھ نہیں ڈالا ہے۔ ثبوت حاصل کیے بغیر پولیس یہ قدم اٹھا بھی نہیں سکتی۔ صرف ایک شخص کے بیان کی وجہ سے وہ اشرف خاں کو گرفتار کر سکتی ہے نہ مجھے!“

”تو کیا ہم دونوں کو ایک ساتھ ختم دو گے؟“ صدف جیسے ہوئے لہجے میں بولی۔ ”اسے آج رات اغوا کرنے کا منصوبہ تو بنایا ہوگا تم نے!“
”تم فضول باتوں میں وقت ضائع کر رہی ہو۔“ صدف وڑائچ کسی حد تک جھجکا گیا۔ ”نہیں اسے قتل کرنا چاہتا ہوں نہ تمہیں۔“

”تو مجھے مذاق میں اغوا کیا ہے؟“
”ہاں۔ تمہیں اغوا تو میں نے ہی کر لیا ہے۔“ صدف وڑائچ نے کہا۔ ”اگر نہ کرو داتا تو تم اپنے گھر میں بھی ماری جاسکتی تھیں۔ اشرف خاں تمہیں زندہ نہیں چھوڑنا چاہتا کیونکہ تم اس کے خلاف واحد گواہ ہو۔ صرف تم ہی نے میری اور اس کی باتیں سنیں لیکن میں اشرف خاں کو شروع ہی میں لعن طعن کر چکا ہوں کہ اس نے یہ فیصلہ غلط کیا ہے۔ میں نے تو تمہاری حفاظت کا بندوبست کیا تھا صدف! اشرف خاں نے اپنے گروہ کے لوگوں کو کچرا ل اور کالا لاش وادی کی طرف بھیجا تھا اس لیے میں نے بھی فوری طور پر بندوبست کیا تھا کہ وہ تمہیں نہ مار سکیں۔ شیراز کو تمہارے دشمنوں سے میں نے ہی بچایا تھا اور جن لوگوں نے کالا لاش وادی سے پشاور آنے والے راستے میں تمہاری کار پر ایک بڑا پتھر لڑھکا دیا تھا، ان پر فائرنگ بھی میرے آدھیوں نے کی تھی۔“

صدف حیران نظر آ گئی۔
”کیا مطلب!“ اس کے منہ سے نکلا۔ ”کیا مطلب ہوا ان باتوں کا؟“

”شاید میں نے کوئی بھی الجھی ہوئی بات نہیں کی۔“ صدف وڑائچ اب بھی بہت سنجیدہ نظر آ رہا تھا۔ ”میں تمہارا دشمن نہیں ہوں۔ تمہیں بچانے اور اپنی زندگی کا رخ بدلنے کے لیے میں جو کچھ کر سکا تھا، وہی کیا ہے میں نے!“
پھر اس نے خاموش ہو کر اپنا موبائل نکالا اور کسی سے رابطہ کرنے لگا۔ صدف حیرت سے اس کی طرف دیکھتی رہی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ صدف وڑائچ کی

باتوں پر یقین کرے یا نہ کرے!
”کہاں ہو؟“ صدف وڑائچ نے موبائل فون پر کسی سے پوچھا اور کہا۔ ”میں بے چینی سے تمہارا انتظار کر رہا ہوں۔“ پھر اس نے کچھ سن کر صرف ”اچھا“ کہا اور رابطہ منقطع کر دیا۔

”میں کچھ بھی سمجھنے سے اب تک قاصر ہوں۔“ صدف کی آواز اس مرتبہ میری ہوئی سی تھی۔
”میں نے اپنی زندگی بدلنے کا فیصلہ کر لیا ہے صدف!“ صدف وڑائچ نے کہا۔ ”میں نے اشرف خاں کے ادارے سے اپنی شراکت ختم کر لی ہے۔ اب اس سے میرا کوئی تعلق نہیں ہے۔ میں نے اپنا سب کچھ اس شرط پر ایک ادارے کے حوالے کر دیا ہے کہ اسے غریبوں کی بہتری پر خرچ کیا جائے۔ میں نے خود کو پولیس کے حوالے کرنے کا فیصلہ بھی کیا ہے۔“

”مگر کیوں؟“ صدف کی سمجھ میں نہیں آ سکا تھا کہ یہ سب کچھ سننے کے بعد اسے کیا کہنا چاہیے!
”کیوں؟“ صدف وڑائچ کی مسکراہٹ پڑھ رہی تھی۔ ”نہ جانے کیوں مجھے یہ احساس ہو گیا تھا کہ میں ایک ایسی زندگی گزار رہا ہوں جو مجھے نہیں گزارنا چاہیے تھی۔ آج میں نے اپنے اور اشرف خاں کے خلاف ثبوت بھی حاصل کر لیا ہے۔ آج میں نے اس سے اپنی تلیدگی کے بارے میں جو باتیں کی تھیں، وہ ریکارڈ بھی کر لی تھیں۔ وہ ریکارڈنگ اور اپنا ایک تفصیلی بیان بھی میں پولیس کو بھیج چکا ہوں۔ میں نے اپنے بیان میں یہ بھی کہہ دیا ہے کہ ایک خاص کام کرنے کے بعد خود کو پولیس کے حوالے کر دوں گا۔“

”مجھے ایسا لگ رہا ہے جیسے میں خواب دیکھ رہی ہوں۔“ صدف دھنسی ہوئی سی آواز میں بولی۔ ”خواب میں سن رہی ہوں میں تمہاری باتیں اور یہ تم نے بلایا کسے ہے؟“
اس سے پہلے کہ صدف وڑائچ اسے جواب دیتا، کسی نے آہستہ سے دروازہ کھٹکھٹایا۔ ساتھ ہی ایک آواز آئی۔ ”مہمان..... باس!“ یہ گویا اطلاع تھی۔

”آئے دو۔“
فوراً دروازہ کھلا اور جو شخصیت اندر آئی، اسے دیکھ کر صدف بھونچکا رہ گئی۔ وہ دل شاد خان تھیں۔
”مما!“ صدف کے منہ سے حیرت کے عالم میں نکلا۔
دل شاد خان تیزی سے اس کے قریب آئیں اور اسے سینے سے لگا کر ہانگوں کی طرح پیار کرنے لگیں۔ پھر سر موڑ کر صدف وڑائچ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ”میں کس زبان

سے تمہارا شکریہ ادا کروں!“
”کسا شکر یہ ادا کرنے کی ضرورت ہے؟“ صدف وڑائچ نے ہنسنے کی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔ ”کیا یہ میرا فرض نہیں تھا کہ اپنی بیٹی کو مرنے سے بچاؤں؟“

صدف چوکی۔
”ہاں صدف!“ دل شاد خان نے کہا۔ ”صدیق ہی تمہارے باپ ہیں۔“
صدف ہانگوں کی طرح کبھی صدف وڑائچ کی طرف اور کبھی دل شاد خان کی طرف دیکھنے لگی۔

”ہاں صدف!“ دل شاد..... پولیس۔ ”میری پہلی شادی صدف ہی سے ہوئی تھی۔ جب تم ایک سال کی تھیں تو ہم دونوں ایک غلط فہمی کا شکار ہو گئے۔ نوبت طلاق تک پہنچ گئی۔ بعد میں وہ غلط فہمی تو رفع ہوئی لیکن طلاق ہو چکی تھی اور میں نے اشرف خاں سے شادی بھی کر لی تھی۔ اسے علم نہیں تھا کہ میں صدف کی مطلقہ ہوں۔ میں نے اس سے یہ شرط سنوائی تھی کہ یہ بات وہ تم پر کبھی ظاہر نہ ہونے دے کہ تم اس کی بیٹی نہیں ہو۔“

اس وقت صدف وڑائچ موبائل فون پر کسی کو پتا بتانے کے بعد کھڑا رہا تھا۔ ”آپ اپنے کسی افسر کو پھیلو یوں کے ساتھ یہاں بھیج دیں۔ میں گرفتار دینے کے لیے تیار ہوں۔“ پھر اس نے رابطہ منقطع کر دیا۔

دل شاد..... بھرائی ہوئی آواز میں بولی۔ ”اب میں اشرف خاں سے طلاق لے کر تم سے شادی کر سکتی ہی اور تم.....“
”اس کے علاوہ کوئی راستہ نہیں ہے دل شاد!“ صدف وڑائچ نے کہا اور پھر صدف کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ ”مجھے ایجنٹ ہونے کی وجہ سے غداری کے جرم میں پھانسی بھی ہو سکتی ہے اور شاید عرقیہ..... اس لیے کہ میں خود ہی اپنے آپ کو گرفتاری کے لیے پیش کر رہا ہوں۔ دونوں ہی صورتوں میں میں ہمیشہ کے لیے بچھڑا رہے۔ ایسی صورت میں کیا تم ایک مرتبہ میرے سینے سے نہیں لگو گئی بیٹی؟“

”بابا!“ صدف کی آواز میں کپکپاہٹ تھی۔
”میری بیٹی!“ صدف وڑائچ نے بڑی محبت سے کہا۔ صدف اس کے سینے سے جا لگی۔ اس وقت دل شاد خان کی آنکھوں میں آنسو تیرنے لگے تھے۔
”پولیس شاید اشرف خاں کو گرفتار کر چکی ہو۔“ دل شاد خان نے اپنی آنکھیں خشک کرتے ہوئے کہا۔ ”میں کار میں گھر سے کچھ دور نکل آئی تھی جب میں نے بیک مرر میں دیکھا تھا کہ پولیس کی دو گاڑیاں پچھلے کے سامنے آئی تھیں۔“

”پولیس کو میرا بیان جمل چکا ہے۔ ابھی آئی جی نے مجھے فون پر بتایا ہے۔ اشرف خاں کے خلاف کوئی بڑا ثبوت تو نہیں لیکن شیراز کے پاس میری اور اشرف خاں کی لنگھوکی ریکارڈنگ اسے گرفتار کرنے کے لیے تو کافی ہے۔“

اسی وقت ایک آدھی تیزی سے اندر آیا۔ اس کے ہاتھ میں خود کار رائل گن تھی۔
”باس!“ وہ تیزی سے بولا۔ ”اشرف خاں کے آدھیوں نے حملہ کیا ہے۔ وہ اندر آنے کی کوشش کر رہے ہیں۔“
”روکو انہیں!“ صدف وڑائچ نے دانت پر دانت جمالیے تھے۔

رائل والا جتنی تیزی سے آیا تھا، اتنی ہی تیزی سے واپس لوٹ گیا۔

☆☆☆

”اب کیا ہوگا بابا!“ صدف کی سانس تیزی سے طپنے لگی۔
”گھبراؤ نہیں۔“ صدف وڑائچ نے کہا۔ ”میرے جیسے جی تم دونوں پر آج نہیں آ سکتی۔“

اسی وقت صدف وڑائچ کے موبائل کی گھنٹی بجی۔ صدف وڑائچ نے فوراً کال ریسیو کی۔ کال کرنے والا اشرف خاں تھا۔

”پولیس مجھے گرفتار نہیں کر سکی صدف!“ اشرف خاں کی آواز میں چٹخ تھا۔ ”غیر ہونے کی نوبت تمہاری وجہ سے آئی ہے اس لیے اب میرے آدھی تمہیں زندہ نہیں چھوڑیں گے۔ وہ تمہیں گھر میں گھس کر ماریں گے۔“

”جو باتیں ہوں میں اشرف خاں کہ تمہارے آدھی مجھے آسانی سے مار لیں۔“ صدف وڑائچ دباؤ ڈال رہا تھا۔

”بھی خالی نہیں ہے۔“
پھر اس نے مزید کچھ کہنے سے بغیر سلسلہ منقطع کیا اور جیب سے ریو لور نکال کر دل شاد خان سے بولا۔ ”تم دروازہ اندر سے بند کرلو!“ اس نے دروازے کی طرف قدم بڑھایا تھا۔
”آپ خود کیوں جارہے ہیں بابا!“ صدف اس کا راستہ روکتے ہوئے بولی۔ ”آپ کے آدھی.....“

”یہاں میرے زیادہ آدھی نہیں ہیں میری بیٹی!“ صدف نے کہا۔ ”وہ انہیں اندر آنے سے نہیں روک سکیں گے۔ تم دونوں بھی خطرے میں پڑ جاؤ گی۔“

”ہم ساتھ مرجائیں گے بابا!“ صدف جذباتی ہوئی۔ ”اسنے دن بعد تو مجھے ملا ہے اپنا باپ۔ اب ساتھ ہی جئیں گے اور ساتھ ہی مریں گے، یا مجھے بھی ایک ریو لور دیجیے۔ میں بھی آپ کے ساتھ.....“



ہیڈ لائن



سوفٹنگ کس بورنیچل وٹننگ سٹو سٹوڈیو سٹوڈیو سٹوڈیو سٹوڈیو

بہترین ڈیو کو بیو ڈیو ڈیو



For Day 1



For Day 2



For Day 3

کیئر سے بہتر کیا!

کوئی کمی نہیں آئی تھی۔
”دل شادا“ صدیق وڈاچ بولا۔ ”میرے گھر کی قیمت میں کروڑ سے کم نہیں ہے۔ وہ میں صدق کے نام کر چکا ہوں۔ تم وہ بچ کر کوئی چھوٹا گھر خرید لینا، دو تین کروڑ کا۔ باقی رقم سے دونوں مناسب زندگی گزار سکتی ہو۔“
دوڑتے ہوئے وڈی بوتوں کی دھمک سنائی دی۔ پولیس اندر آ چکی تھی۔

”بابا!“ صدق آنسو بھری آنکھوں کے ساتھ بولی۔ ”آپ اس طرح لے اب بچھڑ بھی جائیں گے۔“
”میں تمہارا شکر گزار ہوں بیٹی! تم نے اشرف خاں سے جو باتیں کی تھیں، وہ بھی بتائی تھیں اس نے مجھے۔ تمہاری ان باتوں نے میرا ضمیر چھوڑ ڈالا اور تم سے مجھے جو محبت ہے، اس نے بھی مجھے مجبور کیا کہ میں اس زندگی سے کنارہ کر لوں۔“
زور دار آواز کے ساتھ دروازہ کھلا اور کئی پولیس والے اندر آ گئے۔ ان میں ایک سب انسپکٹر اور ایک انسپکٹر بھی تھا۔

”صدق وڈاچ؟“ انسپکٹر سوالیہ انداز میں بولا۔
”ہاں۔“ صدیق وڈاچ نے ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔ ”میری کلائیاں حاضر ہیں آفسیر!“ اس نے اپنے دونوں ہاتھ آگے بڑھادیے۔

جب صدیق وڈاچ کے ہتھکڑیاں لگائی جا رہی تھیں، صدق دل شادا... کے سینے سے لگی سسکیاں لے رہی تھی۔
دل شادا خانم کا چہرہ سفید پڑ گیا تھا۔

”آفسیر!“ صدیق وڈاچ بولا۔ ”یہ صدق اور اس کی ماں ہیں۔ میری درخواست ہے کہ آپ انہیں اپنی حفاظت میں میرے گھر پہنچا دیجیے گا۔“ پھر وہ دل شادا خانم کی طرف دیکھ کر بولا۔ ”میرا خیال ہے کہ تم اشرف خاں کے گھر جانا پسند نہیں کرو گی۔“

دل شادا خانم نے اشاعت میں سر ہلا کر اس سے اتفاق کیا۔

”شیراز کو بھی فون کر دو۔“ ہتھکڑیاں لگے ہوئے صدیق وڈاچ نے کہا پھر مسکرا کر صدق سے بولا۔ ”میں عدالت سے درخواست کروں گا کہ وہ مجھے تمہاری شادی میں گھنٹا بھر شرکت کی اجازت دے۔“

صدق ایک بار پھر رو رہی ہوئی صدیق وڈاچ سے جا پٹی۔
دوسرے دن معلوم ہوا کہ اشرف خاں کو شہر سے فرار ہوتے ہوئے گرفتار کر لیا گیا تھا۔

”ابھی تو میرے پاس ایک ہی ریوالور ہے۔ تم اپنی ماں کے ساتھ نہیں رکھو میری جان!“
”نہیں۔“ صدق اس سے لپٹ گئی۔ ”میں آپ کو۔۔۔“
”اے سنبھالو دل شادا!“ صدیق وڈاچ نے صدق کو شاید پوری قوت سے دل شادا خانم کی طرف دھکیل دیا۔
صدق گرتے گرتے پٹی۔ اسے دل شادا خانم ہی نے سنبھالا تھا۔

صدق وڈاچ تقریباً دوڑتا ہوا کمرے سے نکل گیا۔ گولیوں کی تڑتڑاہٹ بڑی شدت سے جاری تھی۔
”مجھے جانے دیں ماما!“ صدق نے خود کو دل شادا خانم سے چھڑایا اور دروازے کی طرف لپکی۔
”صدق!“ دل شادا خانم نے اسے آواز دی اور اس کے پیچھے آئی۔

صدق اس وقت مایوسی کا سامنا کر چکی تھی۔ دروازہ باہر سے بند تھا۔ صدیق وڈاچ نے دل شادا خانم سے دروازہ بند کرنے کے لیے کہا تھا لیکن صدق کی جذباتیت دیکھ کر خود ہی باہر سے دروازہ بند کر گیا تھا۔

صدق نے پاگلوں کی طرح دروازے پر گھونے برسا دیے۔

”خود کو قابو میں رکھو صدق!۔۔۔ میری بیٹی!“ دل شادا خانم نے اسے سمجھتے کر اپنے سینے سے لگا لیا۔

اسی وقت ایسا معلوم ہوا جیسے گولیاں چلنے میں شدت آ گئی ہو۔ ان دھماکوں سے سارا علاقہ گونج رہا تھا۔

”ماما!“ صدق سسکیاں لیتے ہوئے بولی۔ ”اتنے دن چھپائے رکھی آپ نے مجھ سے یہ بات!“

”میں نہیں چاہتی تھی بیٹی کہ تم اشرف خاں کو سوتیلا باپ سمجھو۔“

اسی وقت گولیاں چلنا بند ہو گئیں۔
صدق چونکی۔ ”یہ کیا ہوا؟“

لیکن دل شادا... کیا جواب دیتی اوہ خود کچھ نہیں سمجھ سکتی تھی۔

پھر دو منٹ بھی نہیں گزرے تھے کہ دروازہ کھول کر صدیق وڈاچ اندر آیا۔

”پولیس آ گئی ہے۔“ اس نے بتایا۔ ”ان کی طرف سے جب فائرنگ ہوئی تو اشرف خاں کے آدمی بھاگ نکلے۔

میں اپنے آدمیوں سے بھی کہہ چکا ہوں کہ وہ ہتھیار ڈال دیں اور پولیس کو اندر آنے دیں۔“

صدق پھر اس سے جا پٹی۔ اس کی جذباتیت میں